گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

مئی 2018

نگران اعلیٰ

معراج رسول

سالگرہ نمبر 2

نگہت سیما، عنیزہ سید و عالیہ حرا کی خوب صورت کاوشیں

شیف ثمینہ جلیل بنی پاکیزہ کی مہمان

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

نگرانِ اعلیٰ : معراج رسول
مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیرہ : نزہت اصغر
معاون : آمنہ حماد

MEMBER APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

قیمت فی پرچا (پاکستان) 70 روپے
قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات
زرسالانہ (اندرونِ ملک) 900 روپے...... جلد 46 ...... شمارہ 02 ...... مئی 2018ء

سرورق ماڈل: عظمیٰ
فوٹو گرافی: ایم کاشف (لاہور)

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

مکمل ناول

افسانے

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com



قارئین کرام......السلام علیکم!

ماہنامہ پاکیزہ کا سالگرہ نمبر 2 لیے حاضر ہیں۔

گزشتہ شمارے کی پزیرائی جس طرح آپ نے کی، وہ ہم سب کے لیے بہت حوصلہ افزا ہے۔ تمام خیر خواہوں نے اسے بصد خلوص سراہا۔ ہم صد شکر ادا کرتے ہیں اپنے پروردگار عالم کا جو ہر آن ہر گھڑی ہمارا حامی و ناصر ہے۔

ابھی ہم اسی سُرور کی کیفیت میں تھے کہ گرمی کی ایک لہر نے ہمارے حواس جگا دیے کہ موسم گرما کا آغاز ہو چکا ہے۔ ویسے بھی ملک کے دیگر علاقوں کی نسبت کراچی میں گرمی بہت جلد مہمان بن جاتی ہے اور پھر جانے کا نام نہیں لیتی۔ اس گرمی کو مزید گرمانے میں ہمارا بجلی کا محکمہ دن، رات کوشاں رہتا ہے۔ جب محکمہ بجلی کی اتنی اعلیٰ کارکردگی ہو تو پانی کا محکمہ کیوں پیچھے رہے۔ بالائی علاقوں کی طوفانی بارشیں اور سیلابی ریلے یہاں تک آتے آتے وہیں کہیں دم توڑ دیتے ہیں کہ ان کو ذخیرہ کرنے کی دردِ سری کون مول لے اس لیے کہ ذخیرہ کرنے کو ملک میں اور مال جو ہے تو کون بیچارے بھوک و افلاس کے مارے تنگ دست عوام کی فکر میں دُبلا ہو۔

ہاں اسی عوام کے ایک محنت کش طبقے کا دن ضرور منا لیا جاتا ہے......ائر کنڈیشنڈ کمروں میں چائے ناشتے کے ساتھ کانفرنسز، سیمینارز اور جانے کیا کیا......لو جی دن گزر گیا چھٹی بھی منالی اور یوم مزدور بھی......

☆ قارئین عزیز......جب تک اس ماہ کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں آئے گا، ماہ شعبان کا اولین عشرہ گزر چکا ہوگا......ماہ شعبان ہمارے پیارے رسول پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم......کا مہینہ ہے کہ اس ماہ توبہ و استغفار کی حد درجہ تاکید ہے......اپنے مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کا بے حد ثواب ہے۔ بلاشبہ یہ عمل ہمارے ہی حق میں بہتر ہے اور اس ماہ کے اعمال اور نفلی روزے دراصل ماہ رمضان المبارک کی تیاری ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ان مبارک مہینوں کی عبادات خلوص نیت سے کرنا نصیب ہوں اور ہم حقوق الٰہی کے ساتھ، ساتھ حقوق العباد کو بھی عین عبادت سمجھ کر انجام دیں، الٰہی آمین......!

مدیرہ

نزہت اصغر

دین کی باتیں

اس نے کہا تم ڈالو، پھر جب انہوں نے ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں کو جادو کردیا، اور ان کو ڈرا دیا، اور وہ بہت بڑا جادو لے آئے (۱۱۶) اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ تو اپنا عصا ڈال دے۔ پس وہ عصا ان سب ڈھکوسلوں کو جو انہوں نے جھوٹ موٹ بنائے تھے، نگلتا چلا گیا (۱۱۷) پس حق واضح ہوگیا اور جو کچھ وہ کرتے تھے سب باطل ہوگیا۔ (۱۱۸) پس وہ (جادوگر) وہیں مغلوب ہوگئے اور ذلیل ہو کر واپس لوٹے۔ (۱۱۹) اور سب جادوگر سجدہ کی حالت میں گرا دیے گئے۔ (۱۲۰) کہنے لگے ہم سب جہانوں کے پروردگار پر ایمان لائے، (۱۲۱) (جو) پروردگار ہے موسیٰ کا اور ہارون کا (بھی)۔ (۱۲۲) فرعون نے کہا پیشتر اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں، تم اس پر ایمان لے آئے ہو۔ یقیناً یہ ایک چال ہے جو تم نے اس شہر میں اس لیے چلی کہ تم اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو۔ پس عنقریب تم (اس کا نتیجہ) جان لوگے۔ (۱۲۳) میں تمہارے مقابل کے ہاتھ اور پاؤں ضرور کاٹوں گا۔ پھر تم سب کو ضرور سولی دے دوں گا۔ (۱۲۴) وہ بولے بے شک ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ (۱۲۵) اور تو ہم سے بیر نہیں کرتا مگر اس بات کا کہ ہم ایمان لے آئے اپنے پروردگار کی نشانیوں پر جب وہ ہمارے پاس آئیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر کا دہانہ کھول دے اور ہمیں تو مسلمان ہی اٹھا لے۔ (۱۲۶) اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا کہ کیا تم موسیٰ اور اس کی قوم کو اس لیے چھوڑ دوگے کہ وہ زمین میں فساد کریں، حالانکہ وہ تمہیں اور تمہارے معبودوں کو چھوڑ چکے ہیں۔ (فرعون) بولا ہم عنقریب ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دیں گے۔ اور ہم یقیناً ان پر غالب ہیں۔ (۱۲۷) موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، تم اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ بے شک زمین اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اور انجام تو پرہیزگاروں ہی کے لیے ہے۔ (۱۲۸) وہ بولے کہ ہمیں تو تکلیف ہی دی جاتی رہی اس سے پہلے کہ تو ہمارے پاس آتا اور بعد اس کے کہ تو ہمارے پاس آگیا۔ اس نے کہا قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کردے، اور تمہیں زمین میں ان کا قائم مقام کردے، پھر وہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ (۱۲۹) اور یقیناً ہم نے آلِ فرعون کو کئی سالوں کے متواتر قحطوں اور پھلوں کے نقصان میں پکڑے رکھا، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں، (۱۳۰) پس جب ان کو کوئی بھلائی پہنچتی تو وہ کہتے یہ ہمارے لیے (ہی آئی) ہے، اور اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچتی تو وہ اسے موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے۔ خبردار! اللہ تعالیٰ کے نزدیک نحوست انہی کی ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (۱۳۱) اور فرعونیوں نے کہا کہ جب بھی تم ہمارے پاس کوئی نشانی لاؤ کہ اس سے ہم پر جادو کردو۔ پھر بھی ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ (۱۳۲) پس ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں، اور چچڑیاں اور مینڈک، اور خون (بھی) یہ کھلی نشانیاں تھیں۔ پھر بھی وہ بڑائی چاہتے رہے، اور وہ مجرموں کی قوم تھے۔ (۱۳۳)

(سورۂ اعراف ۷، پارہ ۹۔ آیات ۱۱۶ تا ۱۳۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ الدَّاعِیْ اِلَی الْاِیْمَانِ ؕ

سید کونین، ختم المرسلین، افضل الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الٰہی و صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا حریص علیکم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے۔ جس کے معنی و مفہوم: خواہش کرنے والے (لوگوں کے ایمان کے لیے) تم پر حرص کرنے والے (ایمان کی) کے ہیں۔

1۔القرآن: ترجمہ: لوگو! تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہش کرنے والے ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے مہربان ہیں۔ (آیت 128، سورۂ توبہ)

ترجمہ: اے پیغمبر! شاید تم اس (رنج) سے اپنے آپ کو ہلاک کردوگے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ (آیت 3، سورۂ شعرا)

2۔الحدیث: 1 ۔ ایک بار ابو جہل نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا پہنچائی تو حضرت حمزہؓ نے یہ واقعہ سنا تو انہوں نے ابو جہل کو جا پیٹا اور پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آ کر بتایا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم کو خوش ہونا چاہیے کہ میں نے ابو جہل سے تمہارا انتقام لے لیا ہے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا۔ ''مجھے انتقام وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں...... ہاں تم مسلمان ہو جاؤ تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔'' سیدنا حمزہؓ کے دل میں یہ بات جم گئی اور وہ مسلمان ہوگئے۔

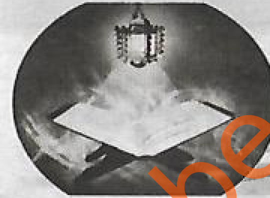
2۔ ایک یہودی لڑکا حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کرتا تھا۔ وہ بیمار پڑا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھے پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کرلے۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا ابوالقاسم (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کنیت) کی بات مان لے۔ چنانچہ وہ مسلمان ہوگیا جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا۔ ''خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچالیا۔'' (بخاری)

3۔الرائے: 1 ۔ اپنے انتہائی عروج کے وقت میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادب و آداب رکھ رکھاؤ اور وضع قطع میں وہی سادگی اپنائے رکھی جو انتہائی مشکل دنوں میں تھی۔ حجرے میں داخل ہونے پر کسی کے غیر معمولی عقیدت ظاہر کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض ہو جاتے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا کے کسی مقصد سے غرض تھی تو وہ صرف اور صرف ایمان کا علاقہ تھا۔ (واشنگٹن ارونگ)

4۔الفضائل: اگر کسی کے پیٹ میں درد ہو تو باوضو حالت میں دس مرتبہ یہ اسم مبارک حریص علیکم پڑھ کر پانی پر دم کرے اور مریض کو پلائے۔ درد ختم ہو جائے گا۔

(قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اقتباس)

اللہ اور اس کا نور





قرآن پاک سے عشق کی پُرنور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

باب شانزدھم

بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ھدایات

قرآن پاک کی سورتوں سے لیے گئے احکامات پچھلے کئی ابواب سے درج کیے جا رہے ہیں۔آج **سورۂ فرقان**: 25 سے آغاز کرتے ہیں۔

261۔''کیا آپ نے اس کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنالیا ہے تو کیا آپ اس پر نگہبان ہوسکتے ہیں؟''(آیت42)

262۔''یہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بدتر ہیں۔''(43)

263۔''اور وہ اللہ ہی تو ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا دیا ایک کا پانی میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور ایک کا پانی کھاری ہے اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنادی۔''(53)

264۔''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو ان کو سلام کہتے ہیں۔''(63)

265۔''اور جو اپنے رب کے سامنے سجدہ اور قیام کرتے ہوئے راتیں بسر کرتے ہیں۔''(64)

266۔''دوزخ کے عذاب سے بچنے کی دعا مانگتے ہیں۔''(65)

267۔''نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ تنگی بلکہ اعتدال سے خرچ کرتے ہیں۔''(67)

268۔''وہ اللہ کے ساتھ کسی کو معبود نہیں پکارتے، جس جان کو مارنے کو منع کیا گیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔''(68)

269۔''وہ جھوٹی گواہی بھی نہیں دیتے جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوتو بزرگانہ انداز سے گزرتے ہیں۔''(72)

270۔''اور جب ان کو اپنے رب کے احکامات سنائے جاتے ہیں تو ان پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے۔''(73)

271۔''اور جو اپنے رب سے دعا مانگتے ہیں، اے ہمارے رب! تو ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عنایت فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔''(74)

272۔''ان صفات کے لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے میں اونچے، اونچے محلات عطا کیے جائیں گے اور ان کو وہاں دعا و سلام کے ساتھ استقبال کیا جائے گا۔''(75)
''اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔''(76)

سورۂ شعرا 26 :

273۔''ابراہیمؑ نے کہا...... رب العالمین میرا دوست ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے راستہ دکھاتا ہے اور وہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا عطا کرتا ہے۔''(آیات 75 تا 80)

274۔''کیا میں تم کو بتادوں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں(221)۔شیطان ہر جھوٹے گناہ گار پر اترتے ہیں(222) اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں(224)۔شاعر لوگ وہ کہتے ہیں جو خود نہیں کرتے۔(226)

سورۂ عنکبوت 29 :

275۔''(اے نبی) آپ اس کتاب کو پڑھا کیجیے جو آپ پر وحی کی گئی ہے اور نماز کی پابندی کیجیے...... یقیناً نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ خوب جانتا ہے۔''(45)

276۔''ہر شخص موت کا مزہ چکھنے والا ہے پھر تم سب ہماری طرف لوٹ کر آؤ گے۔''(57)

277۔''اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کردیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کردیتا ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جانتا ہے۔''(62)

278۔''اور یہ دنیا کی زندگی تو محض کھیل اور تماشا ہے اور بے شک آخرت کا گھر ہی اصلی سچی زندگی ہے۔''(64)

279۔''اور جو لوگ ہماری راہ میں تکلیفیں برداشت کرتے ہیں تو ہم ضرور ان کو اپنے رستے دکھائیں گے اور اللہ بے شک نیکوں کے ساتھ ہے۔''(69)

سورۂ روم 30 :

280۔''اور جو تم سود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں اضافہ ہو تو اللہ کے نزدیک اس میں اضافہ نہیں ہوتا اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اور اس سے اللہ کی رضا چاہتے ہو تو یہی لوگ اپنی دولت کو دو چند، سہ چند کرنے والے ہیں۔''(281)

سورۂ لقمان 31 :

281۔''حضرت لقمان کی بیٹے کو نصیحتیں۔(آیات 13 تا 19)

(1) اللہ کے ساتھ کبھی شرک نہ کرنا۔
(2) ماں، باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔
(3) ان کا کہنا مان، ہاں شرک کے لیے کہیں تو ان کا کہنا نہ ماننا۔
(4) دنیا کے کاموں میں صرف ان کا ساتھ دینا۔
(5) اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر ہو اور ہو بھی کسی پتھر کے اندر یا آسمانوں میں مختفی ہو یا زمین میں ہو تو اللہ اس کو بھی لے آئے گا، بلاشبہ اللہ بڑا باریک بین اور خبردار ہے۔
(6) نماز پابندی سے ادا کرتے رہنا۔
(7) اچھی باتوں کا حکم کرتے رہنا۔
(8) بری باتوں سے منع کرتے رہنا۔
(9) مصیبت پر صبر کرتے رہنا جو تجھے پہنچے۔ بلاشبہ یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔
(10) لوگوں کے سامنے (مارے غرور کے) اپنا گال نہ پھلانا۔
(11) زمین پر اکڑ کر نہ چلنا۔
(12) اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرنا۔
(13) اپنی آواز کو پست رکھنا۔

283۔ ”اگر زمین کے تمام درخت قلم ہوں اور سمندر سیاہی ہوں یعنی ساتوں سمندر سیاہی بن جائیں تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں۔“(27)

284۔ ”اے انسانو! تم اپنے رب سے ڈرو اور اس روز کا خوف کرو جس میں باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام نہ آئے گا۔ یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور دنیا کی زندگی تم کو اللہ سے دھوکے میں نہ رکھے۔“(33)

285۔ ”کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس سرزمین پر مرے گا۔“(34)

سورۂ سجدہ 32 :

286۔ ”آسمانوں اور زمین کو اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں (سب کو) چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوگیا۔ اس کے سوا تمہارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔(4)

287۔ ”اللہ کا ایک دن ہمارے ایک سال کے برابر ہے۔“(5)

288۔ ”آپ فرما دیجیے موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روح قبض کر لیتا ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“(11)

289۔ ”ہماری آیات پر تو وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب وہ آیات ان کو یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں، وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔“(14)

290۔ ”جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے جنتیں ٹھکانا ہیں، بطور مہمانی کے ان کاموں کی جزا ہے جو وہ کرتے تھے۔“(19)

سورۂ احزاب 33 :

291۔ ”اللہ نے کسی آدمی کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے اور نہ تمہاری بیویوں کو جن کو تم ماں کہہ بیٹھتے ہو تمہاری ماں بنایا اور نہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے بنایا...... یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔“(4)

292۔ ”تم لے پالکوں کو ان کے اصلی باپوں کے نام سے پکارا کرو۔“(5)

293۔ ”آپؐ کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں۔“(6)

294۔ ”بے شک تمہارے لیے اللہ کے رسول کی پیروی میں بہترین نمونۂ عمل موجود ہے۔ اس شخص کے لیے جو اللہ پر اور آخرت کے دن عقیدہ رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا رہتا ہے۔“(21)

295۔ ”اے نبیؐ کی بیویو! تم میں سے جو صریح ناشائستہ حرکت کرے گی اس کو دوگنی سزا دی جائے گی۔“(30)

296۔ ”اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرے گی اس کو دوگنا ثواب۔“(31)

297۔ ”محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ ہی ہر چیز سے خوب واقف ہے۔“(40)

298۔ ”مومنو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔“(41)

299۔ ”اور اسی کی صبح شام پاکی بیان کرو۔“(42)

300۔ ”جس روز وہ (مومنین) اللہ سے ملاقات کریں گے تو ان کا تحفہ اللہ کی طرف سے سلام ہوگا۔“(44)

301۔ ”اے نبیؐ! ہم نے تم کو گواہی دینے والا خوشخبری سنانے والا اور عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔“(45)

302۔ ”مومنو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کر کے ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دو تو تم کو اختیار نہیں کہ تم اس کو مجبور کرو کہ عدت پوری کرے اور ان کو کچھ خرچ دے کر خوشی خوشی رخصت کرو۔“(49)

303۔ ”مومنو! تم رسول کے گھر میں نہ جایا کرو مگر اس وقت جب تم کو کھانے کی اجازت دی جائے۔ جب رسولؐ کی بیویوں سے سامان مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو۔“(50)

304۔ ”عورتوں پر اپنے باپ سے پردہ نہ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ اپنے بیٹوں سے اور نہ اپنے بھائیوں سے اور نہ اپنے بھتیجوں سے اور نہ اپنے بھانجوں سے اور نہ اپنی قسم کی عورتوں سے اور نہ لونڈیوں سے۔“(55)

305۔ ”بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رسولؐ پر درود بھیجتے ہیں، مومنو! تم بھی رسولؐ پر درود اور سلام بھیجتے رہا کرو۔“(54)

306۔ ”اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجیے کہ (جب وہ باہر نکلیں تو) اپنے اوپر اپنی چادریں تھوڑی سی نیچی کر لیا کریں۔ یہ امر ان کے لیے باعثِ شناخت اور امتیاز ہوگا تو ان کو کوئی ایذا نہ دے گا۔“(59)

307۔ ”بلاشبہ اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے۔“(64)

308۔ ”مومنو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دی تھی تو اللہ نے ان کو بے عیب ثابت کر دیا۔“(69)

309۔ ”مومنو! تم اللہ سے ڈرو اور درست بات کیا کرو۔“(70)

310۔ ”اللہ تمہارے اعمال کو درست کر دے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔“

سورۂ سبا 34 :

311۔ ”اور اللہ کے نزدیک کوئی سفارش کسی کے کام نہیں آئے گی مگر جس سفارش کی اجازت اللہ نے عطا کر دی ہو۔“(23)

312۔ ”اے نبیؐ ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“(28)

313۔ ”جو ایمان لائے، نیک عمل کرتے رہے، ایسے لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب دوگنا بدلہ ملے گا۔“(37)

سورۂ فاطر 35 :

314۔ ”اللہ جو لوگوں کے لیے (اپنی) رحمت (کا دروازہ) کھول دے تو پھر اس کو بند کرنے والا کوئی نہیں ہے اور جو بند کر دے تو اس کے بعد کوئی اس کو کھولنے والا نہیں۔“(4)

315۔ ”لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز خوبیوں والا ہے۔“(15)

316۔ ”اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں۔“(19)

317۔ ”اور نہ تاریکی اور روشنی۔“(20)

318۔ ”اور نہ سایہ اور دھوپ۔“(21)

319۔ ”اور نہ زندہ اور مردہ برابر ہیں، بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے سنا دیتا ہے اور جو قبروں میں ہیں آپ ان کو نہیں سنا سکتے۔“(22)

320۔ ”بے شک وہ لوگ جو اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے وہ پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جو کبھی تباہ نہ ہوگی۔“(29)

سورۂ یٰسین 36 :

321۔ ”وہ ذات پاک ہے جس نے ہر چیز کے جوڑے بنائے۔ زمین کی نباتات کے، اور خود ان کے اور ان چیزوں کے جن کی ان کو خبر نہیں۔“(36)

322۔ ”اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ چاند (گھٹتے، گھٹتے) کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے۔“(39)

323۔ ”نہ تو سورج ہی چاند تک پہنچ سکتا ہے کہ اس کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آ سکتی ہے اور ہر ایک دائرے میں تیر رہا ہے۔“(40)

324۔ ”جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے۔“(28)

سورۂ زمر 39 :

325۔ ”اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کہہ دیجیے اے میرے بندو! جو اپنے اوپر ظلم کر چکے ہیں، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ تو سب گناہوں کو معاف کر دے گا۔ بلاشبہ وہ بڑا بخشنے والا بڑا رحم کرنے والا ہے۔“(53)

326۔ ”اس حسین ترین کتاب کی پیروی کرو جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے اتری ہے۔ قبل اس کے کہ تم پر عذاب ناگہاں آ جائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔“(55)

(جاری ہے)

......یہ کہاں کی بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں...
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے...
دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے...
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہوجاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے...
آج کا انسان یہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا...
عبادات، معاملات...
جنت گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی...

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 22

تاجور نے زارا کی غیر ہوتی حالت کو محسوس کر لیا تھا...... کیونکہ اب وہ اپنے نفس میں عود کر آنے والے شیطان کے اچانک ہونے والے عقبی وار سے چوکنی ہو گئی تھیں...... اور روح میں خیر و شر کا ازلی معرکہ برپا ہو رہا تھا۔ احسان جتانے کی کبھی نیت نہیں کی تھی مگر جتا دیا تھا...... دل پر منوں بوجھ آ پڑا زارا نے کرسی کی ہتھی پر ہاتھ دھرا پھر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی...... ہنوز پلکیں جھپکائے بنا تاجور کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں، تمہارا برا نہیں چاہتی، تمہیں دوسری لڑکیوں کی طرح نارمل اور نیچرل لائف گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس بار تاجور کے لہجے میں بلا کی شکستگی تھی...... یوں محسوس ہو رہا تھا کہ عمر بھر کی ریاضت پل میں اکارت کر بیٹھی ہوں۔

"آ...... آ...... پ...... مم، میری اماں نہیں ہیں؟" زارا پتھرائی آنکھوں سے تاجور کو تکتے ہوئے شدید صدمے کی کیفیت میں پوچھ رہی تھی۔

"ماں بن کر پرورش تو کی ہے۔" تاجور بہ مشکل یہی کہہ سکیں۔

"ماں مر گئی تھی...... باپ تو زندہ ہے...... مگر وہ کہاں ہے؟" زارا سابقہ کیفیت میں پوچھ رہی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم...... اس نے لکھ کر دے دیا تھا کہ اب اس کا تم سے کوئی واسطہ، تعلق نہیں...... کبھی claim نہیں کرے گا۔" تاجور نے نظریں جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا؟" زارا نے جواب سنا تو صدمہ بڑھ گیا۔

"اب بھی نہ بتاتی...... اگر تمہاری سرکشی حد سے نہ بڑھتی۔" تاجور نے سارا بوجھ اس کی طرف سرکایا۔

زارا جو بے پانی کے دھوئیں جیسے بادل کی طرح اڑتی پھرتی تھی، ایک بھیانک سچ اور خوفناک حقیقت کے بوجھ تلے دبتی جا رہی تھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ پاؤں تلے زمین شق ہو رہی ہو اور وہ دھنستی جا رہی ہو۔

گھر میں انسان، بکری، مرغی، طوطا، مینا بھی پالتا ہے تو وابستگی کا احساس ہمہ وقت جکڑے رکھتا ہے، پالتو جانوروں، پرندوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے، زارا تو پھر انسان کا بچہ تھی...... جب سے بولنا سیکھا تاجور کو اماں، اماں پکارتی تھی کیونکہ سفینہ بھی ماں کو اماں کہتی تھی۔

تاجور نے زارا کے چہرے پر پھیلی وحشت و اذیت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا، کتنی بے بسی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی...... وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھیں اور اسے سینے سے لگا لیا۔

"میں کبھی نہ بتاتی...... مگر میں تمہیں بہت اچھی زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں، ایک مکمل زندگی، ایک پیار کرنے والا شوہر...... پیارے، پیارے بچے، اور ان کی بے حساب خوشیاں...... زارا، تمہیں برے، بھلے کی سمجھ نہیں ہے بیٹا...... تمہاری سرکشی اور منہ زوری مجھے ڈراتی ہے۔ میں تمہیں ٹھکرائی ہوئی عورت کے روپ میں نہیں دیکھ سکتی...... میں چاہتی ہوں تمہاری زندگی میں کسی نعمت کی کمی نہ ہو۔" تاجور نے زارا کو نرم لفظوں میں سمجھایا۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو...... آج کل جو حالات ہیں، چھوٹی، چھوٹی معصوم بچیاں تک درندوں سے محفوظ نہیں...... یہ ماڈرن ایلیٹ کلاس کے لڑکے بالکل بھی بھروسے کے لائق نہیں...... زندگی کو کھیل سمجھتے ہیں...... دوستیاں بناتے ہیں صرف اپنا ٹائم پاس کرتے ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو مستقبل میں ایک عزت دار عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں جیسے کہ ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے۔" بولتے، بولتے تاجور کی آواز بھرا گئی۔

"مگر میں تو آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔" زارا ان کے بازو کا حصار توڑ کر ان کی طرف تکنے لگی...... سارے کس بل نکل چکے تھے، کسی راہ بھولی ہوئی لڑکی کی طرح جو دورانِ سفر سمت بھول جائے اور حیران پریشان دور، دور تک دیکھا کیے۔

"بیٹی ہو ناں تب ہی تو تمہارے مستقبل پر نظر ہے۔ کیا سفینہ اور تم میں کوئی فرق کیا ہے...؟ جس اسکول میں سفینہ کو پڑھایا اسی اسکول میں تمہیں بھی پڑھایا...... اس نے مرضی کا کھایا پیا، تمہیں بھی اپنی پسند کا کھانے، پہننے کی اجازت دی۔ جس طرح اس کی برتھ ڈے منائی اسی طرح تمہاری...... اس نے مسلسل تین بار اسکالرشپ لی اور پھر گولڈ میڈل تو میں نے اسے کار گفٹ کی...... یہ پیرنٹس کی طرف سے شاباشی ہوتی ہے، تم بھی کچھ ایسی کارکردگی دکھاتیں تو گفٹ ضرور ملتا......" وہ اب ایک نادیدہ احساسِ جرم کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی دل جوئی کر رہی تھیں۔

"آپ نے تو کھرے، کھرے مجھے تباہ کر دیا اماں...... اب آپ مجھے ten rupees میں بھی کہیں بیچ دیں تو میں کچھ نہیں بولوں گی۔"



الفاظ تھے کہ بلاسٹک میزائل...... تاجور کے دماغ کو چیر کر دل میں تباہی پھیلانے لگے۔ زارا کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ دل کیوں پھٹا تھا؟ احساسِ برتری کی مکمل موت واقع ہو گئی تھی؟ طبقۂ اشرافیہ کا سر پر سجا ہوا تاج سر سے گر کر ریزہ، ریزہ ہو گیا تھا۔ چڑھی ہوئی ناک...... تمسخرانہ مسکراہٹ...... چال...... جیسے کہ زمین کو روندتی ہوئی، پہاڑ میں دراڑ ڈالنے جا رہی ہو...... گردن کا اکڑاؤ جو ہمہ وقت دائیں طرف جھکی اور بائیں طرف سے اٹھی محسوس ہوتی تھی...... باہر سے آ کر کبھی تمیز سے شوز، سینڈل نہیں اتارے تھے...... پاؤں اٹھا کر اچھالتی تھی...... نوکر دوڑتا ہوا آتا اور سوغات کی طرح اس کے جوتے سنبھالتا...... طبیعت سرشار ہو جاتی تھی...... ایک جوتے اٹھانے والا دوسرا ٹھنڈا پانی لے کر حاضر...... کبھی، کبھی تو اپنی رسٹ واچ بھی ملازمہ سے اترواتی تھی...... پڑھ کر یعنی گویا پہاڑ کھود کر گھر آتی تو لاؤنج میں صوفے پر ساحل کی ریت کی طرح ڈھے جاتی...... اپنا بازو پھیلا کر ملازمہ کو اشارے سے رسٹ واچ اتارنے کا کہتی...... منہ سے بولنا بھی گویا کسرِ شان کے مصداق تھا۔

تاجور نے بڑے دکھی دل سے اس کے بہتے آنسوؤں کی طرف دیکھا تھا، وہ تو آنسوؤں کا ایک ہی مطلب جانتی تھیں کہ جب دل دکھتا ہے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

حالانکہ کم ظرف و حاسد انسان دکھی انسان سے زیادہ "طبیعت" سے روتا ہے کیونکہ دوسروں کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر صدمے سے اس کا کلیجا پھٹنے لگتا ہے۔ اب یہ الگ بات کہ سادہ و معصوم انسان ان آنسوؤں سے طرح،

طرح کے دھوکے کھاتے ہیں۔

تاجور کے تڑپنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ ہروقت زندگی سے لطف اندوز ہونے والی زارا رو رہی تھی۔

مگر صورتِ حال وہی تھی جو اس رونے والے بچے کی ماں کے ساتھ ہوتی ہے جو بچے سے چاقو چھین کر ایک تھپڑ بھی تادیب کے طور پر جڑ دیتی ہے مگر کھیلنے کے لیے چاقو نہیں دیتی۔

''میں تمہاری بھلائی کے لیے جو کر سکتی ہوں کروں گی...... اور مجھے اس بات کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کہ موجودہ وقت میں تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو۔''

تاجور کو شروع ہونے والے واقعے کو سمیٹنا بھی تھا اور یہ جتانا بھی ضروری تھا کہ وہ جو فیصلہ کر چکی ہیں وہ حتمی ہے۔

زارا اس وقت ان کے بے حد قریب کھڑی تھی...... قد میں تاجور سے دو انچ بڑی ہی تھی، کم نہیں تھی۔ تاجور کو اس کی طرف دیکھنے کے لیے چہرہ قدرے اونچا اٹھانا پڑ رہا تھا۔

''اماں...... اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں اس طرح سے رہوں گی جیسے آپ پسند کریں گی بلکہ اس طرح رہوں گی جیسے اپنے گھر میں نہیں میڈم تاجور کے گھر میں رہتی ہوں...... تب بھی آپ کا یہی فیصلہ ہوگا؟'' زارا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے تاجور کی طرف یوں دیکھا جیسے پنجرے میں مقید طوطا آہٹ پا کر کن انکھیوں سے دیکھنے لگتا ہے...... جو اس کے خوف و اندیشے کی علامت ہوتی ہے...... سوال تو کر دیا تھا مگر اندیشہ انکار ہی کا تھا۔ اور جواب اندیشے کے مطابق ہی آیا۔

''ہاں...... اس لیے کہ میرا فیصلہ انتقامی کارروائی نہیں ہے...... میں تمہاری بھلائی اور بہتری چاہتی ہوں...... صحت مند اور محنتی مرد اپنے خاندان کی شان ہوتا ہے...... میرے ہی دوستوں میں تمہیں ایسی عورتیں مل جائیں گی جن کے شوہر گھر میں آنے کے بعد بھی انہیں میسر نہیں ہوتے...... رات بھر drunk ہوتے ہیں، صبح ہوش آتے ہی بزنس کی فکر شروع ہو جاتی ہے، ہر سال نئے ماڈل کی کار، ہر چھ مہینے بعد گھر کی نئے سرے سے ڈیکوریشن...... دبئی، یوکے، سنگاپور، بنکاک، ہانگ کانگ میں شاپنگ...... وغیرہ، وغیرہ...... باپ ہوتے ہوئے بھی ماں سنگل پیرنٹ...... کتنی قابلِ رحم ہوتی ہے ایسی عورت، میں تمہیں سب کچھ دوں گی...... گھر، گاڑی، کیش، ہر وہ شے جس کی تم عادی ہو۔'' تاجور نے قائل کرنے کے لیے دلائل دیے اور پھر تسلی بھی......

''بیٹی بھی کہتی ہیں اور نوکر سے شادی بھی کرنا چاہتی ہیں۔'' زارا کے سامنے ساحل کھڑا فاتحانہ مسکرا رہا تھا...... اور دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''اچھے لڑکوں کو سب اپنا لیتے ہیں بلکہ فخریہ اپنا داماد بناتے ہیں۔''

تاجور سب کچھ کہہ کر بالکل ہلکی ہو چکی تھیں اب ان کا ہر جواب تحمل کا آئینہ دار محسوس ہوتا تھا...... کسی قسم کی عجلت و بے چینی لاحق نہیں تھی۔

''کاش اماں آپ حقیقت بتانے کے بجائے مجھے دھمکی دیتیں کہ اگر میں نے آپ کا کہنا نہ مانا تو آپ میری شادی ساحل سے کر دیں گی...... میں اگر غلط ہوں تو ویسے ہی ٹھیک ہو جاتی...... اور آپ کو ساحل کے لیے counseling نہ کرنا پڑتی۔''

گھٹا کی طرح امڈ کر آنے والے آنسوؤں کو اس نے بہ مشکل روکا...... اب اس کا دل چیخ، چیخ کر رونے کو چاہ رہا تھا...... اپنے ہی جذبات سے خوفزدہ ہو کر تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

تاجور نے بھری جوانی کی تیرہ شبیں تنہا گزاری تھیں...... ہر گزرنے والی رات آگہی کا ایک ستارہ ہتھیلی پر رکھ کر رخصت ہوتی تھی۔

زارا کا خاندانی پس منظر قطعاً امید افزا نہیں تھا...... وہ ایک ایسے خود غرض باپ کی اولاد تھی جو اپنے عیش و آرام کی خاطر اپنے جگر کے ٹکڑے کو خود سے دور کرنے کے لیے تیار ہو گیا اور کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

اس کی ماں کی فطرت کیا تھی اس کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتی تھیں...... کبھی کبھار کسی بزنس ڈنر میں وہ اپنے شوہر کے ہمراہ شریک ہوتی تھی...... چند رسمی جملوں سے زیادہ بات چیت نہیں ہو پاتی تھی...... زارا کی ماں زارا سے زیادہ حسین و جمیل تھی...... مسکراتا ہوا چہرہ تر و تازہ...... گرم جوشی کی غماز بڑی، بڑی آنکھیں...... بظاہر بہت سمجھدار و باوقار نظر آتی تھی...... عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی، زارا کے ماں، باپ میں تھوڑا بہت نہیں پورے بیس سال کا فرق تھا۔ سنی سنائی تھی کہ پھر اس نے یعنی زارا کے باپ نے کسی رئیس عورت کا گھر خراب کر کے دوسری شادی کی تھی اور وہ اپنے نئے شوہر کی بیٹی کی ماں بننے کے لیے تیار نہیں تھی جو پیدا ہوتے ہی ماں سے محروم ہو گئی تھی۔

تاجور حسب نسب کو بہت اہمیت دیتی تھیں ان کے نزدیک DNA ایک کائناتی سچائی ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ زارا کی ایک، ایک نقل و حرکت پر نگاہ رکھتی تھیں...... چوکس و چوکنی ہو کر......

وہ ایک خاندانی عورت تھیں، نانی، دادی سے سنتی آئی تھیں کہ رشتہ کرتے وقت ''ہڈی'' کو دیکھو...... حسب نسب خون میں سفر کرتا ہے۔

تاجور کے دل پر اگرچہ بوجھ آ پڑا تھا مگر ایک عجیب سا بوجھ اترنے کے بعد خود کو ہلکا پھلکا بھی محسوس کر رہی تھیں...... گویا کہ کوئی پہاڑ اٹھایا ہوا تھا...... اچانک وہ پہاڑ سر سے سرک گیا۔

☆☆☆

زارا اپنے سپر ڈیلکس بیڈ روم کے بیچوں بیچ کھڑی ایک، ایک شے کو یوں تک رہی تھی گویا پہلی بار دیکھ رہی ہو...... ہر شے اجنبی، اجنبی سی لگ رہی تھی...... ایک احساس طمانیت جو ہر آن دل پر چھایا رہتا تھا، ایک سرمستی کی کیفیت جو اپنے حصار میں رکھتی تھی...... مفقود ہو گئی تھی۔ جیسے کوئی اجنبی دیس میں قدم، قدم پر رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتا ہے...... وہ ناز و ادا، احساسِ تفاخر، وہ کائنات کو خرید کر ایک طرف پھینک دینے کا اعتماد سب کچھ ہوا ہو چکا تھا...... ایک حیرانی و پریشانی و سر بسری کی کیفیت وحشت زدہ کر رہی تھی...... سب کچھ بہت تباہ کن تھا...... مگر یہ احساس کہ زندہ باپ نے ٹھکرا دیا تھا ایک قیامت برپا کر دینے والا احساس تھا...... تاجور اور سفینہ کے ساتھ جڑے ہونے کا پیارا سا وابستگی کا احساس ایک دم رخصت ہو گیا تھا۔

دل پھٹ رہا تھا، کلیجا منہ کو آ رہا تھا...... حلق پھاڑ کر چلانے، رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ مگر ایک گھٹن تھی جو شہ رگ پر گرفت کیے ہوئے تھی۔ وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح بیڈ پر اوندھی گر گئی......

ساحل بہت پیچھے چلا گیا تھا...... صرف قیامت خیز احساسِ توہین آسیب کی طرح روح پر اترا ہوا تھا۔

☆☆☆

''کیا کہہ رہے ہو؟ ایک دم سے جہاز میں بیٹھ جاؤں...... اتنے رئیسوں، امیروں سے ملنے آؤں گی تو کیا تیاری نہیں کرنا ہوگی؟'' آپا حیران پریشان ساحل سے فون پر بات کر رہی تھیں...... ہاتھ پاؤں بری طرح پھول رہے تھے۔

''ارے کیا تیاری آپا...... ایک دن کی تو بات ہے عید بقر عید کے دو جوڑے پیک کریں اور بس چل پڑیں......'' ساحل کے انداز میں وہ مخصوص جولانی تو نہیں تھی جو عمومی طور پر اس کی ذات کا حصہ محسوس ہوتی تھی مگر انداز میں ٹھنڈا پن بھی نہیں تھا۔

آپا کو فون ملانے سے پہلے اس نے دن بار تو کم از کم ضرور یہ غزل گنگنائی تھی۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

جیسے کوئی وظیفہ کیا ہو اور زیر اثر آ گیا ہو، گویا خود کو سمجھا لیا ہو۔

''عید بقرعید کے جوڑے؟'' آپا ہونق ہو گئیں۔

''ارے وہ تو میں نے ''سیل'' میں اٹھائے تھے۔ دو دھلائی میں گئے۔ پندرہ کی کمیٹی نکلے گی سوچا تھا دو تین موسم کے کپڑے خرید لوں گی، دس، پندرہ ہزار خرچ کرنے کے لیے کمیٹی کا انتظار کرنا پڑتا ہے...... ویسے کہاں جمع ہو پاتے ہیں...... کسی مہینے لگے بھی کہ اس مرتبہ شاید دو تین ہزار بچ جائیں گے تو بجلی کا بل زیادہ آ جاتا ہے...... ارے ہمارے نصیب میں تو بچت ہی نہیں......'' آپا نے اپنے رونے شروع کر دیے۔

''اچھا......'' ساحل نے چند ثانیے رک کر سوچا...... اور فوراً حل نکالا۔

''کوئی بات نہیں...... آپا آپ آ جائیں...... میں آپ کو کسی ڈیزائنر کے آؤٹ لیٹ پر لے جاؤں گا کوئی ریڈی میڈ دلا دوں گا...... بس آپ تیاری پکڑیں۔''

''ارے اتنے مہنگے کپڑے...... دو گھنٹوں کے لیے...... یہ تو پیسے کو آگ لگانے والی بات ہوئی۔'' آپا کے سامنے بڑے، بڑے شوروم گھوم گئے جہاں کپڑوں پر چسپاں قیمتیں دیکھتے ہی سر گھوم جاتا تھا۔

''جو زندگی گزار لی اسے بھول جائیں...... اب آپ برانڈڈ کپڑے ہی پہنا کریں گی...... تاجور کے داماد کی بہن اب عام ٹیکسٹائل کے کپڑے نہیں پہنے گی۔ (کسی مل کا نام لیا......) آخر میری بھی عزت کا سوال ہے...... میری بیوی کیا سوچے گی...... وہ تو دس ہزار کا سوٹ ایک بار پہن لے تو دوبارہ نہیں پہنتی۔''

''بیوی......؟'' آپا بھونچکی رہ گئیں۔

''ابھی تو کہہ رہا تھا کہ آ جائیں رشتے کی بات کرنی ہے۔''

''بھئی ہونے والی...... جب لڑکی کی ماں نے طے کر لیا ہے تو بات پکی ہی سمجھیں......'' ساحل نے جھنجلا کر اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

وقت کم تھا...... کام بہت تھے...... تاجور کے لیے سیٹ کنفرم کرانا کون سا مشکل کام تھا...... دس منٹ میں ہی خبر آ گئی تھی کہ ریٹرن ٹکٹ ہو گیا ہے۔

''اچھا، اچھا، ٹھیک ہے، ابھی شادی ہوئی نہیں اس لیے بہن کے کپڑوں لتوں کا ٹھیکا لے رہے ہو، شادی ہونے دو پھر دیکھتی ہوں...... مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی، ان رئیسوں نے تم میں ایسا کیا دیکھ لیا کہ آناً فاناً فدا ہو گئے......'' آپا کی حیرانی تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی...... انجانے میں بھائی کی بے عزتی کر بیٹھیں۔

''کیوں...... کانا، لنگڑا، لولا، ریلو کٹا ہوں...... یا حبشی النسل ہوں؟'' ساحل نے تپ کر سوال کیا۔

''ارے چندا...... میرا مطلب ہے اتنی امیر خوب صورت لڑکی کو ان کے ملنے جلنے والوں میں بر ہی نہیں ملا...... ایک دم سے تم پر مہربان ہو گئے۔'' آپا نے گھبرا کر صفائی پیش کی...... بائی ائیر سفر...... ڈیزائنرز سوٹ ہاتھ سے جاتا دکھائی دینے لگا۔

''بہن کو خاطر میں لا رہا ہے، سعادت مند بھائی ہے، ورنہ آج کے زمانے میں تو لڑکے شادی کر کے بیوی سامنے لے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان سے ملیے یہ آپ کی بہو یا بھابی ہیں...... کیا نہیں ہوتا اس زمانے میں۔'' وہ ساحل کی بدلی ٹون سے گھبرا گئیں۔

''آپ کا بھائی ہے ہی ایسا کہ جو دیکھتا ہے بس دیکھتا رہ جاتا ہے۔'' ساحل نے کالر کو یوں چھوا جیسا اس کا

فخریہ انداز آپا نادیدہ طور پر دل کی آنکھ سے ملاحظہ کر رہی ہوں۔

''ماشاء اللہ...... اس میں تو کوئی شک ہی نہیں...... لاکھوں میں نہیں، کروڑوں... میں ایک ہے میرا بھائی...... ارے اتنی موٹی، موٹی کتابیں پڑھ کر بیٹھا ہے، اتنے لائق فائق لڑکے ملتے کہاں ہیں۔'' آپا اب سابقہ تاثر مٹانے کی نیت سے دل جوئی کرنے لگیں۔

''یہ بات...... آ گئی ناں آپ کو سمجھ...... لڑکے بہت ہیں آپا مگر ''ڈھنگ'' کے لڑکے مشکل سے ملتے ہیں۔'' ساحل کی خود پسندی کبھی کسی شک و شبہے کا شکار نہیں ہوتی تھی۔

''ویسے...... یہ تو بتاؤ لڑکی کی ماں جو تمہاری کمپنی کی میڈم ہے، زیادہ انگریزی تو نہیں بولتی...... تمہیں تو پتا ہے میں نے گورنمنٹ اسکول سے میٹرک کیا ہوا ہے، وہاں انگریزی کم ہوم اکنامکس زیادہ چلتی ہے۔'' آپا کو اب تعلیم کی وجہ سے احساسِ کمتری نے آ لیا۔

''فکر ہی نہیں کریں...... آپ اردو کے بجائے ہندکو، چترالی بھی بولیں گی تو چلے گا...... انہوں نے مجھے پسند کیا ہے، میں ان کی لڑکی پر عاشق نہیں ہوا تھا۔'' ساحل نے آپا کو بھرپور تسلی سے نوازا۔

''اچھا، ٹھیک ہے پھر میں ''ان'' کو بتا کر نکلتی ہوں...... پنڈی کا خاص پتیسا لیتی آؤں؟'' آپا نے اس خیال سے پوچھا کہ لڑکی والوں کے ہاں کوئی سوغات بھی تو لے کر جانا چاہیے۔

''ارے چھوڑیں یہ پتیسے وتیسے...... کلفٹن سے بہترین قسم کا چیز کیک لے کر جائیں گے...... وہ لوگ اسی طرح کی چیزیں پسند کرتے ہیں...... یہ رئیس لوگ مٹھائیوں سے جتنا ڈرتے ہیں اتنا تو سانپ سے بھی نہیں ڈرتے۔'' ساحل نے اب پہلے سے زیادہ چڑ کر جواب دیا...... آپا تو فون بند نہیں کر سکتی تھیں بات تو اسی کو سمیٹنا تھی۔

''نہیں...... یہ لوگ میٹھا نہیں کھاتے...... چیز کیک میں کیا... نمک، کالی مرچ بھری ہوتی ہے......؟'' آپا کو پھر شدید قسم کی حیرانی نے آلیا۔

''افوہ...... یہ کیک باہر سے آتے ہیں...... لوکل کیک ہزار کا ملتا ہے تو یہ دو ہزار کا ملے گا...... ہائی جینک ہونے کی گارنٹی ہوتی ہے...... جب مال بہت ہو تو جینے کا بھی بہت شوق ہوتا ہے۔'' ساحل نے اب بات ختم کرنے کا انداز اپنایا۔

''اسے ہٹاؤ...... ہم نے تو آج تک کسی رئیس کو سو پورے کرتے نہیں دیکھا...... دل کے اسپتالوں میں پڑے کیمروں سے دل چیک کراتے ہی نظر آتے ہیں۔''

''اچھا آپا...... ابھی میں جلدی میں ہوں...... رات کو آرام سے بات کروں گا، صبح ساڑھے آٹھ کی فلائٹ ہے...... آپ ساڑھے سات تک ائرپورٹ پہنچ جائیے گا...... آپ کو پنڈی کے...، ایک کونے سے اسلام آباد آنا ہے...... اچھا خاصا فاصلہ ہے...... فلائٹ مس ہوگئی تو اکیس ہزار ٹھکانے لگ جائیں گے۔'' اس نے جان بوجھ کر اکیس ہزار کی ٹینشن دی تا کہ آپا فجر پڑھتے ہی رختِ سفر لا دلیں۔

آپا نے بھی بوکھلا کر خدا حافظ کہہ دیا جیسے سر پر سفر سوار ہوگیا ہو۔ ساحل سیل فون رکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے مگر سوال اپنی جگہ موجود ہے...... وہ مجھ سے شادی پر راضی کیسے ہوگئی۔ لگتا ہے پوز کرتی تھی...... جان بوجھ کر attitude دیتی تھی...... یہ بھی کسی کو متوجہ کرنے کی ایک ادا ہوتی ہے۔ ارے بھئی... ہم تو.... چلتے ہوئے پتا نہیں کتنی گراتے تھے...... کوئی لڑکی مجھے اگنور ہی نہیں کر سکتی۔'' ساحل نے بڑے تفاخر سے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

''اچھا...... تو وہ سب اداکاری تھی...... ماں سے کہہ دیا کہ شادی تو مجھے ساحل سے ہی کرنی ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ زارا جیسی لڑکی سے تو اس کا باپ بھی اپنی بات نہیں منوا سکتا......'' کل آپا کے ساتھ جائیں گے تو مہربانوں کی حقیقت دیکھیں گے۔ کار...... بنگلا، کیش، افریقین، امریکن، ایشین، کوئی بھی ہو چلے گی۔'' وہ مسکرایا۔

''ساٹھ سال کی عمر میں دولت دیکھی تو کیا دیکھی...... جوانی تو کھڈے میں گئی ناں...... لائف انجوائے کرنے کا یہی تو ٹائم ہوتا ہے۔'' سفینہ کے ہاتھ سے جانے کی کسک اپنی جگہ تھی...... مگر اس کو خود کو دھوکا دینے میں ہمیشہ سے کمال حاصل رہا تھا...... اس وقت بھی وہ خود کو سمجھا، بہلا رہا تھا...... آنے والے دنوں میں قیمتی سوٹ، برانڈڈ شوز، ٹائیاں، پرفیوم، ذاتی مینوئل، آٹومیٹک گاڑیاں، دفتر میں ادب سے سر جھکائے ماتحت ملازمین، بائی ائر سفر...... یوں جیسے دس روپے کرایے کی چنگ چی کا سفر...... لاکھوں روپے سفر کا خرچہ...... مگر کسی گنتی میں نہیں...... سرمایہ الگ...... منافع الگ...... وہ نشے میں جھوم رہا تھا۔

☆☆☆

دل کو ایک دم سے کچھ ہوا تھا۔ اس نے آپریٹر سے کہا کہ سفینہ سے بات کرائے۔ ایک منٹ سے بھی کم دورانیے میں آپریٹر نے سفینہ کا سیل آف ہونے کی خبر سنا کر اسے اداس کر دیا تھا۔

دل میں انتہائی درجے کی بے چینی نے اسے پہلی بار مضطرب کیا تھا...... اسے یقین واثق تھا کہ سفینہ روحانی طور پر اس سے connected ہے...... لیکن یہ کیا...... رابطے کا واحد ذریعہ ہی اختیار میں نہیں تھا۔

چند لمحے پیشتر اس کا سفینہ کو فون کرنے کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔ وہ ایسے وقت کا منتظر تھا جب کسی قسم کی مداخلت کا اندیشہ نہ ہو...... یکسوئی کمال ہو...... مگر بیٹھے، بیٹھے اس پر عجلت و بے چینی حاوی ہوگئی...... یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اسے بے چین ہونا اچھا لگا...... سفینہ کی آواز کا متلاشی ہوا...... یوں لگا گویا سفینہ عظیم کرب میں مبتلا ہے...... یقین ایسا

تھا کہ گمان سے بدلنے کو رجحان نہ ہوا البتہ بے کلی پہلے سے زیادہ ہوگئی۔

''ہر آدھے گھنٹے بعد ٹرائی کرتے رہنا...... جیسے ہی سفینہ کا سیل آن ملے فوراً بات کرانا۔''

اس نے آپریٹر کو تاکید کی اور ریسیور رکھ کر دیوار کی طرف گھورنے لگا۔

جیسے اسکرین پر سفینہ اپنی باوقار اداؤں کے ساتھ متحرک ہو۔

☆☆☆

یہ اطلاع ملتے ہی کہ ساحل کی بہن کی سیٹ کنفرم ہوگئی ہے تاجور نے اپنے کئی ضروری کام ملتوی کر دیے۔

ساحل کی بہن کا استقبال کرنے کے خیال سے وہ اس طرح سے بالکل بھی نہیں الجھیں یا کنفیوزڈ ہوئیں جس طرح لیڈی صوفیہ کی آمد کا سن کر ہاتھ پاؤں پھلا بیٹھی تھیں۔

''سارا concern تو ساحل ہے...... یہ آپا، باجی تو بس formalities ہیں، یہ بھی اچھا ہے کہ وہ دوسرے شہر میں ہی رہتی ہیں۔''

اب ایک کڑا مرحلہ درپیش تھا اور وہ ساحل کی بہن کے سامنے زارا کو لانا...... وہ دونوں قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار تھیں...... زارا مان بھی سکتی تھی۔ اور اپنی مخصوص ہٹ دھرمی کے ساتھ انکار بھی کر سکتی تھی۔

لیکن وہ اپنی جگہ پُرعزم تھیں کہ جو وہ طے کر چکی ہیں اس سے پیچھے ہرگز نہیں ہٹیں گی۔ اس لیے کہ اس بھری دنیا میں زارا کے دو ہی ٹھکانے ہیں۔ ایک ان کا گھر دوسرا اس کے شوہر کا گھر...... وہ تو یہاں تک سوچ چکی تھیں کہ شادی کے بعد ساحل کی حیثیت گھر داماد کی ہوگی...... وہ کچھ عرصہ دونوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں گی...... ان کے حساب سے زارا کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا تھا کہ جن کی زندگی کا مقصد صرف عیش و آرام کی زندگی کو انجوائے کرنا ہوتا ہے۔ فیشن، پارٹیز، ملبوسات کی ڈیزائننگ، میچنگ کا خبط، مرضی کا کھانا، جی بھر کر سونا...... وقت گزاری کے لیے گپ شپ کرنا۔

یہ عام طور پر اوسط درجے کی ذہنی حالت ہوتی ہے، ایسی لاابالی لڑکیوں کو ذمے دار... اور قابل لڑکے چاہے جانے کے قابل ہی نہیں سمجھتے...... ایک ان کی اپنی زندگی تھی، شوہر زندہ تھے تو دن رات ان کو آرام دینے کی فکر میں مصروف رہتی تھیں، شوہر بھی دل سے قدردان تھیں کہ وہ ان کو عیش و آرام سے رکھنے کے لیے اپنے نفس کا آرام بھی قربان کرتا ہے، جب ساتھ چھوٹا تو دوہری محنت کی، گھر اور بچیاں بھی سنبھالیں اور کاروبار بھی......

ان کے نزدیک تو ہر وقت آرام کے موڈ میں نظر آنے والی عورت پرلے درجے کی عیاش کہلانے کی مستحق تھی۔

اتنی محنتی عورت کو زارا جیسی لڑکیوں سے کیونکر ہمدردی ہو سکتی تھی...... ان کے نزدیک تو انرجی gain کرنے کا مطلب انرجی consume کرنا تھا۔ وہ ایک قطعی اور حتمی موڈ میں نظر آئیں...... چند ثانیے سوچا اور زارا کے بیڈروم کی طرف چل پڑیں۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا، کسی خاص وجہ کے سبب وہ زارا کو اپنے بیڈروم میں ہی طلب کرتی تھیں...... انہوں نے دستک دینے کے لیے ہینڈل تھاما کر دروازہ بھی خود ہی کھولنا چاہا مگر دروازہ لاکڈ تھا...... انہوں نے اب زور سے دستک دی تھی...... دستک اتنی بلند تھی کہ دائیں طرف سے ایک نوکر گھبرائے ہوئے انداز میں نمودار ہوگیا...... اور تاجور کو دیکھ کر گھبراہٹ بدحواسی میں تبدیل ہوگئی۔

تاجور نے اگنور کرنا زیادہ بہتر سمجھا...... نوکر خود ہی سے سمجھ کر سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ تاجور نے اب دروازہ دھڑ دھڑا کر رکھ دیا تھا۔

اور اس کے بعد دروازہ فوراً کھل بھی گیا۔

زارا، تاجور کو سامنے دیکھ کر پہلے شپٹائی پھر اپنی متورم آنکھیں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔
”سو رہی تھیں؟“ تاجور کے دل کو اس کی نم متورم آنکھیں دیکھ کر کچھ ہوا...... مگر فوراً ہی دل کڑا کرلیا۔
زارا نے جواب دینے کے بجائے انکار میں سر ہلا دیا۔
”دیکھو...... جو وقت گزر جاتا ہے اس کو ڈسکس کرنا فضول ہوتا ہے۔ میں کوئی بات repeat نہیں کروں گی...... ابھی آنے والے کل کی بات کرنے آئی ہوں...... کل ساحل کی سسر ہمارے ہاں آئیں گی......“
تاجور اتنا ہی کہہ پائی تھیں کہ زارا نے بدحواسی کی کیفیت میں تاجور کی طرف دیکھا۔
”کیوں آئیں گی......؟“ اس کے منہ سے بس بلا ارادہ ہی نکل گیا تھا۔
”میں چاہتی ہوں سنڈے کو تمہارا نکاح ہوجائے...... بالکل خاموشی سے مگر رخصتی دھوم دھام سے کروں گی۔“
”ن...... ن...... نکاح...... اماں......“ زارا کے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔
”ہاں...... بس میں تمہیں انگیج کرنا چاہتی ہوں...... کیونکہ میں ڈھنگ سے اپنے کام نہیں کر پا رہی...... رسک لے رہی ہوں۔“ تاجور نے فیصلہ کُن لہجے میں بات تمام کی۔
”اماں...... آپ مجھے بڑی سے بڑی سزا دے سکتی ہیں...... مگر میری شادی کرنے کا حق آپ کو نہیں ہے...... آپ نے مجھے پالا ہے، اگر آپ مجھے منڈی سے خرید کر بھی لائیں تب بھی میری شادی کرنے کا حق آپ کو نہیں ملتا...... میں اپنے rights پہچانتی ہوں...... میں یہ rights آپ کو نہیں دے سکتی۔“
”میں بھی اپنی عزت کا تماشا بنانے کا حق تمہیں نہیں دے سکتی۔“ تاجور ابھی تک دروازے کے فریم میں ہی اِستادہ تھیں...... ایک دم گرج کر گویا ہوئی تھیں۔
”تم منہ اٹھا کر پرنس کے گھر اس طرح چلی جاتی ہو...... جیسے بکری کسی کے کھیت میں چرنے چلی جاتی ہے...... تمہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ ان لوگوں کا اسٹیٹس کیا ہے اور اب ہمارا ان سے کیا تعلق ہے؟ میں دو سال سے تمہیں ٹھیک کرنے کی کوشش کررہی ہوں...... او لیول کرتے ہی تم نے پر پُرزے نکالنا شروع کردیے تھے...... میں کوئی رسک نہیں لوں گی، لے ہی نہیں سکتی...... enough is enough“ تاجور نے ایک تواتر و کمالِ سلاست سے اپنے دل کی بات کہہ دی...... کچھ باقی نہیں بچایا۔
”اماں، آپ کے احسانات اپنی جگہ...... مگر میں بھی مجبور ہوں کیونکہ میں پرنس سے لَو کرتی ہوں...... پرنس کو میں نے discover کیا تھا...... آرٹ میری فیلڈ ہے، میں ایک آرٹسٹ کو آئیڈیالائز کرسکتی ہوں۔“ زارا منہ پھٹ عاقبت نا اندیش اور غبی تھی...... احساسِ توہین کی شدت سے خود پر قابو نہ رکھ پائی اور اپنی فطرت کے عین مطابق سب کچھ اگل دیا۔ وہ کس حساب میں تاجور پر رحم کھاتی جو اسے الٹی چھری سے ذبح کرنے جارہی تھیں۔
بلند عمارت جب زمیں بوس ہونے لگتی ہے تو ایک دم ملبے کا ڈھیر نہیں بن جاتی...... شکست و ریخت کا عمل آغاز ہوتے ہی ایک قیامت خیز غبار اڑتا ہے، نگاہ دھندلا جاتی ہے اور عمارت ملبے کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔
تاجور سکتے کی ایسی کیفیت سے دوچار ہوئیں جو کبھی، کبھی حرکتِ قلب بند ہوجانے کا باعث بھی بن جاتا ہے۔
”یہ احمق نہیں ہے، یہ تو پاگل ہے۔“ تاجور کی آنکھیں پھیلتی جارہی تھیں...... دل سکڑتا جارہا تھا۔
زارا، تاجور کی کیفیت کو محسوس کرتے ہی نظریں چرا کر مزید گویا ہوئی۔
”اماں...... اگر آپ مجھے حقیقت نہ بتاتیں، ساحل جیسے نوکر ٹائپ کے بندے سے میری شادی کرنے کا فیصلہ نہ کرتیں تو میں آج بھی اپنے دل کی بات آپ سے نہ کہتی...... چپ چاپ سلگتی رہتی...... کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دیتی...... مگر آپ...... صرف سفینہ کی ماں ہیں...... بہت اچھا کیا کہ آپ نے مجھے سب کچھ بتادیا...... ورنہ میں زندگی

بھر کڑھتی رہتی کہ آپ مجھ میں اور سفینہ میں اتنا فرق کیوں کرتی ہیں۔“
زارا خود غرض تھی، خود غرض کا دل سخت ہوتا ہے اس نے تاجور کی کیفیت کی ذرہ برابر پروا نہیں کی، بولتی چلی گئی۔
”حقیقت پتا چلنے کے بعد تمہیں فرق یاد آیا ہے...... اپنی حماقتوں اور غیر ذمے داریوں کا احساس آج بھی نہیں ہوا...... ماں اپنے بچوں کی بھلائی کی خاطر سختی سے بھی کام لیتی ہے، ان کے عیبوں کو دور کرنے کی کوشش کرتی ہے تاکہ دنیا کو اس کی اولاد کے عیب نظر نہیں آئیں۔“
تاجور کے صدمے میں مزید اضافہ ہوگیا...... وہ ان کے بارے میں کیا سوچتی رہی ہے...... آج یہ بھی پتا چل رہا تھا۔
”اور یہ جو تم نے ابھی پرنس کے بارے میں بات کی تو سن لو آج کے بعد تمہاری زبان پر پرنس کا نام نہیں آنا چاہیے، سمجھیں...... ! پرنس نے سفینہ کو پرپوز کیا ہے، ہم نے پرنس تک اپنی کوئی خواہش نہیں پہنچائی تھی۔ تم پرنس یا پرنس جیسے ہزاروں لڑکوں کو نوٹس کرتی پھرو...... کچھ نہیں ہوتا جب تک خود کوئی تمہیں نوٹس نہ کرے۔“
تاجور اب خود پر خاصی حد تک قابو پاچکی تھیں...... پرنس سے اعترافِ محبت کا اظہار کرتی زارا انہیں پہلی بار بہت اجنبی و غیر محسوس ہورہی تھی جو ان کی بیٹی کی خوشیوں سے حسد کرتی محسوس نہیں، ثابت ہورہی تھی۔
”اب بھی میں صرف اور صرف تمہاری بھلائی کی نیت سے کہہ رہی ہوں۔ اگر ساحل جیسا بندہ بھی تمہیں اپنانے کے لیے تیار ہوجائے تو یہ اس کی مہربانی ہوگی...... تمہاری شکل ماشاء اللہ بہت اچھی ہے مگر محبوبہ کی شکل صورت کی اہمیت ہوتی ہے، بیوی سے شوہر کو بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے، اگر وہ ڈلیور نہیں کرپاتی تو شکل صورت کی کشش بھی اپنا اثر کھودیتی ہے۔ سن رہی ہو ناں......؟“ وہ کچھ ثانیے کو رکیں۔
”بہتر ہے کہ غور سے سنو جو تمہیں کہہ رہی ہوں...... اگر صرف حسن و جمال سے گزارہ ہوتا تو دنیا میں کسی حسین و خوب صورت عورت کو طلاق نہیں ہوتی، خوب صورتی ایک موسم کا نام ہے اور موسم گزر جانے کے لیے آتا ہے۔“
زارا کے حساب سے تاجور نے ظلم کی انتہا کردی تھی۔ آئینہ دیکھ کر اپنی بلائیں لینے والی کو کھڑے، کھڑے زیرو کردیا تھا۔
”beauty تو نیچر کی blessing ہوتی ہے، بازار میں نہیں ملتی اب انہیں میری شکل بھی بری لگنے لگی ہے۔“ اس نے بدگمانی کی انتہا پر تاجور سے اپنی پشت کرلی۔
”اگر کوئی لڑکا تمہیں پسند کرکے پرپوز کرتا تو میں اس سے تمہاری شادی کردیتی۔ ساحل تک میری سوچ بھی نہیں جاتی۔ اور رہی بات پرنس کی...... تمہیں رشتہ کرانے والی نے ہمیں یہ رشتہ نہیں بتایا...... وہ چل کر ہمارے گھر آئے۔“ تاجور بھی اب بول، بول کر تقریباً نڈھال ہورہی تھیں۔
دھڑلے سے پرنس سے محبت کا اعتراف کرنے والی زارا آنا فاناً دل سے بہت دور جاچکی تھی۔
”یہ تو اپنے باپ پر ہی چلی گئی...... خود غرض، موقع پرست، سنگدل جو اپنے جگر کے ٹکڑے سے دور ہوکر بہت سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔“ تاجور کو ان بدصورت لمحات میں زارا کے باپ کی سفاکیت کا شدت سے دھیان ہوا۔ ورنہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو مارے لحاظ و حیا کے یہ بات کبھی اپنے منہ سے نہ نکالتی...... یہ معمولی بات نہیں تھی۔ بہت بھاری بات تھی جو شاید امین چشتی جیسے شخص کی بیٹی ہی منہ سے نکال سکتی تھی...... انہیں آج بھی اچھی طرح یاد تھا کہ زارا کو گود لینے کے معاملے پر اُن کے شوہر آخری وقت تک ڈبل مائنڈڈ تھے...... مگر وہ تڑپ گئی تھیں...... ڈیڑھ دو سال کی حسین و صحت مند کھیلتی کودتی بچی کو انہوں نے دل و جان سے اپنا لیا تھا...... سفینہ کی پیدائش کے بعد ان کو کچھ ایسی پیچیدگیوں نے گھیر لیا تھا کہ وہ دوسری بار ماں بننے کے لائق نہیں رہی تھیں...... زارا کو دیکھ کر

انہوں نے سوچا تھا کہ ان کی بیٹی کو ایک بہن مل جائے گی۔ دو بچوں سے گھر بھرا، بھرا لگے گا...... اللہ جانے اس کا باپ اس کو کیسے لوگوں کے حوالے کر دے...... کوئی سوتیلی ماں سے بھی برا نہ مل جائے۔

''ٹھیک ہے اماں...... میری مجبوری ہے، اگر آپ مجھے دھکے دے کر اس گھر سے نکال دیں تو میں کیا کرلوں گی؟ آپ جو کہیں گی میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

تاجور یہی سننا چاہتی تھیں...... مگر زارا نے جیسے اچانک کوئی حرکت کی تھی...... مانو ایٹم بم ہی گرا دیا۔

زارا نے تو گویا ایک دم پینترا بدلا تھا...... کھرے، کھرے لگژری لائف کے مزے لوٹنے والی کو متعدد اندیشوں نے ہولا کر رکھ دیا...... کہ وہ تو تاجور کی اولاد ہی نہیں ہے...... انہوں نے ساری مہربانیاں روک لیں، سمیٹ لیں تو اس کا کیا بنے گا...... اس کے دوست، کلاس فیلوز جو اس کی سپر لگژری لائف سے متاثر تھے اور خود کو اس سے کم گردانتے تھے وہ تو ایک دم اُن سے گئی گزری ہو گئی تھی...... محل جیسے گھر کی وجہ سے اس کو اپنے حلقۂ احباب میں جو خصوصیت حاصل تھی وہ تو احساسِ برتری کا ایسا نشہ تھا جس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور ہی محال تھا۔

''اوکے...... تھینک گاڈ کہ تمہیں بات سمجھ آ گئی......'' تاجور نے کسی قدر اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''بات تو سمجھ آ گئی ہے...... مگر بات آگے بڑھانے سے پہلے آپ کو میری ایک بات کا کلیئر جواب دینا ہوگا۔''

زرا نے جیسے خم ٹھونک کر میدان میں اترنے کا فیصلہ کر لیا۔

تاجور اس کے انداز پر ہکا بکا رہ گئیں...... انہوں نے مجبوراً اسے حقیقت بتائی تھی کہ وہ اس کی سگی ماں نہیں ہیں اور وہ ثابت کرنے پر تل گئی کہ واقعی وہ ان کی اولاد نہیں ہے...... کیا انداز تھا...... جیسے لحاظ کے سارے پردے چاک کرنے کا تہیہ کر لیا گیا ہو......

''غلطی آپ کی ہے کہ آپ نے مجھے اڈاپٹ کیا...... میں نے آپ سے رحم کی بھیک نہیں مانگی تھی۔'' زارا حسد و نفرت و انتقام کے جذبات سے مغلوب استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ تاجور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تاجور صرف سوالیہ نظروں سے ملاحظہ کر رہی تھیں۔ دل اب نئے خدشات کی زد میں تھا کہ وہ آخر کہنے کیا جا رہی ہے۔

''آپ مجھے الگ گھر دیں گی...... میری کار الگ ہو گی...... میرے نوکر کو آپ پے کریں گی...... ایک کروڑ کیش ہر وقت میرے اکاؤنٹ میں ہوگا...... آپ نے جس زندگی کا مجھے عادی بنایا ہے میں اس پر کوئی کمپرومائز نہیں کروں گی۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

اتنا کچھ تو تاجور شاید خود ہی سے دینے کو تیار تھیں...... مگر زارا نے جس طرح ''بلیک میلنگ'' کا انداز اپنایا تو وہ اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں کہ اللہ نے ان پر کمال مہربانی کی...... دھوکے کے طویل سفر سے بچا لیا۔ حقیقت کے پردے دونوں طرف سے چاک ہو گئے۔

دل شکستہ تو ہوئیں پھر سوچا امین چشتی کی بیٹی سے وہ کیا امید کر سکتی تھیں...... جس نے دولت مند بیوہ سے شادی کرنے کی خاطر اپنی اولاد کو ٹھکرا دیا تھا۔

انہوں نے اب جواب دینے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی اور جس جگہ آ کر کھڑی ہوئی تھیں وہیں سے پلٹ گئیں۔

زارا ان کی پشت پر نظریں جما کر پُراسرار انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''ساحل...... ہونہہ...... میری مرضی کے بغیر وہ نوکر ذات مجھے چھو بھی نہیں سکتا...... مگر ایک آزاد زندگی کا بہانہ تو بن سکتا ہے۔'' اس نے آنسو بہانے کا پروگرام ترک کر دیا۔ ''تاجور ہمدانی کی قید سے تو جان چھوٹے گی۔ پرنس میرا نہیں ہو سکتا...... تو سفینہ کا بھی نہیں ہوگا......'' لامحدود آزادی کے خوشگوار احساس کے ساتھ ہی نئی، نئی سوجھنے لگی۔ رحمان کو ہر سانس میں یاد رکھنے والے ہی شیطان کے ہتھکنڈوں سے بچ سکتے ہیں...... وگرنہ شیطان کو

کوئی نیند آتی ہے؟

☆☆☆

سفینہ نے سیل آف کر کے سونے کی نیت ضرور کی تھی مگر بے قرار دل کو نیند کہاں...... ماہین ابھی تک روم میں نہیں آئی تھی...... تین بجے وہ اس سے لنچ کا پوچھنے آئی تھی، اس نے انکار کر دیا تو وہ یہ کہہ کر چلی گئی تھی کہ لنچ کے بعد وہ لائبریری چلی جائے گی...... وہ آرام سے سو جائے مگر کھڑکی سے باہر پھیلتی تاریکی نے اسے چونکا دیا۔ وہ جاگ رہی تھی اور اتنی بے خبر تھی کہ سورج چھپنے کا احساس تک نہیں ہوا۔

''یہ ماہین کہاں ہے؟ شاید اسائنمنٹ بنا رہی ہو گی...... اسے تو ویسے ہی ڈھیر سارا کام جمع کر کے کرنے کی عادت ہے۔'' اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکی اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر اپنا سیل اٹھایا۔ سیل آن کرتے ہی میسج ٹون لگاتار گونجی۔

''اتنے ڈھیر میسجز آ گئے......'' اس نے کوفت بھرے انداز میں سوچا۔ آج کل تو ان فضول سے میسجز سے ہی باکس بھر جاتا ہے۔ الا بلا جانے کیا، کیا...... شکستہ اعصاب کے ساتھ تو سینے پر دھرا بیر اٹھا کر منہ میں ڈالنا بھی پہاڑ کھودنے جیسا لگتا ہے...... اب یہ boxes بھی جھاڑتے رہو ورنہ آپ کا سیل فون یاد دلا، دلا کر آپ کا جینا حرام کر دے گا۔

اس نے انتہائی بدمزگی کے موڈ میں میسج پر سرسری نگاہ دوڑانا شروع کی...... اور بری طرح چونک پڑی۔

اس کا سیل فون مطلع کر رہا تھا کہ پرنس کے گھر سے کال آئی تھی...... سٹی کوڈ کے ساتھ لینڈ لائن نمبر اسکرین پر چمک رہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

مس کالز آپشن کھول کر دیکھا تو اسی نمبر سے آٹھ مرتبہ ٹرائی کی گئی تھی۔

طبیعت شاد و باغ و بہار ہو گئی۔

''یعنی آپ نے کوئی کام نہیں کیا آج...... بس میرا نمبر ٹرائی کرتے رہے۔'' ایک محبوبانہ تفاخر آمیز مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔

''ہوں...... پتا چلا؟''

وہ یوں گویا ہوئی جیسے پرنس سامنے براجمان ہو۔

''آٹھ مرتبہ اور ٹرائی کریں۔'' اس نے پرنس کو تنگ کرنے کی ٹھان لی۔ خالص وابستگی کی یہی نشانی ہے...... اِدھر محبوب نے توجہ فرمائی اُدھر دل پہلو سے نکل کر بھاگا۔

جدائی یا بے توجہی کا احساس انسان کو اپنے آپ سے نبرد آزما رکھتا ہے۔ یہ بھی کسی کو شدت سے یاد رکھنے کا بہانہ ہے۔

اسے کسی اور کے رابطہ کرنے سے نہ دلچسپی تھی نہ انتظار...... تاجور بلاضرورت فون نہیں کرتی تھیں۔

دل میں گدگدی سی ہوئی اس نے فون دوبارہ آف کر دیا......

چشم تصور میں پرنس کی پریشانی، بے قراری ملاحظہ کر رہی تھی، محبت، پیار، شرارت، لطیف جذبات سے ہلکی پھلکی ہو گئی...... بے خودی میں مسکرانے لگی...... چاہت کا انوکھا تجربہ...... ہر دھڑکن کے ساتھ مدھم سی چمک روح میں جھما کا کرتی تھی۔

اُف...... اتنا سرور انگیز احساس...... جیسے خوشی بارش بن کر برس رہی ہو، دکھی تو پہلے بھی نہیں تھی...... پرنس کے ملنے سے پہلے بھی مطمئن و خوش رہتی تھی...... لیکن یہ خوشی تو بہت ہی انوکھی نرالی تھی...... جی چاہتا تھا کہ بس پرنس کو سوچتی

رہے...... کوئی اس کے تصورات میں مخل نہ ہو...... اس کے ہونٹوں پر فرشتوں جیسی خالص مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

ماہین اپنی دُھن میں اور اپنے مخصوص انداز میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ اور سحر ٹوٹ گیا تھا...... سفینہ یکلخت محتاط ہو کر سنبھل گئی تھی مگر آنکھیں ہنوز مسکرا رہی تھیں۔

”تھینک گاڈ...... آخر کار تم زندہ ہو گئیں......“ ماہین اسے گھورتے ہوئے اپنے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی اور بیگ تکیے پر رکھ کر اپنی رسٹ واچ کلائی سے اتارنے لگی...... اس عمل کے دوران اس کی نظر مسلسل سفینہ کے چہرے پر تھی۔

”یہ تم اتنی دیر سے کہاں غائب ہو...... آج ہی سارا پڑھ لوگی تو کل پرسوں کیا کروگی؟“ سفینہ کے انداز میں جولانی تھی، زندگی کی بھرپور توانائی تھی...... ماہین ہونق ہو گئی۔

”واہ...... بڑی جلدی موڈ اچھا ہو گیا...... آج تو تم نے بہت تباہی مچائی، میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ شیور...... پرنس سے خوب لمبی بات ہوئی ہے، تب ہی کول گیٹ والی آنٹی لگ رہی ہو۔“ ماہین نے دانت پیس کر کہا اور سینڈل اتار کر ایک طرف کی......

”تمہاری قسم...... کل سے ابھی تک میری پرنس سے بات نہیں ہوئی...... تم میرا اسیل چیک کر سکتی ہو۔“ سفینہ نے اپنے قیمتی فون سیٹ کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ بھی کر دیا۔

ماہین پہلے سے زیادہ ہونق دکھائی دی۔

”پرابلم کیا ہے، جب پرنس کے ہونے یا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو...... باؤنڈ کیوں ہونا چاہتی ہو؟ آزادی بہت بڑی نعمت ہے، تم نے ڈیانا سے سبق نہیں سیکھا...... بڑی شہزادی بنی تھی...... بہت آرٹیفیشل لائف ہوتی ہے ان لوگوں کی...... ان کو کیا پتا افراتفری میں برگر کھانے کا کیا مزہ ہوتا ہے؟ اب بھی سوچ لو......“ ماہین سچ مچ دل کی بھڑاس نکال رہی تھی...... آج سفینہ نے درحقیقت اسے بہت اپ سیٹ کر کے رکھا تھا۔ اتنی تھکی، تھکی...... نڈھال، چڑچڑی سی تو وہ کبھی دکھائی نہیں دی تھی...... اور اس وقت اتنی خوش نظر آ رہی تھی گویا گینز بک آف ورلڈ میں خوش اخلاقی کا ریکارڈ درج کروانے جا رہی ہو۔

”میری انگیج منٹ کو پانچ سال ہو گئے...... میں نے کبھی یہ پاگلوں والی حرکتیں نہیں کیں......“ ماہین نے کشن اٹھا کر سفینہ پر اچھالا جو اس نے بڑی مہارت سے کیچ کر لیا۔

”تمہاری انگیج منٹ ہوئی ہے...... انگیج منٹ ہونے اور love ہونے میں ٹھیک ٹھاک فرق ہوتا ہے۔“ سفینہ کھلکھلائی اور کشن سے ماہین کا نشانہ لے کر بدلہ اتارا۔ ماہین کشن تھام کر سفینہ کو گھورنے لگی۔

”ہیں...... یہ...... پرنس نے تمہارا کیا حشر کر دیا۔“

”تو its a discover ایک نئی دنیا discover ہوئی ہے...... اس میں صرف پاگل ہی بستے ہیں۔“ سفینہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بہت پیار سے ماہین کے گال پر ہاتھ پھیرا۔

”شیور......! تم نے ضرور کوئی اچھا سا خواب دیکھا ہے۔“ ماہین کو بہرحال کوئی جواز مل ہی گیا...... اپنی نکتہ رسی پر خوش بھی نظر آئی۔

”مگر میں تو سوئی ہی نہیں...... نیند ہی نہیں آئی۔“ سفینہ نے برجستہ کہا اور شاور لینے کے خیال سے وارڈ روب سے کپڑے نکالنے لگی۔

ماہین کی شکل دیکھنے والی تھی...... سفینہ کھلکھلا رہی تھی۔

☆☆☆

”تم نے سفینہ کی خیریت معلوم کی...؟ اسے یقیناً تمہارے فون کا انتظار ہوگا۔“ لیڈی صوفیہ نے باؤل سے ایک چمچ سوپ لے کر اپنے منہ میں ڈالا جو انجیلا اپنے ہاتھ میں لیے ان کے بائیں طرف کھڑی تھی۔ دوسرا چمچ لینے سے پہلے انہوں نے پرنس کے جواب کا انتظار کیا...... پرنس کھوئی، کھوئی کیفیت میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

”وہ مجھے تنگ کر رہی ہے...... اس کا فون مسلسل آف جا رہا ہے...... میرا خیال ہے وہ اس نئے موسم کو بہت انجوائے کر رہی ہے۔“

یہ کہہ کر پرنس نے ایک مٹن چانپ فورک میں پھنسا کر اپنی پلیٹ میں رکھی...... لیڈی صوفیہ کی آنکھیں مسرت کے فطری احساس سے چمکنے لگیں۔

”ضرور تم سے کوئی بھول ہوئی ہے...... جس کا وہ تمہیں احساس دلا رہی ہے، ورنہ جولڑکی انگیج منٹ کے اسٹیج سے گزر جائے بلاوجہ اپنا فون آف نہیں کر سکتی۔ فون ایجاد ہونے سے پہلے لوگ کبوتر ٹرینڈ کر کے انگیج رکھتے تھے...... یہ تو I T کا پیریڈ ہے۔“ لیڈی صوفیہ پوتے کے رومانس سے یوں لطف اندوز ہو رہی تھیں گویا اپنی عمرِ رفتہ کو آواز دے رہی ہوں۔

”وہ مجھ سے جیت نہیں سکتی......“ پرنس نے سلاد کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے بہت اعتماد سے مسکرا کر کہا۔

”اب دیکھو میں کیا کرتی ہوں...... تم خوشی سے ہار جیت کا کھیل کھیلو......“ لیڈی صوفیہ کا موڈ اس وقت بے حد... خوشگوار تھا۔

پرنس نے حیرت سے دادی کا چہرہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔

”ڈنر کے بعد میں ماہین کو فون کروں گی...... اور سفینہ کو پکڑ لوں گی۔“ لیڈی صوفیہ کے انداز میں بچوں کی سی فطری و روحانی مسرت جھلک رہی تھی۔

”اوہ......“ پرنس نے فورک اٹھانے کے بعد واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"you are very smart" پرنس کے منہ سے بے اختیار نکلا...... وہ ستائشی نظروں سے دادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

“oh yes I am” لیڈی صوفیہ کے انداز میں تفاخر و اعتماد بدرجہ اتم موجود تھا۔

”چلیں...... یہ تو اچھا ہو گیا...... یہ تو آج رات کی انٹرٹینمنٹ ہو گئی۔“ آنے والے خوشگوار لمحات کے احساس نے پرنس کو سرتا پا شاد کر دیا...... ”اکثر ڈنر کے بعد ہم بہت سی باتیں دُہرانے لگتے ہیں...... سفینہ کے آنے کے بعد ہماری لائف میں change تو آنا چاہیے......“ لیڈی صوفیہ نے ہاتھ کے اشارے سے انجیلا کو بس کہا اور وہ بچی کھچی رائس پلیٹ میں نکالنے کا عندیہ بھی دیا۔

انجیلا ان کا پھسلتا ہوا نیپکن ٹھیک کر کے پلیٹ میں چاول نکالنے لگی۔

”وہ...... آپ نے ثوبان کا ڈنر پہنچا دیا تھا۔“ جھکی ہوئی انجیلا پرنس اور لیڈی صوفیہ کے درمیان حائل ہوئی تو ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا...... توجہ صندل اور ثوبان کی طرف چلی گئی۔

“yes sir......” انجیلا نے مؤدبانہ جواب دیا۔

”یہ تمہارے concerns نہیں ہیں پرنس...... not to your buisness جتنا تم کر چکے ہو enough اگر تمہارے پاس ٹائم ہے تو اس پر میرا اور سفینہ کا right ہے...... میرے اور تمہارے گرینڈ

فادر کے بیچ میرا ظالم سسر تھا...... تمہارے اور سفینہ کے بیچ کوئی آئے، یہ میں برداشت نہیں کروں گی۔'' لیڈی صوفیہ کا موڈ ایک دم تبدیل ہونے لگا۔

''ریلیکس...... ابھی سفینہ اس گھر میں نہیں ہے گرینڈ مام......'' پرنس نے جلدی سے ان کا سابقہ موڈ برقرار رکھنے کی سعی کی۔

''وہ اب اس گھر سے اچھے گھر میں ہے اور وہ گھر ہے ہمارا دل...... اس کے حصے کا ایک پل ایک لمحہ کسی کو بھی دو گے تو dishonesty ہوگی۔ زوار حسین اس لڑکی کے تمام معاملات دیکھ رہا ہے۔ dont you worry'' لیڈی صوفیہ کو سفینہ کے ذکر خیر کے دوران صندل کا ذکر اتنا ناگوار گزرے گا...... پرنس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا...... وہ خاموش ہو کر خود کو مرتب کرنے لگا۔

''آپ سفینہ کو ڈانٹیے گا ضرور...... بہت تنگ کیا ہے اس نے آج......'' پرنس نے پھر مسکرا کر سفینہ کی بات چھیڑی تاکہ لیڈی صوفیہ کسی اور جہان میں نہ پہنچ جائیں...... پرنس کے انداز میں معصومانہ شوخی تھی۔

''ہوں...... لیکن پہلے تو میں تنگ کرنے کی reason پتا کروں گی۔'' لیڈی صوفیہ بچوں کی طرح بہل گئیں اب پھر سے مسکرا، مسکرا کر پرنس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ پرنس دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔

☆☆☆

زارا زخمی ناگن کی طرح گاہے، گاہے بل کھاتی تھی۔

''اگر سگی ماں مر جائے تو دنیا کی کوئی عورت کسی کی ماں بن ہی نہیں سکتی۔ ایسا کیا، کیا تھا میں نے...... پرنس کے گھر چلی گئی تھی تو کون سی قیامت آ گئی تھی......؟ کسی کے ساتھ بھاگ تو نہیں گئی تھی؟''

وہ ٹہل، ٹہل کر تھک گئی۔

آزادی ملنے کا احساس اپنی جگہ...... مگر تاجور کی ڈکٹیٹر شپ ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی...... وہ نفرت و طیش میں بھول گئی تھی کہ تاجور نے اسے پسند کی شادی کرنے کا آپشن بھی دیا تھا۔

''اسی لیے سفینہ کو "Lums" سے MBA کرا رہی ہیں، کل وہ سارا بزنس سنبھالے گی اور میں بھکاریوں کی طرح اس سے پیسے مانگا کروں گی۔'' وہ ٹھک کر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی......

نہ بھوک، پیاس کا احساس تھا نہ نیند کا دور، دور تک پتا تھا۔

''لگتا ہے یہ ساری گڑبڑ ساحل کی طرف سے شروع ہوئی ہے...... کیسے دیکھتا تھا مجھے جیسے ابھی کھڑے، کھڑے میرے عشق میں جان دے دے گا۔ اگر مجھے حاصل کرنا ہے تو بھکاریوں جیسی زندگی سے جان چھڑانی ہوگی۔''

زارا بے بسی کی اس انتہا پر تھی جہاں آخر کار ذہن مفلوج سا ہو جاتا تھا۔ کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی تھی...... عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر خودکشی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس گھر سے بھاگ کر کہیں جا نہیں سکتی تھی......

کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر چائے پینے والے کلاس فیلوز بہت تھے مگر کسی نے اس کے عشق میں جان دینے کا ارادہ کبھی ظاہر نہیں کیا تھا......

بہت بے تکا بولتی تھی...... منہ کھولتے ہی چہرے کا حسن غارت ہو جاتا تھا...... ''باربی ڈول'' سے زیادہ وقعت نہیں تھی۔

ڈوبتے کو بھی تنکے کا سہارا ہوتا ہے...... اس کے رئیس کلاس فیلوز جن کو تاجور کی سخت تربیت کی وجہ سے وہ کبھی بوائے فرینڈ نہ کہہ سکی...... سیلون میں ہیئر اسٹائل اور فیشل کرانے جاتے تھے...... بجیم کی جینز پر یوں تبصرے کرتے

غزل

برسوں فریب تو کھاتے رہے دوسروں سے ہم
اپنے بھی کم نہ تھے رہے دو چار مشکلوں سے ہم
اک اور شکار کا اب حوصلہ نہ تھا
کھاتے ہیں مات روز اپنے ہی دوستوں سے ہم
منزل کی ہے طلب تو ہمیں ساتھ لے چلو
راہ وہ دکھائیں گے جو ہیں بربادیوں سے کم
بچپن میں آس تھی پتھر سے روشنی نکال لاؤں
واقف نہ تھے تیرگی کی پیچیدگیوں سے ہم
خواہش یہی کہ دوریاں کیسے پاس آئیں
تنگ آ گئے ہیں روز کی نزدیکیوں سے ہم
افسوس فرح کہ یاد ہماری، کہاں انہیں
پکڑے گئے ہیں ٹھیک تبھی ہچکیوں - سے ہم

کلام: فریدہ لاکھانی فرح، سڈنی، آسٹریلیا

ہے گویا تنگ جینز پہننے سے زیادہ ضروری کام کوئی نہیں ہو۔

آج تک کوئی لڑکا اس کے ساتھ سیریس نہ ہوا...... ٹونی جس کی اسپورٹس کار پر وہ مرتی تھی...... اس کے ساتھ پکی دوستی کرنا چاہتی تھی...... اس نے کئی مرتبہ ٹائم پاس کرنے کے بعد انکشاف کیا وہ بہت جلد us جا کر آباد ہو جائے گا...... اس کی منگیتر جو اس کی فرسٹ کزن ہے US میں ہی پیدا ہوئی وہیں پلی بڑھی...... امیگریشن کا تو مسئلہ ہی نہیں سوائے ساحل کے آج تک کسی نے اسے عاشقانہ نظروں سے دیکھا ہی نہیں تھا۔

معاً جذبات کی شدت سے نڈھال ہو کر جیسے وہ مرنے مارنے والی کیفیت سے مغلوب ہو گئی......

''اماں سے الجھنے کے بجائے پہلے تو مجھے ساحل سے بات کرنی چاہیے'' اس نے سیل فون اٹھا کر ٹائم دیکھا...... رات کے نو بج رہے تھے...... اس نے چند ثانیے سوچا......

اس کے پاس ساحل کا کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں تھا۔ اس کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔

چند لمحے غور و خوض کرنے کے بعد وہ کمرے سے باہر جا رہی تھی اس کے اٹھتے قدموں کا رخ تاجور کے بیڈ روم کی طرف تھا۔

☆☆☆

''دل جمی سے کیسے شادی کرلوں؟
اک کمی سی جو ہے
غم کے پرندے کے پر کاٹ دیے تھے میں نے
گزارے لائق خوشی تو ہے

گلاب کے ساتھ کانٹے بھی تو ہوتے ہیں
صد شکر دل کو یہ تسلی تو ہے"

ساحل شاور لینے کے بعد باتھ گاؤن لپیٹے یوں نظم لکھ رہا تھا گویا اس سے زیادہ ضروری کام کوئی نہیں ہو...... عموماً شاور لینے کے دوران ہی تخلیقی حس زیادہ تیزی سے کام کرتی تھی۔

رئیسوں میں نام لکھوانے کا پیدائشی شوق نہ ہوتا تو سنجیدگی سے شاعری کر کے نامور شاعر تو بن ہی سکتا تھا۔

"صبح، صبح آپا وارد ہوں گی...... ان کا ناشتا کھانا...... آرام کرنے کی جگہ......" یہ کام بھی سر پر سوار تھے۔

وہ بال پوائنٹ پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا...... اور چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔

"ایک دن کی بات ہے، میں صوفے پر سو جاؤں گا...... آپا بیڈ پر اس کے بعد تو آپا جب کراچی تشریف لائیں گی شاندار سے گیسٹ روم میں قیام فرمائیں گی۔ وہ بھی اس صورت میں اگر بھابی کی تلوار جیسی زبان کو برداشت کرنے پر خوشی، خوشی رضامند ہو گئیں۔" اس نے چشمِ تصور میں زارا کا دیدار کرتے ہوئے سوچا...... ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"شکر خدا کا......!! اپنا دل صد باؤنڈ سے چیکنے والا بھی نہیں اسے پھر کچھ سوجھا......
اب کھڑے، کھڑے جھک کر لکھنے لگا۔

"زارا سے آگے جہاں اور بھی ہیں
خواہش بھرے دل کے امتحاں اور بھی ہیں
شادی اور ادھار محبت کی قینچی ہے
بیوی گھر کا سامان، مہرباں اور بھی ہیں

"میں نے تمہاری ماں پر جادو چلا دیا...... تو تم کیا شے ہو......؟ ایک ہی رات میں ایسا پٹاؤں گا...... کیا یاد کرو گی تم بھی۔" وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ گاؤن کی کیپ سے بال رگڑ کر خشک کرنے لگا۔

دل پھینک انسان شاہین سے اونچی پرواز رکھتا ہے...... اس کے پاس خود کو خوش رکھنے کے ہزاروں راستے ہوتے ہیں۔

☆☆☆

"اماں آپ اس سے میری شادی کرنے جا رہی ہیں...... اگر میں آپ سے اس کا سیل نمبر مانگ رہی ہوں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟" زارا بے تاثر سپاٹ لہجے میں تاجور سے مخاطب تھی جو اس کے مطالبے کے بعد شدید اعصابی دباؤ کا شکار ہو رہی تھیں۔

"لیکن تمہیں اس سے ایسی کون سی ضروری بات کرنی ہے جو نہیں ہو گی تو بہت حرج ہو گا......" تاجور متذبذب کیفیت میں پوچھ رہی تھیں۔

"بس...... مجھے بات کرنی ہے...... اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ضروری نہیں میں اس سے فون پر بات کروں...... بات کرنے کے لیے میں اس کے گھر بھی جا سکتی ہوں......" زارا بے خوفی و بے فکری سے کہہ رہی تھی۔

تاجور کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔

"جب میری بات مان کر شادی کرنے کے لیے راضی ہو گئی ہو تو شادی سے پہلے فضول قسم کی باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

تاجور انجانے نامانوس اندیشوں سے ہراساں ہو رہی تھیں...... وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ مردانہ وار کمپنیز

جلانے والی ایک چھٹانک بھر لڑکی کے سامنے اتنی بے بس بھی ہو سکتی ہے۔

زارا تو سانپ کے گلے کی چھچھوندر بن گئی تھی نہ نگلے بن پڑے نہ اگلے...... اگر اس نے ساحل سے الٹی سیدھی باتیں کر ڈالیں تو کہیں وہ شادی سے ہی انکار نہ کر دے...... ان کی تو گویا ساری محنت ہی اکارت گئی۔ انتہائی اقدام کا سوچ کر تو وہ خود اسے اس کی حقیقت بتا بیٹھی تھیں...... ورنہ اب بھی بتانے کی ضرورت نہیں تھی...... گزارہ ہو ہی رہا تھا۔

"اماں...... آج نہیں تو کل ساحل کا فون نمبر تو مجھے مل ہی جائے گا...... میں اس کا نمبر آشا...... یا سیتا سے بھی لے سکتی تھی...... مگر میں آپ سے چھپ کر کوئی کام کرنا ہی نہیں چاہتی...... ایک مرتبہ غلطی کی تو دیکھیے...... زندگی بھر کی سزا مل رہی ہے۔"

زارا نے تو جیسے اُن کا کلیجا ہی نوچ کر پھینک دیا...... دلیل بھی ایسی دی تھی کہ قائل ہوئے بنا چارہ نہیں تھا۔

تیز طرار تھی، عقل سے پیدل تھی، بدتمیز تھی مگر کم عمر بھی تو تھی...... آخر ماں بن کر پالا تھا...... سینے سے لگا کر تھپک، تھپک کر سلایا تھا...... ماں ہی کی طرح راتوں کو جاگی بھی تھیں۔ تاجور کی آنکھیں ایک دم ڈبڈبا گئیں...... ہر چند کوشش تھی کہ کسی بھی طرح پل بھر کو زارا کے سامنے کمزور نہ پڑیں...... مگر یک دم دل چاہا اس خودسر پاگل لڑکی کو سینے سے لگا کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگیں...... بہ مشکل خود کو سنبھالا...... خود کو بکھرنے سے بچایا اور انگلیوں کی پوروں سے آنسو جھٹک کر گہری سانس لی۔

"تم اپنے روم میں جاؤ میں ساحل کا نمبر send کرتی ہوں۔"

زارا سب کچھ بھول کر اب نہایت و غایت درجہ کی حیرانی میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار تاجور کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ ورنہ اس کا خیال تھا کہ ساری دنیا سات سمندر میں ڈوب کر مر جائے اماں کی آنکھوں میں آنسو نہیں آ سکتے......

اس کے شیطانی ذہن نے بڑی سرعت سے اس کمزور لمحے میں کوئی فائدہ اٹھانے کا سوچا...... شادی تو ٹلتی نظر نہیں آ رہی تھی مگر اس شادی میں اس کی بے پناہ سُبکی تھی...... وہ بھی سفینہ کے سامنے...... جو اس سے مزید برتر ہوتی جا رہی تھی۔

"اماں...... میں نے سزا قبول کر لی...... اس لیے کہ آپ کے علاوہ دنیا میں میرا کوئی ہے ہی نہیں۔" زارا کے جملے نے رقت میں مزید اضافہ کر دیا...... آنسو چھپانے کے لیے وہ اس سے نظریں چرا رہی تھیں۔

"آپ سے ایک ریکوئسٹ ہے۔" وہ آہستہ، آہستہ چلتی تاجور کے بالکل قریب آ گئی۔

"میں سن رہی ہوں...... بولو......" تاجور ہنوز اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھیں۔

"آپ سفینہ اور ساحل کو کبھی نہیں بتائیں گی کہ میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔" بولتے، بولتے زارا کی آواز بھرا گئی۔

احساسِ برتری، احساسِ ذلت میں تبدیل ہو کر اسے بہت تنگ کر رہا تھا اور رونا بھی حقیقت شناسائی کی وجہ سے نہیں ذلت کے احساس کی وجہ سے ہی آ رہا تھا...... جس انسان میں تکبر ہوتا ہے وہ معمولی سی ہزیمت بھی برداشت نہیں کر سکتا...... مگر تاجور تو زارا کے آنسوؤں کا سیدھا، سیدھا مطلب یہی لے سکتی تھیں کہ وہ دکھ اور صدمے سے نڈھال ہو رہی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور زارا کو سینے سے لگا لیا۔

"میں ہر قیمت پر تمہاری بھلائی چاہتی ہوں...... میری خواہش ہے کہ تمہاری شادی شدہ زندگی کبھی damage نہ ہو...... جس سے تمہاری شادی ہو وہ تمہیں ہر صورت نبھائے...... خواہ اپنی غرض کے لیے ہی...... میں

نے تمہیں ماں بن کر پالا ہے، میری آرزوئیں بھی ماؤں جیسی ہیں...... میں تمہاری لائف پرفیکٹ دیکھنا چاہتی ہوں...... تمہیں محنت کرکے پیسہ کمانے، کیریئر بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں...... میں چاہتی ہوں تمہارا شوہر محنت کرکے تمہیں ہر طرح کا سکھ دے، تمہاری خواہشات پوری کرے...... تم سوسائٹی میں عزت سے زندگی گزارو......'' وہ بہت جذب کی کیفیت میں کہہ رہی تھیں۔ ایک، ایک حرف خلوص دل کا غماز تھا...... مگر منفی سوچ رکھنے والی زارا کو خلوص سے تعارف نہیں تھا...... وہ تو اسے بھی اپنی بات منوانے کا ہتھکنڈا سمجھ رہی تھی۔

''تم بےفکر رہو...... میں تمہارا تماشا نہیں بناؤں گی...... ساحل اور سفینہ کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں...... یہ میرا پرامس ہے......'' تاجور نے اپنا ہاتھ زارا کے سامنے کیا۔

زارا جس جال میں بری طرح الجھ رہی تھی...... ایک دم کٹ گیا...... جان چھوٹی، اتنا تو اسے بہرحال یقین تھا کہ تاجور اپنے وعدے کا پاس رکھیں گی۔

''تھینک یو اماں......'' اس کی اتا بل کھاتے، کھاتے جھٹکے سے سیدھی ہوگئی۔ اس نے تاجور کو ایک وعدے میں قید کرکے اپنے لیے بے مہار آزادی کا رستہ بنالیا تھا۔

تاجور نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا...... کیوں نہ رکھتیں...... ان کی بات مان تو لی تھی۔

☆☆☆

''مائی گاڈ...... لیڈی صوفیہ......!''

ماہین نے گھبرا کر سفینہ کی طرف دیکھا جو الزبتھ آرڈن کا ہینڈ لوشن اپنے ہاتھوں میں بہت اہتمام و سکون سے لگا رہی تھی...... جو اماں نے پچھلے برس یو ایس سے لاکر دیا تھا...... نہایت دلفریب مہک کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ماہین کے منہ سے لیڈی صوفیہ سن کر وہ گھبرا کر یوں کھڑی ہوئی گویا لیڈی صوفیہ اڑ کر کھڑکی کے راستے بند کمرے میں آگئی ہوں۔

ماہین سیل کان سے لگائے ہونقوں والی شکل بنائے سفینہ کی طرف دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''آپریٹر کہہ رہا ہے لیڈی صوفیہ بات کریں گی۔'' سفینہ اس بری طرح گھبرائی کہ دانتوں تلے پسینہ آگیا۔

''جی...... السلام علیکم......'' ماہین اب سیل پر بات کرنے لگی تھی۔ شہادت کی انگلی سے اپنے کان سے لگے سیل کی طرف اشارہ بھی کررہی تھی جیسے کہ لیڈی صوفیہ سیل میں براجمان ہوں۔

''جی گرینڈ مام......! میں بالکل ٹھیک ہوں...... آپ کی طبیعت کیسی ہے......؟ سفینہ تو ہر وقت آپ کی باتیں کرتی رہتی ہے...... بس یہی کہتی رہتی ہے کہ گرینڈ مام مجھے بہت یاد آتی ہیں۔'' ماہین نے اب آنکھ مار کر ایک تواتر سے بولنا شروع کردیا۔

''جی...... جی...... اب بھی آپ ہی کی باتیں کررہی تھی...... لگتا ہے آپ سے بہت زیادہ محبت ہوگئی ہے اسے۔ جی...... جی......؟ جی، جی...... اوہ...... ہاں...... شاید...... میرا خیال ہے وہ charge کرنا بھول گئی ہو گی...... اوکے...... جی میں آپ کی بات کرواتی ہوں، میرے پاس ہی ہے۔ سفینہ یہ...... بات کرو......'' ماہین کی شکل کارٹون والی ہورہی تھی۔ اپنی طرف سے تو اس نے طومار باندھنے کی کوشش کی تھی...... مگر لیڈی صوفیہ متاثر ہونے کے موڈ میں نہیں تھیں، انہوں نے شاہانہ انداز میں ماہین کو ٹوک دیا تھا کہ سوری میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتی...... سفینہ ہے تو میری بات کراؤ اس کا سیل مسلسل آف جارہا ہے...... ماہین کی تو جیسے ''بچی'' ہوگئی تھی۔

سفینہ نے بوکھلا کر سیل ماہین کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگالیا۔

''السلام علیکم......'' اس نے جھٹ سلام کیا......اور دل پر ہاتھ رکھ کر گویا خود پر قابو پانے کی کوشش بھی ساتھ، ساتھ کی...... ماہین اب دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر پکڑے سفینہ کو گھور رہی تھی۔

''وعلیکم السلام......ارے بھئی......تم نے تو میرے بچے کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے......سیل کیوں آف ہے تمہارا؟''

''جی بس......اسٹڈی میں بہت بزی تھی......آف کیا تو آن کرنا ہی بھول گئی......'' جھوٹ بولنے کی پریکٹس نہیں تھی، بولتے، بولتے پسینے، پسینے ہوگئی۔ اب ان سے کیسے کہتی کہ پرنس کو سبق سکھا رہی تھی۔

''اوکے...... پرنس نے مجھے بتایا کہ تمہارا سیل مسلسل آف مل رہا ہے تو میں پریشان ہوگئی......تھینک گاڈ......کہ تم خیریت سے ہو...... میں اس وقت زیادہ بات نہیں کر پاؤں گی......تم اپنا سیل آن کرو...... پرنس تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ گڈ نائٹ......میری پیاری بیٹی......ٹیک کیئر ڈارلنگ......''

اس کے ساتھ ائرپیس میں سناٹا اتر آیا...... ماہین ابھی تک اپنے سارے کام چھوڑ چھاڑ اس کی شکل تک رہی تھی......جیسے وہاں کچھ لکھا نظر آ رہا ہو۔

سفینہ نے گہری سانس لے کر سیل ماہین کی طرف بڑھا دیا۔

''بس......؟'' ماہین نے دونوں ہاتھ یوں متحرک کیے جیسے پرندہ پر پھڑ پھڑاتا ہے......حیرانی دیدنی تھی۔

''بس......شہ زور ٹرک، ڈمپر، اورنج ٹرین، میٹرو NLC......KMC کا کھچاڑا......''

''اور تمہاری ساس کی لینڈ کروزر......تمہارے پرنس کی اوڈی...... لیموزین......'' ماہین نے سفینہ کے شوخ انداز پر تیزی سے اس کا جملہ اچک کر خود مکمل کر دیا۔ ''ہیں......؟ گرینڈ ساس سے دو منٹ بات کر کے تمہارا یہ حال ہے...... پرنس سے بات کروگی تو باہر لان میں جا کر کرنا......ہوا میں اڑنے کی شرط ہے کہ اوپن ائرایریا ہونا چاہیے۔ کمرے میں تو تمہاری بھٹکی ہوئی روح ہی اڑ سکتی ہے۔''

''میں لان میں جا رہی ہوں......تمہارے سامنے تو پرنس سے باتیں نہیں کروں گی ناں......'' سفینہ نے لپک کر اپنا سیل اٹھا کر آن کیا......ایک مدھری دھن ماحول میں ابھری۔

سفینہ نے بائے، بائے کے انداز میں ہاتھ لہرایا اور کمرے سے نکل گئی۔ سارے جہاں کی حماقتوں نے آنِ واحد میں ماہین کی شکل پر ڈیرا ڈال دیا تھا۔

☆☆☆

پرنس کو اپنے روم میں انٹرکام پر لیڈی صوفیہ نے خوشخبری سنادی تھی کہ سفینہ اس کی کال کا ویٹ کر رہی ہے۔

لیڈی صوفیہ کا پُرجوش انداز اور خوشگوار موڈ پرنس کے لیے بہت بڑی نعمت ہوا کرتا تھا......احساسات بہت لطیف و خوشگوار ہو جاتے تھے......اسے دادی پر بہت پیار آیا۔

پر دادی، دادی، ماں، دوست، ہر رشتے کا بھرپور احساس ان کی ذات سے ملتا تھا...... جب وہ سات آٹھ سال کا تھا اس کے ساتھ کرکٹ کھیلتی تھیں جب عنفوانِ شباب میں قدم رکھا تو اس کے ساتھ لان ٹینس، ٹیبل ٹینس، کیرم، شطرنج، کارڈز کھیلتی تھیں......اسے کبھی احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ اس محل میں صرف دو افراد رہتے ہیں۔ اور اب عشق کے سفر میں بھی اس کے ساتھ، ساتھ تھیں...... پرنس نے دیوار گیر گھڑیال پر وقت ملاحظہ کیا پھر اٹھ کر اپنی پسندیدہ خوشبو لگائی......خوشبو کے بغیر تو وہ کبھی نہیں رہتا تھا......اس وقت تو وہ سفینہ کے ہمراہ چاند کے سفر کی نیت کر چکا تھا۔

''گرینڈ ما م نے یہ تو نہیں بتایا کہ اس کا سیل فون کیوں آف تھا......'' وہ قدرے الجھا پھر مسکرا دیا۔

"چلو خود ہی پوچھ لیتے ہیں......"

وہ آپریٹر سے رابطہ کرنے کے لیے پلٹا تو فون کی گھنٹی نے ٹھٹکا دیا۔

"لگتا ہے بہت جلدی میں ہو......صبر نہیں ہوا......" اس نے خوشگوار احساسات کے بیچ ریسیور اٹھایا۔

"یس......!" یہ آپریٹر کو متوجہ کرنے کا انداز و ادا تھی۔

"سر......ثوبان لائن پر ہیں بات کیجیے......" آپریٹر کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"ثوبان......؟" وہ چونکا نہیں باقاعدہ جھٹکا سا لگا تھا۔

"ہیلو......" اسے سوچنے کے لیے دو پل نہیں ملے......ثوبان کی گھبرائی آواز کان کے پردے سے ٹکرائی۔

"جی بیٹا......؟" ثوبان کی آواز میں کچھ تھا......دل اندیشہ مند ہوا۔

"انکل......شاید ممی کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔" ثوبان کی آواز پر آنسوؤں کا اثر تھا اور لہجے میں فرشتے کی سی معصومیت......

پرنس گویا چکرا کر رہ گیا......یہ شاید تو ایک بگل حشر تھا۔

"what do you mean?" اس نے خود کو سنبھال کر فوراً سوال کیا۔

"انکل......ممی کچھ نہیں بول رہیں......بیڈ سے نیچے گر گئی ہیں، بالکل سیدھی، سیدھی فلور پر لیٹی ہیں......میں ممی سے پوچھ رہا ہوں ممی کیا ہوا......ممی بولتی ہی نہیں......" آخری الفاظ ہچکیوں میں گم ہوگئے۔

"oh my God"

پرنس کے اوسان جاتے رہے۔

"ثوبان، میڈ کہاں ہے؟ اسے بلاؤ......" ذہن نے اب تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا......جو اکثر ایمرجنسی کی صورت حال میں کرتا ہی ہے۔

"جی انکل......وہ تو شاید سو گئی ہے، مجھے ڈر لگ رہا ہے، آپ آجائیں......" ثوبان ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

"اوکے، اوکے......" اس نے تسلی دینا چاہی۔

"please don't cry" پرنس نے ریسیور رکھا اور دونوں ہاتھوں سے چکرا تا سر یوں تھاما گویا قدم اٹھانے کی مہلت لے رہا ہو۔

☆☆☆

اسے صبح نور کے تڑکے بیدار ہونا تھا......وہ اپنی دانست میں جلدی سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر جذبات میں ایک ہیجان برپا تھا، ایک خیال آ رہا تھا دوسرا جا رہا تھا......نیند کے لیے ذہن کا پُرسکون ہونا تو پہلی شرط ہے، آدھے گھنٹے میں دو درجن کروٹیں تو لے چکا تھا۔

کہیں جا کر غنودگی طاری ہوئی تو سیل کی رنگ ٹون نے ہلا مارا۔

"کہیں فلائٹ لیٹ تو نہیں ہو رہی......اس وقت تو آپا ہی فون کرسکتی ہیں۔"

اس نے جھلاتے ہوئے انداز میں سیل اٹھایا......کوفت بھری نظریں اسکرین پر جا ئیں......کسی نامانوس نمبر سے کال آ رہی تھی......پہلے سوچا رانگ نمبر نہ ہو پھر خیال آیا......آپا ہی کسی دوسرے نمبر سے فون نہ کر رہی ہوں۔ اس نے کال وصول کی......اور بہت مدھم آواز میں ہیلو کہا۔

"زارا بات کر رہی ہوں۔" زارا کی آواز بھی بہت آہستہ تھی۔ ساحل کی کنپٹی پر گویا فائر ہوا تھا۔

(جاری ہے)

درد آئے گا دبے پاؤں

عنیزہ سید



حماد حسن کے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر اس کو اُس وقت ملی جب وہ بڑے ابو کے دوست مرزا سلیم بیگ سے ملنے کے لیے جا رہا تھا۔ اس نے اپنا پروگرام فوری طور پر ترک کر دیا۔ اس روز مین ہٹن پر برفیلا دسمبر اپنی پوری شدت کے ساتھ چھایا ہوا تھا۔ کرسمس میں کچھ ہی دن باقی تھے اور لوگ کرسمس کی شاپنگ کرنے کے بعد جلد از جلد گھروں کو واپس جانے کی فکر میں تھے۔ حماد حسن کے ساتھ یہ حادثہ مین ہٹن ہی میں پیش آیا تھا۔ تیمور کو جس شخص نے یہ اطلاع دی تھی اس کے مطابق وہ ففتھ ایونیو اسٹریٹ کے کارنر پر کھڑا تھا اور پولیس وہاں پہنچ چکی تھی۔ تیمور کو وہاں پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگا تھا، اس وقت تک حماد حسن کو اسپتال لے جایا جا چکا تھا۔ اس کا ذہن اس وقت

تک پریشانی، ٹھنڈ اور لمبا فاصلہ طے کرنے کی تھکن کے باعث تقریباً ماؤف ہوچکا تھا۔ اس نے مایوسی اور پریشانی کے عالم میں ایک بڑی سی کیٹل پر کھڑے سالویشن آرمی کے سانتا کلاز کو دیکھا اور جیب سے چند سکے نکال کر اس کی طرف اُچھال دیے۔ اسے حماد کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی نوعیت کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اس نے فون کرنے والے شخص سے کچھ پوچھا بھی نہیں تھا۔ بس پاگلوں کی طرح اس کے بتائے ہوئے پتے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ مایوسی کے عالم میں اسی جگہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کہاں سے اس کے بارے میں پتا کرے۔ اسی وقت ایک پولیس کانسٹیبل اس کی طرف آیا۔

''تیمور شیرازی؟'' اس نے دریافت کیا۔ تیمور نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ کانسٹیبل نے اسے حادثے کے بارے میں بتانے کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ حماد کو پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی نے دانستہ ٹکر ماری تھی۔ وہ پیدل جا رہا تھا، گاڑی میں بیٹھے ہوئے لڑکے شراب کے نشے میں دُھت تھے اور غل غپاڑہ بھی کر رہے تھے۔ اس کے مطابق حماد کی حالت سیریس تھی۔ تیمور جس قدر جلد اسپتال پہنچ سکتا تھا، پہنچا۔ حماد حسن کی پسلیاں بری طرح مجروح ہوئی تھیں اور اسے سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق اس کے بچنے کے چانسز صرف دس فیصد تھے۔ وہ وہیں اسپتال کے ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ کوئی اسے امید افزا خبر سنائے۔

''وہ ہوش میں آ گیا ہے مگر سخت تکلیف میں ہے۔'' ایک نرس نے اس کے استفسار پر بتایا تھا۔ ''اگر تم دیکھنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ۔'' وہ اس کے پیچھے اس طویل کاریڈور کی طرف چل دیا تھا۔ اچانک وہ کیسی صورتِ حال میں پھنس گیا تھا۔ قطعی غیر متوقع اور اذیت ناک...... اس اتنے بڑے ملک میں حماد اور اس کا ایک دوسرے کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں صرف ایک سال پہلے کیسے، کیسے جتن اور کتنے لمبے چکر کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ ان دونوں کو جہانِ اول کے اس عظیم ترین ملک میں پڑھنے کا شوق یہاں تک لے آیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد یہاں رہنے کی خاطر وہ دونوں کن مشکلات سے گزر رہے تھے، یہ وہ ہی جانتے تھے۔ سخت محنت بلکہ مشقت ان کا مقدر بن کر رہ گئی تھی۔ اس دوران کون سا ایسا کام تھا جو انہوں نے نہ کیا ہو...... اور اب جب وہ یہاں کے حالات کو اور حالات کے مطابق زندگی گزارنے کے طریقوں کو سمجھنے میں آہستہ، آہستہ کامیاب ہو رہے تھے تو یہ حادثہ پیش آ گیا۔

اس روز تیمور خود کو کتنا تنہا اور بے بس محسوس کر رہا تھا، یہ وہی جانتا تھا۔ اس کے سامنے حماد پڑا تھا۔ وہ پٹیوں اور پلاسٹرز میں جکڑا ہوا...... اسپتال کے مریضوں کے مخصوص کپڑے پہنے...... اسی صبح ہی تو وہ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر اپنے اپنے کاموں پر نکلے تھے۔ اس روز حماد نے کتنے دنوں بعد شیو کی تھی اور رگڑ، رگڑ کر منہ دھونے کے بعد نیا ٹراؤزر اور پل اوور پہن کر نکلا تھا۔ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ چند گھنٹوں کے بعد وہ اسے اس حالت میں دیکھے گا۔ اس نے دیکھا حماد بدقت سانس لے رہا ہے پھر اس کے سامنے آکسیجن ماسک اس کے چہرے پر چڑھا دیا گیا۔

''اس کے لیے دعا کرو۔'' اس کے ساتھ آنے والی نرس نے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا۔ وہ اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

''تم اپنے کسی اور دوست کو بھی بلا لو، کسی ہم وطن کو، کسی شناسا کو۔'' وہ اسے مشورہ دے رہی تھی۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ ایسا کوئی دوست، ہم وطن اور شناسا موجود نہیں تھا جسے وہ یہاں بلا سکتا۔ دوست، ہم وطن اور شناسا فی الوقت تو وہ ہی تھا جو موت اور زندگی کی کشمکش میں وہاں پڑا تھا۔ وہ اپنے کام اور ایک کمرے کے ٹھکانے کو بھلائے وہیں بیٹھا رہا تھا، نہ جانے کتنے گھنٹے یا شاید پورے دو دن...... حماد کو ہوش آنے اور اس کی حالت بہتر ہونے کی خبر بھی اسے ایک نرس سے ہی ملی تھی۔ وہ اسے دیکھنے اس کے پاس چلا آیا۔ اسے شدید تکلیف تھی جس کے اشارے اس کے چہرے سے عیاں تھے مگر وہ تیمور کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

''مجھے معلوم تھا تم اِدھر ہی ہو گے، بھلا تم کیسے نہ آتے۔'' وہ بدقت کہہ رہا تھا۔ تیمور کا سر ہلکا ہو گیا، وہ جان رہا تھا جبکہ ڈاکٹرز کو خدشہ تھا کہ وہ اپنی یادداشت بھی کھو سکتا تھا۔ ''وہ وہی تھے جن سے اس روز پیزا شاپ پر میرا جھگڑا ہوا تھا، معمولی سی بات پر میری جان لینے کے درپے ہو گئے۔'' وہ آہستہ آواز اور ٹوٹے ہوئے لفظوں میں اسے بتاتا رہا۔ ''ایک وعدہ کرو مجھ سے تیمور۔'' پھر اس نے اسے کہا۔ تیمور نے نظریں اٹھا کر بہ مشکل اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی تکلیف کو محسوس کر سکتا تھا اور یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

''اگر میں بچ نہ سکا تو پلیز میری ممی کو پتا نہ چلنے دینا یار...... پلیز ان کو خبر نہ کرنا، وہ زندہ نہیں رہ سکیں گی۔'' تیمور نے ڈبڈبائی نظروں سے حماد کو دیکھا جو تکلیف کے سبب سفید چہرہ لیے اس کے سامنے زخمی پڑا تھا۔ تیمور کے آنسوؤں نے اس کا چہرہ دھندلا دیا تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم یار، تمہیں کیوں کچھ ہوگا، تم ہوش میں آ چکے ہو، سب کو پہچان رہے ہو اور باتیں کر رہے ہو، اب تو تمہارے نہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' تیمور نے اپنے لرزتے جذبات کو دباتے ہوئے کہا۔ جواب میں تکلیف کی شدت کے باوجود حماد محض مسکرا کر رہ گیا۔ حماد کے لیے تیمور کے دل میں جو جذبات تھے وہ کسی اور کے لیے ہو نہیں سکتے تھے۔ اس کے دل میں اس کی محبت اور اس کے لیے نیک جذبات کا عرصہ بیت چکا تھا اور اب تو پچھلے ایک سال سے ان کا دن رات کا ساتھ تھا۔ ان کی خوشیاں مشترک تھیں، ان کے دکھ، مسائل سب ایک سے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپا سکتے تھے، پچھلا ایک سال جس طرح انہوں نے دن رات کی پریشانیوں اور نئے حالات سے نبرد آزما ہوتے گزارہ تھا، اس میں ایک دوسرے کا مکمل ساتھ ہی ان کے سروائیول کا سبب بنا تھا اور اب تو وہ ان مشکلات سے گزر کر اس اجنبی ماحول سے مانوس ہو چکے تھے۔ اب ہی تو وہ نئی، نئی جگہوں اور ملازمتوں کو دریافت کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے کہ حماد اس بیچارگی کے عالم میں یوں بے حس و حرکت بیڈ پر جا پڑا تھا۔

یہ دو ہفتے پہلے کی ہی بات تھی جب حماد نے اسے بتایا تھا کہ جس پیزا شاپ پر وہ کام کرتا تھا وہاں اس کی کچھ سیاہ فام امریکن لڑکوں سے تو، تو میں، میں ہو گئی تھی۔ اسی روز تیمور نے اسے فوری طور پر وہ پیزا شاپ چھوڑ دینے اور محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ دو ہفتے خیریت سے گزر گئے تھے اور کچھ بھی غیر معمولی نہیں ہوا تھا۔ حماد بدستور اسی شاپ پر کام کر رہا تھا۔ نئی جگہ جاب ملنا مشکل مرحلہ تھا اور اب تو وہ دونوں اس ناخوشگوار واقعے کو بھولنے لگے تھے لیکن ان وحشیوں کو یہ واقعہ نہیں بھولا تھا جن کے لیے انسانی جان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ ملک ان کا تھا اور قانون بھی ان کا ہی.. ان کے لیے یہ روز کا معمول تھا، اسے وہ ایڈونچر اور تھرل کا نام دیتے تھے۔

اس شام تیمور، حماد کو باتیں کرتا چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے اس شخص کے پاس گیا تھا جس کی کیب وہ چلاتا تھا۔ وہ تقریباً آٹھ بجے واپس آیا تھا مگر اسپتال میں اس کے لیے بری خبر منتظر تھی۔ حماد حسن اچانک... بلڈ پریشر شوٹ کر جانے کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا، وہ اسے اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہنے والا، ہمیشہ کے لیے اسے تنہا چھوڑ گیا تھا۔ تیمور پر انتہائی دلگرفتگی اور غمگینی کا عالم طاری تھا، اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آج اس غیر ملک میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا ہے، اس کے پاس تو اس کے آنسو پونچھنے والا، دلاسا دینے والا اور مشورہ دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ ایسے وقت فہد ادریس سے اس کا تعلق بنا تھا، فہد ادریس کے لیے یہ جگہ نئی نہیں تھی اور پاکستان سے آنے والے نوجوانوں کے حالات سے بھی ناواقف نہیں تھا۔ حماد حسن کی موت کا اس نے بھی خاصا اثر لیا تھا۔ وہ یہاں اچھی خاصی معقول جاب کر رہا تھا اور حماد کے سلسلے میں اس نے کافی بھاگ دوڑ بھی کی تھی۔

"میری معلومات کے مطابق" نائتھ پری سنکٹ" مین ہٹن کی ففٹی نائتھ سے لے کرایٹی سکستھ اسٹریٹ یعنی ففتھ ایونیو سے ایسٹ ریورتک کی ذمّے دار ہے۔ حماد والے حادثے کی رپورٹ ان کے پاس موجود ہے اور اگر یہ دانستہ ٹکر مارنے کا نتیجہ ہے تو حقیقت بھی جلد کھل کر سامنے آ جائے گی اور امید ہے کہ جرم کرنے والوں کو اس کی سزا ضرور ملے گی۔"

تیمور کو حادثے کے سزاواروں میں اس وقت کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے ہیرے جیسا دوست گنوا دیا تھا اور اس کے دل میں رہ، رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ اب وہ یہاں تنہا تھا۔

"لیکن تم نے یہ کیوں کہا کہ اس کی ڈیڈ باڈی پاکستان نہ بھجوائی جائے، کیا واقعی اس کا وہاں کوئی نہیں۔" فہد ادریس نے اس سے پوچھا تھا۔ تیمور اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھے شکست خوردہ انداز میں فہد ادریس کے اپارٹمنٹ میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا اس کے سوال کا جواب سوچ رہا تھا۔

"میں بچ نہ سکا تو پلیز ممی کو پتا نہ چلنے دینا، پلیز یار اُن کو خبر نہ کرنا، وہ زندہ نہ رہ سکیں گی۔" موت سے چند گھنٹے قبل کہے حماد کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ فہد ادریس کو کیا بتاتا کہ ماں جیسی کتنی قیمتی ہستی حماد پیچھے چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ ماں جس کی زندگی، امید، حوصلہ، طاقت اور تسلی سب حماد حسن سے وابستہ تھا، وہ ماں جس کی زندگی کا محور ہی حماد حسن تھا، یہ تو صرف تیمور ہی جانتا تھا کہ کس طرح حماد اپنی ممی سے علیٰحدہ ہوا تھا اور پچھلے ایک سال میں کس شدت سے وہ انہیں یاد کرتا رہا تھا۔

حماد اور اس کی ممی ایک دوسرے کا لازم وملزوم حصہ تھے۔ حماد نے جب دو سال قبل تیمور سے امریکا جانے کی بات کی تھی اس وقت اور بہت سی ناممکن باتوں کے علاوہ یہ بات سب سے زیادہ قابلِ غور معلوم ہوئی تھی کہ حماد اور اس کی ممی ایک دوسرے سے الگ کیسے ہوں گے۔ تیمور خود تو بچپن میں ہی والدین کی شفقت سے محروم ہو چکا تھا۔ حماد سے اس کی ممی کی محبت اور اس کے لیے ان کی دیوانگی کی باتیں سن کر وہ اس کی قسمت پر رشک کرتا تھا۔

جن دنوں وہ امریکا آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اسے نہ تو وطن سے اور نہ ہی ان مانوس فضاؤں سے دور جانے کا دکھ تھا، اسے صرف یہ دکھ تھا کہ اسے دل سے خدا حافظ کہنے والا، پیچھے یاد کرنے والا، اس کے لیے دل سے دعا کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے اس وقت تک کی زندگی اپنے واحد چچا کے گھر گزاری تھی جنہوں نے محدود وسائل کے باوجود اسے تعلیم، خوراک، لباس اور رہائش جیسی بنیادی سہولتوں سے محروم نہیں ہونے دیا تھا۔ شاید صرف اس لیے کہ وہ اپنے والد کی اچھی خاصی جائداد کا وارث تھا اور اس کے ساتھ اس حسنِ سلوک کے نتیجے میں کچھ حصے کے وہ بھی حق دار ٹھہر سکتے تھے مگر وہ اسے اپنائیت اور محبت کا وہ احساس کبھی نہ دے سکے جس کے ہونے سے زندگی، زندگی بن جاتی ہے۔ اسی وجہ سے جب وہ حماد سے اس کی ممی کی محبتوں کی شدت اور اس کی چھوٹی، چھوٹی باتوں سے ان کی ہر پل وابستگی کی باتیں سنتا تو اس کے اندر احساسِ محرومی شدت سے جاگنے لگتا۔

باپ کے سائے سے حماد بھی محروم تھا مگر اس کے والد کی وفات کے بعد اس کی ممی نے اسے اور اس کی چھوٹی بہن کو باپ کی طرح پالا تھا۔ وہ ملتان کے ایک مقامی گرلز کالج میں لیکچرر تھیں اور شوہر کی وفات کے بعد انہوں نے تن تنہا حالات کا مقابلہ کیا تھا، گھر، بچوں اور نوکری، تمام ذمّے داریوں کو بڑی خوبی سے نبھایا تھا، وہ بہت کم عمری میں بیوہ ہو گئی تھیں مگر اپنے خاندان والوں کے اصرار کے باوجود انہوں نے دوسری شادی نہیں کی اور ایک لمبی زندگی تنہا گزار دی۔ حماد نے اسے بتایا کہ انہوں نے ہمیشہ یہ ہی کہا کہ وہ اپنے دو چھوٹے، چھوٹے پودوں کی نمود کے انتظار میں زندگی گزارنا چاہتی تھیں اور انہوں نے ایسا کر کے بھی دکھایا۔ تیمور، حماد کی بہن سے کبھی نہیں ملا تھا۔ حماد کو دیکھ کر اس کی پرورش اور تربیت کرنے والے ہاتھوں کی نفاست اور ذہن کی خوب صورتی کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ حماد ایک انتہائی نفیس شخصیت اور اعلیٰ کردار کا نوجوان تھا۔ اس کی سوچ اور اس کے شعور میں جو پختگی تھی وہ اس عمر کے نوجوانوں میں کم ہی پائی جاتی تھی۔ کالج اور یونیورسٹی میں وہ اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے ہر دل عزیز تھا اور اگر کوئی اس کی ان خوبیوں کی تعریف کرتا تو وہ بڑے عجز کے ساتھ اس کا کریڈٹ اپنی ممی کو دیتا تھا۔ اپنی ممی سے اس کی انسیت کا یہ عالم تھا کہ وہ ان کے بغیر رہنے کے تصور سے بھی گھبراتا تھا لیکن جب سوال بہتر مستقبل کا آیا تو حماد کو اپنے دل پر جدائی کا بھاری پتھر رکھنا ہی پڑا۔ اس کی ممی اگرچہ اس کے اس فیصلے سے ناخوش تھیں لیکن اس کی خوشی کی خاطر انہوں نے اسے منع بھی نہیں کیا تھا۔

امریکا آنے سے پہلے ہی تیمور، حماد کی اپنی امی سے انسیت اور وابستگی کے بارے میں جانتا تھا...... مگر یہاں آ کر اس نے اس دیوانگی کا عملی مظاہرہ بھی دیکھا تھا جو حماد کے دل میں اپنی امی کے لیے تھی۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اور جدوجہد کے اس ابتدائی دور میں بھی اس کا رابطہ اپنی والدہ سے نہ ٹوٹا تھا، فون، نیٹ اور خط رابطے کا کوئی ذریعہ ایسا نہ تھا جو وہ استعمال نہ کرتا تھا۔ وہ کیا کرتا تھا، کیا کھاتا تھا، کیا پہنتا تھا، کیسے رہتا تھا، اس کی والدہ اس سے ہر روز کی رپورٹ لیتیں اور وہ بھی خاصی تفصیل سے انہیں بتاتا تھا، خصوصاً جب وہ نیٹ پر آن لائن ہوتیں اُدھر وہ بھی دن بھر گھر کی، رشتے داروں کی، اپنی مصروفیات کی، شہر کے موسم کی تفصیل اسے بتاتی تھیں اور یہ سب دیکھ، دیکھ کر تیمور کا رشک بڑھتا جاتا۔ وہ حماد کو خوش نصیب ترین انسان سمجھتا تھا جس کے معاملات سے کوئی اتنا جڑا تھا۔ وہ پورے تجسس اور شوق سے حماد کو دیکھتا رہتا، خصوصاً اس وقت جب وہ آن لائن گفتگو میں مصروف ہوتا اور وقفے، وقفے سے اسے بھی بتاتا رہتا کہ اس کی والدہ کیا کہہ رہی ہیں۔

☆☆☆

فہد ادریس کے پاس بیٹھے ہوئے اس کے سوال کے جواب میں کہ وہ حماد کی میت پاکستان کیوں نہیں بھجوانا چاہتا تھا اسے رہ، رہ کر گزرے ایک سال کے مناظر اور باتیں یاد آ رہی تھیں اور پھر حماد کی وہ درخواست جسے اس نے بار، بار دُہرایا تھا۔ وہیں بیٹھے، بیٹھے اس نے سوچا کہ کیا وہ حماد کی ممی کو اس کی موت کی اطلاع دے سکتا تھا، کیا وہ اس کی میت کو پاکستان بھجوا سکتا تھا، اس کے دل اور دماغ دونوں نے ہی اس سوال کا جواب نفی میں دیا تھا۔ وہ ایسا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا تھا اور پھر اس پر اپنے دوست کی آخری خواہش کا احترام بھی واجب تھا۔

☆☆☆

حماد کی تدفین کے کئی دن بعد تک اس کا ذہن نارمل نہیں ہوا تھا، اس دوران فہد ادریس نے اسے اخلاقی اور مالی دونوں طرح سے ہی سپورٹ کیا تھا اور وہ اس کا مشکور ہوئے جا رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس عالمِ بے بسی اور عالمِ تنہائی میں خدا تعالیٰ نے فہد ادریس کی صورت اس کو ایک فرشتہ عطا کر دیا تھا۔ اس روز وہ شاید ہفتے کے بعد کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا، حماد کا پاس ورڈ اس کے پاس تھا۔ اس نے یونہی اس کی میل چیک کرنے کے غرض سے نیٹ آن کیا اور ایسا کرتے ہوئے یقیناً اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق حماد کی میل اس کی ممی کے پیغامات سے بھری ہوئی تھی - انہیں بے حد تشویش تھی کہ وہ کہاں تھا اور ان سے رابطہ کیوں نہیں کر رہا تھا۔ انہوں نے مختلف چھوٹی، چھوٹی اطلاعات بھی دی تھیں اور اس سے بہت سے سوال بھی کیے تھے۔ اس روز رات گئے تک تیمور کا دل بے چین رہا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ یہ بات وہ ان سے کتنی دیر تک چھپا سکتا تھا مگر فوری طور پر بتانا بھی ممکن نہیں تھا۔ حماد کا ملتجیانہ انداز اور اس کی آخری خواہش کا احترام بھی واجب تھا، بہت سوچنے کے بعد اس نے دوبارہ نیٹ آن کیا اور حماد کے ایڈریس سے اس کی ممی کو میل کرنے لگا۔

☆☆☆

''دل بہت بے چین تھا، شکر کیا تمہاری اطلاع ملی، یہ تم نے کیسا نیا کورس جوائن کرلیا ہے، جس میں کھو کر تم ماں کی خبر لینا ہی بھول گئے، تم جانتے ہو میں کتنی وہمی ہوں اور تمہارے لیے تو خصوصاً۔ بیٹا! میں نے تم سے کہا تھا کہ چاہے کتنے ہی مصروف ہو، مجھے اپنی خیریت کے بارے میں مختصراً ضرور بتادیا کرو، تم نے ایک دم ہی چپ سادھ لی اور اتنی لمبی چپ کہ میری راتوں کی نیندیں ہی اڑادیں۔ تمہیں عزوٰی کی طبیعت کا تو پتا ہے ہی اس نے رو، رو کر اپنی آنکھیں سجالیں۔ اصل میں تمہارے بغیر تو اسے اپنا، آپ ہی بہت تنہا سا لگتا ہے۔ اوپر سے تمہاری اطلاع نہیں آئی۔ اسے تو پڑوس کی حمیدہ خالہ اور نسرین بھابی بھی چپ کراتی رہیں کہ بھلا ایسا کیا مصروف ہوگیا ہوگا، خود ہی دے گا اطلاع مگر بے چین دل کو چین کہاں سے آئے۔ میرے بیٹے، ہم دکھیا جانوں پر ایک رحم کرنا، آئندہ یوں غائب نہ ہوجانا اتنے دن...... میری تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تمہیں فون بھی کروں تو کہاں کرو۔ یہ بتاؤ صحت کیسی ہے تمہاری، طبیعت ٹھیک تو ہے ناں، کھانا پینا ٹھیک ہے تمہارا، اپنی کوئی تازہ تصویر ہی بھجوادو، میں آنکھوں کی پیاس بجھالوں گی۔''

اس کی میل کے جواب میں حماد کو ممی نے لکھا تھا اور تیمور کا دل پہلے سے زیادہ بے چین ہوگیا تھا، وہ حماد کی تازہ تصویر کہاں سے بھجوائے گا اور انہیں نہ بھجوانے کے بارے میں کیا بتائے گا پھر اس نے حماد کا پکچر فولڈر کھولا اس میں کئی تصویریں تھیں مگر سب پرانی تھیں، وہ نہیں جانتا تھا کہ حماد کی ممی نے ان میں سے کون سی نہیں دیکھی تھی۔ بہت سوچ کر اس نے ان کو وہ تصویر بھجوادی جو حماد کی وفات سے چند ہفتے پہلے ہی انہوں نے ایک گیس اسٹیشن پر کھنچوائی تھی۔ ساتھ میں تفصیل سے حماد کی خیریت اور روزمرہ کے معمولات میں سے چھوٹی، چھوٹی باتیں بھی لکھ دیں۔

☆☆☆

دن، ہفتے، مہینے گزرتے جارہے تھے، فہد اور اس کے چند دوستوں کی محبت اور خلوص بھری مدد کے ساتھ تیمور اس اجنبی ملک میں پاؤں جماتا جارہا تھا۔ حماد کی ممی سے نیٹ پر رابطہ قائم رہا تھا۔ اس نے ان کو اپنے حالات بہتر ہونے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ ان کے ذہن میں اب بھی یہی بات تھی کہ وہ سیٹل ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ وہ ان سے مسلسل رابطہ نہیں کرتا تھا اور انہیں یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ بہت مصروف رہتا ہے لیکن وہ مسلسل رابطہ رکھتی تھیں اور کچھ عرصے بعد تو وہ حماد کے گھر اس کی والدہ، بہن، عزیز رشتے داروں اور ملنے ملانے والے سے یوں واقفیت حاصل کرگیا تھا جیسے وہ انہی کے گھر کا حصہ ہو۔ نیٹ پر بیٹھ کر حماد کی ممی سے بات کرتے ہوئے کبھی کبھی اسے احساس ہوتا جیسے وہ اس وقت اس ہی کی امی ہیں۔ وہ اپنے متعلق سب کچھ بھول جاتا تھا، اس کی ساری حسیات حماد کی حسیات میں بدل جاتیں اور ان سے گفتگو کرتے ہوئے اسے قطعی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ حماد نہیں تھا۔ حماد سے متعلقہ لوگوں کے متعلق جان لینے کے بعد وہ اکثر اکا دُکا سوال خود ہی ان کے متعلق کرلیتا تھا، کبھی کبھار وہ کوئی غلطی بھی کرجاتا جس کی وہ فوراً تصحیح کردیتیں، اس نے حماد کی پرانی تصویریں اینگل اور رنگ کی تبدیلی کے ساتھ انہیں وقتاً فوقتاً بھجوائی تھیں۔ ممی بھی اپنی اور حماد کی بہن عزوٰی کی تصویریں بھجواتی رہتی تھیں۔ عزوٰی، تیمور نے دیکھا ایک خوش شکل لڑکی تھی، وہ ایم اے انگلش کا امتحان دینے کے بعد کسی مقامی اسکول میں جاب کررہی تھی۔ ممی کی میل سے اس کی روٹین کا پتا چلتا رہتا تھا۔ رفتہ، رفتہ وہ ان دونوں شخصیات سے مانوس ہوتا گیا۔ اسے محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ حماد نہیں تھا اور ان دونوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

☆☆☆

پھر ایک روز اسے ممی کی طرف سے بھیجا گیا پارسل ملا، جس میں دو شلوار سوٹ اور ایک ہاتھ سے بنا سوئٹر تھا۔ اس روز اس کا دل انتہا سے زیادہ اداس رہا۔ وہ سوچتا رہا، کتنے چاؤ سے حماد کی ممی نے یہ کپڑے سلوائے ہوں گے، وہ کیا جانتی ہوں گی کہ انہیں پہنے ہوئے جس کا تصور وہ کر رہی ہوں گی وہ کب کا منوں خاک تلے جاسویا۔

پھر ممی کی میل آئی، وہ اس سے کپڑوں کے متعلق پوچھ رہی تھیں اور انہوں نے فرمائش کی تھی کہ حماد ان کپڑوں میں تصویر بنا کر انہیں بھیجے۔ پہلے کچھ عرصہ وہ انہیں ٹالتا رہا لیکن پھر اسے خود وہ شلوار سوٹ پہن کر تصویر بنوا کر ایڈیٹنگ کروانی پڑی۔ تصویر میں جسم اس کا مگر چہرہ حماد کا تھا، اس روز اس کا دماغ تھکنے لگا۔ وہ کتنی دیر تک ایک ماں سے اتنی بھیانک حقیقت چھپا سکے گا۔ وہ بار، بار یہی سوچتا رہا اور پھر ایسے ممکنہ طریقوں پر غور کرتا رہا جن کے ذریعے وہ انہیں بتا پائے گا کہ اُن کا بیٹا انہیں چھوڑ کر دنیا سے جاچکا۔ اس روز وہ یہ بھی سوچتا رہا کہ وہ ممی سے یہ بات چھپا کر اس دوسری دنیا میں موجود حماد کو مغفرت کی دعاؤں سے محروم کررہا تھا۔ اس روز اس نے فیصلہ کرلیا کہ جلد ہی وہ انہیں یہ اطلاع دے دے گا۔

☆☆☆

ابھی وہ فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ اسے انہیں یہ اطلاع کیسے دینی تھی کہ ان کی میل آگئی۔ وہ خود امریکا آنے کی تیاری کرچکی تھیں۔ ان کے بقول وہ یہ تیاری خاموشی سے کررہی تھیں تاکہ حماد کو سرپرائز مل سکے۔ انہوں نے اپنی آمد کے دن اور تاریخ سے بھی مطلع کردیا تھا۔ تیمور کے ہوش تو گم ہوگئے، وہ ایسی صورت حال کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ان کا سامنا کیسے کرے گا اور انہیں کیا بتائے گا۔

''یہ بلکہ اچھا ہے یار۔'' فہد نے اس سے یہ بات سن کر کہا۔ ''وہ آئیں گی، انہیں معلوم ہوجائے گا، وہ حماد کی قبر پر بھی جاسکیں گی، ان کے دل کو تسلی ہوجائے گی۔ وہاں بیٹھے انہیں معلوم ہوتا تو وہ تڑپتی رہتیں۔''

یہ بات تیمور کے دل کو بھی لگی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ ممی کے لیے یہ بات بہتر ہوگی مگر خود اس کے لیے کیسی ثابت ہوگی، کیا وہ اسے ایک اداکار نہیں سمجھیں گی، کیا اس کا گریبان پکڑ کر پوچھیں گی نہیں کہ وہ کون ہوتا تھا ان سے یہ بات چھپانے والا...... جب وہ زخمی

ہوا تھا اس نے اسی وقت انہیں اطلاع کیوں نہیں دی تھی، یہ نہیں پوچھیں گی وہ اس سے۔ اس کا دل یہ بوجھ اٹھا، اٹھا کر تھک چکا تھا۔ ذہن و دل کی ہر وقت کی کشمکش نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ اس لیے اسے لگا کہ اسے آنے والے وقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوجانا چاہیے، انسانی اور اخلاقی قدریں اس سے یہ ہی تقاضا کرتی تھیں سو اس نے سب خیال جھٹک کر ممی کی آمد کے دن کا انتظار کرنا شروع کردیا۔

☆☆☆

اور پھر بالآخر وہ دن آ گیا تھا۔ حماد نے فہد سے ساتھ چلنے کو کہا مگر وہ مصروف تھا۔ مجبوراً اسے خود ہی ائر پورٹ جانا پڑا۔ ائر پورٹ پر مخصوص گہما گہمی اور آمدورفت جاری تھی۔ پی آئی اے کی وہ فلائٹ شام چھ بجے پہنچنا تھی۔ حماد وہاں کھڑا انتظار کررہا تھا پھر فلائٹ کی آمد کے بارے میں معلوم ہوا اور اس نے محو انتظار نظریں پسنجرز لاؤنج کی طرف ٹکادیں۔ وہ ممی کی شکل خوب پہچانتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ائر پورٹ پر وہ ان سے یہ ہی کہے گا کہ حماد مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکا تھا۔ ایک کے بعد ایک مسافر اس کی نظروں کے سامنے آنے لگے۔ ممی کا چہرہ کہیں نظر نہیں آیا۔ تنہا آنے والی مسافر خواتین میں ممی جیسا شناسا کوئی چہرہ نہیں تھا مگر اسے ایک چہرہ ضرور مانوس سا نظر آیا، وہ ایک کم عمر لڑکی تھی جو غالباً تنہا تھی اور جبھی اپنی گھبرائی ہوئی نظروں کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مسافروں کو ریسیو کرنے کی خاطر آنے والوں کے ساتھ اس فلائٹ کے تقریباً تمام مسافر ائر پورٹ سے رخصت ہوچکے تھے جبکہ وہ لڑکی وہیں تھی۔ تیمور ہم وطن سمجھ کر اس کی مدد کے لیے آگے آیا۔

''کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں۔'' اس نے اس کے قریب جا کر پوچھا تو وہ چونک گئی۔

''آپ، آپ؟'' وہ شاید پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

''جی میں تیمور شیرازی۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔

""اوہ، آپ تیمور شیرازی۔"" اس لڑکی کی جیسے جان میں جان آئی۔ ""میں عزویٰ حسن ہوں، حماد حسن کی بہن۔"" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

""اوہ......"" تیمور کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ""مگر آج تو آپ کی ممی کو آنا تھا یہاں۔""

""جی ہاں مگر......"" وہ کہتے، کہتے رکی...... ""حماد بھائی کہاں ہیں......؟""

""حماد کو ایک ضروری کام تھا وہ آ نہیں سکا۔ اس کی جگہ میں آ گیا ہوں۔"" تیمور نے تیزی سے کہا جیسے سبق سنا رہا ہو۔

""مگر آپ کی ممی...... کیا وہ نہیں آئیں۔"" اس نے سوال کیا۔ جواب میں عزویٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

""اچھا ہی ہوا حماد بھائی ائرپورٹ پر نہیں آئے، گو مجھے انہیں یہاں نہ پا کر بہت پریشانی ہوئی مگر شاید یہ اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے آپ کو بھیج دیا۔"" تیمور اس کی بے ربط سی بات سن کر مزید حیران ہوا۔

""کیا مطلب؟"" وہ کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں بولا۔

""ممی کی ڈیتھ ہوگئی۔"" عزویٰ کہتے، کہتے رو پڑی۔ تیمور کے اردگرد جیسے سب کچھ جامد ہوگیا تھا۔

""کیا؟"" کافی دیر بعد بہ مشکل اس کے حلق سے آواز نکلی ""کب...... کیسے......؟""

""پچھلے دسمبر کے آخری ہفتے میں۔"" اس نے ٹوٹ ٹوٹ کر چند الفاظ ادا کیے۔ ""وہ بہت بیمار تھیں مگر یہی کہتی تھیں کہ حماد کو اس کے بارے میں پتا نہیں چلنا چاہیے۔"" ائرپورٹ سے باہر آتے ہوئے اس نے بتایا۔ ""پھر ان کا آخری وقت قریب آ گیا اور انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں حماد بھائی کو ان کی موت کے بارے میں نہ بتاؤں، ان کا کہنا تھا کہ حماد بھائی ان سے جس قدر قریب تھے ان کی وفات کی خبر برداشت نہیں کر پائیں گے، وہ فوراً واپس پاکستان چلے آئیں گے اور پھر کیا خبر واپس امریکا جا سکیں کہ نہیں، پچھلی ساری کوشش بھی بیکار جائے گی اور زندگی بھی اپنی ڈگر سے ہٹ جائے گی۔""

""اوہ میرے خدا!"" تیمور کا ذہن اس صورتِ حال پر شل ہونے لگا۔ ""کیا دنیا میں اس قسم کے اتفاقات بھی ہو سکتے ہیں......؟""

""پھر اس وقت سے اب تک میں حماد بھائی کے ساتھ نیٹ پر امی بن کر بات کرتی رہی، میں نے پوری کوشش کی کہ حماد بھائی کو ذرا بھی شک نہ ہو کہ وہ امی سے مخاطب نہیں اور شکر ہے کہ انہیں نہیں ہوا۔"" وہ کہہ رہی تھی۔

""آپ نے یہاں آنے کا فیصلہ کیسے کیا؟"" تیمور نے مرتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

""میں نے فیلوشپ کے لیے اپلائی کیا تھا، وہ مجھے مل گئی۔ میں نے گھر اور سامان بیچ دیا، میں وہاں تنہا نہیں رہ سکتی تھی، یہاں حماد بھائی تو ہیں ناں۔""

تیمور نے آنکھیں زور سے بند کرلیں اور گاڑی کی پشت سے سر ٹیک دیا۔ وہ اتنے دنوں سے ذہن میں جملے ترتیب دے رہا تھا، وہ سب منظر جو اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے، سب کے سب بدلنے والے تھے...... مگر وہ حالات اور صورتِ حال کی مماثلت اور اتفاقات پر حیرت کے سمندر میں گم تھا۔

""حماد بھائی کہاں ہیں اس وقت؟"" کافی دیر کی خاموشی کے بعد عزویٰ نے پوچھا۔

""امی کے پاس......"" بے اختیار تیمور کے منہ سے الفاظ نکلے۔

عزویٰ کا ردِعمل قدرتی تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ جس بھائی کے آسرے پر وہ سب کچھ چھوڑ آئی تھی، وہ وہاں نہ صرف موجود نہیں تھا بلکہ اس دنیا سے ہی جا چکا تھا اور تیمور کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس ردِعمل کا مظاہرہ کرے۔ ایسی صورتِ حال سے وہ کب کہاں گزرا تھا۔ عزویٰ بری طرح رو رہی تھی اور وہ جیسے اس کے آنسوؤں میں بہتا چلا جا رہا تھا۔



آخر تو ماں ہے

ہالہ احمد

""میرا خیال ہے روبی ہمارا نوّے فیصد کام مکمل ہو چکا ہے کیا خیال ہے کہیں بیٹھ کر تھوڑا فریش نہ ہو لیا جائے۔"" شہلا نے تھکن اور تھوڑے سے اطمینان کی ملی جلی کیفیت میں مجھے مخاطب کیا۔ میں تو خود یہی سوچ رہی تھی سو فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور پھر ہم دونوں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے جہاں بیٹھ کر تھوڑا سستا بھی لیتے اور کچھ پیٹ پوجا بھی ہو جاتی۔

ہمارے کالج میگزین کا سالانہ ایڈیشن آنے والا تھا۔ اس کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں، میں اور شہلا فورتھ ایئر کے اسٹوڈنٹس ہونے کے ساتھ، ساتھ

میگزین کے لیے کام کرنے والی ٹیم کے سرگرم رکن بھی تھے سو ہماری مصروفیات تو آج کل دو چند تھیں۔ ہم دونوں ایک سروے پر کام کر رہے تھے جس کا موضوع تھا۔ ”نچلے درجے کی آبادی کے مسائل......“ اور اس کے لیے ظاہری بات تھی ہمیں نچلے طبقے سے ہی رابطہ کرنا تھا۔ ان ہی سے بات کرنا تھی تاکہ ہم ان کے مسائل کو جان سکیں۔ ہمارے کالج سے کچھ فاصلے پر پکھی داس خانہ بدوشوں کی ایک بستی آباد تھی۔ جسے ہم اکثر آتے جاتے دیکھا بھی کرتے تھے۔ جب سروے کی بات شروع ہوئی تو شہلا کے ذہن میں فوراً اس بستی کا خیال آیا۔ میں بھی متفق ہوگئی۔ اپنے، اپنے گھروں میں اطلاع دینے کے بعد آج چھٹی والے روز ہم دونوں اپنے مشن پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔

شروع میں تو یہ کام ہمیں ذرا مشکل ہی لگا۔ پہلے تو ان لوگوں کی بات سمجھنے میں ہی ہمیں کافی دشواری محسوس ہوئی۔ پھر کچے پکے، اونچے نیچے راستوں پر چلنا، گندگی کے ڈھیر، تعفن زدہ فضا اور ان لوگوں کی ہم پر جمی نظریں جو ہمیں اپنا ایکسرے کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں...... مگر یہی تو وہ ماحول تھا، یہی تو وہ فضا تھی جس میں چھپے جا بجا مسائل کے بارے میں ہمیں جاننا تھا۔ جب اُن لوگوں کو سمجھ آئی کہ ہم ان ہی کے مسائل پر اُن سے بات کرنا چاہ رہے ہیں تو وہ غریب بیچارے بڑے پُرجوش ہوگئے۔ ہر کوئی بڑھ چڑھ کر بولنے لگا۔ ہمیں خوب ہنسی بھی آئی کہ جس انداز میں وہ لوگ اپنے مسائل کی نشاندہی کر رہے تھے، وہ ہمارے لیے نیا اور انوکھا ہی تو تھا۔ کم و بیش ایک ہی طرح کے مسائل تھے جو ہمیں ہر ایک کی زبان سے سننے کو ملے۔ میں اور شہلا سب پوائنٹس نوٹ کرتے جا رہے تھے اور اب ہمیں بھوک، پیاس اور تھکن کا احساس خود پر غلبہ پاتا نظر آیا تو ہمارے لیے بہت ضروری ہوگیا کہ اب کوئی بیٹھنے کے لائق جگہ تلاش کی جائے۔ پکھی داسوں کی خیمے نما جھونپڑیوں سے تھوڑا ہٹ کے ہمیں ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی نظر آئی تو ہم اس کو غنیمت جان کر اس پر ڈھیر ہوگئے۔ شہلا نے اپنے بیگ سے پانی اور جوس کی بوتلوں کے ساتھ ہلکا پھلکا کھانے کا سامان بھی برآمد کرلیا۔ ابھی ہم نے کھانا پینا شروع ہی کیا تھا کہ دائیں ہاتھ کی طرف ایک جھونپڑی میں سے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ پہلے تو ہم نے نظر انداز کیا اور بدستور کھانے میں لگے رہے مگر وہ شور و غل بڑھتا ہی چلا گیا۔ آغاز تو بچوں کی چیخ و پکار اور لڑنے کی آوازوں سے ہوا تھا مگر اب اس میں کسی مرد کے زور، زور سے چلّانے اور کسی جوان عورت کے مسلسل بولنے کی آوازیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ اب تو ہم سے نہ رہا گیا فٹافٹ جوس کے دو تین گھونٹ جلدی، جلدی حلق سے اتارے اور سب چیزیں بیگ میں واپس ٹھونستے ہوئے اس جھونپڑی کی طرف لپکے۔

جھونپڑی کے قریب پہنچ کر میں نے بلند آواز میں پکارا۔

”کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟“ کوئی دروازہ وغیرہ تو تھا نہیں جس پر ہم دستک ہی دے لیتے۔ بس دروازے کے نام پر ایک بدرنگ میلا سا پردہ لٹک رہا تھا۔ میری پکار پر تیس، پینتیس برس کا ایک مرد باہر نکلا۔ یہ غالباً وہی تھا جس کے چلّانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہمارے بارے میں اب تک اس چھوٹی سی بستی کے تقریباً ہر فرد کو ہی خبر مل چکی تھی لہٰذا اس آدمی نے بھی ہم سے کوئی سوال کرنا ضروری نہ سمجھا اور سر جھکا کر ہمیں اندر آنے کے لیے کہا۔ ہم دونوں اندر داخل ہوئے تو چار، پانچ بچے جو دھما چوکڑی مچانے میں مشغول تھے ذرا خاموش سے ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ زور، زور سے بولتی تقریباً تیس سالہ وہ عورت بھی ایک دم خاصی مؤدب سی بن کر ہمیں چارپائی پر بیٹھنے کی دعوت دینے لگی، جھونپڑی کے ایک کونے میں سکڑی سمٹی گٹھری سی بنی ایک ضعیف عورت...... اپنی چنی منی سی آنکھیں کھول کر ہمیں خاموشی سے تکے جا رہی تھی۔

”کیا معاملہ ہے بھئی؟“ شہلا نے اس آدمی کو مخاطب کیا...... ”کیوں جھگڑا ہو رہا تھا یہاں اور یہ اماں جی وہاں نیچے کیوں بیٹھی ہیں، کون ہیں یہ تمہاری؟“ وہ آدمی اور عورت سر جھکائے خاموش رہے، ایک بچہ شرماتے لجاتے ہوئے ننھی سی آواز میں بولا۔

”دادی ہے ہماری......“

”اچھا تو دادی کو وہاں کیوں بٹھایا ہوا ہے؟“ میں نے بھی سوال داغا۔

”دادی بڈھی اے...... ہور کی کریے؟“ (دادی بوڑھی ہے اور کیا کریں ہم) ایک لمحے کے لیے ہم سن سے ہوگئے۔ تب وہ آدمی زمانے بھر کی بیزاری چہرے پر سجائے گویا ہوا۔

”او جی ماں ہے میری...... یہ بیوی ہے اور یہ بچے ہیں ہمارے۔“

”پھر؟“ ہم نے کہا۔

”پھر کیا جی، یہ جھونپڑا او نترا دیکھ رہے ہو آپ بار ہاتھ کی جگہ اور اتنے جی...... بچے میرے کو بولتے ہیں کہ اپنی بڈھی ماں کو کہیں اور بھیجو...... ان کی بک بک سے تنگ ہو کر یہ میری گھر والی بھی میرے کو بولتی ہے کہ اپنی ماں کو نکالو، بچوں کی پوری نہیں پڑتی تو اس بیکار وجود کو کہاں تک پر ڈال کے رکھوں؟ سونے کو جگہیاں نہیں ملتیں، کھانے کو روٹی ٹکر نہیں ملتا...... بچے اوازار (بیزار) گھر والی پریشان...... میں کیا کروں جی آپ ہی بتاؤ؟“ وہ ہم سے سوال کر رہا تھا اور ہم یک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔ ایک ماں کا وجود اتنا بیکار، ارزاں اور بھاری؟ اف ف ف......

”تم بتاؤ کچھ؟“ میں نے بچوں کی ماں کو مخاطب کیا۔

”جی دیکھ لو آپ ہی آپ...... میں کی بولاں؟ (میں کیا بولوں) اپنے سارے بچے...... کھان نوں لبھدائیں...... اس بڈھی نوں کتھے رکھاں؟ کتھوں کھلاواں......؟“ (اتنے سارے بچے کھانے کو ملتا نہیں اس بوڑھی کو کہاں رکھوں، کہاں سے کھلاؤں؟)

”دادی بڈھی کو لے جاؤ آپ...... اسی اچھے کھیلنا۔“ ایک بچہ درمیان میں ٹپک پڑا۔

”بڈھی دادی کج نہیں کردی...... صرف کھاندی...... لے جاؤ بڈھی دادی نوں......“ اب دوسرے بچے کی بھی ہمت ہوئی۔

”ٹھیک ہی ہے بچے وچارے وی کیا کریں؟“ آدمی سر جھٹک کر بولا۔

میں اور شہلا سناٹے میں تھے، غربت نے ان لوگوں سے رشتوں کو پہچاننے کی صلاحیت تک چھین لی تھی اولاد بھی ماں کو ایک بیکار، فالتو وجود سمجھ رہی تھی۔ اس مقدس رشتے کی پہچان تو تھی ہی نہیں ان لوگوں میں...... بڑی مشکل سے ہم دونوں نے خود کو سنبھالا۔ ایک فریق کے دلائل تو سن ہی چکے تھے۔ اب ان اماں جی سے بھی بات بہت ضروری تھی۔ آخر انہیں بھی تو ان لوگوں کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنا تھی ناں، انہیں بھی تو اپنا دل ہلکا کرنا تھا ناں...... کون سنتا ان کی آواز...... ظاہر ہے ہم اور اسی منفی جذبے سے مغلوب ہو کر ہم اپنے بیگ سنبھالتے اماں جی کے قریب گئے۔ ان کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہم نے ان سے پوچھا۔

”اماں جی آپ کے بچوں کی بات تو ہم نے سن لی...... آپ کیا کہیں گی؟“ ساتھ ہی ہم نے خود کو اماں جی کی طرف سے جوابی کارروائی کے لیے تیار بھی کرلیا لیکن جواب میں جو الفاظ اماں کی زبان سے ادا ہوئے وہ سن کر ہم حقیقتاً پتھر کے ہوگئے۔ معلوم ہے اماں نے کیا جواب دیا۔

”نہ پتر...... یہ بچے ہیں، میرے بچے...... وچارے بوت پریشان ہیں، رہنے کو جگہ نہیں، کھانے کو کچھ نہیں وچارے بچے...... شالا خوش رکھے رب...... میں کچھ نئیں بولدی...... میری جند جان میرے بچے...... بوت دیوے رب...... خوش رکھے رب......“ یہ کہہ کر وہ محبت پاش نگاہوں سے اپنے بیٹے، بہو اور پوتے، پوتیوں کو دیکھنے لگی۔ میری آنکھ سے ایک آنسو نکل کر پلکوں پر ٹھہر گیا۔ ہم نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور بوجھل قدموں سے جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔



ناولٹ

چھٹا حصہ

محبت لفظ ہے لیکن ......

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کے بولا کرو کیونکہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی برا یا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

خوب صورت جذبوں کی باریکیاں بیان کرتی حیا بخاری کی ایک دل نشیں تحریر

میم تبسم کو مطمئن کرتا وہ مسکراتا ہوا اب اس کمرے میں کھڑا تھا۔ جس کے واش روم میں بند لالہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ ضیا نے کچھ دیر سوچا...... پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا...... دروازہ کھلتا دیکھ کر لالہ تیزی سے باہر آئی تھی۔ اور باہر ضیا کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں تیرنے والا اطمینان ضیا کو ایک لمحے کے لیے حیران کر گیا۔ اس کی توقع کے مطابق لالہ کا ری ایکشن نہایت سخت آنے والا تھا۔ اگلے ہی پل اسے

مزید جھٹکا لگا تھا۔ جب اس نے لالہ کو دونوں ہاتھوں میں منہ چھپاتے پھوٹ، پھوٹ کر روتے دیکھا۔

”لالہ......“ وہ بس اس کا نام لے کر رہ گیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ لالہ نے چند لمحوں میں ہی خود کو کمپوز کرتے ہوئے چہرہ صاف کیا۔

”مجھے لگا میں یہاں اکیلی رہ گئی ہوں۔ تم سب چلے گئے ہو......“ اس کی بات پر سینے پر ہاتھ باندھے وہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

”سب چلے ہی گئے ہیں۔“ نہ جانے کیوں ضیا علی خان کو لالہ کا سکون غارت کر کے ہی سکون ملتا تھا۔

”مطلب......؟“ وہ پہلی بار چونکی۔

”مطلب صرف تم اور میں بچے ہیں۔ باقی سب لوگ نکل چکے ہیں۔“ اس کی بات پر لالہ کا منہ ذرا سا کھلا تھا۔

”اور شکر کرو کہ میں بھی کسی کام سے تھوڑی دیر لیٹ ہو گیا کیونکہ میرے گارڈز میری گاڑی بھی لا چکے ہیں تو مجھے کوئی ایشو نہیں تھا رکنے کا...... تبھی میم تبسم نے مجھے کال کر کے تمہارا بتایا تو میں تمہیں چیک کرنے آ گیا۔“ اس نے صفائی سے جھوٹ گھڑا۔

”اوہ میرے خدا......“ وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

”اب میرے ساتھ چلنا ہے یا کوئی اور بندوبست کر لوگی؟“ اس نے معصومیت سی چہرے پہ طاری کرتے ہوئے پوچھا۔ لالہ نے لب کچلتے ہوئے ایک بے بس سی نگاہ ضیا پر ڈالی۔ وہ یوں کندھے اچکا گیا جیسے جتلا رہا ہو۔ ”تمہارے پاس اور کوئی آپشن نہیں رہا لالہ ارتضیٰ زیدی......“

”اوکے......“ کافی دیر تک اسے یونہی خاموش دیکھ کر ضیا نے ہاتھ جھاڑے۔ ”میں نکلتا ہوں، ویسے بھی مجھے شہر سے آگے پھر گاؤں بھی جانا ہے ضروری کام سے۔“ اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر اسے جیسے الوداع کہا تھا۔ اور مڑ گیا تھا۔

”رکو......“ لالہ کی تیز آواز نے اس کے قدم روک دیے تھے، وہ مڑا نہیں تھا لیکن لبوں پر حسین مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

”مجبوری ہے...... میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“ وہ کمزور آواز میں بولی تھی۔ ضیا سر ہلاتا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ لالہ نے کچھ دیر سوچا۔ پھر مرے، مرے قدموں سے اس نے بھی ضیا کی تقلید کی تھی۔

اسے خود پر...... نمرہ پہ اور باقی سب پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ لیکن فی الحال وہ یہ موقع بھی نہیں گنوانا چاہتی تھی جو اس اجنبی شہر میں قدرت نے اسے دیا تھا...... کم از کم اسے تو یہی لگا تھا۔

☆☆☆

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ لیکن نیند ان کی آنکھوں سے غائب تھی۔ شوق سا جاگ رہا تھا ان کی گہری آنکھوں میں...... آرام دہ کرسی پر جھولتے وہ مسلسل دروازے کی سمت دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کا شوق پتا دے رہا تھا...... وہ کسی کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ تبھی زنجیری چھنکی تھی۔ جھولتی کرسی ایک دم روک دی تھی انہوں نے۔ چھن، چھن کی دھیمی آواز آہستہ، آہستہ قریب آ رہی تھی۔ گھنی مونچھوں تلے ہونٹ مسکرا اٹھے تھے۔ پھر آواز ان کے کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ پھر کسی نے آہستگی سے ان کے بیڈروم کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

”چھوڑ دو......“ انہوں نے بارعب آواز میں حکم دیا تھا۔ ان کی آواز پر دروازہ فوراً ذرا سا وا ہوا تھا اور تھکے، تھکے وجود کو گھسیٹتے وہ دو ہٹے کٹے مرد اندر آئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے انہیں جانے کا کہا تھا۔ وہ سر جھکاتے واپس ہو لیے...... انہوں نے آگے بڑھ کر دروازہ لاک کر دیا تھا۔ پھر دھیرے، دھیرے چلتے اس کمزور وجود کے قریب آ ٹھہرے تھے۔ جس کے لمبے بالوں نے اس کے چہرے تک کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ کمزور سا وجود یوں ہانپ رہا تھا جیسے پیدل کوئی لمبی مسافت کر کے آیا ہو یا پھر کافی مدت بعد چلا ہو۔

”کیسی ہو......؟“ انہوں نے اسے کندھوں سے

تھام کر زم لہجے میں پوچھا۔

”ہونہہ......“ کمزور وجود نے سختی سے آواز نکالتے ہوئے اُن کے ہاتھ جھٹک دیے تھے۔ وہ بہ مشکل خود کو سنبھال پائے تھے۔

بلند آواز میں فحش سی گالی دیتے ہوئے انہوں نے اسے بالوں سے دبوچا...... اس کے منہ سے اُف تک نہیں نکلی...... زرد لیکن خوب صورت چہرہ بالوں کے پردے سے آزاد ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے تھے۔ جب اس نے دوبارہ خود کو اُن کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی تھی۔

”اف...ف!“ انہوں نے گرفت مزید سخت کرتے ہوئے کہا۔

خوب صورت نیلی آنکھیں غصے سے انہیں دیکھنے لگیں۔

”رسی جل گئی...... پر بل نہیں گیا......“ انہوں نے اسے بالوں سے کھینچتے ہوئے اپنے قریب کر لیا تھا۔

”یہی تو بات ہے سہراب خان...... رسی ابھی جلی نہیں......“ ان کے سینے سے لگی بالکل بے بس سی وہ عورت بے حد مضبوط لہجے میں بولی تھی۔ اس کی آواز کے ساتھ، ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی بے خوفی تھی۔

”تم نے تو بس کھیل شروع کیا ہے۔ مگر بھول گئے ہو کچھ کھیل بہت لمبے چلتے ہیں۔ خاص کر زندگی کے کھیل...... سازشوں کے کھیل......“ وہ منہ اُن کے مزید قریب کر کے پھنکاری تھی۔

”بس......“ کمزور سی کمر کے گرد مضبوط بازو حائل کرتے ہوئے انہوں نے اس کمزور سے وجود کو خود میں سمو لیا تھا۔

”بس یہی ادا ہے تمہاری......“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مخمور لہجے میں بولے۔

”جس سہراب علی خان کے سامنے شیطان بھی خوف سے تھر تھر کانپتا ہے تو اسے بولتی ہے، شیرنی ہے قسم سے۔“ وہ مسلسل ان کے شکنجے کو توڑنے کی کوشش میں لگی تھی۔

”اسی وجہ سے...... صرف اسی وجہ سے تجھے چھوڑ کر بھی تجھے بھول نہیں پایا میں......“ وہ اس کی ہر کوشش ناکام کرتے ہوئے بولے تھے۔

”چل...... اب مجھے پریشان نہ کر...... ویسے بھی اتنے سال اس کال کوٹھڑی کے بعد اپنے پرانے بیڈروم میں آ کر کچھ تو تمہیں بھی یاد آیا ہوگا۔“ اس کے پیروں سے بندھی زنجیر شور کرنے لگی تھی۔

”بیوی نہ سہی...... باندی ہی سہی...... پر میرے کمرے پر تمہارا حق ہمیشہ رہنے والا ہے۔“ انہوں نے بھوکی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بیڈ پر اچھال دیا تھا۔

”میں تھوکتی ہوں سہراب خان...... تجھ پر...... تجھ سے جڑی ہر شے پر...... تھو......“ اس نے نڈر لہجے میں کہتے ہوئے اُن کے چہرے پر تھوکا تھا۔ سہراب علی خان نے آستین سے چہرہ صاف کرتے ہوئے غضب ناک نظروں سے اسے گھورا تھا۔ اور پھر ایسے اس کمزور وجود پر پل پڑے تھے جیسے شیر اپنے شکار پر...... نہ جانے کتنے سالوں بعد حویلی ایک مرتبہ پھر اس کی درد ناک چیخوں اور زنجیر کے شور سے گونج اٹھی تھی۔

☆☆☆

ریسٹورنٹ کی کھلی چھت پر کونے کی ٹیبل پر بیٹھا وہ کپل بے حد حسین تھا تبھی آتے جاتے لوگوں کی توجہ کھینچ رہا تھا، اوپر سے خاموشی سے اسے تکتی امن......

”مجھے گھورنا بند کرو پلیز......“ دونوں ہاتھوں کی پوائنٹر فنگر ملا کے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے اس نے جیسے درخواست کی تھی۔

”کم آن یاری...... تم شرما رہے ہو۔“ امن کھلکھلا دی۔ اسے خود اتنا اچھا لگ رہا تھا باریال کو ایسے تکتے رہنا اور اس کی حیا سے بوجھل ہوتی آنکھیں اور جھینپتا انداز......

”غیرت دار پٹھان ہوں یار......“ اس کی بات پر وہ بھی دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ پہ بھی اس کی آنکھوں میں ہمیشہ چھلک دیتی نمی بھی چمک اٹھی تھی۔ سحر سا طاری ہوا تھا۔ امن اسے دیکھتی چلی گئی۔

”کچھ تو شرم کرو یار......“ اب کی بار باریال نے

ٹیبل بجاتے ہوئے رخ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ اور اس کی اس ادا پر امن ہنستی چلی گئی تھی۔

”میرے خیال میں مجھے چلنا چاہیے۔“ وہ خفا، خفا سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”باریال...... باریال......“ امن بھی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا سوری...... سوری......“

”پکا......؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہنڈرڈ پرسنٹ......“ وہ واقعی شرمندہ تھی۔

باریال دوبارہ بیٹھ گیا۔

”توبہ ہے باری......! تم تو ناراض بھی لڑکیوں کی طرح ہوتے ہو۔“ وہ پھر ہنس رہی تھی۔

”میں واقعی چلا جاؤں گا امن......“ اسے یونہی غیر سنجیدہ دیکھ کر اس نے دھمکی دی جو فوراً اثر کر گئی۔

امن خاموشی سے ٹیبل بجانے لگی۔

”اب کیا ہم وہ بات کرلیں جس کے لیے محترمہ نے مجھے یہاں بلایا ہے۔“ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد باریال نے کہا تو امن کے یاقوتی لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔

”آج کا دن کتنا خوب صورت ہے ناں......“ وہ دونوں ہاتھوں پر ٹھوڑی جماتے بولی۔ موسم واقعی...... بے حد خوب صورت تھا۔ ایک دم سے گھر کر آنے والے کالے بادلوں نے دن کو شام سی خوب صورتی عطا کی تھی۔ اوپر سے کن من برستی رم جھم...... سب کچھ جیسے نکھر سا گیا تھا۔

”دن تو سبھی خوب صورت ہوتے ہیں۔“ باریال نے اس کی بات کا جواب دیا تو اس کا منہ بن گیا۔

”توبہ باریال، تم کتنے بور ہو۔“ وہ چڑ گئی تھی۔

”سچی......“ باریال خوش ہوا...... ”تو میں چلوں؟“ فوراً اجازت چاہی۔

”باری......“ اب کی بار وہ واقعی ناراض ہونے لگی تھی۔

”امن پلیز...... جلدی بتاؤ جو کہنا ہے...... ڈیڈ میرا انتظار کررہی ہوں گی۔“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے اس کی ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا...... امن کچھ دیر اسے یونہی ناراض نظروں سے گھورتی رہی۔

”واٹ......؟“ باریال نے سوالیہ انداز میں کندھے اچکائے۔

امن نے کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر خود کو جیسے کمپوز کیا۔ اور پرس سے ایک مخملیں سرخ کیس نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ باریال نے پہلے کیس اور پھر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”کھولو تو......“ امن مسکرائی۔ باریال نے سر ہلاتے ہوئے بایاں ہاتھ آگے بڑھا کر کیس اوپن کردیا۔ ہیرے کی خوب صورت انگوٹھی جھلملائی تھی۔

”یہ......؟“ وہ حیران سا امن کو دیکھنے لگا تھا۔

”مجھ سے شادی کرو گے باریال......“ ہیرے کی انگوٹھی کی ساری جھلملاہٹ اس وقت جیسے امن کی آنکھوں میں جا سمائی تھی۔

باریال بت بنا اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

گیٹ اس قدر زوردار آواز سے کھلا تھا کہ اقرا اور حمزہ دونوں دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ زرینہ بیگم تھیں۔ چہرے پہ شدید غصہ رقم تھا۔ اقرا اور حمزہ دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا جیسے ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کے غصے کی وجہ پوچھ رہے ہوں۔

”ہائے اقرا پانی پلا ٹھنڈا......“ ماتھے پر ہاتھ مارتی وہ صحن پر رکھے تخت پہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔ اقرا فوراً کچن کی طرف بھاگی۔ حمزہ، ماں کے قریب چلا آیا۔

”کیا ہوا امی؟ آپ تو مارکیٹ گئی تھیں ناں......؟“ حمزہ نے پریشانی سے پوچھا۔

”مارکیٹ ہی کے لیے نکلی تھی۔ لیکن پھر اماں کی طرف چلی گئی۔“ نظریں چراتے ہوئے انہوں نے

جیسے اپنا جھوٹ بھی چھپایا تھا۔ لیکن حمزہ فوراً بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ انہیں مارکیٹ کا کہہ کر وہ نانو کی طرف ہی گئی تھیں تاکہ حمزہ وہاں نہ جاسکے...... وہاں جا کر انہیں لالہ کے ٹور پہ جانے کا پتا چلا ہوگا اور یہ سارا نزلہ اب اس پر گرنے والا تھا۔ وہ بددل ہو کر اٹھنے لگا تھا۔

”اور سنو......“ اسے اٹھتا دیکھ کر انہوں نے فوراً تیزی دکھائی۔

”وہ اپنی لالہ...... جس کی بڑی تعریفیں کرتے ہو ناں تم...... اسلام آباد پہنچی ہوئی ہے۔ وہ بھی اکیلی اتنے مردوں کے ساتھ۔“ دونوں ہاتھوں سے بین کرتی وہ جیسے اسے بریکنگ نیوز دے رہی تھیں، حمزہ لب کاٹنے لگا جبکہ پانی کا گلاس لاتی اقرا کا بھی دل سخت برا ہوا۔

”ہائے، ہائے میرے بھائی کی روح کو مر کر بھی چین نہ لینے دیں گے یہ لوگ۔“ وہ اونچی آواز میں بین کرنے لگیں۔ حمزہ گیٹ کی طرف بڑھا۔

”لکھوا لو...... یہ بی بی میرے بھائی کی عزت کو داغدار کرکے ہی رہے گی۔“ آواز حمزہ کو باہر جاتا دیکھ کر مزید بلند ہوئی۔ حمزہ تیزی سے گیٹ کراس کرتا باہر نکل گیا تھا۔

”مجال ہے جو اُن کے خلاف کچھ سن لے۔“ فوراً آواز معمول پر آئی تھی۔

”اور تو، تو اِدھر مر......“ اقرا کو گھوری دکھائی۔ وہ فوراً قریب آئی۔

”اب صرف پانی پہ ہی ٹرخائے گی، جا چائے بنا میرے لیے۔“ گلاس لیتے ہوئے ایک دھپ بھی کمر پہ رسید کی گئی، وہ بیچاری کمر سہلاتی اندر چلی گئی۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا اس لالہ بی بی کا جادو حمزہ کے سر سے اتارنے کے لیے۔“ ان کی سوئی اب بھی لالہ پہ ہی اٹکی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ضیا گاڑی کافی تیز چلا رہا تھا۔ لیکن لالہ بھی خاموشی سے بیٹھی رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا ضیا جان بوجھ کر صرف اسے تنگ کرنے کے لیے گاڑی تیز چلا رہا تھا۔ ایک تو بیٹھی فرنٹ سیٹ پر تھی۔ سامنے سے آتی ہر چیز اسے خود سے ٹکراتی محسوس ہوتی۔ دل دھڑک، دھڑک جاتا۔ لیکن پھر بھی خاموش بیٹھی رہی۔ وہ کسی طور خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ضیا کے تینوں کن مین پچھلی سیٹ پر براجمان تھے، وہ گاہے بہ گاہے ان پر بھی ڈری، ڈری نظر ڈال لیتی۔ لیکن وہ سب مکمل طور پر باہر متوجہ تھے۔ لالہ نے ایک مرتبہ بھی ان کو اپنی طرف متوجہ نہیں پایا تھا۔ ضیا بھی... فی الحال تک تو خاموش ہی رہا تھا۔ یہ چیز بھی اسے مطمئن کررہی تھی۔ صرف چند منٹس کی ڈرائیو کے بعد ہی وہ اسلام آباد سے نکل آئے تھے اور موسم بھی نہایت سہانا ہونے لگا تھا۔ ایک دم سے گھر کر آنے والے بادل اور ننھی منی کن من...... ضیا نے ہاتھ آگے بڑھ کر پلیئر آن کیا تھا۔

آج کی بات پھر نہیں ہو گی
یہ ملاقات پھر نہیں ہو گی
ایسے بادل تو پھر بھی آئیں گے
ایسی برسات پھر نہیں ہو گی

نصرت فتح علی خان کی آواز نے ماحول میں ایک دم سحر سا طاری کیا تھا۔ لالہ نہ جانے کیوں مزید سمٹ گئی تھی۔ اور ضیا وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا...... وہ کس لیے زیادہ خوشی محسوس کررہا تھا۔

لالہ کے ساتھ ہونے کے لیے.... یا پاپا جی کی منزل کے بے حد قریب ہونے کے لیے......

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا ایک موسم اور دوسرا مدھم موسیقی اور بادشاہِ سُر کی آواز...... وہ جیسے کسی سحر کے حصار میں محصور ہوا جا رہا تھا۔

رات ان کو بھی یوں ہوا محسوس
اب یہ رات پھر نہیں ہوگی

لالہ نے چادر اپنے گرد مزید لپیٹی تھی۔

ہے کہاں کا ارادہ تمہارا صنم
کس کے دل کو اداؤں سے بہلاؤ گے

میوزک تیز ہوا تھا۔ لالہ نے اچانک ہی ضیا کی

طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔
"تم اسے بند کر کے نہیں چلا سکتے کیا گاڑی......"
وہ غصے سے بولی۔
"چلا سکتا ہوں لیکن اس طرح تھکوں گا نہیں ناں......" وہ مسکرایا۔
"تم نے سنا نہیں......میوزک روح کو تازہ دم کر دیتا ہے۔" ساتھ ہی لالہ کی معلومات میں بھی اضافہ کیا گیا۔
"ابھی تو یہ مجھے تھکا رہا ہے......سر میں درد ہونے لگا ہے۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔
"اوہ ......تو یوں بتاؤ ناں......" وہ پریشان ہوگیا۔ فوراً میوزک آف کر دیا۔
"یہاں کچھ دور ایک کیفے ہے۔ کہو تو کافی پینے رک جاتے ہیں۔" اس کی آفر پہ لالہ سوچ میں پڑ گئی۔
"بالکل فریش ہو جاؤ گی۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ کم کرتے ہوئے بولا تھا۔
"لیکن......" وہ بیک ویو مرر میں اس کے گن مین کو دیکھتے ہوئے کچھ کہتے ہوئے ٹھٹکی۔ ضیا نے اس کی حرکت نوٹ کر لی تھی۔
"تم لوگ گاڑی کے پاس ہی رہنا......ہم بس کافی پی کر آتے ہیں۔" وہ ایک خوب صورت ہوٹل کا اوپن یارڈ کیفے تھا۔ جس طرف اس نے گاڑی موڑتے ہوئے اپنے آدمیوں کو ہدایت دی تھی۔
"یا پھر پچھلی طرف ہوٹل سائڈ پر جا کر تم لوگ بھی کچھ کھا پی لینا۔ میں پے کر دوں گا......" دوسرے ہی لمحے اس کی دوستانہ نیچر اُمڈ کر آئی تھی۔
"جی خان......!" ایک آدمی نے مؤدب لہجے میں جواب دیا تھا۔ اور گاڑی سے نکلتے وقت لالہ بالکل بھی نہیں دیکھ پائی تھی کہ ضیا نے اپنا فون اس آدمی کو پکڑا دیا تھا۔

☆☆☆

ان دونوں کے بیچ کتنے ہی لمحے خاموشی سے سرک گئے۔ امن، باریال کو دیکھ رہی تھی اور باریال...... ٹیبل پر پڑی اس قیمتی انگوٹھی کو......بارش کی ننھی ننھی رم جھم ان دونوں کو بھگونے لگی تھی۔ لوگ تیزی سے نیچے جانے لگے تھے لیکن وہ دونوں جیسے سے کی چھڑی سے بت بنے رہ گئے تھے۔
باریال حیرت اور بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن تھا......تو امن جیسے حیاتِ گل کی تمام تر خوشیوں سے دامن سمیٹنے کے لیے بے قرار......
وقت نے رفتار کی لگامیں ایک دم سے کھینچی تھیں۔
کائنات کی ہر چیز جیسے ان دونوں کے مقدر کے فیصلے کی منتظر تھی۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کو کیا ملنے والا تھا؟
وصال، قبولیت، محبت......یا پھر ہجر کی کالی سیاہی......دکھ اور فاصلے......اور وقت کی آنکھ نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ امن کی آنکھوں میں صرف خوشی تھی۔ انتظار تھا......وصل کا......قبولیت کا......محبت کا......
لیکن ہجر، دکھ اور فاصلوں کا خوف نہیں تھا اور اسے لگا یہی غلط تھا......اس قدر اعتماد ہی تو اچھا نہیں ہوتا...... قسمت یہیں پہ ہی تو دھوکا دے جاتی ہے۔ اور سوچ کے بالکل الٹ ہو جاتا ہے۔
"باریال......!" امن کی آواز پہ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"میں نے اتنا مشکل سوال تو نہیں پوچھا۔" وہ مسکراتے ہوئے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
"یہ کافی اچانک نہیں امن......" وہ سر کے پیچھے ہاتھ باندھتا کرسی کی پشت سے ٹیک لگا گیا۔ جیسے خود کو ریلیکس کر رہا ہو۔
"سو واٹ......؟" وہ آگے کو جھکی۔
"کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ امن سکندر تمہیں خود پرپوز کر رہی ہے۔" اس کی آواز میں غرور سا سما گیا۔ باریال نے گہری نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ پھر بایاں ہاتھ آگے بڑھا کر وہ ننھا سا کیس بند کیا اور آہستگی سے واپس اس کی طرف کھسکا دیا۔
"میں ابھی اس سب کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مجھے سوچنے کا وقت دو......" اس نے سادہ لہجے میں کہا تھا۔ لیکن

امن کے چہرے پر پھیلتی ناگواری بے حد واضح تھی۔
"واٹ ڈو یو مین باریال ولی خان......؟" غصے سے اس کی سفید بے داغ اسکن پر سبز رگوں کا جال سا تن گیا تھا۔
"امن سکندر، اس ملک کے بزنس ٹائیکون سکندر خان کی بیٹی کا پرپوزل قبول کرنے کے لیے تمہیں سوچنا پڑے گا۔" وہ غصے میں آپے سے باہر ہوگئی تھی۔
ٹیبل پر دھرے خوب صورت قیمتی برتنوں کو زوردار ہاتھ مار کے نیچے گرا دیا تھا۔ باریال بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی خوب صورت چمکیلی آنکھوں میں اب تاسف کا رنگ نمایاں تھا۔ دو تین بیرے دوڑتے ہوئے وہاں آئے تھے۔
"تم واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو امن......" وہ دھیرے، دھیرے چلتے اس کے قریب آ ٹھہرا۔
امن کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر امید سی لہرائی۔
"مجھے سوچنے کی بھی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔"
وہ ایک مرتبہ پھر اسے پاتال کی گہرائیوں میں دھکا دے رہا تھا۔
"سوری......میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔"
اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور امن......دکھ سے اسے دیکھتی اچانک ہی جھول کر زمین پر آ رہی......اسے سنبھالنے کے لیے سب سے پہلے آگے بڑھنے والا مرد بھی باریال ولی خان ہی تھا۔

☆☆☆

کافی ختم ہونے تک ضیا بالکل خاموش رہا تھا۔ لالہ نے دیکھا تھا وہ اس کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں رہا تھا۔ اردگرد کے نظاروں میں ہی کھویا رہا۔ اس کے دل میں ضیا کے لیے شدید چڑ آہستہ آہستہ پسندیدگی میں بدلنے لگی۔ وہ آج تو یہ ماننے پر مجبور ہوگئی تھی کہ نمرہ بالکل ٹھیک کہتی تھی۔ ضیا اس قدر برا آدمی نہیں جتنا وہ اسے سمجھتی تھی۔ باقی رہی اس کے پیچھے آنے والی بات تو ایسے امیر لڑکے اکثر غریب لڑکیوں کی محبت میں ایسی بے وقوفانہ حرکات کرتے ہی ہیں۔ یہ

لالہ ارتضٰی کا ماننا تھا۔

”تو کیا ضیا مجھ سے محبت کرتا ہے؟“ اپنی ہی سوچوں پر وہ بری طرح چونکی تھی۔ دل اچانک ہی بے قابو سا ہوا تھا۔ اس نے ایک گہری نظر ضیا پر ڈالی...... وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ بلیک شلوار قمیص میں ملبوس اس کی شخصیت بے حد اجلی تھی۔ ہلکے بھورے روئیں پہ بندھا وہ گندھا ہوا ڈارک براؤن دھاگا...... لالہ نے اعتراف کیا تھا وہ اسے بے حد سوٹ کرتا تھا...... اچانک ہی ضیا نے اس کی طرف دیکھا تھا اور لالہ کو لگا اس سے پہلے اس قدر خوب صورت آنکھیں اس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ کچھ سرمئی سی...... یا بادامی سی یا جھلملاتی سنہری...... وہ اس کی آنکھوں کا رنگ نہ جانچ سکی تھی۔

”تم مجھے گاڑی میں بھی یونہی دیکھ سکتی ہو...... میں مائنڈ نہیں کروں گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے وہی دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولا تو وہ بے اختیار جھینپ گئی۔

”نہیں، میں تو......“ وہ بول نہ سکی۔

”مذاق کر رہا تھا۔“ اس نے فوراً وضاحت دی۔

”چلیں......؟“ اور پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ نظریں جھکائے اپنا پرس اٹھاتی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ ضیا اندر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے اندر آتے ہی اس کے خاص آدمی نے اس کا موبائل اسے تھما دیا تھا۔

”خان...... بل ادا کر دیا ہے میں نے۔“ اس نے مؤدب لہجے میں کہا۔

”تم لوگ چلو...... میں آیا......“ اس نے حکم دیا اور اُن کے جاتے ہی تیزی سے موبائل پہ ہاتھ چلانے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ گھر پہنچی تو کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ امی اسے فریش ہو کر آنے کا کہہ کر گئیں تو وہ جلدی سے واٹس ایپ آن کر کے بیٹھ گئی۔ گھر پہنچنے کا اسٹیٹس لگانا تو بھول ہی گئی تھی۔ اسٹیٹس لگا کر اس نے یونہی سرسری نگاہ نیچے فرلیش لگے دوستوں کے status پر ڈالی تھی۔ سب سے نئی اپ ڈیٹ ضیا علی خان کی طرف سے تھی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے اس پر کلک کر دیا تھا۔ اور اگلے ہی پل سے...... وہ اچھل ہی پڑی۔

یہ ایک اوپن کیفے کا منظر تھا۔ ضیا علی خان اور لالہ ایک ساتھ...... اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ تصویر کے بعد تصویر بدل رہی تھی۔

”میرے ساتھ ایک کپ کافی پینا پسند کرو گی؟“ ضیا کا مسکراتا بے حد صاف لہجہ......

”اگر تم نے پھر کبھی ضیا علی خان کے ساتھ میرا نام لینے کی بھی کوشش کی تو ہماری دوستی ختم......“

”اتنے سادہ نظر آنے والے لوگ اتنے مکار کیسے ہو سکتے ہیں؟“ وہ خود سے سوال کرتی لب کچلنے لگی تھی۔

اُدھر ضیا علی خان نے seen میں نمرہ کا نام نظر آتے ہی مسکراتے ہوئے سیل آف کیا تھا۔ اور بلیک گلاسز لگائے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

اسے ہوش آ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی بے ہوشی کی وجہ ایک دم سے اسٹریس اسٹروک بتائی تھی۔ کسی بات پر وہ شاکڈ ہوئی تھی۔ اور وہ بھی اس قدر زیادہ کہ اس کا دل اور دماغ برداشت نہیں کر پائے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ اسٹروک جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ دیوار سے پشت لگائے، ٹانگوں کی قینچی بنائے، سینے پر بازو باندھے وہ بے بسی سے بستر پر پڑے اس وجود کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی کھلی رنگت میں صرف چند گھنٹوں میں زردیاں سی گھلنے لگی تھیں۔

وہ مسلسل اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ...... وہ اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے وہ بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کہنے کے لیے مناسب الفاظ تراشتا سکندر صاحب گھبرائے ہوئے اندر آئے تھے۔ وہ احتراماً سیدھا کھڑا ہوا تھا لیکن انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ سیدھا بیڈ پر نڈھال سی لیٹی امن کی طرف بڑھے۔ ان کو

دیکھتے ہی امن نے اٹھتے ہوئے ان کی کمر کے گرد بازو حائل کیے اور سسک پڑی۔

”امن...... میرے بچے......“ وہ جو پہلے ہی پریشان تھے اسے اس طرح بی ہیو کرتے دیکھ کر مزید پریشان ہو گئے۔

”امن...... واٹ ہیپنڈ مائی چائلڈ......“ انہوں نے محبت سے اس کے بالوں پہ اپنے لب رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”سر......“ باریال نے انہیں متوجہ کرنے کے لیے پکارا۔ ان کے ساتھ، ساتھ امن نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”پاپا...... اسے کہیں جائے یہاں سے۔“ وہ دوبارہ ان کے پہلو میں سر چھپا کے سسک اٹھی۔

”لیکن بات کیا ہے میری جان......؟“ وہ نا سمجھی سے کبھی باریال تو کبھی روتی بلکتی امن کو دیکھتے۔

”سر......“ باریال کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ امن نے چلا کر اسے روک دیا تھا۔

”چلے جاؤ یہاں سے باریال......“

”امن پلیز......!“ وہ امن کے قریب آیا۔

”گیٹ لاسٹ باریال...... لیو...... لیو ناؤ......“ وہ چلائی تھی۔ سکندر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں باریال کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک بے بس سی نظر امن پر ڈالی۔ اور پھر تیز قدموں سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

لالہ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی ضیا خود اسے چھوڑنے اس کے گھر تک آیا تھا...... گھر سے ایک دو گلیاں دور ہی وہ ایک دم رک گئی۔

”یہاں سے میں خود چلی جاؤں گی، تم جاؤ......“ اس کے ہاتھ سے اپنا سفری بیگ تقریباً کھینچتے ہوئے اس نے کہا۔

”کیوں......؟ کیا پرابلم ہے؟“ ضیا کو برا لگا۔

”گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔ ورنہ یہ آوارہ لڑکے تو کام کر کے ہی دیں گے۔“ اس نے نکڑ پہ لگے بجلی کے کھمبے کے سائے میں کھڑے چند اوباش نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو انہی کی طرف متوجہ تھے۔ نظریں لالہ پر ہی جمی تھیں۔

”تم نہیں سمجھو گے ضیا...... بس پلیز تم جاؤ...... میں چلی جاؤں گی۔“ وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ ماں کے حوالے سے وہ ویسے بھی حساس تھی۔ اوپر سے اس کی گلی کی کسی بھی خاتون نے اس طرح اسے ضیا علی خان کے ساتھ دیکھ لیا تو وہ جانتی تھی کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ تماشا بنتے ذرا دیر نہیں لگنی تھی۔ اور وہ بس اسی تماشے سے ڈر رہی تھی۔

”اچھا تم جاؤ، میں یہیں کھڑا ہوں۔“ اس نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

”نہیں بالکل نہیں...... تم جاؤ ضیا......“ وہ بضد تھی۔ ضیا نے ایک خفا، خفا سی نگاہ اس پر ڈالی اور مڑنے ہی لگا تھا کہ ایک بائیک زوردار آواز سے ان کے قریب آ رکی تھی۔

لالہ کی سانسیں رک سی گئی تھیں۔ وہ شاویز تھا جو یقیناً اسے اور ضیا کو دیکھتے ہی رک گیا تھا۔

”آ جاؤ لالہ......“ کوئی اور بات کیے بغیر شاویز نے لالہ کو کہتے ہوئے اس کا سفری بیگ اٹھا کر اپنے سامنے رکھا تھا۔ ضیا الجھی ہوئی نگاہوں سے شاویز کو دیکھ رہا تھا۔ لالہ کی آنکھوں میں جھلکتی شناسائی سے وہ اتنا سمجھ ہی گیا تھا کہ لالہ سے اس کا کوئی اہم رشتہ تھا۔ لیکن کیا...... یہ بات اسے الجھا گئی کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق لالہ اپنے ماں، باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔

”گھر پر سب ٹھیک ہیں؟“ لالہ نے بیٹھتے ہوئے شاویز سے پوچھا تھا۔ ضیا علی خان کو وہ مکمل نظر انداز کر چکی تھی۔ وہ لب کاٹنے لگا۔

”ہاں سب ٹھیک ہیں۔“ شاویز نے نارمل لہجے میں جواب دیتے ہوئے بائیک آگے بڑھا دی تھی۔ لالہ نے ایک ترچھی نگاہ دور ہوتے ضیا پر ڈالی تھی۔ وہ مڑ چکا تھا۔

☆☆☆

سارا دن وہ خوشی، خوشی دادو اور امی کو مری اور اپنے وزٹ کے متعلق بتاتی رہی تھی۔ شاویز بھی موجود رہا تھا لیکن لالہ جانتی تھی، امی اور دادو کے سوتے ہی وہ ضرور اس سے باز پرس کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اس کا کھویا، کھویا سوچوں کے جال سے بھرا چہرہ دیکھتے ہوئے بھلے وہ امی اور دادو کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر اسے مطمئن کرنے کے بہانے ڈھونڈنے میں لگی رہی۔

رات کو اس کی توقع کے عین مطابق دادو اور امی کے کمرے میں جاتے ہی وہ اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ وہ جو اتنے دن ضائع ہونے کے خیال سے پڑھنے کی تیاری میں لگی تھی۔ اسے اپنے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر بالکل نہیں چونکی تھی۔ شاویز کچھ قدم کے فاصلے پر ہاتھ سینے پر باندھے اسے چپ چاپ دیکھنے لگا۔ لالہ منتظر تھی۔ وہ سوال پوچھے لیکن وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

”تم جو بھی پوچھنا چاہتے ہو پوچھ سکتے ہو شاویز......؟“ بالآخر اسی نے پہل کی تھی اور بیڈ پر جا بیٹھی۔

”تم حق رکھتے ہو۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ وہ کرسی اٹھاتا اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”میں یہ نہیں پوچھوں گا لالہ...... کہ وہ کون ہے اور تم اس کے ساتھ کیوں آئیں؟“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔

”لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا تم جانتی ہو ہم اتنی چھوٹی سی بات کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔“ لالہ جانتی تھی وہ آگے کیا کہنے والا ہے۔ اس کا منہ بن گیا تھا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو ہمارے محلے کی عورتوں کو...... زرینہ پھپھو (اصل میں جو اس کی خالہ تھیں مگر وہ لالہ کی طرح پھپھو ہی کہتا تھا) تک اس بات کی بھنک بھی پہنچی تو حمزہ اور......“

”شاویز پلیز......“ لالہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ یہ صرف اتفاق ہی تھا کہ مجھے ایک کلاس فیلو کے ساتھ آنا پڑا...... پھر بھی تم جانتے ہو میں اس معاملے میں خود کتنی محتاط ہوں۔“ وہ اٹھ کر سیٹ کی ہوئی کتابوں کو خواہ مخواہ ہی اِدھر اُدھر رکھنے لگی تھی۔ یہ اس کے اندر کا انتشار تھا۔ شاویز کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

”اور پھر مجھ سے زیادہ بہتر کون جانتا ہوگا کہ ایک لڑکی کی عزت کس قدر ہلکی ہوتی ہے، پر سے بھی ہلکی...... ہاتھوں پہ، گلیوں، بازاروں میں، پھونکوں سے اڑائی جاتی ہے۔“ وہ تلخ ہوئی تھی۔

”تم ناراض ہو گئیں...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ شاویز اداسی سے بولا۔ لالہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

”نہیں شاویز...... مجھے اچھا لگا کہ تم میرا خیال رکھتے ہو، میری کیئر کرتے ہو۔“ اس کا لہجہ اس کی سچائی کا عکاس تھا۔ شاویز مطمئن سا ہوا۔

”لیکن......“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ شاویز چونکا۔

”حمزہ اور مجھے ساتھ ملانے کی کوئی ضرورت نہیں...... اس کے اور میرے درمیان زرینہ پھپھو کا حوالہ بہت صاف ہے...... اور بے حد اہم بھی......“ قطعی لہجے میں کہتی وہ اسے بے حد خفا، خفا سی لگی۔ رشتوں سے، اپنوں سے......

”چلو تھک گئی ہو گی تم...... سو جاؤ......“ شاویز نے جاتے ہوئے اس کا سر تھپتھپایا تھا۔

وہ بھی تھکے، تھکے انداز میں مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

وہ کافی دن بعد اس بنگلے پر آیا تھا۔ پھر بھی دروازے پر کھڑے گارڈز نے فوراً اس کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ گاڑی سیدھا گیٹ کے اندر لے گیا تھا۔ اندر پہلے سے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ نہ جانے کیوں اس کے ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہوا تھا۔ اندر سے آتے تیز میوزک اور گھنگروؤں کے شور نے نہ جانے کیوں اس کی بیزاری میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر ہال کی طرف آیا تھا۔

محفل سجی تھی اور اس کی توقع کے عین مطابق ناچنے والی دو تین لڑکیوں میں ایک زمزمہ بھی تھی۔ لیکن اس کی چال ڈھیلی تھی۔ باقی لڑکیوں کی طرح اس میں وہ لچک نظر نہیں آ رہی تھی جو پہلی دفعہ ضیا کی توجہ کا مرکز بنی تھی۔ اور اس کی وجہ بھی صرف ضیا ہی جانتا تھا۔ جب سے وہ زمزمہ کی زندگی میں آیا تھا۔ زمزمہ نے اس دلدل سے نکلنے کی امید باندھ لی تھی اور اسی امید کی وجہ سے اسے یہاں رد و بد بودار کام کرتے ہوئے مزید مشکل ہونے لگی تھی۔ ہال کے دروازے پر کھڑی ہوشیار سی ادھیڑ عمر عورت نے اسے خوش آمدید کہا تھا۔

”خانم کو بلاؤ......“ اس نے اندر جانے کے بجائے اسے حکم دیا۔ اور سگریٹ سلگاتا کھلے چبوترے پر آ گیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق خانم چند لمحوں میں اس کے آگے کھڑی تھی۔

جس علاقے میں وہ رہتی تھی یہاں اس قسم کا دھندا زیادہ تر ہلکا ہی رہتا تھا۔ نشے کے عادی، چور اچکے اور کبھی کبھار دن کے شرفا اس طرف آ ہی نکلتے تو کچھ کمائی ہو جاتی...... ایسے میں ضیا علی خان جیسے کسی لینڈ لارڈ کی اولاد کا آنا ان کی قسمت چمکا دیتا تھا۔ اسی لیے جب بھی وہ وہاں آتا تھا خانم بچھی، بچھی جاتی تھیں۔

”زہے نصیب...... زہے نصیب......“ ضیا ایک غصیلی نگاہ اس کے تہ در تہ میک اپ میں چھپے چہرے کو ڈالتا اس کے نزدیک آیا۔

”میں نے منع کیا تھا...... جب تک میں یہاں آتا ہوں زمزمہ کسی اور کے سامنے نہیں جائے گی۔“ سخت لہجے میں کہتا وہ آخری بات پر چلّایا تھا۔

”حکم خان جی......“ وہ کانپتی ہاتھ باندھ گئی۔

”آپ اتنے دن آئے ہی نہیں۔“ نظریں جھکائے وہ آہستہ لہجے میں بول رہی تھی۔ لیکن ضیا اس کے باوجود اس کے دل میں چھپے لالچ کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

”اور آپ کو تو پتا ہے خان! یہاں دو دن ان دوشیزاؤں کے پانی جیسے شفاف حسن کو رقص اور موسیقی کی غذا نہ ملے تو کمہلا جاتی ہیں...... کالی رزدہ تالاب کی طرح بے ڈھب لگنے لگتی ہیں۔“ دانت نکالتے ہوئے وہ خباثت سے بولی تھی۔ ضیا نے بہ مشکل اس پر ہاتھ اٹھانے سے خود کو روکا تھا...... وہ دو قدم آگے آیا تھا اور خانم خوفزدہ ہو کر پیچھے......

”زمزمہ چاہے گہنا جائے، چاہے سب بھول جائے، آئندہ یہ غلطی مت کرنا خانم......“ اس کی آنکھوں میں عجیب سے شعلے لپک رہے تھے۔ خانم پر لرزہ سا طاری ہونے لگا تھا۔

”جاؤ زمزمہ کو بھیجو یہاں......“ وہ مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تھا۔ خانم سر ہلاتی تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

چند لمحوں بعد ہی زمزمہ اندر آئی...... اور تھکی، تھکی سی صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ضیا کو خوش آمدید نہ کہا تھا۔ بس خاموشی سے پیروں سے بندھے گھنگرو اتارنے لگی تھی۔ وہ دھیرے، دھیرے چلتا اس کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔

”تھک گئی ہو زمزمے......“ اس نے زمزمہ کے پسینے سے تر چہرے کو دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا تھا۔

”نہیں خان...... بس لگتا ہے ٹوٹنے لگی ہوں۔“ اس کی سیاہ کٹورا آنکھوں میں پانی جھلملانے لگا تھا۔ ضیا اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں تمہیں خرید لوں گا زمزمے...... تمہیں ہمیشہ کے لیے اس دلدل سے دور لے جاؤں گا۔“ وہ بولا تو زمزمہ بت بنی رہ گئی۔ تو کیا واقعی اسے زمزمہ کی مدد کے لیے خدا نے بھیجا تھا۔ اس کی دعائیں قبول ہوئی تھیں۔

”میں بابا جی سے بات کرتا ہوں وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔“ وہ فیصلہ کرتے ہوئے باہر کی طرف بڑھا۔ زمزمہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”لیکن خانم......“ وہ پریشان لہجے میں بولی۔

”اس کا مسئلہ صرف پیسہ ہے اور ویسے بھی ضیا علی خان جو سوچ لے کر کے رہتا ہے...... so no worries“ وہ باہر نکل گیا تھا۔ زمزمہ کا دل نہ

ماں

ماں تیری ممتا کو میں
گر حکم ہو سجدہ کروں
کیسے کروں میں حق ادا
دیکھوں تجھے سوچا کروں
میری جفا، میری خطا
تیری دعا، تیری عطا
میں کتنا نافرمان تھا
اور کس قدر نادان تھا
پیاروں سے رشتے توڑ کر
غیروں سے ناتے جوڑ کر
تیری رفاقت چھوڑ دی

گویا کہ جنت چھوڑ دی
ملتا رہا اغیار سے
اور حادثے ہوتے رہے
الجھا رہا منجدھار سے
میں تجھ سے کر کے بے رخی
کرنے لگا تھا سرکشی
تو نے مجھے کیا، کیا دیا
میرے لیے ہر دکھ سہا
قدموں کو چلنے کے لیے
ہر راستہ تو نے دیا
علم و عمل تو نے دیا

جانے کیوں سجدۂ شکر کے لیے مچل رہا تھا۔

☆☆☆

دو دن بعد ہی ابراہیم نے اوزگل اور گل مینہ کو سب بڑے، بڑے کالجز کا وزٹ کروادیا تھا۔ اورگل مینہ نے ایک اچھے کالج کو سلیکٹ کر کے ایڈمیشن بھی کروالیا تھا۔ اوزگل اور گل مینہ تو بے حد خوش تھیں۔ لیکن ابراہیم...... وہ اس ذمّے داری سے اکتانے لگا تھا۔ اوزگل کی تو پھر بھی خیر تھی۔ سارا وقت گاڑی کے باہر ہی جھانکتے، دوڑتے بھاگتے مناظر کو تکتی رہتی لیکن اصل مسئلہ تھا گل مینہ......

وہ سارا وقت بس اسے ہی تکتی رہتی اور بیچارے ابراہیم حیات کے ہاتھ کانپتے رہتے۔ اسے اس خانزادی کی نڈر اور بے باک آنکھوں سے خوف سا آتا تھا، کبھی کبھی اسے لگتا تھا وہ ہر طرح کے اختیار کے باوجود بھی اس سنہری جھیل میں ڈوب مرے گا۔ نہ جانے کیوں! وہ آس پاس ہوتی تو اِک سنہرا پن سا اسے اپنے گرد محسوس ہوتا۔ وہ کسی حصار میں خود کو جکڑتا محسوس کرتا۔ اور فوراً خود کو سنبھال لیتا۔ اسے گل مینہ کی نظروں میں بھی اپنا عکس نظر آیا تھا لیکن وہ اس کی طرح خود سے بھی ہر جذبہ چھپانے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس کے اندر بغاوت سی تھی...... عشق سی بے باکی...... اور یہی چیز اس سے خوفزدہ کیے جاتی۔

اب بھی جب وہ داخلہ کرا کر واپس گھر جارہے تھے تو مینہ نے اچانک ہی آئس کریم کی فرمائش کردی تھی۔ وہ منع کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے جب چلتی گاڑی کا ہی دروازہ کھول دیا تو چار و ناچار اسے رکنا پڑا۔

”کیا کرتی ہو مینے...... ایسے کچھ ہو جاتا تمہیں تو؟“ اوزگل نے دھک، دھک کرتے دل کے ساتھ اسے ڈانٹا۔

”ہاں تو اس ڈرائیور کی غلطی ہے ناں...... یہ کیوں میری ایک بات نہیں سنتا......“ وہ منہ بناتے ہوئے گاڑی سے اتری...... یہ دیکھے بنا کہ ڈرائیور کے لفظ پہ ایک مرتبہ پھر ابراہیم کی آنکھیں سلگ سی اٹھی تھیں۔

مشکل کا حل تو نے دیا
مہمیز جذبوں کو کیا
اڑنا مجھے سکھلا دیا
لیکن یہ میں نے کیا، کیا
تجھ سے ہی منہ کو موڑ کر
ہر آس تیری توڑ کر
پنچھی بنا اور اڑ گیا
زاغ و زغن میں گھر گیا
زخمی ہوا!
بے پر ہوا!
آخر تری آغوش میں
اک روز میں آ کر گرا

میری خطائیں بھول کر
میری جفائیں بھول کر
تو نے مجھے اپنا لیا
آواز آئی روح سے
دل نے بھی آخر یہ کہا
ماں سے بڑی تعظیم کیا
ماں تیری ممتا کو میں
گر حکم ہو سجدہ کروں
کیسے کروں میں حق ادا
دیکھوں تجھے سوچا کروں

شاعرہ: یمنیٰ احمد
انتخاب: حمیرا اقبال، کوٹری

☆☆☆

”ایک مرتبہ بھائی آجائیں...... اس ڈرائیور کی تو نوکری ہی ختم کروانی ہے میں نے۔“ اس نے ابراہیم کو زبان دکھاتے ہوئے کہا اور آئس کریم کارنر کی طرف بڑھ گئی۔ اوزگل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے سر پہ...... گل جی چادر کو سامنے سے کھینچ کر گل مینہ کو گھونگھٹ کروادے...... شہر آتے ہی اس نے چادر سے چہرہ چھپانا بالکل چھوڑ دیا تھا اور بالکل بے پرواہی ہوتی تھی۔

اوزگل کو ابراہیم پر بھی ترس آتا تھا۔ جب سے گاؤں سے آئے تھے۔ وہ ہر جگہ ان کے ساتھ نہ صرف خوار ہوا تھا بلکہ گل مینہ کی ہر الٹی سیدھی حرکت بھی نظر انداز کرتا رہا تھا۔ اس سارے وقت میں وہ تقریباً خاموش ہی رہا تھا۔ سوائے کام کی بات کے جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

”مجھے لگتا ہے آج مجھے باء جی کو فون کر کے تمہاری کچھ تو خبر دے دینی چاہیے۔ ورنہ ساری حدود بھول جاؤ گی تم۔“ گاڑی میں واپس بیٹھتے ہی اوزگل نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

”آپ کو یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں...... میں آج خود ہی باء جی کو بتادوں گی سب...... اگر آج بھی ضیا لالا نہ آئے تو دیکھنا میں کرتی کیا ہوں۔“ الٹا وہ منہ بسورنے لگی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ابراہیم کے لبوں پر بہت پیاری مسکراہٹ رینگ گئی تھی اور بالکل اسی وقت اس نے اپنے سامنے ضیا کی گاڑی کو رکتے دیکھا تھا۔

”لالا......“ ضیا کو گاڑی سے اترتا دیکھ کر گل مینہ چیختے ہوئے گاڑی سے اتری اور بھاگ کر بھائی سے لپٹ گئی تھی۔ ضیا نے دایاں بازو بہن کے کندھوں کے گرد پھیلا دیا تھا۔ ابراہیم بھی فوراً باہر آیا تھا۔ اوزگل نے بھی ان کی پیروی کی تھی۔

”بھائی شکر ہے آپ آگئے......“ ہمیشہ کی طرح گل مینہ فوراً اسٹارٹ ہوئی تھی۔ ابراہیم، ضیا سے ہاتھ ملاتا وہیں ٹھہر گیا۔ اوزگل بس دونوں کو دیکھ کر رہ گئی۔ اسے اب گل مینہ کے خاموش ہونے تک چپ ہی رہنا تھا۔

"ورنہ آپ کے اس ڈرائیور اور اس بڑی بہن......" اوزگل کو دیکھ کر بڑی، بڑی آنکھیں مزید بڑی ہوئیں۔ "ان دونوں نے مجھے تنگ کر دیا تھا۔" بڑے مان سے شکایت کی گئی تھی۔ ابراہیم کا منہ بنا اور ضیا کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"آپ ہنس رہے ہیں؟" مینے کو غصہ آنے لگا۔

"ہاں...... کیونکہ یہ میرا ڈرائیور نہیں، میرا دوست ہے ابراہیم حیات......" اس نے ہنستے ہوئے وضاحت کی تھی۔ مینے نے چونک کر ابراہیم کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جتاتی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ جب سے اسپتال آئے تھے، امن کی حالت نے انہیں پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ نہ وہ انہیں کچھ بتا رہی تھی، نہ ہی وہ خود سمجھ پا رہے تھے۔ باریال بھی شاید امن کے رویے سے کافی ہرٹ ہوا تھا تبھی واپس نہیں آیا تھا۔

"امن...... کیا ہوا ہے بچے......؟" وہ اس کی کمر سہلاتے ہوئے دوبارہ پوچھنے لگے۔ نڈھال سی ان کے سینے میں سر چھپائے وہ مسلسل سسک رہی تھی۔

"کچھ بتاؤ گی...... تبھی تو میں کچھ حل نکال پاؤں گا ناں......" وہ اس کے سر پر ٹھوڑی رکھے اسے سمجھا رہے تھے۔

"پاپا......" اس نے بھیگا، بھیگا چہرہ اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا...... وہ انگلیوں کی پوروں پہ اس کے آنسو چننے لگے۔

"آپ تو کہتے تھے آپ کی امن اس دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے۔" وہ ہچکیوں میں بولی۔

"میں اب بھی یہی کہتا ہوں میری جان...... میری امن اس دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے۔" انہوں نے ہاتھوں کے پیالے میں اس کا خوب صورت چہرہ لیتے ہوئے کہا۔ اپنی امن کو یوں بکھرا، بکھرا دیکھ کر ان کا اپنا دل پھٹا جا رہا تھا۔

"اور آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کی پری کو کوئی نہیں ٹھکرا سکتا۔" وہ سسکی۔

"بالکل...... مجھے اپنا ایک، ایک لفظ یاد ہے میرے بچے......" وہ اس کی صبیح پیشانی چومتے ہوئے بولے۔

"لیکن ہوا کیا ہے امن؟" وہ سخت بے چین ہو رہے تھے۔

"اس نے مجھے ٹھکرا دیا پاپا...... امن سکندر کو اس نے ٹھکرا دیا پاپا......" وہ چلاتے ہوئے بولی اور ایک مرتبہ پھر پھوٹ، پھوٹ کے رو دی...... سکندر صاحب کچھ دیر خاموشی سے اس کی کمر سہلاتے رہے۔

"کون ہے وہ امن......؟" حالانکہ انہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی انہوں نے دھیمے لہجے میں پوچھا تھا۔

"باریال پاپا...... باریال ولی خان......" وہ اس کا نام بتاتے ان کے سینے میں جا سمائی تھی۔ سکندر نے اسے خود میں سمیٹ لیا تھا۔

☆☆☆

تہ خانے میں دن کے وقت بھی قریباً اندھیرے کا راج تھا۔ یہ موٹی، موٹی دیواروں سے بنے کمروں پر مشتمل تھا۔ جن کو سامنے سے جیل کے کمروں کی طرح باریک مگر تنگ سلاخوں کے دروازوں سے بند کیا گیا تھا۔ ہر کمرا مربع کی شکل کا تھا اور بے حد تنگ...... اس قدر کہ ایک آدمی اگر سیدھا لیٹتا تو پاؤں دوسری دیوار سے لگ جاتے۔ ہر کمرے کی ساخت اور اس میں گنجائش تقریباً ایک ہی تھی۔

ہر کمرے کی پچھلی دیوار میں دو تین پتلی لکیروں کے مانند روشن دان تھے جو اس اندھیر نگری میں سورج کی چمکتی شعاعوں کو ملنے والا واحد رشتہ تھا۔ شاہ سوار نے تہ خانے کا دروازہ کھولا اور پھر تین چار ملازموں کو لیے اندر آیا...... دروازہ کھلتے ہی روشنی نے جیسے ہر طرف ڈیرا جما یا تھا۔ آنکھیں موندے لیٹے کچھ ترچھے ٹیڑھے بدن تیزی سے سیدھے ہوئے...... اور کچھ آنکھوں پر ہاتھ رکھے رخ پھیر گئے۔ سب اندر آنے والے باقی آدمی کھانے کی چھوٹی سی ٹرے ایک، ایک کر کے ان کے سامنے رکھتے گئے۔ شاہ سوار سیڑھیوں کے اوپر ہی کھڑا چوکنا سا انہیں دیکھتا رہا۔ کھانا تقسیم ہو گیا تھا۔ اب وہ سب آدمی کل والے برتن اٹھا رہے تھے جو تقریباً خالی تھے۔ یہاں ناشتے کے بعد صرف ایک مرتبہ ہی کھانا دیا جاتا تھا، شام سے کچھ دیر پہلے...... برتن اٹھائے وہ سب ایک، ایک کر کے باہر نکل گئے۔ لیکن آخری آدمی شاہ سوار کے قریب آ کر رک گیا تھا۔

"شاہ سوار خان......! اللہ لوک نے کچھ بھی نہیں کھایا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم جاؤ، میں دیکھتا ہوں۔" اس نے پُرسوچ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے اسے جانے کے لیے کہا۔ دروازہ اندر سے بند کرتا وہ نیچے اتر آیا۔ سیڑھیوں کے بالکل سامنے والا کمرا اللہ لوک کا تھا۔ اس کے لمبے بال کھلے تھے اور چہرہ ان میں ڈھک سا گیا تھا۔ شاہ سوار نے کندھے سے لٹکی مشین گن اتار کر سائڈ پر رکھی اور ٹرے اٹھا کر دروازے کے قریب آ گیا۔

"اللہ لوک......" اس نے دھیرے سے پکارا مگر دوسری طرف خاموش رہی تھی۔

"اللہ لوک... کھانا کھالو......" اس نے دوبارہ پکارا تو اس بار اس نے سر اٹھایا۔ لمبے بال پیچھے ہٹے تھے، سفید نورانی چہرہ اندھیری کال کوٹھری میں جگمگایا تھا۔

"کھانا کیسے کھالوں......؟" ان کی گہری سبز آنکھوں میں آنسو تھے، پپڑی زدہ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"تھا...... وہ چلائی...... "کیسے کھالوں کھانا؟"

"مجھے سب نظر آنے لگا ہے......" وہ چلاتے ہوئے بیٹھے، بیٹھے، گھٹنوں کے بل یوں چل کر اچانک سلاخوں کی طرف بڑھی تھیں جیسے کوئی ننھا بچہ crawl کرتا ہے۔ شاہ سوار خوفزدہ ہو کے بے اختیار چند قدم پیچھے ہٹا۔ سائڈ پہ دیوار کے ساتھ لگی مشین گن نہ جانے کیسے زمین پر گر پڑی تھی۔

اللہ لوک زمین پر بیٹھے، بیٹھے ہی سلاخوں کے قریب آ گئی تھی۔

"پکڑ ہو گئی ہے تم سب کی......" وہ سلاخوں پر ہاتھ رکھے قہقہے لگانے لگی تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے ٹرے اٹھا کر شاہ سوار پہ اچھال دی تھی۔ سارا سالن اس پر گرا اُس کے کپڑے خراب کر گیا تھا۔ اللہ لوک مزید بلند قہقہے لگانے لگی تھی۔

"جا...... جلدی سے کھانا کھالے......" وہ اسے ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہہ رہی تھی۔ لیکن وہ بت بنا وہیں کھڑا رہا...... غصے سے اس کا وجود لرزنے لگا تھا۔

"اپنے خان کو بھی کھلا دے...... جا...... شو...... شو......" وہ ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہی تھی۔ شاہ سوار چند لمحے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر ٹرے کو لات رسید کرتا...... گن اٹھاتا اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ اللہ لوک کی چلاتی آواز نے دروازہ بند ہونے تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا۔ فروری کے اواخر میں ہونے والی بے حد کم بارشوں نے جہاں بہار کو زندگی بخشی تھی۔ ہر جگہ سبزہ لہلہانے لگا تھا، خزاں رسیدہ ٹنڈ منڈ درخت ہرا لباس اوڑھنے لگے تھے۔ وہیں مارچ کے شروع میں ہی سورج کی دھوپ نے وہ تمازت پکڑی تھی کہ اللہ، اللہ...... بہار کا آغاز ہی موسم گرما کا پتا دینے لگا تھا۔

آج حمزہ اسے لینے کالج نہیں آ سکا تھا۔ وہ رکشے پر گھر تک آ گئی تھی لیکن رکشے والا اسے مین روڈ پر ہی اتار کر چلا گیا تھا۔ اس نے کافی منتیں کیں لیکن وہ نالیوں والی گلی میں جانے کے لیے راضی نہ ہوا۔ مرتی کیا نہ کرتی کی تصویر بنی تیز دھوپ میں وہ گھر کی طرف پیدل چل پڑی۔ مارچ کے اوائل کے دن تھے اور دن کے ایک بجے یوں کڑکتی دوپہر کا سا سماں تھا...... ہر طرف سہما دینے والی ویرانی تھی۔ اس کا گھر دو گلیاں

آ گے تھا۔ اور یہ دونوں گلیاں کافی لمبی تھیں۔ اوپر سے جگہ، جگہ ابھری ہوئی سیمنٹ سے بنی نالیاں...... اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

''اقرا......'' تیز آواز پہ جہاں قدم خود بخود رکے تھے۔ دل اتنا ہی تیز، تیز دھڑکنے لگا تھا۔ وہ آغا تھا۔ اس کے تیز قدموں کو قریب آتا سن کر بھی وہ اس کی طرف نہ مڑ سکی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی اقرا.. اتنے دنوں سے تمہارے کالج کے چکر لگا رہا ہوں، بیرونی گلی کے نکڑ میں کھڑا تمہاری راہ دیکھتا رہتا ہوں، ایسی بھی کیا بات ہوگئی کہ تم مجھ سے پردہ کرنے لگی ہو۔'' وہ اس کے قریب آتے ہی آہستہ آواز میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔ اقرا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا پھر اِدھر، اُدھر خالی گلی میں۔

''تم ابھی جاؤ آغا...... کوئی دیکھ لے گا۔'' اس کی آواز میں خوف تھا۔

''پھر کل نہر پر ملوگی؟'' وہ اب بھی سرگوشی میں بات کر رہا تھا، اقرا جانتی تھی کہ وہ اس کی عزت کی پروا کرتا تھا۔ تبھی اس وقت اس طرح آہستہ آواز میں بات کر رہا تھا...... وہ کبھی اس کو یوں گلی میں نہ روکتا...... لیکن پچھلے ایک ماہ سے جس طرح اقرا اس سے چھپ رہی تھی۔ اسے مجبوراً ایسا کرنا پڑا تھا۔

''بولو اقرا...... آؤ گی نہ نہر پر ملنے؟'' وہ بہت بے قراری سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دوبارہ پوچھنے لگا۔

''ہاں، ہاں آؤں گی۔ اب تم جاؤ......'' اقرا خود بھی گھبرا رہی تھی۔ اس وقت ہی حمزہ کے گھر آنے کا وقت ہوتا تھا۔ اور اگر وہ اسے آغا کے ساتھ دیکھ لیتا تو وہ جانتی تھی کہ یہ ان دونوں کے حق میں بالکل بہتر نہ ہوتا۔

''جاؤ آغا......'' وہ تیز، تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ آغا بھی بھاگ کر اس کا ہم قدم ہوا۔

''کل بریک کے وقت میں پچھلے گیٹ پر تمہارا انتظار کروں گا۔''

''کہا ناں آجاؤں گی، جا اب یہاں سے۔'' وہ فرار کتے ہوئے بدتمیزی سے بولی تھی۔ آغا مسکرا دیا۔

''ہاں اب آیا نہ یقین کہ تم ضرور آؤ گی۔'' محبت سے اسے تکتا وہ دائیں طرف والی گلی میں مڑ گیا۔ اقرا نے ایک نظر دوبارہ آگے پیچھے گلی میں ڈالی۔ گلی ویران تھی...... مطمئن سی سانس لیتی وہ سامنے والی گلی میں داخل ہوگئی۔

☆☆☆

امن اسپتال سے گھر آگئی تھی لیکن پچھلے ایک ہفتے سے وہ آفس نہیں آرہی تھی۔ سکندر صاحب بھی اس تمام عرصے میں اس کے ساتھ رہے تھے۔ آفس کی تمام تر ذمے داریاں باریال سنبھال رہا تھا۔ وہ چاہ کر بھی امن کی عیادت کو نہ جا سکا تھا۔ اسپتال میں اس کا رویہ دیکھ کر اس کا خیال تھا کہ امن دوبارہ بھی اس کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہے گی۔

وہ کنفیوژڈ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں دل تھا کہ اس فیصلے پر آمادہ نہیں تھا...... اور وہ اس معاملے میں سراسر دل کی مرضی چاہتا تھا۔ امن ایک اچھی لڑکی تھی۔ ایک اچھی شخصیت...... لیکن اس کے لیے وہ ہمیشہ ایک اچھی اور مخلص دوست رہی تھی۔ اس رشتے سے بڑھ کر باریال نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا اور اب جب سوچنا چاہتا تھا تو دل راضی نہیں تھا۔ اس وجہ سے وہ دوبارہ امن کے سامنے بھی نہیں گیا تھا۔ اس نے پوری ایمانداری کے ساتھ ان دونوں کی غیر موجودگی میں تمام ذمے داریاں بخوبی سرانجام دیں...... اب بھی وہ سائٹ کا راؤنڈ لگا کر آفس پہنچا تھا۔ جب سر سکندر کی سیکرٹری نے انہیں ان کی آمد اور باریال کو اپنے آفس بلانے کی اطلاع دی تھی۔ اس نے کچھ ضروری فائلز اٹھائیں اور سیدھا ان کے کمرے میں چلا آیا۔

''امن کیسی ہے سر......؟'' رسمی سلام دعا کے بعد اس نے فوراً پوچھا...... سر سکندر نے سر اٹھا کر ایک گہری نگاہ اس کے وجود پر ڈالی۔

''بیٹھو باریال......'' انہوں نے اسے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ سر ہلاتا بیٹھ گیا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے امن کو کیسا ہونا چاہیے؟''

دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنا کر ان پر ٹھوڑی رکھ کے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تھا۔ باریال کو اُن کے انداز اور سوال پر حیرت ہوئی تھی۔

''میری اس سے بات نہیں ہوئی سر......'' اس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے جواب دیا تو اس کی شخصیت کا ازلی ٹھہراؤ ہمیشہ کی طرح بے حد واضح تھا۔

''آپ کا فون، گھر کے نمبرز بھی کئی دفعہ ٹرائی کیے لیکن نہیں مل پائے۔ میں یہی سمجھا جی آپ اسے وقت دے رہے ہیں تبھی......'' اس نے بات مکمل کر کے جملہ چھوڑ دیا تھا۔

''کبھی تم اس کی خیریت دریافت کرنے گھر تک نہیں آئے؟'' باریال کو لگا وہ ناراض تھے۔

''اس دن اسپتال میں آپ نے امن کا ری ایکشن دیکھا تھا سر...... بس میں اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ وہ سیدھا سر سکندر کی آنکھوں میں دیکھ کے بات کر رہا تھا۔ اور سر سکندر نے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں صرف اطمینان تھا...... کوئی ملال کوئی افسوس نہیں۔

''تمہیں ذرا بھی احساس نہیں باریال...... یہ جو کچھ بھی ہوا تمہاری وجہ سے ہوا۔'' وہ ذرا سا آگے کو جھکے...... باریال نے ایک گہری سانس لی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ بالآخر آپ کو بھی پتا چل گیا۔

''سر......! میرے خیال میں تو آپ بھی مجھے اس معاملے میں بالکل بھی بلیم نہیں کر سکتے۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

''بے شک آپ امن سے کلیئر کرلیں۔'' اس کی بات پر وہ کچھ پل اسے یونہی خاموشی سے دیکھتے رہے۔

''وہ تم سے بہت محبت کرنے لگی ہے باریال......'' کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے انہوں نے کمزور سے لہجے میں جیسے اپنی بیٹی کی غلطی کا اعتراف کیا تھا۔

''اور تم جانتے ہو میں امن سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔'' وہ اُن کی بات میں جواب میں کچھ نہ کہہ پایا۔ چپ چاپ ان کو دیکھتا رہا۔ جیسے ان کی اگلی بات کا منتظر ہو۔

دلی دعا

☆ دعا ایک امید ہے...... ایک یقین ہے۔
☆ دعا ایک بھروسا ہے...... ایک وسیلہ ہے۔ دعا ایک حوصلہ ہے...... میری دعا ہے ہم سب کا پاکیزہ بے حد ترقی کرے، روشن مستقبل کی طرف گامزن رہے، آمین۔

کامیابی کی دعا پاکیزہ کے لیے

دعا ہے کہ کامیابی کے ہر قدم پر آپ کا نام ہوگا
آپ کے ہر قدم پہ دنیا کا سلام ہوگا
ہمت سے مشکلوں کا سامنا کرنا ہماری دعا ہے
کہ وقت بھی ایک دن آپ کا غلام ہوگا
بہت، بہت سالگرہ مبارک ہو

از طرف: حسینہ ممتاز خان، اسلام آباد

''میں نے اس سے دنیا کی ہر خوشی پائی ہے، امن وہ واحد ہستی ہے جس نے میری کائنات مکمل کردی۔ جس کے بعد مجھے زندگی میں کسی بھی رشتے کے بچھڑنے کا دکھ توڑ نہ پایا۔ اب تم بتاؤ یار...... میں اسے یوں ٹوٹتا، بکھرتا کیسے دیکھ سکتا ہوں۔'' وہ ہمیشہ والے دوستانہ لہجے میں اس سے مخاطب تھے اب۔ باریال کو ان کی حالت پہ افسوس سا ہونے لگا۔

''کیا کچھ فیصلے دوسروں کی خوشی کے لیے نہیں کیے جاسکتے؟'' انہوں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے منت کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے امن سے بھی یہی کہا تھا سر...... کہ مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔ اور اب آپ سے بھی یہی گزارش کروں گا۔'' وہ دونوں ہاتھوں کی پوائنٹر فنگرز ملا کر لبوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ سکندر نے اس کی اس ادا کو بہت جذب سے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ انہیں بے حد معصوم اور کھرا سا شخص لگا۔ انہوں نے

خود کو باور کرایا تھا اس لمحے...... امن کو باریال کی اسی ادا سے محبت ہوئی ہوگی۔

”کئی ایسے وقتی فیصلے جو صرف دوسروں کی خوشی دیکھ کے کیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اس وقت کافی مہنگے پڑھ جاتے ہیں جب قدرت آپ کی اپنی خوشی آپ کے سامنے لا کر رکھ دیتی ہے۔“ اس کی بات میں وزن تھا۔ وہ لاجواب ہوئے تھے۔

”تمہیں حق ہے، جتنا چاہو وقت لو...... لیکن......“ وہ اٹھنے لگا جب انہوں نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تم جانتے ہو جواب کیا ہونا چاہیے ورنہ؟“ وہ اس بار قدرے روکھے، خشک لہجے میں بولے۔ باریال نے حیرت سے ان کے بدلے انداز کو دیکھا۔

”ورنہ......؟“ اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر چکا تھا۔ لیکن سر سکندر نہ سمجھ سکے تھے۔ وہ خفگی کا تھا یا غصے کا۔

”ورنہ...... آفس آنے کی ضرورت نہیں......“ انہوں نے تلخ لہجے میں کہتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا تھا۔ باریال کے چہرے پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ پہلے امن نے اور اب سر سکندر نے اس کے لیے فیصلے کو آسان کر دیا تھا۔ وہ سر ہلاتا آفس سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

جب سے ضیا واپس آیا تھا...... اس نے ابراہیم کو دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ ضیا بالکل باء جی کی طرح ہی ان دونوں کا خیال رکھتا۔ اسے کالج خود ڈراپ کرنے جاتا...... اور واپسی پر اکثر کسی گارڈ کو بھیج دیتا۔ کالج جاتے وقت تو ہمیشہ وہ مایوس ہی ہوتی لیکن کالج سے آنے کے وقت وہ دعا کرتی کہ کسی طرح ضیا لالا، ابراہیم کو بھیج دیں۔ اور ہمیشہ ابراہیم کی جگہ گارڈ کے ساتھ اوزگل یا بی جان کو دیکھ کر اس کا دل سلگ اٹھتا۔ ابراہیم تو جیسے اس کی طرف آنے والا ہر راستہ ہی بھول گیا تھا۔

وہ تو اسے صرف اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسے چھیڑتی رہتی تھی۔ اور اسے لگا تھا وہ چھیڑنے کے بجائے اس سے بری طرح چڑ گیا تھا۔ تبھی اس نے دوبارہ ان کے گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔

وہ ایک صاف، اجلا دن تھا، عجیب سی بوریت چھائی تھی طبیعت پر تبھی اس نے کالج سے بھی چھٹی کر لی تھی، اوزگل کو ناول میں مصروف دیکھ کر وہ نیچے پچھلی طرف بنے سرسبز لان میں آ گئی...... لان بے ترتیب سا تھا۔ بہار کی بارشوں سے ناٹے قد کی ہری پیلی جھاڑیاں سارے لان میں پھیل چکی تھیں۔ جن پر کاسنی، لہو رنگ، زرد پھول لگ چکے تھے، درختوں نے بھی اس قدر شاخیں نکالی تھیں کہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کون سا پیڑ کہاں شروع ہو رہا ہے کہاں ختم...... سب کے پتے، شاخیں آپس میں گڈمڈ تھیں جیسے۔ ہری بھری نرم گھاس کافی اوپر آ گئی تھی۔ اس نے چپل اتاری اور ننگے پیر گھاس پر چلنے لگی۔ ٹھنڈی نرم گھاس نے اسے ایک دم شانت سا کر دیا تھا۔

”حیرت ہے...... گھر کے سب سے پیارے حصے کا ہی کسی کو ہوش نہیں۔“ لان کے بیچوں بیچ ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے اس نے خود سے سرگوشی کی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے سب پودوں کو بدمست سا کیا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ جھوم اٹھی تھی۔

”لوگ بارش میں ایسے جھومتے ہیں۔“ اوزگل اچانک ہی وہاں اسے ڈھونڈتی ہوئی آئی تو اسے یوں جھومتا دیکھ کر مسکرا دی۔

”کوئی تمہیں ایسے یوں خشک موسم میں جھومتا دیکھے گا تو پاگل سمجھے گا۔“ اس نے مینے کو چڑایا۔

”تمہیں میں پاگل نہیں لگتی گل؟“ اس نے دوپٹا ہوا میں اچھالا تھا یوں جیسے بادبانی کشتیوں کے ملاح ہوا کے زور پر کشتی حوالے کرتے بادبان کھولا کرتے ہیں۔

”بالکل لگتی ہو۔“ اوزگل کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”لیکن یہ تو پتا چلے تمہیں ہوا کیا ہے؟“ وہ شرارت سے دائیں آنکھ دباتے ہوئے بولی۔

”سچ بتا دوں......“ مینے دھیرے، دھیرے چلتی









قریب آئی تھی۔ ہوا نے اس کا آنچل سنبھال رکھا
کے کھلے بال بھی ہوا پر رقص کر رہے تھے اور اس
کی معصومیت پر کوئی نور سا حاوی ہوا جاتا تھا۔
چند لمحے بہن کے معصوم حسن کو تکتی رہ گئی۔

"مجھے محبت ہوگئی ہے اوزگل......" اس کے یاقوتی
نے مسکراہٹ سجاتے اعتراف کیا تھا۔ اوزگل نے
کر بے اختیار دو قدم پیچھے ہو کر ارد گرد دیکھا تھا
دوبارہ ہوا کے ساتھ، ساتھ جھومنے لگی تھی۔

"گل مینہ کو محبت ہوگئی ہے......" اس نے پشتو
گنگناتے ہوئے کہا تھا۔ اور اوزگل نے موت اور
کی پہلی پیری کی آہٹ سنی تھی۔

☆☆☆

وہ جب سے یونیورسٹی واپس آئی تھی، نمرہ اسے
کچھ کھنچی، کھنچی محسوس ہوئی تھی۔ کلاس میں بھی وہ
کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے دوسری سیٹ پر بیٹھ گئی
اور کلاس ختم ہونے کے بعد بھی وہ یوں منظر سے
ہوئی کہ لالہ اسے ڈھونڈتی رہ گئی تھی۔

وہ جب سے مردان سے واپس آئے تھے۔ لالہ
اسے کئی بار کال کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن ہر
تو وہ کال کاٹ دیتی یا فون ہی بند ملتا...... لالہ
سوچا تھا وہ کہیں بزی ہوگی مگر یونیورسٹی آنے کے
اسے لگا تھا۔ نمرہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔
اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے مری
ہونے والی اپنی اور نمرہ کی لڑائی یاد تھی۔ لیکن وہ اتنی
بات بھی نہیں تھی کہ وہ اور نمرہ اسے یاد رکھ کے
رہتے۔ ان کی دوستی اتنی کمزور تو نہیں تھی......
نمرہ کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ ایک، دو دن تو
اسے اپنا وہم بھی لگا لیکن پھر وہ سمجھ گئی تھی۔ نمرہ اس
واقعی ناراض تھی اور بے حد ناراض تھی۔ اور اسے
حال میں نمرہ کو منانا تھا۔

وہ ابھی میم تبسم کا پیریڈ لے کر فارغ ہوئے تھے،
کلاس مس کی تھی اور لالہ اٹینڈ کرنے کے باوجود بھی
پوائنٹس مس کر گئی تھی۔ جبکہ ماڈرن فزکس اس کا
فیورٹ ٹاپک تھا۔ پھر بھی آج کلاس میں اس کا دل
بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ پیریڈ ختم ہوتے ہی وہ نمرہ کو
ڈھونڈتی ڈیپارٹمنٹ کے پچھلے لان کی طرف آئی تھی۔

یہاں سے ایک خوب صورت کشادہ سڑک پیچھے
فارسٹ کالج تک جاتی تھی۔ جس کا کچھ ایریا ان کی
یونیورسٹی سے بھی متصل تھا۔ یہ حصہ کافی سرسبز تھا اور
اونچے گھنے درختوں پر مشتمل تھا۔ اکثر لڑکے، لڑکیاں
پیریڈ آف ہوتے ہی خود کو فریش کرنے اس طرف
آنکلتے تھے۔ اس نے پیریڈ ختم ہونے کے بعد نمرہ کو اس
طرف جاتے دیکھا تھا لیکن اب وہ اسے کہیں بھی دکھائی
نہیں دے رہی تھی۔ لالہ کی متلاشی نظریں چار سو اسے
تلاش رہی تھیں۔ اور پھر کچھ دیر بعد ہی وہ اسے ضیا کے
گروپ کے ساتھ کھڑی دکھائی دی تھی۔ لالہ کو دیکھتے
ہی وہ تیزی سے ان سے ایکسکیوزمی کرتی دوسری طرف
نکل گئی۔ ضیا نے بھی لالہ کو دیکھ لیا تھا اور دور سے ہاتھ
ہلا کے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جسے وہ مکمل
طور پر نظر انداز کرکے نمرہ کی طرف بھاگی تھی۔

"نمرہ...... رکو پلیز بات تو سنو......" اس کے قریب
پہنچتے ہی اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ نمرہ رک گئی۔ لالہ کو
اس کی نگاہوں میں سرد سا تاثر حیران کرگیا۔

"تم اتنی ناراض ہوجاؤ گی۔ میں سوچ بھی نہیں
سکتی تھی یار......" اس نے بنا کوئی شکایت کیے فوراً ایک
مان سے کہا تھا۔

"میں بھی کہاں سوچ سکتی تھی لالہ......" نمرہ کا
سرد سا لہجہ اسے حیران کرگیا تھا۔

"کیا...... کیا مطلب نمرہ......؟" اب کی بار وہ چڑ گئی۔

"مطلب......" وہ دو قدم چل کر اس کے قریب آئی۔

"مطلب تو تمہیں پتا ہونا چاہیے...... تم ہی بھول
گئیں لالہ اپنی کی ہوئی بات۔" وہ طنزیہ مسکرائی۔

"کون سی بات؟" لالہ نے بھنویں اچکائیں۔

"یہی کہ اگر کبھی میں نے تمہیں اور ضیا کو ایک
ساتھ جوڑنے کا ذکر بھی کیا تو ہماری دوستی ختم۔"

"ہاں، تو......؟" وہ اب بھی نا سمجھی سے اسے

دیکھے گئی۔
"تو تم نے تو کافی پی لی ضیا کے ساتھ۔" اس کے اگلے جملے نے لالہ کے ہوش اڑا دیے تھے۔
"دوستی بھی اچھی خاصی ہوگئی۔ مطلب تم اور ضیا ایک دوسرے سے جڑ گئے۔" لالہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کہہ کیا رہی ہے۔
"اور اسی لیے لالہ! اب میں کہتی ہوں ہماری دوستی ختم......!" تلخی سے کہتی وہ اسے بت بنا چھوڑ کر کینٹین کی طرف بڑھ گئی۔ لالہ کتنی ہی دیر اپنی جگہ پہ ساکت کھڑی رہی۔
اس کا وجود جیسے برف کے مجسمے میں بدل گیا تھا...... بے حس...... ٹھنڈا ٹھار...... موت کا سا سرد وجود......

☆☆☆

اقرا چائے لے کر کمرے میں آئی تو حمزہ ٹیبل پر رکھے لیپ ٹاپ پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ اس قدر بزی تھا کہ اقرا کے آنے کا بھی پتا نہیں چل سکا تھا اسے۔ اقرا کپ اس کی ٹیبل پر رکھنے لگی تو اس کی نگاہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر پڑی۔ وہاں لالہ کی تصویریں مختلف فیملی ممبرز کے ساتھ تھیں جو ایک، ایک بدل جاتیں۔ حمزہ کے چہرے پہ بہت پیاری مسکان مچل رہی تھی۔
اقرا نے کچھ دیر اسے یونہی مسکراتا دیکھا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بری طرح چونکا۔
"بھائی......"
"اقرا تم...... کب آئیں؟" وہ فوراً لیپ ٹاپ بند کر گیا۔
"یار ناک ہی کر دیا کرو......" وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ اقرا کو ہنسی آئی۔
"شکر کریں میں ہوں...... امی نہیں آگئیں......"
اس نے حمزہ کو مزید ڈرایا...... وہ مسکرا کر چائے پینے لگا۔
"ویسے بھائی...... ایک بات کہوں؟"
"ہاں بولو......"
"آپ کو نہیں لگتا، آپ کو لالہ کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔" حمزہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھلک گیا تھا۔ اقرا دوپٹے سے ہی اس کی شرٹ صاف کرنے لگ گئی
"میں جانتی ہوں بھائی...... آپ کو لالہ بہت اچھی لگتی ہے لیکن کیا آپ کو نہیں لگتا کہ امی تو اب لالہ [illegible] برداشت نہیں کر پاتیں...... سوچیں اگر آپ کی شادی ہو جاتی ہے تو...... امی نے لالہ کا جینا حرام کر دینا ہے۔" اس کی بات میں اس قدر سچائی تھی کہ حمزہ کچھ بول ہی نہیں پایا۔
"پتا ہے میرا دل کیا کرتا ہے......" اقرا اس کے سامنے دوزانو ہو کے زمین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
"بھائی آپ کو لالہ ہی ملے...... لیکن امی کے لیے میرا دل کرتا ہے۔ رضیہ خالہ کی بیٹی سزا جیسی [illegible] آئے۔ تب امی کو اچھے برے کا فرق پتا چلے گا۔" اس کی بات پر حمزہ کو ہنسی آگئی۔
"توبہ ہے اقرا کتنا برا سوچتی ہو تم۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔
"سچ کہہ رہی ہوں بھائی...... یقین کریں اب بھی اس کے [illegible] کے آرہی ہوں۔ لالہ سے اوڑھنا پہننا سیکھو، ادائیں دکھانا سیکھو...... توبہ توبہ...... امی کی باتیں۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگائے ہوئے بتانے لگی۔ حمزہ کی ہنسی کو یک دم بریک لگ گئی۔
"لالہ بیچاری تو امی کو اُف تک نہیں کہتی لیکن امی ان کا اور سبین مامی کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔" وہ سگی ماں سے کس قدر بدظن تھی۔ حمزہ نے دل میں سوچا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
"تم یہ سب مت سوچا کرو...... جاؤ اب تیاری کرو...... رات کو جانا ہے نہ نانو کے گھر...... دیر ہو گئی تو پھر مامی ناراض ہوں گی۔" اس کی بات پر وہ سر ہلاتی باہر نکل گئی۔ حمزہ کتنی دیر تک اس کی باتوں کو سوچتا رہا۔

☆☆☆

باریال نے دیدے سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ سب بتا دیا تھا۔ دیدے نے ہمیشہ کی طرح اس کا ساتھ دیا تھا۔ اور یہ ان کی تربیت ہی کا تو اثر تھا کہ باریال نے اپنا سودا نہیں کیا تھا۔ رشتے سودا کب ہوتے ہیں،

دولت، شہرت یہ کب کسی رشتے کی مضبوط بنیاد بن [illegible]۔
اس نے واقعی سچے دل سے سوچنے کے لیے [illegible] مانگا تھا۔ وہ امن کے متعلق کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے خود کو مکمل وقت دینا چاہتا تھا لیکن امن اور اس کے بعد سر سکندر نے اسے امارت کے پلڑے میں تول کر اور اپنا محتاج جان کر جیسے مٹی کا کر دیا تھا۔ تبھی اس بار اس نے خود کوئی بھی جاب نہ کرنے کا فیصلہ لیا تھا۔ وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنا چاہ رہا تھا۔ اور اس [illegible] میں اسے دیدے کی مکمل حمایت حاصل رہی تھی۔
ہوم ورک تو پہلے ہی شروع کر رکھا تھا۔ زمین، [illegible] کا نقشہ سب وہ decide کر چکا تھا۔ اب [illegible] فریم ورک باقی تھا۔ اور اسے کچھ اچھے اور مخلص [illegible] کی تلاش تھی...... جو اس کی طرح ہی لگن اور محنت [illegible] کریں...... اور اسے یقین تھا...... وہ بہت جلد [illegible] مقصد میں کامیاب ہونے والا تھا۔

☆☆☆

لالہ کی تیز آواز نے سارے گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ سبین تو ہمیشہ کی طرح چپ کی چادر اوڑھے کچن [illegible] مصروف تھی۔ نانو البتہ اس کے ساتھ خوب دماغ [illegible] رہی تھیں۔
"لالہ بچے...... اتنا غصہ نہیں کرتے۔" انہوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"غصہ...... دادو میرا دل کر رہا ہے میں سارے [illegible] تہس نہس کر دوں......" وہ مزید بل کھا گئی۔
"تم تو بالکل اپنے دادا پر چلی گئی ہو......" دادو کے لہجے میں شرارت سی جاگی۔
"سچ، [illegible] تمہاری طرح ہی پیارے لگتے [illegible]۔" ان کی اگلی بات پر موبائل پر مصروف شاویز کا [illegible] بے ساختہ تھا۔ لالہ نے اسے گھورا۔ وہ کان کھجاتا [illegible] موبائل میں مصروف ہو رہا۔
"مجھے بہلائیں مت دادو...... ضرورت کیا تھی [illegible] لوگوں کی دعوت کی۔" وہ نروٹھے انداز میں بولی۔
"ہر دوسرے دن آ تو جاتی ہیں دل جلانے پھپو......"
"بری بات لالہ......" ہمیشہ کی طرح سبین نے فوراً ٹوکا تھا اسے۔
"یہی ہمت ذرا ان کے سامنے بھی دکھا دیا کریں ناں امی...... انہیں تو کبھی نہیں ٹوکتیں آپ۔" وہ فوراً تلخ ہوئی۔
"زرینہ پھپو کا غصہ تم امی پہ کیوں نکالنے لگتی ہو؟" شاویز چڑتے ہوئے بولا۔
"تو غلطی بھی تو امی ہی کرتی ہیں، انہیں مزہ آتا ہے ناں جب پھپو میری انسلٹ کرتی ہیں...... بار، بار مجھے یاد دلاتی ہیں کہ میں ایک......" سبین کے ہاتھ سے چمچ چھوٹ کر گرا۔
"لالہ......" وہ شاید بہت کچھ کہہ جاتی روانی میں اگر شاویز ٹوک نہ دیتا۔
"تم کمرے میں بند رہنا یا چھت پر چلی جانا...... لیکن یوں سب سے بدتمیزی کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا بچے......" دادو نے محبت سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"آپ سب مجھے ہی غلط کہتے رہیں، میرا تو کسی سے بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ پیر پٹختی اندر چلی گئی...... اور وہ سبھی جانتے تھے کہ صرف اس معاملے میں وہ ضدی بچی بن جاتی تھی۔ ورنہ ان کی لالہ بے حد سمجھدار تھی۔

☆☆☆

محفل کا آغاز تو بے حد خوب صورت تھا۔ سب گھر والے اتنے دنوں بعد ایک ساتھ...... پرانی یادیں تو کبھی نئے خواب ایک دوسرے سے شیئر کر رہے تھے۔ لیکن زرینہ موجود ہوں اور لالہ ان کے طنز سے بچ جائے یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اب بھی وہ سب شام سے ذرا پہلے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ لالہ کچھ دیر بعد ہی ان کے لیے چائے اور لوازمات لیے آئی۔ شیفون کی گلابی شلوار قمیص پر گولڈن کلر کا دوپٹا شانوں پر اچھی طرح سے پھیلائے وہ کسی اپسرا سا روپ اوڑھے لگ رہی تھی۔ زرینہ نے ترچھی نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ ان کی توقع کے عین مطابق لالہ کی طرف ہی

متوجہ تھا۔ وہ لالہ سے اس کی یونیورسٹی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ لالہ بھی اسے تفصیل بتانے لگی۔

''لالہ......!'' زرینہ بیگم نے اچانک ہی اسے پکارا تھا۔

''جی پھپو......'' وہ فوراً ان کی طرف مڑی تھی۔

''کیا یونیورسٹی بھی ایسے بھی بن ٹھن کر جاتی ہو لڑکی؟'' سب کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہوا تھا۔ زرینہ کو نہ جانے کیوں چین نہ پڑتا تھا جب تک سب کا چین غارت نہ کر دیتیں۔ حمزہ نے بددلی سے کپ ٹیبل پر رکھا تھا۔

''بالکل......'' لالہ نے تیز آواز میں کہا۔ سبین بیچاری اشارہ کرتی رہ گئیں۔

''بلکہ اس سے بھی زیادہ بن ٹھن کے جاتی ہوں۔'' وہ تو جیسے سارے بدلے چکانے پر اتر آئی تھی۔ دادو کو تو خوشی محسوس ہونے لگی۔ سبین کے البتہ پسینے چھوٹ گئے۔

''دیکھ لیں اماں......شرم حیا تو اس لڑکی کو چھو کر نہیں گزری۔'' زرینہ اسے دو بدو ہوتا دیکھ کر نانو کی طرف مڑیں۔

''ہاں، تو تجھے کس نے روکا ہے۔ تو ہی کر لے ذرا شرم......'' اماں تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں فوراً بولیں۔

''دتیلی لگائے بغیر تو تجھے چین نہیں آتا۔'' اماں واقعی غصہ تھیں۔

''تم اماں بس میرا ہی منہ بند کرواتی رہنا۔ کل کر آئے گی ناں کہیں منہ کالا......تب روتی رہنا۔'' اماں کا تو دل دہل گیا۔

''تیرے منہ میں خاک زرینہ......'' ان کا بس چلتا تو واقعی مٹی اٹھا کر اُن کے منہ میں ہی ڈال دیتیں۔ لالہ کی برداشت بھی بس یہیں تک تھی، وہ اٹھنے لگی کہ چھت پر ٹھک، ٹھک کی زوردار آواز نے سب کی توجہ کھینچ لی۔

''لالہ بیٹا......ذرا دیکھو تو......شزا ہوگی۔'' سبین نے فوراً موقع کا فائدہ اٹھا کر اسے کام دیا تھا۔ وہ تلخ نظروں سے زرینہ کو تکتی اوپر آ گئی تھی۔

''میں ذرا بھابی کو دیکھ لوں، کیا بنایا ہے؟'' اماں کا بگڑا منہ دیکھ کر زرینہ نے بھی کچن کی راہ لی تو حمزہ کو جیسے موقع ہاتھ آیا تھا۔ وہ نانو کو بتا کر اوپر چھت پر آ گیا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے ہر سو اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سامنے ہی منڈیر کے اس پار لالہ اور اس پر تیز مزاج شزا ٹھہری تھی۔

حمزہ نے کچھ دیر اپنے اردگرد چھائے اندھیرے کو محسوس کیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ چلتا لالہ کے قریب آ ٹھہرا تھا۔

''حمزہ......'' شزا اسے یوں اچانک سامنے دیکھ کر ایک دم کھلی تھی، لالہ نے بھی چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ لالہ کے مقابل آ ٹھہرا۔

''کیسے ہو حمزہ؟'' شزا کی آنکھوں میں اسے دیکھتے ہی رنگ لو دینے لگے۔

''میں تم سے ہی بات کرنے آیا ہوں شزا۔'' اس کی بات پر شزا سے زیادہ حیرت لالہ کو ہوئی تھی۔

''مجھ سے؟'' شزا خوشی سے چہکی۔

''میں اپنی امی کو تمہارے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔'' شزا کا منہ تو کھلا سو کھلا......لالہ پوری کی پوری حمزہ کی طرف مڑی تھی۔

''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟'' اور شزا دوپٹے کا پلو دانتوں میں دبائے بس اتنا کہہ کر بھاگ گئی۔

''بالکل نہیں جی۔''

''حمزہ......'' لالہ ابھی تک حیرت سے بت بنی کھڑی تھی۔ حمزہ کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، پھر اداسی سے مسکرا دیا۔

''مجھے معاف کر دینا لالہ...... مجھے بہت دیر سے سمجھ آیا کہ میں تمہارے قابل نہیں...... کبھی ہو بھی نہیں سکتا۔'' اس کا لہجہ زخمی تھا۔

''حمزہ......'' وہ تو کچھ بول ہی نہیں پائی۔ حمزہ کی دائیں آنکھ سے ایک موتی سا چھلکا تھا۔ جسے انگلیوں سے اڑاتا وہ اسے وہاں...... چھوڑ کر نیچے چلا گیا۔ لالہ کی آنکھیں نہ جانے کیوں جلنے لگیں۔

(باقی آئندہ)

صولت اپنی بیٹی عنایہ کے ہمراہ اپنی بڑی بہن ...کو نئے گھر کی مبارک باد دینے آئی تھیں۔ عنایہ کے ...کے امتحان ہو چکے تھے۔ وہ فارغ تھی یوں بھی ...خالہ جنہیں سب جمن خالہ کہتے تھے کے نئے گھر کی اتنی تعریف سنی تھی کہ گھر دیکھنے کا بہت شوق ہو رہا تھا۔ ان دنوں مکانوں کے نام رکھنے کا بہت رواج تھا۔ ...خالہ کے گھر کا نام ''سدابہار سرائے'' رکھا گیا تھا۔

اتنا افسانوی نام کس نے سوچا ہوگا، بھلا ''سرائے'' بھی کوئی لفظ ہے جو سدابہار ہونے کا تاثر دے۔ فیصل آباد سے ملتان تک کے لمبے سفر میں صولت وقفے، وقفے سے جمن خالہ کی باتیں بتاتی رہیں۔ ناہیدہ آپا کی بیٹی یعنی جمن خالہ کی نواسی قدسیہ اُن کے ہاں ہی رہتی تھی جو تقریباً عنایہ کی ہم عمر تھی۔ دور ہونے کے سبب آنا جانا برسوں بعد ہوتا تھا۔ خطوط کا تبادلہ بھی خاص خبروں پر ہی

سدا بہار سرائے

دُردانہ نوشین خان



ہوتا۔ اس وقت ٹیلی فون خوشحال گھروں میں ہوتے تھے۔ عنایہ نے محسوس کیا کہ ماں کی باتوں میں بڑی بہن کی دولت وحشمت پر یک گونہ رشک اور احساسِ کمتری تھا۔ عنایہ خود بھی کچھ ایسا ہی محسوس کررہی تھی۔

اگرچہ ان کے ہمراہ اٹیچی میں چنے ہوئے بہترین کپڑے رکھے تھے۔ عنایہ دل میں پلان کررہی تھی کہ وہ اپنے اسکول میں ڈی سی کی بیٹی کی سہیلی اور استانیوں کی چہیتی ہونے کی قدسیہ پہ دھاک جمائے گی یعنی جتنی تھوڑی بہت دھاک اس کے پاس تھی جمع کررہی تھی۔

اگرچہ وہ اپنے گھر کے بارے میں کافی سارا جھوٹ بول سکتی تھی مگر اس کی امی جھوٹ کا پول کھول دیتی تھیں، وہ اتنی ہی سیدھی تھیں۔

ملتان اتر کر ماں، بیٹی نے تانگا کیا۔ ملتان، صولت کا آبائی شہر اور میکا تھا۔ یہاں آکر وہ خود اعتماد اور ہوشیار ہوجاتی تھیں۔ تانگے میں اٹیچی کے علاوہ سوغاتوں کی ٹوکری تھی۔ ہاتھ پر بٹی ہوئی سویّاں، چاولوں کا آٹا، باجرے کا آٹا، دیسی گھی، چھوٹی مکھی کے شہد اور میوے والا گڑ، اور کھدر، بوسکی کے جوڑے یہ خالص دیسی تحفے تھے۔

تانگا ”سدا بہار سرائے“ کی سبز تختی جس کے کونوں میں پھول بنے ہوئے تھے، والے لمبے چوڑے پھاٹک پر رکا...... پھاٹک کھول کر نوکر نے جھانکا اور تانگا اندر لے آنے کا اشارہ کیا۔ سبز درختوں کے نیچے، دائیں بائیں ہرے بھرے پھولوں سے لدے گملے اور کیاریاں، عنایہ نے ماں کو ٹھوکا دیا۔

”امی...... گھر میں بھی تانگا چل رہا ہے، گھر شروع ہوگیا ہے۔“ امی اپنی چادر کا پلو منہ پر رکھے ”ماشاء اللہ...... اللہ تیری شان۔“ کہے جاتی تھیں۔

دونوں تانگے سے اتریں۔ صولت نے بیٹی (عنایہ) کو سوغات کی ٹوکری پکڑائی اور خود چھوٹی اٹیچی تھام کر چند قدم ہی چلی تھی کہ کہیں سے پرانا بوڑھا ملازم شدو پہچان کے دوڑا آیا۔ تپاک سے سلام عرض کیا۔

”صولت بی بی ہوراں آئے ہو...... بسم اللہ......“

ٹوکری اور اٹیچی دونوں لے لیے۔

”شدو میاں کیا حال ہے؟ کیسے ہو؟ بال بچے ٹھیک ہیں۔“

صولت اسے اپنی شادی ہونے سے پہلے کا جانتی تھی۔ صولت کی شادی ہوئی تو شدو میاں آنسو بہاتا ہوا دور تک موٹر کے ساتھ چلا تھا۔ ارجمند بی بی کی اولادیں وحید اور ناہیدہ کی شادیوں میں ہر دم پیش، پیش ہمہ وقت خدمت خاطر، ہنسی مذاق اور دعاؤں کی رونق لگائے رکھتا۔ پنج وقتہ نمازی، شریف بندہ تھا۔ شیخ رضی الدین سے زیادہ بی بی کا وفادار تھا۔

”ماشاء اللہ...... بہت بڑا گھر ہے۔“

”جی بی بی جی......“ وہ گھر کی تفصیلات بتانے لگا۔ سیاہ و سفید بادلوں کے مشرق کی جانب سے بڑھتے ہوئے گالے، کہیں دھوپ، کہیں چھاؤں کا عکس لیے ہوئے گہری سبز گھاس، ایک سفید خرگوش پھدکتا ہوا پودوں میں چھپ گیا۔ عنایہ کی نگاہ انجیر کے درخت کے پیچھے نئے چمکتے اسٹینڈ والے جھولے پر پڑی...... خوشی سے کھلکھلائی۔

”امی...... وہ دیکھیں...... وہ دیکھیں امی......“

شدو میاں جوش و خروش کا سبب جان گیا، ہنس کر بولا۔

”ہاں جی...... یہ جھولا رکھوایا ہے، کی بی بی (قدسیہ) کا تو سارا وقت ہی یہیں گزرتا ہے۔ ابھی اسکول گئی ہوئی ہیں۔“ جھولے میں بچھی مخملیں نیلی گدی اور اس کی مضبوط ڈوریوں پر لپٹے پھولوں کا گمان (مگر وہ اصلی پھول نہیں تھے) پاس ہی آم کا درخت جس کے نیچے گری پڑی کچی سبز امبیاں (انہیں کوئی کیوں نہیں اٹھاتا) اور انجیر کے درخت میں لگی کالی سبز انجیریں......(اف یہ کتنے امیر ہیں) عنایہ کے دماغ میں جملے ابھرتے۔

”دھی رانی کا کیا نام ہے؟“

”عنایہ...... آؤ عنایہ...... کیا یہیں کھڑے رہنا ہے؟“

شدو میاں نے اس کا نام لینے کی ناکام کوشش کی مگر کوشش ترک کرکے عنایہ کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

”صولت بی بی...... میرے منہ پر تو دھی رانی کا نام نہیں چڑھتا...... کنگوری بیٹی! آپ کے بال کٹی کے بھٹے جیسے ہیں۔“

بس اس دن سے شدو میاں نے اس کا نام کنگوری رکھ دیا۔ (سنہری کو سرائیکی میں کنگوری کہا جاتا ہے)

باغ، لان اور روش کے بعد اندر داخل ہونے والا دروازہ صاف ستھرا براؤن رنگ کا تھا۔ شدو نے ہال کمرے میں (جسے آج کل لاؤنج کہا جاتا ہے) سامان رکھا اور بی بی کو خبر کرنے چلا گیا۔ صولت نے دوراتار کرتہ کی، دوپٹا درست کیا اور عنایہ کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر ٹھیک کیا۔ خالہ ارجمند، شدو کے ساتھ بولتی ہوئی راہداریوں میں آرہی تھیں۔ گہرے نیلے رنگ کا سوٹ جس کی قمیص اور دوپٹے پر نفیس گلکاری تھی۔ بالوں کا سمٹا ہوا جوڑا، کانوں میں سونے کی موٹی، موٹی بالیاں، مسکراتی ہوئی بانہیں پھیلا کر اُن سے ملیں۔ عنایہ کو تو یہ حیرت ہوئی کہ خالہ گھر میں بھی اچھی بھلی تیار ہوتی ہیں جبکہ امی کے تو گھر کے کپڑے پھیکے سے ہوتے ہیں، دونوں بہنیں دیر تک ملتی رہیں پھر عنایہ کو پیار کرنے کی نوبت آئی۔

”بھائی رضی کہاں ہیں؟“ صولت نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کچہری گئے ہیں۔“ گلاسوں میں ٹھنڈا ٹھار مزے دار فالسہ جوس ڈالتے ہوئے بتایا۔ ”ناہیدہ لاہور سے آئی ہوئی ہے ابھی سسرال گئی ہے، شام تک آجائے گی۔ قدسیہ تو میرے پاس ہوتی ہے۔“

”یہ اچھا کیا ہوا ہے...... رونق رہتی ہوگی۔ کون سی جماعت میں ہے؟“ قدسیہ کی باتیں سننے میں عنایہ کو دلچسپی تھی۔ وہ کسی انگریزی اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ اسے اسکول سے ڈرائیور موٹر میں لاتا تھا۔ چھٹی کے وقت کے انتظار میں ملازمہ لڑکی میدو نے تازہ جوس کا گلاس برف ڈال کر ڈھانپ کر کھانے کی میز پر لا رکھا تھا۔ میدو، عنایہ کو بلا کر گھر دکھانے لگی تھی۔ وہ زیادہ تر قدسیہ کی چیزیں دکھاتی رہی۔

”یہ چھوٹی بی بی کا چڑیا گھر ہے، یہ ڈبا گیندوں سے بھرا ہوا ہے...... کچھ پزل گیم جیسے نہ سمجھ آنے والے کھلونے...... رنگین چکنے رسالے، اس کے کمرے کی وہ الماری جس میں جانے کتنے سوٹ ہینگر میں لٹکے تھے۔ اس کی میز پر تین سیاہ چشمے پڑے تھے۔ اس کا جیولری بکس تو میدو نے دیکھنے نہ دیا۔ عنایہ اس کی کتابوں کو الٹتے پلٹتے ہوئے رعب جھاڑنے کو بولی۔

”میں ہائی اسکول میں پڑھتی ہوں...... میں گرل گائڈ میں ہوں۔“

چٹی ان پڑھ میدو کو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ اپنا ہی راگ الاپتی جارہی تھی۔

”ایک دن قدسیہ بی بی نے مجھے کہا مہندی گھول دو...... میری گڈی کی شادی ہے...... قدسیہ بی بی کے پاس اتنی ڈھیر گڈیاں ہیں...... یہ صندوقچی بھری ہوئی ہے۔“ وہ ایک چاندی جیسے بڑے ڈبے کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ ”میں بولی...... بی بی شادی ایک دن میں تھوڑی ہوجاتی ہے...... پہلے مٹھائی آتی ہے، تیریخ رکھی (تاریخ) جاتی ہے۔ پھر ڈھولکی بجتی ہے...... پھر مہندی گھلتی ہے، ہم نے تین دن تک گڈی کی شادی کی تھی۔ پھر گڈا اسے لے کر یہ اس ڈبے میں چلا گیا تھا۔“

اس نے ایک اور ڈبا دکھایا جو شیشے کا تھا جس میں لال کپڑوں والی گڈی اور شیروانی والا گڈا رکھا تھا۔ یہ دکھا کر وہ ہنسنے لگی۔

”آپ کو مہندی پسند ہے؟ میں گھول رکھتی ہوں، رات کو لگائیں گے۔“ عنایہ نے انکار کردیا۔

جب قدسیہ اسکول سے آئی تو میدو پہلے سے چھتری لے کر بھاگ پڑی۔ سفید اجلے یونیفارم، کندھے تک ترشے بالوں کی اونچی پونی باندھے، سیاہ چشمہ لگائے قدسیہ آرہی تھی۔ پیچھے، پیچھے شدو میاں بیگ سنبھالے آتا تھا۔ میدو بائیں طرف چھتری اونچی کیے چل رہی تھی،

”اُف اللہ کتنا نخرہ ہے اس کا......“ مگر وہ عنایہ سے

خوش ہوکر ملی اور بول چال میں اس کے غرور نہیں تھا۔
شام ڈھلی، ناہیدہ آگئی۔ باغیچوں کے درمیان دو تین موٹریں ٹھہری تھیں۔ خالو رضی الدین لان میں کرسی پر ملنے والوں کے درمیان بیٹھ رہے تھے۔ شدو میاں شربت لا کر پیش کررہا تھا۔ گپ شپ ملنا، جلنا جب ہو چکا تو صولت گھر دیکھنے اٹھیں۔

''جمن آپا...... سدا بہار سرائے ...... یہ نام کس نے رکھا؟''

''صولت خالہ، مدتوں سے میری اماں جی کو ایک ہی شوق تھا...... میرا اپنا بڑا سا گھر ہو، اس کا گوشہ، گوشہ اپنے ہاتھوں سے سجاؤں۔ ان کا بس چلتا تو مستری کو ایک طرف کر کے ایک، ایک اینٹ خود رکھتیں۔'' ناہیدہ بولی تھی۔ ارجمند نے بیٹی کو ہنس کر دھپ لگائی۔ وہ ہنستی ہوئی بولتی چلی گئی۔

''آپ اب بھی دیکھیں گی اماں جان کی ہنر مندیوں کے شاہکار......'' گوری چٹی ناہیدہ جس کی چال ڈھال میں افسر کی بیوی کی چھاپ تھی مگر زبان شیریں تھی۔

''باورچی خانہ دیکھیں، عورت کا اصلی مقام......''
وہ تینوں باورچی خانے میں داخل ہوئیں......

باورچی خانے کا کونہ، کونہ صاف ستھرا اور ایسے سجا ہوا جیسے عروسی کمرا ہو، ان دنوں نیچے بیٹھ کر پکانے کا دستور تھا مگر وہاں دونوں نظام موجود تھے۔ تعمیر کی خوبیوں کو چھوڑیں جو سجاوٹ ہاتھ کی کاریگری سے کی گئی تھی وہ ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی۔ کہیں پھولوں کی ٹوکریاں، چمچے کانٹے لٹکانے کے فریم، مسالہ جات کے ڈبوں پر متعلقہ اشیا کی خوش رنگ تصاویر جو پینٹ کی گئی تھیں، سجاوٹی فریم، متعلقہ احادیث کی خطاطی کے فریم، وہ باورچی خانے سے نکل کر سارا گھر گھومتی چلی گئیں۔ پلاسٹک کی کوڑا کرکٹ کی ٹوکریاں تب نہیں ہوا کرتی تھیں۔ گتے سے تیار کردہ روغنی کاغذ اور ربن سے مزین ٹوکریاں رکھی گئی تھیں بلکہ کوڑا دان جا بجا دھرے گئے تھے۔ صراحی نما، جگ نما، جام سفال گلدان جو جس جگہ ہے وہیں پھب رہا ہے، پرانا دھرانا حصہ اتنا سجا ہوا کہ جیسے کیا کوئی فائن آرٹس والی طالبات کریں۔ برآمدہ کے آگے چلمنیں پڑی تھیں چلمنوں پر باریک لہریے پڑے تنے ہوئے جن میں گوٹ کناری کی بیلیں جھلملاتی تھیں۔ برآمدے میں بڑا سا لکڑی کا دیوان تھا جس پر سفید چاندنی بچھی تھی اور گلابی تکیوں کی بہار تھی۔

''جمن آپا...... آفریں، آفریں...... تم، اب بھی اتنی دیدہ ریزی کرلیتی ہو، میں تو حیران ہوں...... اب کہاں ہو پاتا ہے یہ باریک کام......''
ارجمند متبسم ہوگئیں۔

''خالہ...... یہ ایک دن کا کام نہیں ہے...... یہ جہیز تو برسوں سے بن رہا تھا۔'' ناہیدہ کے فقرے خوب ہوتے۔

''گھر تو پچھلا بھی اچھا تھا......'' صولت نے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا تھا مگر...... اپنا نہ تھا۔'' ارجمند نے ست بھرائی کو پرانے صوفے کی سائڈ والی کرسیاں لا کر رکھنے کو کہا جو کہ برآمدے میں رکھا تھا۔ یوں اچھی خاصی محفل اندرونِ خانہ کے باغیچے میں جم گئی۔

''الحمدللہ...... یہ خواب پورا ہوا۔''

''اللہ بسنا نصیب کرے...... رچ رچ ہو...... رضی بھائی کہاں ہیں؟ وہ کدھر بیٹھے ہیں؟''

''خالہ...... ابا جی اپنی دنیا میں رہتے ہیں، جتنا آپ سے مل لیا وہ اتنے ہی ہیں۔'' کلائی میں پڑی درجن بھر سونے کی چوڑیوں کو ترتیب دیتی۔ ناہیدہ گویا ہوئی۔

''قدسیہ بی بی کو کانٹا چبھ گیا۔ خون نکل آیا۔'' میدو، قدسیہ کا ہاتھ پکڑے شور مچاتی آرہی تھی۔

''کیا ہوا ہے...... کیا ہوگیا۔'' ناہیدہ لپکی۔

''بسم اللہ...... میرے بچے بسم اللہ......'' ارجمند اٹھ گئیں۔ ''اری جاؤ میدو...... مگے میں پانی اور کاٹن لے آ......''

''کاٹن؟'' میدو سوالیہ نشان ہوگئی۔

''روئی...... دوائیوں والی الماری میں رکھی ہے۔''

''بی بی...... میں جاتی ہوں۔'' ست بھرائی اپنا بھاری وجود گھسیٹتی اٹھی۔

''تو پہنچ گئی...... ڈیٹول کی شیشی بھی لیتی آنا......''
ناہیدہ نے پیچھے آواز دی۔

''مجھے بھی لگی ہے۔'' عنایہ اپنی کلائی کی خراش کو دوسرے ہاتھ سے دبائے صولت کے پاس آکر منمنائی۔

''اچھا......'' کہہ کر اس کی کلائی کو سہلاتے ہوئے صولت کی توجہ قدسیہ کی طرف تھی...... قدسیہ کی کلائی پر پٹی لگا کر اسے صوفے پر بٹھا دیا گیا تو وہ عنایہ کو دیکھ کر بتانے لگی۔

''اماں جی...... عنایہ کو بھی لگی ہے۔''
خالہ نے اسے پچکارا...... ''آؤ بچے...... مجھے دکھاؤ۔'' اس کی کلائی کو ڈیٹول سے بھگو کر صاف کیا گیا۔ تبھی قدسیہ کے چھوٹے بھائی آگئے۔ وہ کچھ نئے کھلونے لائے تھے۔ ان کی شرارتوں سے گھر بھر سا گیا۔

عنایہ دیکھ، دیکھ کر سوچا کرتی ہائے اللہ کتنے مزے کا گھر ہے، جس جگہ بیٹھ جاؤ وہیں مزہ آتا ہے، باہر اتنے بڑے بڑے باغیچے پھر اندر الگ باغیچہ ہے۔ فوارے میں سے پانی گرتا ہے۔ چڑیاں آکے نہاتی ہیں، نیلی چڑیاں کتنی پیاری ہیں، سبحان تری قدرت...... کہتا ہوگا ست بھرائی بتا رہی تھی۔ عنایہ برآمدے میں بیٹھتی تو سر اٹھا کر پھولوں سے لدی صراحیاں اور لٹکتی جھولتی گملیاں دیکھتی رہتی۔ وہیں پاس ہی سبز طوطوں کا جوڑا اپنے کھلے سے پنجرے میں اٹکھیلیاں کرتا، بولیاں بولتا ہوتا، صبح ہوتی تو ناشتے کی خوشبو باورچی خانے سے اٹھتی سارے گھر میں پھیل جاتی۔ وہ امی سے آہستہ سے کہتی۔

''امی، بھوک لگی ہے۔''

''چپ کرو...... ایسے نہیں کہتے...... گھر میں تو تمہیں کھانے کی پروا نہیں ہوتی۔''

''امی، ہمارے ناشتے کی ایسی خوشبو کیوں نہیں ہوتی؟''
عجیب احمقانہ سوال تھا۔ صولت نے آنکھیں دکھائی تو چپکی ہورہی۔

قدسیہ کا صبح اسکول جانا، اس کا روز لاڈ سے ٹھنکنا کہ کہنا میں چھٹی کرتی ہوں۔ تراشے ہوئے بالوں میں سرخ ہیر بینڈ لگانا، چمکتے جوتے، اتنا اچھا بیگ، لنچ باکس، تھرماس، کیا ٹھاٹھ ہوتے۔ کار اندرونی دروازے کے ساتھ آکر لگتی، شوفر دروازہ کھولتا اور وہ عنایہ کو ہاتھ ہلاتی چلی جاتی۔ عنایہ باہر والے جھولے پر جا بیٹھتی۔ اسے خالو رضی الدین سے ڈر لگتا تھا۔ ایک دفعہ وہ ٹوتھ برش کرتے، کرتے لان میں آگئے۔ عنایہ جھولا روک کر اترنے لگی۔

''بیٹھو، بیٹھو، بیٹھی رہو......'' وہ تیز، تیز بولتے تھے، چہرے کے نقوش سے غرور ٹپکتا تھا۔ شدو میاں اسے اچھا لگتا وہ جب بھی اسے دیکھتا۔ ''ککوری دھی...... جیتی رہو......'' کہتا تھا۔

واپسی سے ایک رات پہلے وہ اندر والے باغیچے میں تا دیر محفل جمائے بیٹھی رہیں، پیڈسٹل فین چل رہا تھا۔ صحن والی ٹیوب لائٹیں آن کرنے سے مچھر آتے تھے۔ برآمدے کی لائٹ آن تھی۔ چاندنی رات اور ملی جلی دھیمی روشنی میں ارجمند خالہ، صولت، ناہیدہ چھوٹے صوفوں پر بیٹھی تھیں، قدسیہ، عنایہ موڑھے پر تھیں، ست بھرائی، میدو گھاس پر چوکڑی لگائے بیٹھی تھیں۔ چھوٹے بچے سو گئے تھے، خالو کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ ماضی کی باتیں، شادیوں کی رونقیں دہرائی گئیں۔ صولت کے گھر آنے کے پیمان باندھے گئے، جمن آپا کہہ رہی تھیں وہ خط لکھنے میں ست ہیں۔ ناہیدہ سے ٹیلی فون پر بات ہوتی ہے۔ بات سے بات نکلی تو جانے کہاں سے بات اٹھی کہ جمن آپا گیت سنائیں۔ صولت تو نئے گھر کی خوشی میں تکرار کررہی تھی مگر وہ سات سمندر پار جا بسنے والے شادی شدہ بیٹے وحید کی باتیں کررہی تھیں تو گانے لگی تو بولوں میں یہی احساس تھا۔ ست بھرائی مٹی کا مٹکا اٹھا کر لائی۔ اسے الٹا رکھ کر گت دینے لگی۔ ارجمند خالہ کی آواز میں بچن بیگم کا سا رچاؤ تھا۔

چن کتھاں گزاری ای رات وے
میں تاں نی ولایا تاک وے
میڈا جی ولیلاں دے وات وے

کوٹھے تے پرکوٹھڑا تے کوٹھے سکدا کھیس بھلا
میں تکدی رہ گئی آں میڈا ماہی گیا پردیس بھلا

ارجمند کی آواز میں آنسو گھلنے لگے۔

”مائیں اپنے عشق کا محور بیٹیوں کو کیوں بنا لیتی ہیں۔“ ست بھرائی نے بی بی کے غمِ ہجر کو کم کرنے کے لیے جگت لگائی۔

”ھن او بول گا وَچا...... جیڑے اندروں ستے گھوٹ کتے ھن (ترجمہ: اب وہ بول گا لو جو اندر سوئے ہوئے تمہارے دولھے کے لیے ہیں) اور پھر ست بھرائی ہنس، ہنس کر گانے لگی۔

کوٹھے تے پرکوٹھڑا تے کوٹھے سکدی ریت بھلا
اساں کھنڈایاں میڈھیاں توں کئی بہانے دیکھ بھلا

ناہیدہ بھی چٹکیاں بجا، بجا کر ساتھ دے رہی تھی۔ ارجمند اسے دھپ مار کر بولیں۔

”تو آپ میڈھیاں گھتدا اے انوار کو دکھا۔“

(انوار، ناہیدہ کے میاں کا نام تھا) وہی عورتوں کا خاوندوں کی بے اعتنائی کا قلق......

رات گہری ہو رہی تھی۔ تاروں سے آسمان بھر گیا تھا۔ ارجمند، صولت کی پرانی باتوں کی یادیں، کنوار پن کے زمانے کی عیدیں، حویلی کا آسیبی، املی کا درخت بڑے ماموں پر کیا گیا جادو جو بازارِ حسن میں ان کی معشوقہ نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کیا تھا۔ وڈی بوا کا طاعون سے فوت ہونا اور طاعون میں موت دیوی کی دستک سننا، طاعون اور چیچک کی ہندو کوچوں میں بھجن گا کر دیوی کو راضی کرنے کی پُراسراریت، باتوں کی پٹاری کھلتی چلی گئی۔ کہیں کسی کو پہلی جمائی آئی رفتہ، رفتہ ساروں کو تھکن کا خیال آیا۔ عنایہ اور قدسیہ تو سر ڈال کر سوتی پڑی تھیں، صولت نے کہا۔

”چلو اٹھو بھئی صبح دس بجے اسٹیشن پہنچنا ہے۔“

یوں بالآخر محفل برخاست ہوئی۔

اپنے گھر واپس پہنچ کر عنایہ کئی دنوں قدسیہ کا جھولا، اس کے لاڈ، خالہ کے گھر کی سجاوٹ اور وسعت یاد کرتی رہی۔ یاد تو صولت بھی بہت کرتی رہیں۔ تب باتیں جلد پرانی نہیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر رفتہ، رفتہ...... اپنی زندگیوں میں مصروف ہو گئے۔ ارجمند خالہ کی طرف سے کبھی کبھار کارڈ آ جایا کرتا اس میں روایتی خیریت کے فقرے ہوتے، ایک آدھ سطر کوئی نئی خبر بتاتی تھی جو بالعموم موسم کی ہوا کرتی تھی۔ اکثر یہ خالو کے ہاتھ کے لکھے ہوتے، جن کے آخر میں ارجمند بیگم سلام لکھوا رہی ہیں۔ بچوں کو پیار ہوتا، اس طرح کا کارڈ ادھر سے صولت کے میاں لکھ بھیجتے۔ ایک کارڈ پر لکھا آیا تھا ارجمند کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جواب میں صولت نے خود خط لکھا تھا مگر اس خط کا کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر صولت کے میاں کا ملتان سے مزید دور تبادلہ ہو گیا۔ آمد و رفت کے ارادے خواب ہو گئے۔ ڈیڑھ سال گزر گیا۔

☆☆☆

معمول کی ایک سہ پہر تھی۔ موسم خزاں کی وجہ سے ہوائیں چلتی اور محکمہ جنگلات و انہار کے بنگلوں میں لگے بے تحاشا درختوں سے بے شمار پتے گرتے رہتے، پوری کالونی میں درختوں کی کمی تھی نہ گرتے پتوں کی، خلاصی کی گھر والی نے صحن میں جھاڑو لگا کر پتوں کے ڈھیر کو آگ لگائی تو دھویں کے مرغولے اٹھنے لگے۔ صولت نے دیکھا تو کہا۔

”چھوڑو جھاڑو کو...... یہ تو ہر وقت کا عذاب ہے، پتا نہیں کیوں میرا دل اچھا نہیں ہے، کچھ پکانے کو جی نہیں کر رہا...... مونگ کی دال پکا کر رکھتی جانا۔“

اتنے میں ڈیوڑھی سے عنایہ کے ابو داخل ہوتے دکھائی دیے۔ ”آج تو انہوں نے پٹوار سرکل کی میٹنگ بلا رکھی تھی۔ اتنی جلدی کیسے اٹھ آئے۔“ ان کے ہاتھوں میں کارڈ تھا۔ صولت نے ہاتھ بڑھایا۔

”جمن آپا کا ہے؟“

”رضی الدین شیخ کا ہے۔“

”ہاں...... وہی......“ صولت نے کارڈ پکڑا۔

”بیٹھ جاؤ...... صولت...... سکون سے بیٹھ جاؤ...... خیر کی خبر نہیں ہے۔“ خیر کی خبر نہیں ہے؟ یہ چار لفظ نہ تھے گویا سر پر چھت آ گری...... اب تو کارڈ پر نظر ڈالتے دل دہل رہا تھا۔ وہاں نظر ڈالنے کی جلدی بھی تھی۔ نظروں نے جلد ہی منحوس خبر کو جا لیا۔

”ارجمند بیگم کا انتقال ہو گیا ہے، اللہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔“ کتنے آرام سے، کتنی بے نیازی سے لکھ دیا گیا۔ صولت کی آنکھیں انہی لفظوں پر یوں جمی تھیں جیسے کوئی اور مطلب کھوج نکالیں گی، جانے کہاں سے عنایہ دوڑتی ہوئی آئی۔ کارڈ پہ جھانک کر چیخ پڑی......

”امی...... جمن خالہ...... امی...... جمن خالہ؟“

”یہ، یہ، کیوں لکھا ہے؟ یہ کیا بکواس ہے۔“ صولت کا دماغ لفظوں کو قبول نہ کر رہا تھا۔ ابو تلملا رہے تھے۔

”تار نہیں بھیج سکتا تھا...... ٹیلی فون ہے ڈسٹرکٹ آفس میں...... یہ دو دن پہلے کی تاریخ ہے...... آج تیسرا دن ہے۔“

”ہائے، ہائے...... تیسرا دن......“ خلاصی کی گھر والی نے کلیجے پیٹ ڈالے۔ ہر طرف سے آتی آوازوں نے صولت کی رگوں میں یقین اتارا تو وہ وہیں زمین پر ڈھیر ہوتی چلی گئی۔ زمین نے صفِ ماتم کھول دی۔

☆☆☆

وہی ”سدا بہار سرائے......“ کا پھاٹک تھا۔ صولت، عنایہ اور اس کے ابو اندر داخل ہوئے، چند موٹریں اور اسکوٹر ٹھہرے تھے گھر پر جیسے پھٹکار برس رہی تھی رنگ و بہار کوچ کر گئے تھے۔ پھاٹک کے ساتھ مٹی پر پھسکڑا مار کر بیٹھا ہوا شدو میاں دکھائی دیا۔ صولت بی بی کو دیکھتے ہی دیوار تھام کر گرتا پڑتا اٹھا۔

”ہائے قسمت ہماری......“ یہ کہہ کر سفید داڑھی والا منہ ڈھانپ روتا تھا۔ عنایہ کے ابو نے کندھے پر ہاتھ رکھا تو سینے سے جا لگا۔

”میری بی بی چلی گئی...... ساری رونق بہار لے گئی...... میں بے گھر، بے در ہو گیا......“ صولت کے آنسوؤں میں سوال ہی سوال تھے ”جمن آپا کو کیا ہو گیا؟ مجھے کسی نے کیوں نہ بتایا؟ جیتے جی کیوں نہ ملایا۔“

میں نے اس طور سے چاہا تجھے

میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں
جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے
جیسے سورج کی کرن سیپ کے دل میں اترے
جیسے خوشبو کو ہوا رنگ سے ہٹ کر چاہے
جیسے پتھر کے کلیجے سے کرن پھوٹتی ہے
جیسے غنچے کھلے موسم سے حنا مانگتے ہیں
میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں
جیسے خوابوں میں خیالوں کی کماں ٹوٹتی ہے
جیسے بارش کی دعا آبلہ پا مانگتے ہیں
میرا ہر خواب میرے سچ کی گواہی دے گا
وسعتِ دید نے تجھ سے تیری خواہش کی ہے
میری سوچوں میں کبھی دیکھ سراپا اپنا
میں نے دنیا سے الگ تیری پرستش کی ہے
میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں

(میرے پیارے پاکیزہ کے نام)
مرسلہ: نائلہ طارق، ضلع لیہ

سوالات ہر قدم کے ساتھ بڑھتے چلے گئے یہ روتا ہوا قافلہ گاڑیوں میں سے راہ بناتا اندرونِ دروازہ جا پہنچا۔

وہ سامنے برآمدے کے باہر نازوں پلی، سونے میں تلی آنکھوں کا تارا قدسیہ جسے دیکھ، دیکھ کر ارجمند جیتی تھیں، فرش پر بیٹھی تھی میلے کچیلے کپڑے، اجڑی صورت، روتی آنکھیں، اس کی گود میں کوئی کپڑا تھا۔ جسے دبوچے ہوئے تھی بعد میں پتا چلا ارجمند (نانی) کا دوپٹا تھا۔ قدسیہ کے پاس اس کا آٹھ سالہ بھائی آ کر کچھ کہتا تھا اس کے گال پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ صولت نے آگے بڑھ کر قدسیہ کو سینے سے لگایا تو وہ زور، زور سے رونے لگی۔

برآمدے کے اندر چند عورتوں کی موجودگی نظر آ رہی تھی۔ عنایہ آنکھیں پھاڑ کر گھر کے در و دیوار تک رہی تھی۔ پہلی بار یہ انکشاف وارد ہو رہا تھا کہ گھر،

مکان، کوٹھیاں خوب صورت نہیں ہوتیں انہیں اچھے انسان خوب صورت بناتے ہیں، رونق اور برکت جو لفظی اصطلاحات لگتے تھے۔ آج وجودی حقائق کی طرح دکھ رہے تھے۔ اب بھی تو لٹک رہے تھے گملے صراحیاں، چمکیلی چلمنیں، جھاڑ، فانوس مگر جیسے.... بے روح بے جان فضول اشیا کا ہجوم، ان کا زندگی کی حرارت سے کیا لینا دینا تھا۔ ایک چھوٹی سی دری بچھی تھی جس پر صولت بیٹھ رہی ست بھرائی سامنے بیٹھ کے رو، رو حال سنانے لگی۔

''سرطان پھوڑا نکلا تھا۔ آٹھ مہینے چار پائی پر رہی...... بڑے، بڑے حکیموں کا علاج کرایا، بڑی صابر تھی، بڑی صابر تھی۔''

''ناہیدہ؟'' صولت کی نظریں تلاش رہی تھیں۔

''بہن ہیں آپ؟'' کوئی ادھیڑ عمر، مدبر خاتون تسبیح لیے بیٹھی تھی، آگے کھسک کر پوچھا۔ پھر خود ہی کہا۔

''ادھر پرسہ چل رہا ہے، اُدھر تہنیت مبارک سلامت...''

ست بھرائی ہائے، ہائے کہہ کر رانیں پیٹنے سر دھننے لگی۔ صولت کا تو دماغ گھوم رہا تھا۔

''ناہیدہ کہاں ہے؟ اکیلی قدسیہ کیوں بیٹھی ہے؟ کون سی مبارک سلامت؟ یہ اتنی چند عورتیں؟'' موجود منظر سے اٹھتے سوالوں کے پیچھے غم کی آگ کو بھڑکاتے مزید سوالات کے شعلے......

''جمن آپا کو ہوا کیا؟ صحت مند ہنستی بولتی شیر جوان مٹی میں مل گئیں۔''

اُدھر عنایہ، قدسیہ کے سامنے یوں سراپا حیرت و غم فرش نشین تھی کہ خاموشی بولتی تھی۔ ایک قدسیہ کو دیکھ لینا ہی بے ثباتی حیات کی تصدیق کو کافی تھا۔ یہ وہی قدسیہ ہے جس کی آؤ بھگت کی مرعوبیت اس کا کھلا منہ بند نہ ہونے دیتی تھی۔ اب اتنی عام تام سی ہو کر بیٹھی ہے۔ اس میں اور میدو میں کوئی فرق نہیں، کیا انسان کی وقعت، اہمیت، قدر و قیمت کسی انسان کی بدولت ہے؟ کسی رشتے کی بدولت ہوتی ہے۔

باورچی خانے میں برتن کھنک رہے تھے، نئی ملازمہ کسی کا کھانا بنا رہی تھی۔ مگر...... خوشبوئیں کہاں مر گئی تھیں؟ سفر، تھکان، غم، بھوک، پیاس کے باوجود اشتہا کیا ہوئی؟ کتنا کچھ کھو گیا تھا، پورے کا پورا ایک زمانہ مر گیا تھا۔ اکیلی خالہ ارجمند نہیں مری تھیں۔

عنایہ کے ابو اندر آ کر صولت کو ایک طرف بلا کر حالات حاضرہ سے باخبر کر رہے تھے۔ دو عورتیں اب دیوان پر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھیں، دری پر ست بھرائی سر باندھ کر لیٹ رہی تھی۔ قدسیہ اندر چلی گئی تو میدو اس کے ساتھ چلی گئی۔

باغیچے کے درخت پر کوا کائیں، کائیں کر رہا تھا۔ تیتر کا پنجرہ خالی تھا۔ عنایہ باغیچے میں کھڑی تھی۔ ''سدا بہار سرائے'' سے تعزیت ہی اصلی جامع تعزیت تھی۔ یہاں اس کالے صوفے پر یہیں تو جمن خالہ بیٹھی تھیں۔

کتنی چین گزاری اے رات وے
کتنے دن گزر گئے، کتنے ان کی راہ تکتے طاق
(کواڑ) کھولے مت گئے کیا جمن خالہ کا بیٹا آیا ہوگا؟

جمن خالہ کی انکھیاں تو اس کی آس میں بند نہ ہوتی ہوں گی، عورت شوہر کی بے وفائی جھیل جاتی ہے مگر بیٹے کی بے وفائی جگر چھلنی کر دیتی ہے، ماؤں کو آنسو دے کر ترقی خوشی دیتی ہوگی؟

اب ناہیدہ آ گئی تھی، سسرالی گھر سے اپنا سامان لینے گئی تھی۔ وہ آٹھ ماہ سے یہیں تھی۔ اب سارے در بند کر کے واپس جا رہی تھی، ناہیدہ کے آنے سے ماں کی تعزیت سج گئی تھی۔ سب ایک جگہ بیٹھے تھے۔ جمن آپا کی اذیتوں کی کہانی اس قدر تکلیف دہ تھی کہ کسی آنکھ میں آنسو تھمتے نہ تھے۔ کینسر کی تشخیص، علاج، اسپتال سے بہت پہلے کا دور تھا، اسے ایک پھوڑا گردان کر نشتر لگائے گئے، مرہم ڈالے گئے، عقربی نسخے آزمائے گئے۔

''خالہ...... جب حکیم صاحب آتے اور پٹی بدلتے تو اماں جی کے منہ میں دبا ہوا دوپٹا دانتوں تلے کٹ جاتا تھا مگر اذیت کا دریا پار کر کے سانس لینے کی آسانی ملی تو کہتیں...... نیدو...... جا کھانا کھالے، بچوں کو کھلا، اپنے ابا کو دے۔''

(کہاں تک عورت کے پاؤں تلے جنت ہوگی، مولا جانے)

''کہیں تو لے جاتے جمن خالہ کو...... لاہور، کراچی، لندن۔'' عنایہ سے رہا نہ گیا۔

''میری مٹھی......'' ناہیدہ نے اشکوں سے تر رخسار والی عنایہ کا سر اپنی گود میں رکھا۔ ''اللہ تجھے کبھی غم نہ دکھائے، وحید بھائی نے بار، بار کہا کہ لندن لے آؤ، ٹکٹ دیتا ہوں، میری بھولی ماں، گھر نہ چھوڑتی تھی، گھر نہ چھوڑتی تھی وہ...... اتنے چاؤ سے کونہ، کونہ سجایا تھا، روز کہتی...... اب ٹھیک ہو جاؤں گی......'' ناہیدہ کے الفاظ ساتھ چھوڑ گئے، عنایہ نے سر اٹھایا تو وہ اپنے گھٹنوں میں سر دے کر ہچکیوں میں ڈوب گئی۔ صولت اسے سر پر تھپکتی تھی، جانے کون سے دلاسے دیتی تھی، وہاں تو درد سے سب کے دامن بھرے تھے اور درد ہی بٹ رہا تھا، پتا نہ چلا کب رضی الدین خالو سر پر آ پہنچے۔

''شام ہو رہی ہے، ہوا چل رہی ہے ٹھنڈی...... اٹھو یہاں سے اندر چل کر بیٹھو...... وہ دکھوں سے نجات پا گئی ہے، اللہ کی مرضی تھی، بندہ اس کی رضا پر صبر کرتا ہے، شریعت میں سوگ تین دن کا ہوتا ہے۔'' پھر ناہیدہ کو خفگی سے دیکھا۔ ''مہمانوں کو کھانا چائے دے...... ترا دل نہیں بھرتا دریاں بچھانے سے۔''

''میں جاتی ہوں، میری چھت چھاں نہیں یہاں۔'' ناہیدہ اٹھ کر بچوں کو بلانے لگی۔

''صولت بہن...... تم میری سالی بعد میں بنی، باپ کی بیٹی اور بہن پہلے تھی...... اب بہن بن کر میرے ساتھ آؤ، اپنی بھابی سے مل لو آ کر......''

''بھابی سے...... کیا؟'' صولت کو لگا اس کے کان بجے ہیں، رضی بھائی تیز بولتے ہیں کیا فضول سا جملہ کان نے سمجھ لیا ہے، وہ آنے کا اشارہ کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

''ناہیدہ......'' صولت نے پلٹ کر دیکھا وہ بچوں کو لینے چلی گئی تھی۔

''ست بھرائی۔'' صولت نے گھبرا کر آواز دی، ست بھرائی آہ بھر کر اٹھ رہی تھی۔

''ست بھرائی کا دانہ پانی یہاں سے اٹھ گیا... بی بی...... جو آپ نے سنا وہ سچ ہے، یہ معاملہ کئی مہینوں سے چل رہا تھا۔ نکاح بھی بی بی کے جیتے جی ہو گیا تھا، کل آ گئی...... آنے والی نے پہلا حکم پرانے نمک حلالوں کو نکالنے کا دیا ہے، شدو بیچارہ اپنی گٹھڑی باندھے بیٹھا ہے، ناہیدہ بی بی کی موٹر آ گئی ہے، میں کرماں سڑی اور میدو کو ہماری بستی پر اتارتی جائے گی...... اللہ ناہیدہ بی بی کو سکھ سلامت رکھے۔''

''ہا...ہا...'' دل پر ہاتھ پڑا۔

اب تو سوجھتا ہی کچھ نہیں تھا۔ کسی بات کا سرا ہی نہیں ملتا تھا۔ عنایہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''جاؤ، ابو کو بلا لاؤ، ہم چلتے ہیں۔''

عنایہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ واپس کیسے جائیں گے ابھی تو چند گھنٹے پہلے اتنے لمبے سفر سے پہنچے ہیں مگر یہ سمجھ آ رہی تھی کہ ان کا اب یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔

عنایہ اندرونی دروازے سے باہر نکل کر اِدھر، اُدھر دیکھ رہی تھی۔ شدو میاں دور پھاٹک کے پاس وہیں بیٹھا دکھائی دے گیا۔ اشارے سے بلایا، وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتا اٹھا، پاس آ کر پوچھا۔

''جی...... ککوری دھی......''

''شدو میاں...... میرے ابو کو بلا دیں۔''

''اچھا، دھی......'' وہ کندھے جھکائے دھیرے، دھیرے چلتا ہوا تھوڑی دور گیا پھر رک کر کچھ سوچا اور پلٹ آیا۔

''وہ وہاں شیخ صاحب بیٹھے ہوں گے، مجھے دیکھ کر غصہ کریں گے۔ مجھے تو وہ فجر ویلے کے نکال چکے ہیں وہ تو میں ناہیدہ بی بی کے انتظار میں رکا ہوا ہوں...... بی بی جائے گی تو ہم سب چلے جائیں گے۔ اچھا، ککوری دھی، ایسا کرتا ہوں کسی کو بھیج کر بلوا لیتا ہوں۔''

بیچارے پرانے ملازم، مجبتی اور وفادار...... ان پر بھی کیسا وقت آن پڑا تھا، صولت بھی دروازے پر چلی آئیں، عنایہ کے ابو آتے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتے بولے۔

”یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہو چکا ہے، سن لیا تم نے؟ سمجھ نہیں آرہی کیا کریں اب؟ تعزیت تو یہاں ٹھپ ہی ہو چکی ہے۔“

”جیسے بھی ہو...... یہاں رکنا بے سود ہے...... میں یہاں رک نہیں سکتی۔“ صولت کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے۔

”تم بچی ہو۔“ اس کے شانے کو تھپک کر صبر دلاتے بولے۔”ادھیڑ عمر کی بیوہ لاولد عورت ہے، ڈپٹی ڈائریکٹرس ہے، اب بیٹھنا۔ اس بڈھے شیخ کا ولیمہ کھانا ہے، اس مسز شیخ کے کلرک، چپڑاسی، دفتر والے آرہے ہیں...... شیخ صاحب سر اونچا کر کے بتاتے ہیں، یہ مسز شیخ کے ملازمین ہیں، فاتحہ خوانی کے بعد یہ شخص ایک فقرہ اپنی پچیس، تیس سالہ رفاقت کی یاد میں نہیں بولا۔“ ایک آہ بھری۔

”میں ناہیدہ بیٹی سے مل لوں...... اسپیشل ٹیکسی کروالوں گا۔“

”ہاں، آپ اندر آجائیں، دو چار عورتیں بیٹھی تھیں، وہ بھی کب کی جا چکیں...... اتنی سنسان کوٹھی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے، بہن کو روؤں کہ بہن کے بعد کی بے قدری کو...... ناہیدہ بچاری اپنے کپڑے لتے اکٹھے کر رہی ہے، سیدھی لاہور نکل رہی ہے۔“

وہ آپس میں بات کرتے ہوئے اندر آئے، ست بھرائی سامان اٹھائے موٹر میں رکھنے جا رہی تھی، ناہیدہ کے خالو نے ناہیدہ کے سر پر ہاتھ رکھا، تصویر غم تھی، ماں کے بچھڑنے کا درد تھا ہی باپ بھی نہ ہونے والوں میں شامل ہو چکا تھا۔ صولت نے بھی چادر اوڑھ لی۔ عنایہ نے ایک بار رک کر پیچھے گھر کو دیکھا...... قدسیہ اس کے برابر چل رہی تھی۔

”قدسیہ تمہارا جھولا؟“

”وہ میں نے توڑ دیا......“

”تمہاری اتنی سب گڑیاں......؟“

”...... دیں وہ توڑنے نہیں دیتی تھی۔“

”طوطوں کا جوڑا......؟“

”میں نے اڑا دیا...... میں نے باورچی خانے میں ہر سجاوٹ توڑ دی۔ میری مرضی، میری مرضی......“ عنایہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ غم و غصے سے اس کا ہاتھ تپ رہا تھا اور چہرہ سرخ تھا۔ وہ سب آگے پیچھے چلتے ہوئے پھاٹک تک پہنچے...... شدو میاں ایک بار پھر رونے لگا۔

”گھر خالی کر کے جا رہے ہو...... میری مالکن کے پیارو......“ پھر اس نے صولت کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”شدو میاں...... نہ، نہ کیا کرتے ہو جاؤ۔“

”بی بی، شدو سے ایک غلطی ہو گئی...... اس کا دکھ سینے پر پہاڑ کی طرح دھرا ہے۔“

سوالیہ نگاہیں...... شدو کانپتا ہوا بولا۔

”جمن بی بی کے فوت ہونے سے دو دن پہلے...... میں نے ایسی منحوس خبر سنی کہ عقل کام نہیں کر رہی تھی، حواس جگہ پر نہیں تھے۔ میں آم کی چھاؤں میں کھٹولے پر لیٹا دستی پنکھے سے پٹھ کھجا رہا تھا کہ منشی کچہری سے آیا۔ سائیکل کھڑی کی...... میرے پاس آکے بولا۔

”کوٹھی دوسری کے نام چڑھا دی شیخ صاحب نے......“ ہائے، ہائے، ہائے ہائے، قیس الٹی پڑ گئی، ننگے پاؤں اندر دوڑا۔ ناہیدہ بی بی برآمدے میں کھڑی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی میری بکا نکل گئی...... جو سنا تھا کہہ دیا...... ناہیدہ نے دوڑ کر جمن بی بی کے کمرے کا کھلا دروازہ بند کیا...... مگر وہ اِدھر ہی دیکھ رہی تھیں...... ہائے، ہائے میرے اللہ...... بی بی نے سن لیا...... جن آنکھوں میں اپنے درد پر کبھی آنسو نہ گرے تھے، ان آنکھوں میں آنسو تھے...... بس صولت بی بی...... وہ تو اسی گھڑی ختم ہو گئی تھیں۔ پھر بی بی نے کچھ کھایا نہ پیا اور نہ ہی کچھ بولیں۔“

”سدا بہار سرائے۔“ کی تختی بڑھتی ہوئی بیل میں چھپ کر صرف لفظ سرائے دکھا رہی تھی اور صولت پر ایک ایسا پل وارد ہو رہا تھا کہ جب بم گرتا دکھائی دے رہا ہو...... دیکھنے والا نشانے پر ہو مگر فرار ممکن نہ ہو۔

اس چھوٹی سی عمر میں خوب صورت لہجے اس کی کمزوری بن گئے تھے، جب انسان کو اپنا آپ ہی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔

اس کے لہجے کی نغمگی مت پوچھ
چلتے چلتے ٹھہر گئے ہیں لوگ

خوب صورت اور میٹھے بول ہر دوسرے قدم پر اس کے قدم روک لیتے۔ خود اماں بتاتی تھیں کہ جس وقت وہ دنیا میں آئی تھی تو خاندان کے سب سے بڑے بزرگ یا ور بھائی نے جب اس کے کان میں اذان دی تھی تو معصوم سی شیر خوار بچی نے چونک کر آنکھ کھول دی تھی اور بڑی پُرسکون ہو کر بنا آنکھ جھپکائے وہ ان کی دلکش آواز میں اللہ کا حکم سنے گئی...... اور آواز کے حسن کی بنا کیا پڑی...... وہ خوب صورت آوازوں میں الجھتی چلی گئی۔

اسکول میں تھی تو میڈم نبیلہ اسے کبھی اچھی نہیں لگیں...... ذرا سی بات پر کسی کو بھی اپنے اسکیل سے

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں (۲)

ناولٹ

سیما رضا ردا



پیٹ ڈالتیں...... ان کی کرخت آواز پوری کلاس میں گونجتی رہتی...... ان کی ڈانٹ، ان کی سزا اتنی سخت ہوتی کہ بچے ان سے سہمے ہی رہتے۔ اس کے برعکس مس رونق افروز کا انداز سب سے جدا تھا۔ وہ اتنے پیار سے پڑھاتیں کہ وہ کیا تمام بچے ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے انہیں ہی تکا کرتے اگر کوئی بچہ شرارت بھی کرتا تو وہ بے حد پیار سے اسے سمجھاتیں۔ ان کا من موہنا معصوم سا لہجہ دلوں میں گھر کرتا جاتا۔

اور جب وہ آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی تو اس وقت ریڈیو سننے کا شوق چرایا۔ خوب صورت آوازوں کا شوق یہیں زیادہ پروان چڑھا۔ ملی جلی خوب صورت آوازیں اپنے منفرد لہجے میں اسے بڑی اچھی لگا کرتیں۔

اسے سب علم تھا کہ موسیقی کا فرمائشی پروگرام اقبال کاردار کرتے ہیں۔ وہ رات کو نیند میں جھومتے ہوئے بھی ان کا پروگرام پابندی سے سنا کرتی۔ ''دھنک'' پروگرام کی کمپیئرنگ موئل شیرازی کرتی ہیں تو ''جھرنے'' پروگرام سیف کمال کرتا ہے۔ غرض یہ کہ ہر پروگرام کے میزبان کو اُن کے لب سے ایک جملہ ادا ہونے پر پہچان لیتی۔

یوں جب دل کو شعور ہی نہ تھا۔ خوب صورت لہجوں والے لوگ اس کے اندر بستے چلے گئے۔ جوں، جوں وہ بڑی ہوتی گئی، یہ عادت اس کی کمزوری بن گئی۔ جسے اماں اس کی خامی کہتیں۔

''ہائے اماں دیکھیں تو سہی زرینہ بھابی کتنے پیار سے بولتی ہیں۔''

زرینہ بھابی ملتان میں رہتی تھیں اور اس کے پھوپی زاد بھائی کی بیوی تھیں۔ ان کے بولنے کا اپنا مخصوص انداز تھا۔ ہر بات میں ''چندا'' کہتیں۔ لہجے میں ایک عجیب ہی دُلار تھا۔

مگر اماں کہتیں: ''ارے یہ میٹھی زبان ہی تو اس کی دولت ہے۔ ورنہ فاخرہ کو اس حالت میں اکیلا چھوڑا جاسکتا تھا۔'' زرینہ بھابی فاخرہ بھابی کی جیٹھانی تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا...... اور چھ مہینے بعد زرینہ بھابی نے علیحدہ گھر لے لیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ اس گھر پر ہمارا حق نہیں ہے۔ انہوں نے تو اپنی دانست میں نیکی کی تھی مگر اماں اور سارے خاندان والے کہتے تھے کہ بس اس کے میٹھے بولوں ہی میں جادو ہے۔ جو اس کے میاں نے بیوہ بھاوج اور تین یتیم بچوں کا خیال نہ کیا اور ان کو اس کسمپرسی میں اکیلا چھوڑ دیا...... پیٹھ پیچھے تو سب ہی برا بھلا کہتے تھے مگر جب زرینہ بھابی یہاں آئیں تو سب ان کے آگے پیچھے پھرا کرتے...... اور جب کوئی بھی ان کے گھر جاتا تو وہ بچھ بچھ جاتیں۔

اور اس کا خیال تھا زرینہ بھابی ہیں ہی اتنی اچھی اگر وہ اتنے اچھے طریقے سے بات نہ کریں تو سب ان کے دیوانے کیوں ہوں؟ آخر فاخرہ بھابی بھی تو ان سے ملتی تھیں مگر اماں کو زرینہ میٹھی چھری ہی لگتیں اور اماں کا خیال بدلنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔

اماں کہتیں: ''نوشینہ...... تو اتنی سے اتنی بڑی ہوگئی...... ابھی تک تیری پہچان وہی ہے، تو لوگوں کو اوپری، اوپری دیکھتی ہے۔ گہری نظر سے دیکھ تو پتا چلے کہ یہ میٹھی زبان کیسی ہوتی ہے؟''

اسے اماں کی باتیں کبھی سمجھ میں نہ آتیں بس یہی سوچ اس کے گرد ڈیرا ڈالے رہتی۔ بچپن سے دسویں تک کی عمر نے صرف مس رونق افروز کا لہجہ ہی متعارف کروایا تھا۔

اسے یاد تھا ایک دفعہ جب اس نے مس رونق کا ہوم ورک نہیں کیا تھا۔ تو اسے مس رونق نے ڈانٹنے کے بجائے بڑے پیار سے پوچھا تھا کہ اس نے کام کیوں نہیں کیا۔ کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ امی تو ٹھیک ہیں آپ کی؟ وغیرہ وغیرہ۔

اور وہ کتنا خوش ہوئی تھی مس کی اتنی توجہ پا کر۔ تب اس نے دوسرے روز گھر کے باغیچے میں لگے گلاب کا تر و تازہ پھول مس کے لیے توڑ لیا تھا۔ اور جب ان کو دیا تو انہوں نے کتنی خوشی سے اس کے ہاتھ سے پھول لیا تھا۔ بلکہ اس کے گالوں کو تھپتھپایا بھی تھا اور پھر اچانک مس رونق افروز کا تبادلہ ہوگیا تھا۔ تو وہ کتنے ہی دن روتی رہی تھی۔ حتیٰ کہ اماں سے ضد میں آ کر یہ تک کہہ دیا تھا کہ وہ اسکول نہیں جائے گی۔ مس رونق کے بغیر اسے اسکول میں کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اور وہ اماں سے آ، آ کر یہی کہتی تھی کہ وہ اب نہیں پڑھے گی۔ تب اماں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر اور کبھی پیار سے سمجھایا تھا کہ مس رونق تھوڑے دن میں آجائیں گی۔ اور وہ بہل گئی تھی۔ اور ان کے انتظار میں اسکول کی سرحدیں کالج سے جا ملیں۔ اور مس رونق افروز ذہن کے حافظے میں ایک خوب صورت یاد بن کر رہ گئیں۔

وہ اماں کی اکلوتی اولاد تھی۔ ابا کا انتقال ہوچکا تھا مگر وہ اپنے پیچھے خاصی جائداد چھوڑ گئے تھے۔ جو اُن دو نفوس کے لیے بہت تھی۔ اماں نے اسے پھولوں بھری چھاؤں میں پالا پوسا تھا۔ اس کے ناز نخرے اٹھائے تھے۔ اب کالج کی تمام سرگرمیوں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھی بلکہ شوق سے مباحثوں، مشاعروں کے مقابلے میں جایا کرتی۔ اماں نے کبھی روک ٹوک نہیں کی تھی۔ بس یہ حکم ضرور تھا کہ مغرب سے پہلے گھر میں موجود ہونا چاہیے۔ مائرہ اس کی قریبی دوست تھی۔ دونوں بی اے فائنل ایئر میں تھیں۔ تمام سوشل ایکٹویٹیز میں مائرہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔

اس دن بھی آرٹس کونسل میں مباحثہ تھا۔ مباحثے کا عنوان تھا۔

''ہم جھوٹ بولتے ہیں۔''

آرٹس آڈیٹوریم میں مباحثے کے جوش و خروش کا عالم دیدنی تھا۔ لفظوں کی برساتیں عجیب چوٹ لیے ہوئے تھیں۔ مخالفت اور موافقت میں ڈھیروں پوائنٹس دیے جارہے تھے۔ ہر ایک دلچسپی سے دیکھنے اور سننے میں مصروف تھا۔ تب این ای ڈی کے مانے ہوئے ڈیبیٹر کا نام پکارا گیا۔ بلال طاہر کچھ اس طرح موضوع کی حمایت میں بولا تھا۔

''آسمانوں سے فرشتے بھی جو اتارے جائیں
وہ بھی اس دور میں سچ بولیں تو مارے جائیں''

پھر اس نے بڑی خوب صورتی سے کہا تھا۔

''تو آپ، میں، ہم سب مان کیوں نہیں لیتے کہ ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ اور بول رہے ہیں۔'' اس کے دلائل میں اتنی سچائی تھی کہ وہ واقعی پہلا انعام جیت گیا۔ بلال طاہر اسے بے حد سچا لگا تھا۔ اس کی آواز کی مضبوطی اور دلائل نے اسے کھرا ثابت کردیا تھا۔ اور وہ پہروں یہی سوچتی رہی کہ اللہ نے آوازوں کو بھی کیا حسن عطا کیا ہے۔ آواز یا لہجے اگر کمزور ہوں تو مایوسی طاری ہوجاتی ہے۔ اور طاقتور ہوں تو خوش نصیبی آپ کا مقدر...... بلال طاہر کی آواز کی بازگشت اسے اپنے اطراف محسوس ہوتی۔ اس کے لہجے نے دماغ میں جگہ بنالی تھی۔

مائرہ نے بلال طاہر کی ڈیبیٹ پر خاصے ریمارکس دیے تھے۔

''لیکن مائرہ اس نے بڑی سچائی سے خود کو منوایا اور واقعات و حالات کا اتنا زبردست تجزیہ! واہ بھئی......'' وہ واقعی ششدر تھی۔

''صاحب کردار آدمی ہوگا۔'' مائرہ شوخی سے ہنسی۔

''کیا مطلب......؟'' اسے سمجھ نہ آئی۔

''ارے بھئی تم نے سنا نہیں۔

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اس پہ ظفرؔ
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے!

تو جناب قائم رہنا بہت بڑی بات ہے اور ''قائم رہنا'' میں کمال کرنا اس سے بھی بڑی بات اور عین ممکن ہے۔ وہ شخص اس ہنر سے واقف ہو۔'' مائرہ نے جواب دیا۔

''اب ظاہر ہے جھوٹ کے گواہ تو ہوتے نہیں۔ میرا مطلب ہے جھوٹ کے پاؤں تو ہوتے نہیں۔ بلال طاہر نے بڑی فنکاری سے جھوٹ کا پودا بو دیا۔'' مائرہ نے اپنی دانست میں بلال طاہر کو صاحب کردار ثابت کردیا۔

''نہیں مائرہ! تم اس طرح کیوں کہہ رہی ہو؟ تمام شرکاء سے اس کا موازنہ کرکے دیکھ لو۔ سب پہ وہی سبقت لے گیا تھا۔''

"ارے رہنے دو۔" مائرہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ "ساری بات اس کے لہجے کی دلکشی کی ہے۔ وگرنہ دلائل دینے میں سچ اور جھوٹ دونوں کا سہارا لینا پڑتا ہے نوشینہ بی بی، ورنہ بات کیسے بنے۔ سچ کہنے سے صرف حوصلہ ہوتا ہے لیکن یاد رکھو اپنا آپ منوانے کے لیے مبالغہ آرائی بہت ضروری ہے اور اس مبالغہ آرائی میں سچ سے زیادہ جھوٹ ہوتا ہے سمجھیں!"

"اچھا بھئی بس کرو۔ تم نے تو بالکل ہی بے مزہ کردیا۔" اس نے بات ختم کرنا چاہی۔ "اس نے خود کو اتنی سچائی سے ثابت کیا تھا اور تم......" وہ تقریباً برا مان کر منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

"بات ساری یہ ہے کہ بلال طاہر اپنے لب و لہجے سمیت تمہیں اسیر کر گیا ہے۔"

اس نے جھٹ سے آئینہ اس کے سامنے کردیا۔

اور وہ آئینہ دیکھ کر بھی آنکھ بند کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اور بات گئی رات گئی کے مصداق مائرہ کی کہی آخری بات دل میں رقم ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر غلام مرتضیٰ کی تقریر وہ بہت دلجمعی سے سنتی تھی۔ بلکہ جس روز ٹی وی پہ ان کا خصوصی پروگرام آتا تھا۔ جلدی، جلدی سارے کام نبٹا لیتی۔ اور ٹی وی کے سامنے آکے بیٹھ جاتی۔ ڈاکٹر غلام مرتضیٰ کا لیکچر اس کے اندر قطرہ در قطرہ کرکے اترتا جاتا۔ دنیا سے جی اچاٹ ہوجاتا۔ اسے لگتا جیسے ان کے لیکچر سے اس کے اندر ایک اور نوشینہ جنم لے رہی ہو۔ دنیا بھر کی بے تکی باتیں جو ارد گرد ہوتی رہتی تھیں... وہ کہیں دور جا بستی تھیں۔ فیشن، فلم، اداکاروں کی باتیں جو زندگی کا حصہ بنتی جارہی تھیں۔ جو اس کی عمر کی لڑکیوں میں عام تھیں۔ اس کے اوپر بھی ان باتوں کا بہت اثر تھا۔ مگر ذہن کا ایک گوشہ کہیں ان باتوں کے لیے بھی مخصوص تھا جو اسے دوسری لڑکیوں سے ممتاز کرتا تھا۔ مگر کچی عمر کی لڑکیوں کی طرح ابھی شعور و آگہی کا رنگ اس پہ پوری طرح چھایا نہیں تھا۔ بس خوب صورت گفتگو اسے اچھی لگا کرتی۔

بڑے ذوق شوق سے وہ ٹی وی دیکھنے میں مگن تھی۔ ابھی پروگرام ختم ہی ہوا تھا کہ مائرہ کا فون آگیا۔

"سنو، سلیم کوثر کا نیا شعری مجموعہ آگیا ہے۔" اس نے بڑے جوش سے اطلاع دی تھی۔

"کون سا......؟" اس نے بھی جواباً اسی جوش سے پوچھا۔

"محبت اِک شجر ہے۔ اور جناب کل تقریب رونمائی ہے چلنا ہے......" اسے معلوم تھا کہ پوچھنا تو رسم ہے وہ تو چلنے کو ہر لمحہ راضی رہتی تھی ایسی محفلوں میں......

اور ہوا بھی یہی، دونوں کالج سے واپسی پہ تقریب میں موجود تھیں۔ دونوں دیر سے پہنچی تھی...... یہ بھی اچھا ہوا کہ سلیم کوثر نے ابھی اپنا کلام نہیں سنایا تھا۔ ابھی تو کتاب کے حوالے سے تنقیدی گفتگو ہورہی تھی۔ تب سلیم کوثر کو اسٹیج پہ آنے کو کہا گیا۔ انہوں نے کتاب کے پس منظر اور عنوان پہ تبصرہ کیا اور ایک بہت خوب صورت نظم "چھاؤں" سنائی۔

"محبت میں ایک ایسا موڑ آتا ہے
جہاں آکر کہانی ہار جاتی ہے
کہانی میں تو کچھ کردار ہم خود فرض کرتے ہیں
محبت میں کوئی کردار بھی فرضی نہیں ہوتا
کہانی کو کئی کردار مل جل کر کہیں آگے چلاتے ہیں
محبت اپنے کرداروں کو خود آگے بڑھاتی ہے
کہانی میں کئی کردار زندہ ہی نہیں رہتے
محبت اپنے کرداروں کو مرنے ہی نہیں دیتی
کہانی کے سفر میں منظروں کی دھول اڑتی ہے
محبت کی مسافت، راہ گیروں کو بکھرنے ہی نہیں دیتی
محبت اِک شجر ہے
اور شجر کو اس سے کیا مطلب
کہ اس کے سائے میں جو بھی تھکا ہارا مسافر
آکے بیٹھا ہے
اب اس کی نسل کیا ہے رنگ کیسا ہے
کہاں سے آیا ہے، کس سمت جانا ہے

شجر کا کام تو بس چھاؤں دینا، دھوپ سہنا ہے
اسے اس سے غرض کیا ہے
پڑاؤ ڈالنے والوں میں کس نے چھاؤں کی تقسیم کا
جھگڑا اٹھایا ہے
کہاں کس عہد کو توڑا، کہاں وعدہ نبھایا ہے
مگر ہم جانتے ہیں
چھاؤں جب تقسیم ہوجائے
تو اکثر دھوپ کے نیزے رگ و پے میں اترتے ہیں
اور اس کے زخم خوردہ لوگ
جیتے ہیں نہ مرتے ہیں!"

داد و دہش، واہ، واہ اور تالیوں کی گونج میں سلیم کوثر دوبارہ اپنی نشست پر براجمان ہوچکے تھے۔ مگر اس محفل سے واپس آنے سے پہلے اس کے ذہن میں اس نظم سے متعلق بہت سے سوالات بیدار ہوچکے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شاعر کے روبرو جاکر ان پر سوالات کی بوچھاڑ کردے۔ عجیب نظم تھی جس سے وہ متفق نہ تھی تب ہی تو گھر آتے، آتے مائرہ کا دماغ کھا چکی تھی۔

"آخر محبت میں ایسا موڑ آتا ہی کیوں ہے، کیا کہہ گئے ہیں وہ باتوں، باتوں میں؟" وہ چڑ گئی تھی۔

"موڑ تو ہر کہانی میں ہوتا ہے پیاری۔" مائرہ نے اپنی تجزیہ نگاری دکھائی۔ "پھر محبت تو اس کائنات کا سب سے لطیف اور لازوال جذبہ ہے۔ محبت کی مسافت راہ گیروں کو بکھرنے نہیں دیتی۔ محبت تو اِک شجر ہے، جو چھاؤں دیتا ہے۔" مائرہ بڑی ترنگ میں بول رہی تھی۔

"ہونہہ...... نظم کے آخری پیرائے پہ بھی ذرا غور کرلو۔ وہ خود ہی کہہ رہے ہیں۔

چھاؤں جب تقسیم ہوجائے
تو اکثر دھوپ کے نیزے رگ و پے میں اترتے ہیں
اور اس کے زخم خوردہ لوگ
جیتے ہیں نہ مرتے ہیں!

تو پھر ایسی اذیت بخش محبت کا فائدہ جو بندے کو تپتی دوپہر میں لا کھڑا کردے۔"

"نہیں نوشینہ! محبت سے تم پھر بھی انکار نہیں کرسکتیں۔ اپنے اطراف ہی دیکھ لو کہ اگر تمہارے اپنوں نے بھی تم سے بے رخی سے بات کی تو کیا تم یہ انداز سہہ سکوگی؟" مائرہ کی بات میں وزن تھا اور دلیل دینے میں وہ کم نہ تھی۔

"ہاں سہہ لوں گی۔" اس نے بڑے زعم سے کہا۔ "کیونکہ تم جانتی ہو کہ مجھے کسی کی اتنی پروا ہوتی نہیں ہے۔"

"خیر یہ نہ کہو، بڑے بڑوں کو آہیں بھرتے دیکھا ہے، محبت کی حسین وادی میں۔"

"تو محبت کی وادی میں قدم رکھا کس نے ہے؟" اس نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔" مائرہ کے لہجے میں بڑا یقین تھا کہ آگے، آگے دیکھیے کا بورڈ چسپاں تھا اور وہ دوبارہ شعری مجموعے کو کھول کر پڑھ رہی تھی۔

"خدا کے لیے آئندہ اس نظم کو کھول کر نہ بیٹھنا میرے سامنے۔" نوشینہ نے اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

☆☆☆

پھولوں کی پنکھڑیاں چننے والی لڑکی بھی عجیب ہوتی ہے۔ بہار کے ہاتھوں میں ہر وقت وجود محسوس ہوتا ہے۔ وہ بھی تو ایسی ہی تھی، بارش کی ہنسی، پھولوں کی ہنسی سے پیار کرنے والی۔ آگہی کے شور سے بہت دور۔ پوری نیند سونے والی، خوابوں کے شیش محل میں رہنے والی۔

اس نے بھی عجیب سا خواب دیکھا تھا کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ سمندر پر پکنک منا رہی ہے۔ مگر ایک لمحہ آتا ہے کہ وہ سب ساتھیوں سے الگ ہوکر ساحل کے کنارے تنہا گیلی ریت پہ بیٹھی ہے۔ آتی جاتی لہروں کو گن رہی ہے یا پھر گیلی ریت پہ کسی کا نام لکھ رہی ہے۔

"کس کا نام؟" اس نے گہری نیند سے بیدار ہوکر گیلی ریت پہ وہ نام دیکھنا چاہا تھا۔ انگلیاں پھیریں تو ہاتھ میں شکن آلود چادر سمٹ گئی اور نام پتا نہیں مٹ

گیا تھا یا بگڑ گیا تھا۔ اور وہ ماحول کے حبس میں جیسے سانس روکے ہوئے تھی۔ تب تازہ ہوا کی طرح ایک خوش رنگ خیال اس کے دل کو چھو گیا تھا۔

☆......☆......☆

”اے آنکھ! اب تو خواب کی دنیا سے لوٹ آ
مژگاں تو کھول! شہر کو سیلاب لے گیا!“

مائرہ حسبِ موقع شعر پڑھتی ہوئی اس کے سر پر سوار تھی اور وہ اسی ایک ہفتے پہلے کے دیکھے ہوئے خواب کے حصار میں تھی۔

”ارے تم کب آئیں؟“ وہ اسے دیکھ کے خاصی حیران تھی کہ اس کے آنے کا تو پتا ہی نہیں چلا تھا۔

”سنو تم یہ بیٹھے، بیٹھے خوابوں میں کیوں گھوم رہی تھیں، عجیب مدہوش سی لگ رہی ہو۔“

”کچھ نہیں بابا......“ وہ اس کے تشویش والے لہجے پہ گھبرا سی گئی۔ ”نیند پوری نہیں ہو رہی۔ اماں صبح ہی صبح اٹھا دیتی ہیں۔“ جلدی سے وضاحت کی کہ مائرہ سے کچھ چھپانا فضول تھا۔ مگر نیند کا سارا پس منظر چھپا گئی۔

”یہ بتاؤ تم صبح ہی صبح کیسے نازل ہو گئیں؟ چھٹی کے روز تم بھی نیند پوری کر لیتیں۔“ اس نے فوراً کہا۔

”یا وحشت نوشینہ!“ اس نے چڑ کر کہا اور پاس پڑا اخبار اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”اس وقت بارہ بج رہے ہیں۔ میں ضروری کام سے آئی ہوں اور وہ یہ کہ آج شام سات بجے فرحان بھائی کی گارمنٹ فیکٹری کا افتتاح ہے، اس خوشی میں پارٹی ارینج کی ہے۔ حالانکہ رات میں تمہیں اتنا فون کیا مگر تمہارا فون بالکل تمہاری طرح ہے۔ کوئی ایکشن نہیں لیا اس نے، بس بجتا ہی رہا۔“ چلتی قینچی کی طرح اس کی زبان ایک دم خاموش ہو گئی اور وہ گہری گہری سانس لینے لگی۔

”لہٰذا براہِ کرم آپ چھ بجے تیار ملیے گا۔ خالہ جان سے میں نے کہہ دیا ہے تمہیں پک کر لوں گی۔ اس وقت جلدی میں ہوں۔ کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ لہٰذا چائے بھی نہیں پیوں گی۔ خدا حافظ بس تم تیار ملنا۔“ بے حد تیزی سے کہہ کر وہ چلتی بنی اور وہ حیران ہو کر اپنی آنکھوں کو رگڑنے لگی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ مائرہ آ کر جا بھی چکی ہے اور خاصی تقریر بھی کر گئی ہے۔

جمعہ کا دن تھا جلدی، جلدی کام نمٹائے کہ مائرہ وقت کی پابند تھی اور وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر کپڑوں کا انتخاب کیا۔ پھر کپڑے پریس کیے۔ پھر تھوڑا سا نیند کا بھی ذائقہ لے لیا۔ آنکھ کھلی تو ساڑھے پانچ ہو رہے تھے۔ ہول کر رہ گئی۔ آدھ گھنٹا تھا مائرہ کے آنے میں اور اس کا غصہ۔ جلدی، جلدی تیار ہوئی۔

کاسنی سیلف پرنٹ کا سوٹ تھا۔ جس پر Patches سے اس نے ڈیزائننگ کی تھی اور بڑا سا کاسنی دوپٹا شانوں پر ڈالے وہ خاصی اچھی لگ رہی تھی۔ سادہ سے میک اپ نے اس کے چہرے کو مزید تر و تازگی بخش دی تھی۔

مائرہ کی گاڑی کا ہارن چھ بج کر دس منٹ پہ سنائی دیا اور وہ اس کے اندر آنے سے پہلے ہی بالوں میں برش پھیرتی، اماں کو خدا حافظ کہتی باہر نکل آئی۔

فرحان بھائی ڈرائیونگ سیٹ پہ تھے۔ مائرہ ان کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان تھی۔ اس نے پیچھے نشست سنبھال لی تو فرحان بھائی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ فرحان بھائی اس کی خیر خیریت پوچھنے لگے۔ مائرہ کی طرح وہ اس کا بھی خیال رکھتے تھے۔ وہ بھی انہیں بڑے بھائی کی طرح عزت دیتی تھی۔

مارچ کا مہینہ بھی بڑی خوب صورتی لیے ہوتا ہے۔ بہار کی دلکشی ہر شے پہ محسوس ہوتی ہے۔ فضا گنگناتی ہوئی سی لگتی ہے۔ جیسے اس وقت نوشینہ کو ہر چیز نکھری، نکھری اور پیاری لگ رہی تھی۔ اپنا آپ پیارا لگ رہا تھا۔ جانے کیوں شاید۔

عمر ایک ایسی بھی ہوتی ہے جس میں دل کو
ہر چیز اچھی لگتی ہے حقیقت کے سوا

عمر کا دخل بھی تو ہر شے کو خوب صورتی عطا کر دیتا ہے۔ پھر کم عمری میں تو چیزوں کے برتنے کا فن ہی الگ ہوتا ہے۔ وہ دنیا جہاں سے بے نیاز راستوں سے گزرتے ہوئے ہر لب و بام کو دیکھے جا رہی تھی۔ بس دیکھے جا رہی تھی نہ تجسس تھا نہ اسرار، نہ دلچسپی، بس ہر شے بھلی لگ رہی تھی۔

”سنیے نوشینہ عمر خیالوں سے واپس آ جائیں اندر بھی آپ کو جانا ہے۔ ساری عمر آپ کو سفر ہی نہیں کرنا ہے۔“ مائرہ گردن موڑ کر اپنی دانست میں اسے جگا رہی تھی۔ اور وہ خجل ہو کر اس کے ساتھ تیزی سے اتر کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

سائٹ ایریا میں انہوں نے فیکٹری تعمیر کی تھی۔ فرحان سے چھوٹے صفان وہاں موجود تھے۔ وہ اور مائرہ ویلکم کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ خاصے مہمان مدعو تھے۔ تقریباً ساڑھے سات بجے تک تو مہمانوں کی آمد کا سلسلہ ہی رہا۔ تب کہیں جا کے مہمانوں کی فہرست پوری ہوئی۔

آخری مہمان بڑی خاص اور قد آور شخصیت کے حامل تھے جو فرحان بھائی کے بے حد قریبی دوست تھے جس کا اظہار فرحان بھائی کی بہت بے چینی سے تھا۔ جب وہ آئے تو نوشینہ کا ان کی طرف رخ نہ تھا اور تب ہی فرحان بھائی سے وہ بڑے تپاک سے ملتے ہوئے عین اس کے سامنے آ ٹھہرے۔ اپنے دلکش لب و لہجے سمیت......

”بلال طاہر“ زبان نے اس کا نام ترپ کر پکارا تھا۔

جاگتی آنکھوں سمیت بلال طاہر سامنے ایستادہ تھا۔ کچی عمروں کے نئے جذبے بھی کیا ہوتے ہیں، دل کہ پھول کھلنے کی عمر بھی ہوتی ہے اور آگہی بھی۔

”ارے آپ تو وہی ہیں ناں!“ مائرہ کی شوخ آواز سنائی دی۔ پھر اس نے نوشینہ کو پکارا۔ ”نوشینہ یہ ہیں بلال طاہر، فرحان بھائی کے بے حد قریبی دوست، جن کی ڈیبیٹس پہ ہم نے بہت اچھے ریمارکس دیے تھے۔ بڑے دنوں تک آپ کی ڈیبیٹ ہمارے درمیان موضوعِ بحث رہی۔“ مائرہ نے اسے بتاتے ہوئے پھر بلال طاہر سے کہا۔

اور شناسائی کا یہ پل پا کر بے اختیار بلال طاہر نے بھی اسے دیکھا اور مخاطب ہو بیٹھا۔

”کیوں، میری ڈیبیٹ میں ایسی کیا بات تھی جس کا اتنا چرچا رہا؟“ وہ براہ راست اس سے ہم کلام تھا۔ پُرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے......اور وہ گڑبڑا گئی تھی۔

”بس آپ کا سچ اچھا لگا تھا۔“ وہ اسی قدر کہہ سکی تھی۔

”خیر اچھا تو بہت کچھ لگا تھا آپ کو کیا خبر......“

”مائرہ!“ اچانک صفان کی آواز نے اس کی بات مکمل ہی نہ ہونے دی۔ وہ آواز کی سمت مڑ گئی اور بات وہیں رہ گئی۔ جبکہ فرحان بھائی کی رہنمائی میں وہ لوگ اندر کی جانب بڑھ گئے۔ افتتاحی تقریب جاندار رہی۔ اس کے بعد ڈنر کا اہتمام تھا۔ وہ مائرہ کے ساتھ، ساتھ تھی۔ اس کے ساتھ مہمانوں کو بھی اٹینڈ کرتی رہی۔ تب ہی مائرہ اس کا ہاتھ تھامے فرحان بھائی کے گروپ کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں بلند و بانگ قہقہے لگ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ بلال کے جملوں نے محفل کو زعفران زار بنایا ہوا ہے۔

”ارے مائرہ، نوشینہ آؤ۔ تم لوگ ٹھیک سے ملیں اس صاحبِ طرزِ شخصیت سے۔“ فرحان بھائی نے پوچھا۔ مائرہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولے۔ ”ارے کمال کا شخص ہے بلال، ایسی دلچسپ اور خوب صورت باتیں کرتا ہے کہ بس، قطعاً بور نہیں ہونے دیتا۔ بھئی بہت جاندار گفتگو کرتا ہے۔“ فرحان بھائی نے کہا تو مائرہ بولی۔

”ہم بھی تو سنیں ایسی کیا خوبی ہے آپ میں؟“

”ارے تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے مائرہ بی بی۔ اس کے علاوہ کہیں مل بیٹھیں گے تو پھر ضرور محظوظ کریں گے اپنی باتوں سے آپ کو۔“ وہ بڑے دلکش لہجے میں بولا تھا۔

”آپ کیا بولتی نہیں ہیں؟“ اس نے مائرہ کے ساتھ خاموش کھڑی نوشینہ کو چھیڑا۔

"نہیں سننے کا بہت شوق ہے۔" مائرہ نے فوراً جواب دیا۔

"تو کیا سنیں گی آپ؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"سچ۔" وہ بھی نہ جانے کس دھیان میں.... بے اختیار بول اٹھی۔

"سچ سننا چاہتی ہیں آپ؟" وہ اس کے چہرے پہ نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔ "تو سنیے مجھے آپ بہت اچھی لگی ہیں پہلی نظر میں۔"

شکر تھا فرحان بھائی نہیں تھے اس وقت مائرہ کو بلا کے وہ خود دوسرے مہمانوں میں مصروف ہوگئے تھے اور بلال طاہر کا یہ جملہ سچ تھا یا کوئی دھماکا جو کانوں سے ہوتا ہوا دل و دماغ کو تہ و بالا کر گیا۔ تب مائرہ بھی جیسے سن سی ہوگئی تھی۔

"اتنا خوب صورت سچ پہلی بار دیکھا بلکہ سنا ہے۔"

"کیوں، ہمارا سچ آپ کو اچھا نہیں لگا؟" اس کی تائید پاکر نوشینہ سے پوچھا۔

اچھا یا برا تو کچھ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دلِ دماغ ساکت سے ہوگئے۔ عجب حشر سا بپا تھا۔ دل چاہ رہا تھا بلال طاہر کی نظروں سے کہیں دور چلی جائے۔ اپنا وجود اس کے حصار میں لگ رہا تھا۔

"ارے آپ اتنی پزل کیوں ہو رہی ہیں؟ آپ نے سوال کیا میں نے جواب دیا۔ بات ختم!" بلال طاہر نے اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی مشکل آسان کی اور دوسری طرف مڑ گیا پھر تو مائرہ نے اس کا گھیراؤ کرلیا اور مبارک باد دینے لگی۔

"سنو بس گھر چلو مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

اس نے مائرہ کے مذاق سے گریز چاہا۔

"فرار کیوں ہو رہی ہو۔ ساتھ ہی چلتے ہیں۔" مائرہ نے اس کی کیفیت دیکھ کر خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

تقریب کا ہنگامہ گیارہ بجے تک رہا۔ بلال طاہر جاتے وقت بھی بڑے دلکش انداز میں اسے خدا حافظ کہہ کر گیا اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ گھر آگئی۔ دل اس کی کہی بات پر جھومنے لگا تھا۔ بلال طاہر کا نام ستارہ بن کر چمک چکا تھا۔ رات بھر آنکھ جیسے کھلی رہی، دل کے در بھی کھلے رہے۔

"آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔" پہلی بار صنفِ مخالف کا یہ جملہ کچے ذہن کی اس لڑکی کو سرشار کرتا رہا۔ جو اس کے دل میں پہلی بار دھڑکا تھا۔

☆☆☆

کئی روز گزر گئے تھے۔ مائرہ نہ آئی تو وہ خود ہی اس کے ہاں آگئی۔

"شکر ہے تمہیں بھی فرصت ملی میرے پاس آنے کی۔" مائرہ اسے دیکھتے ہی بے چین ہو کر بولی۔

"میں نہ آؤں تمہاری طرف تو تم پلٹ کر پوچھو ہی نہ۔" وہ خفگی سے بولی۔ نوشینہ نے اسے اپنی باتوں سے منا لیا تھا۔

دونوں چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ باتوں میں مگن تھیں۔ مائرہ چپس کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"اک عجیب بات بتاؤں۔ خیر عجیب کیا تمہارے لیے تو بڑی اچھی بات ہے اور زبردست سرپرائز بھی۔ بلال طاہر نے اس پورے ہفتے چار پانچ فون کیے ہیں۔ اتفاق ہی رہا ہے کہ ہر دفعہ میں نے فون ریسیو کیا۔ چار باتیں ہم سے متعلق اور آٹھ باتیں تم سے متعلق ہوتی تھیں...... "نوشینہ کیسی ہے، کیا کرتی ہے، کہاں رہتی ہے۔ آپ کی کیسی دوست ہے وغیرہ وغیرہ۔ کل تو میں چڑ ہی گئی۔ میں نے پوچھا آخر آپ اس کے بارے میں اتنا کیوں پوچھتے ہیں؟" ذرا سی دیر وہ رکی تھی۔

"کہنے لگے۔ وہ مجھے بہت اچھی لگی ہے۔ اس سے مجھے ملاؤ۔" اور سنو بڑے جذباتی انسان ہیں موصوف، یہ بھی بتا رہے تھے کہ میں اب پریکٹیکل فیلڈ میں آگیا ہوں، اپنے پاپا کا بزنس سنبھال لیا ہے۔ سب بضد ہیں کہ شادی کا فیصلہ کرلو۔ تمہاری دوست مجھے اچھی لگی ہے۔ کیا وہ میری لائف پارٹنر بننا پسند کرے گی۔ مگر اس کی پسند پوچھنا بھی ضروری ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اس سے میرے بارے میں رائے لو۔" دیکھو تو اتنا بڑا فیصلہ انہوں نے مجھ پر چھوڑ دیا۔"

آج تو مائرہ نے اسے حیران کر کے ہی چھوڑا۔

"ہاں اب تم بتاؤ کیا کہتی ہو ان کے بارے میں؟" مائرہ نے پوری بات بتا کر اس کی رائے لی۔

وہ تو ہکا بکا تھی۔ عجیب حیران کُن مرحلے پہ کھڑا کر دیا تھا بلال طاہر نے، یہ تو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ......

"میں کیا بولوں؟" وہ گڑبڑا گئی۔

"بھئی ظاہر ہے اگر وہ تمہیں پسند ہے تو بات آگے بڑھ سکتی ہے اگر نہیں پسند تو بات یہیں ختم سمجھو۔" مائرہ تیزی سے بولی۔

"نہیں، برے تو وہ نہیں ہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اس کا مطلب ہے پسند ہیں، میرا خیال درست تھا۔ اس وقت سے ہی ناں جب تم نے ان کی ڈیبیٹ سنی تھی۔ تم جب سے ہی گرویدہ تھیں۔ چلو بھئی بلال بھائی کی نیت صحیح تھی تو منزل بھی آسان ہوگئی۔" اس نے چڑانے کے طور پر کہا اور وہ جھینپی جھینپی ہنسی ہنسنے لگی۔

☆☆☆

کتنے عجیب شب و روز ہوگئے تھے۔ ایک نئے انکشاف نے زندگی کے حسن کو ندرت بخش دی تھی۔ پیار کی نئی دستک کیا سنائی دی وہ اپنے آپ پر...... دنوں حیران رہی۔

مائرہ نے کہا تھا۔ "بلال طاہر نے سوچنے کا وقت دیا ہے۔ کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔"

آنکھ میں کتنے ہی ستارے اتر آئے تھے۔ ہاتھوں میں گلاب تھامے وہ سوچوں کی وادی میں اتر جاتی۔

"سوچوں تو وہ ساتھ چل رہا ہے، دیکھوں تو نظر آ رہا ہے۔"

لیکن اس کی نظر نے اس کے حق میں ہاں کر ہی دی۔ ان کے خواب کا ذائقہ اور دور ساحل پہ بیٹھی ہوئی موجوں کے آہنگ سے بے خبر ریت سے ایک ننھا گھروندا بنانے میں مصروف کسی ننھی بچی کی طرح اس نے رضامندی دے دی کہ فصلِ بہار کے پہلے گلابوں کی ٹھنڈک لیے بلال طاہر کا "وش کارڈ" "کیک" ملا۔

"میں ہر حال میں مسکراتا رہوں گا
اگر تمہاری محبت ساتھ ہوگی"

اگر کہہ کر محبت کا فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ ایک نازک خیال لڑکی جس کے فیصلے ریشم کی طرح تھے۔ بس اس کی محبت پہ اپنی محبت نچھاور کرنے کو تیار......

بلال طاہر کے والدین فرحان بھائی کی معیت میں اس کے گھر آئے تو مائرہ بھی ساتھ تھی۔ اماں نے یوں تو بڑھ چڑھ کر ان لوگوں کی پزیرائی کی۔ خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مگر جب مدعا معلوم ہوا تو سوچ میں پڑ گئیں کہ ایک تو اُن کے ہاں برادری سسٹم تھا۔ دوسرے شوہر ان کے سر پر نہ تھا۔ اور وہ بے حد پرانے مزاج کی حامل خاتون تھیں۔ باہر سے آنے والے رشتوں کو اس وقت دیکھا جاتا تھا۔ جب برادری میں ہم عمر رشتے موجود نہ ہوں۔ نوشینہ کے لیے اس کے ہم عمر رشتے تھے مگر کسی کا اس طرف ابھی خیال نہ گیا تھا۔ اماں نے...... سردست تو کچھ نہ کہا مگر ان لوگوں کے جانے کے بعد بڑی دیر تک سوچتی رہیں۔ بلال طاہر انہیں بھی پسند آیا تھا اور پھر اچھے رشتے تو ویسے بھی بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔

اماں نے قریبی عزیزوں سے مشورہ کیا تو متفرق رائے بھی ملی۔ مگر ان مشوروں کے باوجود مسئلہ یہ تھا کہ نوشینہ کے جوڑ کے لڑکے ابھی زیرِ تعلیم تھے۔ غمِ دوراں سے نہ الجھے تھے۔ یوں بہت کچھ سمجھتے ہوئے اور سوچ بچار کر کے انہوں نے یہی بہتر جانا کہ آنے والے پہلے رشتے کو یک دم ٹھکرانا دانشمندی نہیں۔ اللہ کو بھی یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ یوں انہوں نے بلال طاہر کے گھر والوں کو رضامندی دے دی۔

پھر چند روز بعد منگنی کی تقریب بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ نوشینہ کے گھر کا ماحول خاصا بیک ورڈ تھا۔ اس لیے اماں نے اپنی پرانی روایت کے تحت رسم انجام دی۔ جبکہ بلال طاہر کا اصرار تھا۔ وہ نوشینہ کو خود انگوٹھی پہنائے گا۔ ان کے والدین نے بھی اماں سے کہا تو اماں نے صاف لفظوں میں کہا کہ ہمارے خاندان میں

ایسا نیا نویلا نہیں ہوتا ہے۔ مجھے اپنا سر جھکانا نہیں ہے۔ وہی ہوگا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

اور وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا تھا۔ بلال کے گھر والے اور چند قریبی عزیز آئے اس کو انگوٹھی پہنانے بے حد سادگی سے۔ اسی طرح اماں بھی چند قریبی عزیزوں کو لے کر منگنی کی رسم کے لیے گئیں۔ یوں دونوں طرف بے حد سادگی سے رسم انجام پا گئی۔ اور بلال طاہر جو جانے کیا کیا منصوبے بنائے ہوا تھا۔ وہ سب خاک میں مل گئے۔

''بیک ورڈ لوگ!'' کوئی پچیس مرتبہ کہہ کر اس نے کہیں جا کے اپنا غصہ اتارا تھا۔

اور مائرہ نے کوئی پچاس مرتبہ اس کا ریکارڈ لگایا تھا۔

''سنیے بلال بھائی آپ تو اسی کو رو رہے ہیں۔ وہ لوگ واقعی بہت بیک ورڈ ہیں۔ جب منگنی کے بعد باقاعدہ پردہ ہوگا ناں تب دیکھیے گا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ یعنی پردہ۔ وہ میرے سامنے ہی نہیں آئے گی۔'' اس نے تصدیق چاہی۔

''جی ہاں۔'' مائرہ نے کہا۔

''لیکن ہماری منگنی ہوئی ہے۔ ہم آزادانہ مل سکتے ہیں اور پھر تمہیں پتا ہے میں نے اسے پہلی نظر میں پسند کیا اور منگنی بھی کر لی۔ تھوڑی سی انڈر اسٹینڈنگ تو ضروری ہے، ملاقاتوں میں زیادہ سامنا ہی نہیں ہو نہ باتیں ہوئیں۔''

''نہیں میرا خیال ہے وہ لوگ نہیں مانیں گے۔''

''میں نوشینہ کی اماں کی بات نہیں کر رہا، نوشینہ کی کر رہا ہوں۔ وہ تو مان جائے گی ملنے پر۔'' وہ بڑے زعم سے بولا۔ ''آخر میں اسے فون پر تو راضی کر سکتا ہوں ناں۔''

''فون کو بھی ان کی اماں پسند نہیں کریں گی۔'' اس کی یہ بات سن کر بلال کو لگا وہ اسے محض چھیڑ رہی ہے۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں بلال بھائی۔ بہت روایتی لوگ ہیں وہ۔ نوشینہ تو پھر بھی میری وجہ سے بہت آگے ہوگئی ہے۔ ورنہ اس کے خاندان کی لڑکیاں تو بہ بہت دوقسم کی ہیں۔ بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی۔''

''روایت تو میں توڑ دوں گا تم دیکھنا کم از کم میری منگیتر میرا مان نہیں توڑے گی۔ میں اسے اپنے سانچے میں ڈھال لوں گا یاد کرو تمہارے ساتھ مل کر دو ایک بار اسے فون کیا تھا۔ وہ جب میری اسیری میں آگئی تھی تو اب کیوں نہیں؟''

''وہ بات اور تھی۔ اب آپ دیکھ لیجیے گا نوشینہ بہت کم آمیز ہے۔''

''نہیں، اب بات اور ہے۔'' بلال طاہر نے کہا۔

''پہلی نظر کی محبت بہت پاورفل ہوتی ہے۔ تم دیکھنا تو سہی کچھ اور بھی کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔'' وہ ترنگ سے بولا۔ اور مائرہ ''آپ کی مرضی۔'' کہہ کر خاموش ہوگئی۔

بلال طاہر ایک آزاد مرد تھا۔ اس کی طبیعت میں ایک حاکمانہ جذبہ تھا۔ اسے ایک ایسا شریک حیات چاہیے تھا۔ جو بنا جھجک اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے۔ وہ اسے پرکھنا چاہتا تھا۔ اس کے بارے میں خود اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ اپنی کہنا چاہتا تھا۔ لائف اسٹائل ڈسکس کرنا تھا مگر ساری حسرتیں ایک پردے میں چھپ گئیں۔ مگر وہ بھی اپنے نام کا بلال طاہر ہی تھا۔ زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کر ہی لیا تھا تو وقت سے پہلے اپنے فیصلے کو صحیح ثابت بھی کرنا تھا۔ وہ مانا ہوا ڈیبیٹر تھا۔ اس نے کبھی شکست کا سامنا نہیں کیا تھا۔ تو اب کیسی شکست؟ بہت کچھ سوچ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی۔

☆......☆......☆

بلال طاہر کا پہلا فون، منگنی کے ایک ہفتے بعد آگیا۔ اتفاق تھا اماں گھر پہ نہیں تھیں۔

''کیسی بے درد لڑکی ہو تم اکیلے، اکیلے منگنی کر لی۔ ہمیں بلایا بھی نہیں۔'' بلال طاہر نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

اور وہ بات سمجھ کر شرما گئی۔ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

''سنو تم فون کر سکتی تھیں۔ آخر مبارک باد ہی دے دیتیں۔'' وہ شکوہ کر بیٹھا۔

''وہ عجیب سا لگتا ہے ناں آپ کو فون کرنا۔''

''ارے عجیب کی کیا بات ہے۔ میں تو منتظر ہی رہا کہ تمہارا فون آجائے۔ پورا ہفتہ اسی انتظار میں گزرا۔'' اس نے اداکاری کرتے ہوئے کہا پھر یک دم بولا۔

''اچھا یہ بتاؤ کیسا لگا مجھ سے منگنی کرنا؟''

''جی!'' وہ شپٹا گئی اور جواب غائب۔ وہ شرم سے دوہری ہوگئی۔

''نوشینہ کے ساتھ جب بلال لگے گا تو تم نوشینہ بلال بن کے کیسا محسوس کرو گی؟ ویسے ایک بات ہے، میں ہوں بہت اوکھے مزاج کا انسان۔ مجھے انکار پسند نہیں ہے۔ جائز بات تو مان لیتا ہوں مگر میری بات نہ ماننے والا بڑا گھاٹے میں رہتا ہے۔'' وہ اپنے بارے میں بتانے لگا اور وہ سنے گئی۔ ''میرے دوستوں کا حلقہ اس بات کی گواہی دے گا۔ میرا کاروبار اسی سیٹ اپ پر قائم ہے۔ بادشاہ آدمی ہوں کبھی نواز دیا، کبھی نہیں نوازا۔ تم اس بادشاہ کے ساتھ رہو گی تو معلوم ہوگا کہ محل کے کتنے دروازے ہیں۔''

اور اسے یہ بات سمجھ ہی نہیں آئی کہ محل کے دروازوں سے اس کا کیا مطلب تھا؟

''تمہیں ڈریسز کس قسم کے پسند ہیں۔'' اچانک اس نے یہ سوال داغ دیا۔

''سنو، فیشن کے مطابق لباس منتخب کیا کرو۔ مجھے اچھے لگتے ہیں ایسے ڈریسز۔'' بلال نے بتایا۔

''فلمیں دیکھتی ہو؟'' اگلا سوال بھی تیار ہی تھا۔

''جی موڈ ہوتا ہے تو دیکھ لیتی ہوں۔''

''سنو تم کھیا خان کی فلمیں دیکھا کرو۔ وہ جاپانی اداکارہ کی فلم۔ وہ ویسے بھی بہت بولڈ ہے۔ مجھے ایسی جی دار قسم کی لڑکیاں پسند ہیں۔ وہ مرد کو سنبھال لیتی ہے۔''

اور یوں بلال طاہر کی باتوں کا سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا۔ اماں پہ بھی منکشف ہو گیا کہ اس کے فون آتے ہیں۔ اماں کہاں تک منع کرتیں۔ ایک دو دفعہ منع کیا۔ اپنی اولاد پہ ہی زور تھا۔ تب اماں نے بھی رنگ کی نزاکت دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔

دنیا کے پاس دیکھنے والی نظر نہیں۔ ''وہ نظر'' اسے بہت کچھ سمجھ میں آگیا تھا۔ اس کی شدتیں آہستہ، آہستہ پروان چڑھتی ہوئی محبت کی بیلیں ثابت ہوئیں۔ بلال طاہر یوں بھی اسے سجا لگا تھا۔ وہ واقعی اس کی سچی محبت کی جھیل میں ڈوبنے لگی تھی۔ مائرہ اس کی کھوئی، کھوئی صورت دیکھ کر اس کا مذاق اڑاتی اس کے خیالات پر دہائیاں دیتی۔

''دیکھا میں نہ کہتی تھی محبت انسان کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ محبت ایک شجر ہے جناب اور اس کی چھاؤں بڑی بابرکت ہوتی ہے۔'' اور وہ دنوں اس چھاؤں پہ سوچتی اور حیران ہوتی۔

اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ بے انتہا بولڈ ہونے کے باوجود اندر کہیں یہ خوف سمایا تھا کہ ہر چیز ایک حد میں ہی اچھی لگتی ہے۔ بلال طاہر کی دیوانگی اسے شروع میں تو بڑی اچھی لگی کہ وہ کئی روز تک اپنے آپ پر نازاں رہی۔ آتے جاتے مائرہ اس کی ہر ادا پر جملہ کستی، اور بلال طاہر کے جملے اس کے چہرے پر دھنک سی بکھیر دیتے۔ ایک نئے احساس نے زندگی کا مفہوم بدل دیا تھا۔ چلتے پھرتے اس کی آواز کی بازگشت سی رہا کرتی۔ اس کے حصار میں رہتے ہوئے لگتا تھا زمانہ بیت گیا ہو۔ اس کے فون پابندی سے آتے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ جب چاہتا فون کھڑکا دیتا۔ گھنٹوں بے تکان بولتا رہتا۔ وہ اس کے جواب میں چپ رہتی۔ بس اس کی باتوں کے سحر میں ڈوبی رہتی۔ تب وہ اس کی ''ہوں ہاں'' سے چڑ جاتا۔

''سنو نوشینہ کچھ تو بولا کرو۔ مجھے گھر میں مورتی نہیں سجانی۔ ہنستا بستا وجود چاہیے۔ بات کیا کرو مجھ سے، مجھے وحشت ہونے لگتی ہے تمہاری خاموشی سے۔ میں بولتا رہتا ہوں تم سنتی رہتی ہو۔ تم نہیں بولو گی تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

''آپ کو سننا اچھا لگتا ہے۔'' وہ سادگی سے صرف یہی کہتی۔

"اچھا یہ بتاؤ میرے ساتھ گزارہ کرلوگی تم، میرا بزنس کچھ ایسا ہی ہے۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔"

اور وہ جواب ہی نہ دے سکی۔ بس خاموشی ہی رہ گئی۔

"سنو میرے ساتھ بڑی پرابلم ہے۔ کبھی مہینوں منافع اور کبھی منافع ہی نہیں۔ اور یہ منافع کبھی دو ہزار کی صورت میں بھی ملتا ہے، گزارہ کرلوگی۔ بس یہی دوڑ ہے منافع کی۔" لگتا تھا منافع پہ سوئی اٹک گئی تھی۔ منافع سے بات آگے ہی نہیں بڑھ رہی تھی۔

"سنیں آپ کی بات مجھے سمجھ نہیں آرہی ہے۔" بیچارگی سے وہ بول پڑی اور دوسری طرف...... بلال طاہر قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

"بہت معصوم ہو تم۔" وہ بہت دلار سے بولا اور اس نے جھینپ کر فون ہی رکھ دیا تھا۔

اس نے کبھی جواباً فون نہیں کیا تھا۔ کچھ اماں کا ڈر اور کچھ اپنی احتیاط پسندی۔ مائرہ بھی کہتی تھی۔ "بلال بھائی سے کہو اپنے عشق کی رفتار میں کمی کریں۔ کچھوے کی چال چلیں۔ خرگوش کی نہیں کہ کچھوا بالآخر آہستہ، آہستہ چل کے پہنچ ہی جاتا ہے۔ ابھی تم ان کی دسترس میں نہیں ہو۔" اور جب اس نے بلال طاہر کو مائرہ کی بات بتائی تو اس نے کہا۔

"صرف میری نظر سے دنیا دیکھو! اب تم بلال طاہر کے حوالے سے پہچانی جاتی ہو بس۔ یہ میری محبت کا کمال ہے اُدھر مائرہ بیگم کو میری ادائیں گراں گزرتی ہیں تو گزریں۔" مگر اماں کو بھی بلال طاہر کی یہ جنوں پسندی بہت بری لگتی۔ وہ بڑبڑائے جاتیں، "ایسا دیوانہ پن تو ہم نے کہیں نہ دیکھا۔"

امتحان ختم ہوئے تو وقت گزارنے کے لیے ایک اشتہاری کمپنی کا اخبار میں اشتہار آیا، تو اس نے بھی درخواست دے دی۔ صرف پانچ گھنٹے دینے ہوتے تھے۔ اماں نے بھی بخوشی اجازت دے دی۔

یوں اس کی جاب ہوگئی۔ بلال طاہر کو پتا چلا پہلے تو بہت گرم ہوا پھر نرم پڑ گیا۔ ساری معلومات لینے لگا۔ اس کمپنی کے روحِ رواں جانی پہچانی شخصیت عمر خان تھے۔ اچھا اسٹاف تھا۔ ماحول خوب صاف ستھرا تھا۔

بلال طاہر کی محبت کی جہتیں بھی عجیب ہی تھیں۔ اس کے آفس سے نکلنے سے پہلے اس کا فون آجاتا۔ ہزار نصیحتیں اس کے پلو میں باندھتا اور ابھی وہ آفس سے گھر میں داخل ہی ہوتی کہ فون کی بیل بج اٹھتی۔ حد یہ کہ آفس میں تین چار دفعہ فون کرکے اس کی خیریت معلوم کرتا...... وہ پریشان ہو اٹھتی۔ سب کی نظریں اسے شرمندہ کرتیں تب وہ دھیرے سے کہتی۔

"کیا ضرورت تھی یہاں فون کرنے کی؟ سب عجیب، عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔" مگر وہ بلال طاہر ہی کیا جو مان جائے۔ وہی اپنی محبت بھری باتوں کا قصہ شروع کردیتا۔ وہ ہاری جاتی۔ بہت سی پابندیوں میں جکڑی ہوئی محبت بس ہر وقت یہی اصرار۔

"میں تمہاری شکل بھولنے لگا ہوں۔ آخر ملتی کیوں نہیں ہو مجھ سے، کل آفس مت جانا۔ مجھ سے ملنے آجاؤ۔"

"نہیں، یہ میرے لیے ممکن نہیں۔ اماں کو قطعی پسند نہیں ہے کہ منگنی کے بعد ملا جائے۔"

"بہت خود پسند ہو، کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟ تم یہ جان لو کہ مجھے ضدی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔"

بس ہر وقت یہی گھیراؤ کہ مجھ سے ملو۔

اور دل کا بیکار سا مشورہ
ہو سکے تو ان سے مل!"

دو تین دن پہلے کی پڑھی ہوئی نظم اسے یاد آگئی تھی۔

محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے جس میں تم لکھو
کہ کل کس رنگ کے کپڑے پہنے، کون سی خوشبو لگائی ہے
کسی سے کیا بات کہی، کون سی کس سے چھپائی ہے
کہاں کس پیڑ کے سائے تلے ملنا ہے مل کر پوچھنا ہے
کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟

اور بلال کی محبت بھی اسی نظم کے گرد گھومتی تھی، اس سے مل کر وہ محبت کا اظہار چاہتا تھا۔

اور جتنا نوشینہ احتیاط برتتی اتنا ہی وہ بلال طاہر کی محبت کے شعلوں کو ہوا دیتی۔ وہ انتظار جیسے لفظ سے بالکل ناآشنا معلوم ہوتا تھا جبکہ وہ دُہرے عذاب کا

...ر ہو کر رہ گئی تھی۔ آفس سے واپس پہنچنے میں ذرا سی ...ہو جاتی۔ فون پہ سوال ہوتا۔

"اتنی دیر کیوں؟ میں اب تک تمہارے انتظار ...پانچ فون کرچکا ہوں۔"

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ نئی پروڈکٹ پہ کام بڑھ ...گیا تھا مگر اس کو صرف اپنی غرض تھی۔ "صرف اپنا خیال ...ہے۔ میرا خیال نہیں۔ میں تمہاری محبت میں پاگل ...ہو رہا ہوں۔ اور تم بے نیاز ہو میری طرف سے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ بالکل ...غلط سوچ رہے ہیں۔" وہ احتجاجاً بولی۔

"سنو نوشینہ کیا تمہارا بھی دل نہیں چاہتا مجھے ...دیکھنے کو تم نے تو کبھی مجھ سے اس قسم کی خواہش کا اظہار ...نہیں کیا۔"

ایک اور امتحان اس کی ناتواں ذات پر......؟ یہ ...کیسی محبت تھی جو قدم قدم پر اس کا امتحان لیتی تھی۔ ...دوسرے دن بھی اس کا فون آیا، وہی اس کے کٹھور ...لہجے میں اس کے ... احتجاج پہ جملے ... پروری پہ چھڑکاؤ۔ اس نے بھی سارے ...دن کی روداد اسے بتائی۔

"تمہارے پاس اور کوئی موضوع نہیں ہوتا کیا ...مجھ سے بات کرنے کو، سوائے اپنے آفس کی باتیں ...کرنے کو۔" وہ تھکن زدہ لہجے میں بولا۔

"سنو! بس کل تم مجھ سے ملنے آرہی ہو، وہ بھی ...میرے آفس، میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تمہارا انتظار ...کروں گا۔ گیارہ بجے، دیکھوں گا تم میری بات کتنی مانتی ...ہو۔ بس کل تم آرہی ہو۔ بس میں نہیں جانتا۔" وہ ...تحکمانہ لہجے میں بولا اور دھڑ سے فون بند کردیا۔

اور وہ کتنی ہی دیر تک فون سیٹ کو گھورتی رہی۔ وہ ...کا لہجہ ناراضی لیے بلند ہو چکا تھا، وہ اندر ہی اندر سہم ...گئی۔ ایسا تو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ بلال طاہر نے ہمیشہ ...محبت بھرے لہجے میں بات کی تھی۔

"بھلا میں کیسے جاسکتی ہوں۔ اماں کیا کہیں گی، وہ سمجھتے کیوں نہیں ہیں؟"

مائرہ اسلام آباد گئی ہوئی تھی۔ وہ ساری رات بے چین ہی رہی۔

صبح اٹھی تو آنکھیں رت جگوں کی چغلی کھا رہی تھیں، آفس جانا بھی ضروری تھا۔ آفس میں بھی یہی خیال جاگزیں رہا کہ گیارہ بجے اسے جانا ہے۔

اور گیارہ کے بعد کتنے ہی بج گئے۔ مگر وہ جا ہی نہ سکی کہ اسے اجازت نہ تھی۔

اور پھر وہ سارا دن گزر گیا۔ پوری رات گزر گئی۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ فون خاموش ہی رہا۔ اور اس کی سانس جیسے رک رک کے چل رہی تھی۔ بلال طاہر کا فون نہ آیا۔ آفس میں بھی وہ الجھی الجھی رہی۔ تب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تیسرے دن کی شب میں اس کی انگلیاں بے ساختہ اس کا نمبر ڈائل کررہی تھیں اور تیسری بیل پہ اس کی گمبھیر و دلکش آواز آئی۔

"ہیلو......" وہ کہہ رہا تھا۔ تیسری مرتبہ وہ بہت بےزاری سے ہیلو کہہ کر شاید فون بند ہی کردیتا کہ وہ خود پہ قابو نہ رکھ سکی۔

"میں نوشینہ بات کررہی ہوں۔"

"اوہ نوشینہ، کیا حال ہیں تمہارے؟" تکلف کا یہ انداز سن کر وہ بے اختیار پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔

"ارے بھئی رو کیوں رہی ہو؟"

"آپ نے فون کیوں نہیں کیا؟"

"تمہیں احساس نہیں کہ میں نے فون کیوں نہیں کیا۔ ویسے حیرت ہے تم نے فون کیسے کرلیا مجھے۔ کسی کا ڈر آڑے نہ آیا۔"

"نہیں، بس آپ کے فون کی عادت پڑگئی تھی ناں۔ نہیں آیا تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔" اس نے سادگی سے اعتراف کیا۔

"اگر ایسا تھا تو اس روز مجھ سے ملنے کیوں نہ آئیں؟"

"میں اکیلی نہیں آسکتی تھی۔ لیکن آپ اب ناراض تو نہیں ہیں ناں۔" اسے اس کی ناراضی کا خوف تھا۔

"نوشینہ تم مجھے انڈر اسٹینڈ کیوں نہیں کرتیں۔ مجھے میری پہلی نظر کی سزا تو نہ دو۔ آخر تم ڈرتی کیوں ہو۔ بہادر بنو۔ پُراعتماد ہو کر مجھ سے ملو۔" وہ رکا۔

”دیکھو خوشگوار زندگی کو گزارنے کے لیے تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔ مستقبل کی بہت سی پلاننگز کریں گے۔ خوش آئندہ دنوں کے حوالے سے کچھ سوچیں گے...... مگر ملنے کے لیے تمہارا بیک ورڈ رویّہ۔ فون پہ تمہارا وہی کم بولنا۔ کیا بات کروں میں تم سے، روز وہی باتیں۔ وہی تمہارا جھجکنا۔ کس لیے کروں فون؟ صرف میری باتیں سنتی ہو۔ میرے لیے کچھ نہیں ہے دامن میں۔ اپنے آفس کی اِک اِک بات خوش ہو کر بتاتی ہو۔ مگر میرے لیے خوش نہیں ہوتیں۔ میں بیزار ہو گیا ہوں اس طرح تو کوئی چارم نہیں۔ یاد رکھو، میں بہت حقیقت پسند انسان ہوں۔ میں محبت دیتا ہوں تو محبت لیتا ہوں۔ مگر پریکٹیکل محبت......تم تو زبانی محبت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ہو۔ اگر کوئی ایسا وقت آ گیا تو میں انتہائی قدم اٹھانے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ ہزار لڑکیاں میری دوست ہیں۔ میری ہم عمر بھی ہیں۔ مجھ سے سینئرز بھی ہیں۔ اپنا آپ لٹانے کو تیار ہو جاتی ہیں میری دلداری میں۔ مگر جس پہ ناز ہے۔ وہ ناز ہی نہیں اٹھانا جانتی۔ نادان لڑکی لڑکیاں تو اپنے منگیتروں کی ایک، ایک حرکت پر نظر رکھتی ہیں۔ جیلس ہوتی ہیں۔ ان سے لڑتی ہیں مگر تم......تم بے حس لگتی ہو مجھے۔“

وہ اس کے طویل لیکچر کو سن کے پگھلنے لگی تھی۔ کافی دیر دونوں طرف خاموشی رہی۔

”اچھا چلو کل بات کروں گا۔ اللہ حافظ!“

گھٹن کچھ کم تو ہوئی تھی فون کر کے مگر ایک اداسی سی اندر جم گئی تھی۔

☆☆☆

ان کی منگنی کو ایک سال ہو گیا تھا۔ اماں نے دو سال کا وقت لیا تھا۔

ان ہی دنوں میں ایک واقعے نے اسے بلال طاہر سے بات کرنے میں اور محتاط کر دیا۔ ہوا یوں کہ زرینہ بھابی کی بیٹی ثوبی کی منگنی ان کے بھائی کے بیٹے طلعت سے ہوئی تھی۔ منگنی کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ دوسری طرف سے لڑکے والوں نے منگنی توڑ دی۔ معلوم ہوا کہ زرینہ بھابی کی بیٹی اور ان کے بھائی کے بیٹے میں زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ نتیجتاً لڑکے نے کہا ”ثوبی زبان کی بہت تیز ہے۔ عزت کرنا نہیں جانتی“۔ حالانکہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے آئے تھے اور اب منسوب ہونے کے بعد یہ الزام تراشی...... زرینہ بھابی کو بہت دکھ ہوا تھا اور وہ اماں سے دیر تک یہی باتیں کرتی رہیں۔

اسے قصور قطعاً ثوبی کا نہ لگا تھا۔ اس لیے کہ جس اعتبار سے ان دونوں کی دوستی تھی۔ بے حد اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ثوبی کو طلعت کی ساری سرگرمیوں کا علم تھا۔ ان سرگرمیوں پہ جب اس نے کڑی نظر رکھی تو طلعت نے بہت حد تک برداشت کرنے کے بعد معاملہ ہی ختم کر دیا اور اماں کو موقع مل گیا۔

”دیکھا یہ ہوتا ہے آزادی کا نتیجہ۔ شادی سے پہلے کیا ضروری ہے لڑکے لڑکی کا ملنا۔ دونوں ایک دوسرے کی کمزوریوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ پھر موقع ملنے پر ایک دوسرے کو طعنے تشنے دے کر جتاتے ہیں۔ اتنا گھلنا ملنا شادی سے پہلے جائز نہیں ہے۔ جب اللہ اور اس کے رسول کو یہ بات پسند نہیں تو پھر ہم کیوں اجازت دیں؟ جب ہی تو ہمارے ہاں کی شادیاں پنپتی نہیں۔ ہر کام میں اپنی مرضی......تو پھر کرو اپنی مرضی۔“ اور اماں نے جو بڑبڑانا شروع کیا تو ان کو چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

وہ دل میں ثوبیہ کا درد لیے کمرے سے باہر آ گئی۔ دونوں کی کتنی دھوم دھام سے منگنی ہوئی تھی اور انجام یہ؟ کیسی انڈر اسٹینڈنگ تھی...... وہ بلال طاہر سے مزید محتاط ہونے لگی۔ مگر اس کا کہنا۔ ”تم میں اتنا بہت ہے، ضدی ہو تم۔“

پھر ان دنوں آفس میں اس کی کولیگ شہلا کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ اس نے نوشینہ کو ہر تقریب میں بلایا تھا۔ اماں نے بھی اجازت دے دی جانے کی اور وہ بھی بڑی دلجمعی سے شریک ہوئی۔ مایوں میں بھی گئی۔ مہندی میں جانے کے لیے تیار ہو ہی رہی تھی کہ

...طاہر کا فون آ گیا۔ وہ بال بنا رہی تھی۔ تیزی سے ...ہوئی آئی اور فون ریسیو کیا۔

”وہ میں اپنی کولیگ کی مہندی میں جا رہی ...“ چھوٹتے کے ساتھ ہی بتا بھی دیا۔ نہ سلام نہ دعا ...بلال طاہر تپ گیا۔

”سنو نوشینہ احمد، میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں ...گر یہ بتا دو کہ تمہاری زندگی میں میرا کیا مقام ...“ اور فون بند......

اور نوشینہ کو پھر گھبراہٹ کے دورے شروع ہو گئے۔ ...میں جانے کا سارا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ ...شوق سے سلوایا گیا سوٹ سب سے برا لگنے لگا۔ ...جیولری، امپورٹڈ شوز۔ اب کوئی شے اچھی نہیں ...رہی تھی۔

بلال طاہر کا خشک لہجہ دل میں ترازو ہو گیا تھا۔ ...پوچھا بھی کہ وہ کیوں نہیں جا رہی۔ تو اس نے ...کا موڈ نہیں ہو رہا۔ عجیب انداز تھا بلال طاہر کا۔ ...ایسا کیا اس نے اتنا ستم ڈھا دیا۔ ”یہ تو میں نے ...ہی نہیں تھا۔“ وہ پوری رات روتے ہوئے ...۔ ”اب کیسے بات کروں گی۔ وہ تو ناراض ہو گئے ...بات ہی نہیں کریں گے۔ یا اللہ اب کیا ہو گا۔“ کچھ ...ہوا تو اس کا نمبر ڈائل کرنے کی ...اعصاب میں وہ ...قدر بس گیا تھا کہ اگر ایک دن بھی بات نہ ہوتی تو لگتا کہ ...کوئی شے کھو گئی ہے۔ فون مسلسل مصروف مل رہا تھا۔ ...کچھ دیر رک کر پھر وہ نمبر ملاتی مگر ہنوز انگیج ٹون...... ...اندیشے اسے لرزانے لگے۔

”...فون اتنا بزی کیوں ہے؟“

...دو گھنٹے بعد کہیں جا کے فون ملا تھا۔ وہی اجنبی لہجہ ...کہ وہ پوچھ ہی بیٹھی ”...اتنی دیر تک فون پہ کون تھا؟“

”کیا ہو جاتا ہے آپ کو...“ اسی قدر کہہ سکی۔

”مجھے کیا ہو گا نوشینہ بیگم۔ آپ اپنی کہیے۔“

”آپ ناراض تو نہیں ہیں۔“

”ناراض ہو کے کون سی خوشی مل جاتی ہے تم سے۔“ ...عجیب شخص ہے میں اس کے لہجوں کے پس منظر...

سمجھ لیتی ہوں مگر...... یہ صورت آشنا ہوتے ہوئے بھی میری مجبوریوں کو نہیں سمجھتا۔ میری روایتوں سے منحرف ہو جاتا ہے۔

”آپ کو پتا ہے میں مہندی میں بھی نہیں گئی تھی۔ آپ نے ٹھیک سے بات ہی نہیں کی تھی۔“

”کس کی خاطر؟“

”آپ کی خاطر۔“ وہ بے اختیار کہہ بیٹھی اور بلال طاہر کا دلآویز لہجہ پرانی جون پہ لوٹ گیا۔

”اچھا چلو معاف کیا۔ شادی میں چلی جانا۔ کہو تو میں لے جاؤں؟“

وہ بڑے شاہانہ انداز میں بولا۔ ”خیر شادی میں تو میں آ سکتا ہوں۔ تمہیں دیکھنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔“

”مگر آپ کیسے آ سکتے ہیں...... آپ تو؟“

”ارے کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ کیا تمہارا انجوائے کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ دیکھو میں تمہیں لے چلوں گا شادی میں اور پھر شادی سے ہم چلیں گے ساحل سمندر پہ بہت مزہ آئے گا۔ ایک دوسرے کی رفاقت میں۔“ اس نے لمحوں میں اپنا پروگرام سیٹ کر دیا اور وہ خوفزدہ ہو گئی مگر وہ بضد تھا۔

”مگر یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔“ وہ بڑبڑائی اور یک دم بولی۔

”کیونکہ اماں بھی تو جائیں گی۔“ بروقت اسے وہی جواب سوجھا تھا۔

”چلو چھٹی ہوئی۔ اصل مسئلہ تو وہی ہیں۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ ”ٹھیک ہے تم جاؤ۔ بہت ضدی ہو تم، تمہیں یہی منظور نہیں تو کیا ہو سکتا ہے۔ اور دل تو تم رکھ سکتی ہی نہیں۔“ پھر لہجہ بدل کر بولا۔ ”نوشینہ دعائیں مانگا کرو محبتوں کی پختگی کی دعائیں۔“

شادی میں وہ وقتی سلون کے ساتھ گئی۔ اماں کا تو بہانہ تھا۔ وہ دو تین لڑکیوں کے ساتھ مل کر گئی تھی۔ واپسی میں بھی وہ نوشینہ کو چھوڑ کر گئی تھیں۔ شادی میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ سب ہی نے اس کی تعریف کی تھی۔ اس کے لباس کو سراہا تھا۔ سر عمر نے کہا تھا

"ارے نوشینہ آج تو آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" انہوں نے بہت شفقت والے انداز میں کہا تھا۔ بارہ ایک بجے تک واپسی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اماں سے آکر پوچھا تھا۔

"اماں میرا فون تو نہیں آیا کوئی؟" اس نے بالوں سے پنیں نکالتے ہوئے کہا۔

"نہیں کوئی فون نہیں آیا۔" اماں بولیں۔ "البتہ دو مرتبہ فون کی گھنٹیاں بجیں تو میں بہت دیر تک "ہیلو ہیلو" کرتی رہی۔ مگر کوئی بولا ہی نہیں۔ شاید رانگ نمبر تھا۔" اماں یہ کہہ کر پہلو بدل گئیں۔ "رانگ نمبر" ایک لمحے کو ذہن بلال طاہر کی طرف گیا مگر بند ہوتی آنکھوں نے نیند کو اپنا ہم سفر بنالیا اور سوچ باہر ہی دستک دیتی رہی۔

اور پورا ہفتہ کچھ اس خاموشی سے گزرا کہ یہ خاموشی طوفان کا روپ دھارنے لگی۔ اور طوفان ہی تو تھا جو آکے رہا۔ ریت کے گھروندے کے مکیں کے سامنے خواب مسمار ہوگئے۔ ریت پہ لکھا نام ریت ہی ہوگیا۔ اس کی سچی بات رسوائی بن گئی، وہ جو پل، پل اس کی محبت کا دم بھرا کرتا تھا۔ اس ہی نے اس کے پندار کی کرچیاں توڑ ڈالی تھیں۔ اپنے سچے لہجے میں بات کرنے کا ہنر جاننے والا اس کو نہ جان سکا۔ محبت میں اس ظالم کو اس پر تو کیا خود پر بھی یقین نہیں تھا۔ ورنہ وہ یوں اس کی غیر موجودگی میں عشق کے گواہ نہ ڈھونڈتا۔ سچ بولنے والا اس کے گریز کو نہ جان سکا۔

بلال طاہر نے اس کی مشرقی روایت کی بھی قدر نہ کی۔ ورنہ وہ اس رات فون نہ کرتا، جب نوشینہ کی غیر موجودگی میں اماں نے اس کا فون سنا تو وہ دم سادھے اماں کی آواز سنتا رہا تھا۔ پھر دوسری مرتبہ اپنے شبے کی تسکین کے لیے دوبارہ فون کیا تھا تو اماں نے مسلسل ہیلو، ہیلو کرنے کے بعد فون رکھ دیا تھا۔

اور اب جبکہ عید کی خوشیاں دستک دے رہی تھیں تو اس نے اس کے ساتھ کے حوالے سے کتنی ہی دعائیں بارگاہ الٰہی میں مانگ لی تھیں۔ مگر اس نے بے حد سنگدلی سے سارے تعلق قطع کرلیے...... بڑے اطمینان سے یہ کہہ کر کہ......

"نوشینہ احمد! مجھے کمزور ارادوں کی ضدی لڑکیاں کبھی اچھی نہیں لگیں۔ میں تمہیں کب تک آزماتا۔ تم نے تو مجھے بھی تھکا دیا ہے۔ مجھے تو ایسا ہم سفر چاہیے جو مجھ سے زیادہ مجھ پر حاوی ہو اور تم......" وہ طنز سے ہنسا تھا۔ "تم اپنے روایتی ماحول کی پروردہ بھلا تم میرے ساتھ زندگی کا سفر کیسے طے کرسکو گی۔ وگرنہ تم مجھ سے یوں نہ بچتیں۔ یاد رکھو مرد ایک حد تک آزماتا ہے۔ اس کے بعد اس کے صبر کی حد ختم ہوجاتی ہے۔ تم نے اپنی دلکشی خود کھودی ہے۔ اپنی ضدی فطرت اور کمزور ارادوں کے ہاتھوں...... مجھے بیزار کردیا ہے تم نے۔ میں جتنا آگے بڑھا، تم پیچھے ہٹتی گئیں اور مجھے بھی پیچھے ہٹادیا۔ تم میں لچک ہی نہیں ہے اور بے لچک شاخ جھکنا نہ جانے وہ ٹوٹ جاتی ہے۔"

وہ اپنے اندر کا سچ بول کر راستہ بدل چکا تھا۔ اسے "ضدی لڑکی" کا خطاب دے کر اور محبت کے زخم خوردہ لوگ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں۔

اور وہ ضدی لڑکی ٹوٹتی ہی چلی گئی کہ اصل محبت تو اس نے کی تھی بلال طاہر سے۔ جو آب حیات کی طرح اس کے اندر بہہ رہی تھی۔ اسے اس کے لہجے سے عشق تھا جو اس کے مشرقی حسن کو سہہ نہ سکا۔ وہ یہ بھی نہ جان سکا کہ اگر وہ کمزور ارادے کی مالک ہوتی تو کبھی کی دل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اس کے ہر حکم کو کسی معمول کی طرح بجالاتی...... مگر وہ تو ضدی بھی نہ تھی۔ اگر وہ واقعی سچا ہوتا اپنی محبت میں تو خود کو سنبھال کر رکھنے والی اس ضدی لڑکی کی ضرور قدر کرتا...... مگر وہ تو ظرف کے معاملے میں بڑا چھوٹا نکلا۔

اور وہ نادان لڑکی آج بھی اسی کا انداز اپنائے اس کے نمبر پر اپنی فگار انگلیاں ڈائل کرتی رہتی ہے مگر یہ نہیں پوچھ سکتی کہ......

یہ ہم لڑکیاں!
کچی عمروں سے ہی خواب کیوں دیکھنا چاہتی ہیں؟

▲▲▲

پپی برتھ ڈے تیمور

عقیلہ حق



اس نے کڑاہی میں تیل گرم کرنے رکھا اور پھر ...ں ملانے کے لیے جلدی جلدی پیاز کاٹنے لگی، ...سے تو اتر سے پانی بہہ رہا تھا۔ اب پتا نہیں وہ ...ں کی وجہ سے تھا یا پھر...... اصلی آنسو......

اس نے سیدھے ہاتھ کی پشت سے چہرے پر ...رنگ پانی پونچھا۔ اور پھر جلدی سے باورچی ...انے کے دروازے پر کھڑے ہو کر سارے گھر پر ایک نظر ڈالی، صاف ستھرا چمکتا ہوا گھر، کمرے میں بچھی سفید براق چادر، ایک طرف رکھے تخت پر سجے گاؤ تکیے اور تخت کے آگے دھری چھوٹی سی سینٹر ٹیبل کے کنارے رکھی دو پلیٹیں اور دو چمچے لہسن اور پودینے کی چٹنی کے جار...... پیاز تو وہ کاٹ چکی تھی لیکن آنکھ کے کونے سے پھر پانی پھسلا......

پتا نہیں خوشی تھی یا افسردگی بعض اوقات ہم اپنے

احساسات کو نام نہیں دے پاتے لیکن ہمارے پورے وجود میں ایک عجیب سی حساسیت گردش کر رہی ہوتی ہے...... اس قسم کے احساس سے وہ دوچار تھی۔

تیمور کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ اندر ایک خاموشی تھی اس کا بارہ سالہ بیٹا اس کی جان تیمور جو بڑی سنجیدگی سے تیار ہو رہا تھا‘ نے کمرے میں جھانکتی ماں کو دیکھا تو مسکرا دیا۔

☆☆☆

اس کی شادی کو دو‘ تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ اس کے شوہر جہانگیر کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا۔ پیٹ میں ننھی سی کونپل پھوٹی ہی تھی کہ سہاگ کی چوڑیاں توڑ دی گئیں۔ ماں، باپ اس کے تھے نہیں اور سسرال والوں نے نحوست کا تمغہ اس کے گلے میں ڈال کر عدت بھی گزارنے نہ دی اور گھر سے باہر نکال دیا...... مجازی خدا، حقیقی خدا کے پاس چلا گیا اور وہ سر جھکائے ٹرین میں جا بیٹھی۔

ایک شہر سے دوسرے شہر لیکن سکون تھا کہ ملتا ہی نہیں تھا۔ اور پھر کراچی میں تیمور کی پیدائش ہوئی تو اس نے بھی نئی زندگی کا آغاز کراچی میں برنس روڈ پر ایک کرایے کے فلیٹ سے شروع کر دیا۔ گو تعلیم تو زیادہ نہیں تھی لیکن اللہ پاک نے ہاتھ میں ہنر دیا تھا سو وہ گھر کے ایک کونے میں مشین لے کر بیٹھ گئی۔ مشین کے پہیے کے ساتھ، ساتھ اس کی زندگی بھی آگے بڑھتی رہی، جہانگیر اور وہ‘ دونوں کا تعلق ایک غریب طبقے سے تھا۔ دونوں ہی کم تعلیم یافتہ تھے لہٰذا وہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور وہ حتی الامکان کوشش کرتی کہ اس کی وہ خواہشیں جو کہ اب حسرتیں بن گئی ہیں، اس کے بیٹے کی زندگی میں خواہش ہی رہیں۔

تیمور کو شہر کے نامور اسکول میں تعلیم دلوانے کے لیے گو کہ اسے مشین زیادہ چلانی پڑتی تھی لیکن اس کی خواہشات...... دروازے کی تیز گھنٹی سے جیسے وہ حال میں واپس آگئی۔

”کوئی دروازے پر ہے۔“ اس نے تیمور کی طرف دیکھا۔

اور تیمور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

چہرے پر پھیلتے مچلتے آنسو اس نے دوپٹے کی پشت سے پونچھے اور کچن کی طرف بڑھ گئی

پھر دروازے پر مچتے شور پر وہ گھبرا کر باورچی خانے سے باہر آئی...... اور......

☆☆☆

”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم......“ اس نے بلند پڑھا...... اور مٹی کا گلک زور سے زمین پر مارا۔

”اوہ......“ زمین پر 10,20,50 کے نوٹ اور بہت سارے سکے پھیل گئے۔ ”چلو تم 10,20 کے نوٹ اکٹھے کرو......“ اس نے مسکراتے ہوئے فرح سے کہا۔ ”اور میں 50، 50 کے نوٹ چنتا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے تیمور کو بکھرے ہوئے نوٹوں اور سکوں کو ایک بے یقینی کی کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔

4000,8000,3300,2000 اس نے 100,50,20 اور 10,10 کے نوٹوں کو الگ الگ گنتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یعنی ٹوٹل 17300 روپے۔“

”اور امی یہ 1200 کے سکے بھی تو ہیں......“ فرح نے اپنی جھولی پلٹ دی۔

”اوہ......!“ فرح کے منہ سے نکلا۔ 18500 روپے......“ وہ سارے پیسوں کو تیمور کی طرف کھسکاتے ہوئے بے ساختہ ہنس دی۔

اور تیمور اس کو دیکھتا رہ گیا کہ اس نے اپنی ماں کو زندگی میں بہت کم ہنستے دیکھا تھا۔

اور اس کی ماں فرح کا بھی کیا قصور...... بیچاری کو ہنسنے کا موقع ملا بھی تو نہیں تھا۔

☆☆☆

”کہاں تھے تیمور؟“ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، اس نے بیتابی سے پوچھا۔

”کہیں نہیں امی...... وہ نیچے والی خالہ بشیراں نے روک لیا تھا۔ پھر وہ باتیں کرنے لگیں، اسجد اور امجد بھی آگئے تو دیر ہوگئی۔“

”خالہ بشیراں......!“ فرح کے منہ میں حلق تک کڑواہٹ سی گھل گئی۔

اس متوسط طبقے کی بلڈنگ میں سب سے ناپسندیدہ شخصیت اس کے لیے خالہ بشیراں ہی تھیں۔

خالہ بشیراں کی ایک ہی بیٹی تھی جس پر بدکرداری کا الزام لگا کر اس کے شوہر نے اس دو بچوں کی ماں کو طلاق دے دی تھی۔ خالہ بشیراں خود بیوہ تھیں اور سارا دن محلے میں سٹرگشت کرتی رہتی تھیں، کہیں ناشتا اور کہیں کھانا کھا لیا اور اس کے عوض خواتین کو ایک دوسرے گھر کے راز بھی پہنچا دیے۔ بیٹی گھر بیٹھی تو خالہ بشیراں نے جلدی، جلدی ہاتھ پیر مار کر اسے بیاہ دیا...... وہ دوبارہ اپنے گھر کی ہوگئی، اور پہلے میاں کے بچوں سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا...... ہاں اس کے دونوں بیٹے اسجد اور امجد جو تیمور ہی کی عمر کے تھے، ان کے پاس رہنے لگے۔ خالہ کی اب بھی وہی مصروفیات تھیں، ہر ماہ میاں کی پنشن وصول کرتیں اور اپنا گزارہ چلا لیتیں۔

فرح کو وہ اپنی ٹوہ باز طبیعت کی وجہ سے سخت ناپسند تھیں لیکن پھر بھی اکثر و بیشتر وہ فرح کے گھر چلی آتی تھیں۔ فرح دروازے پر جب ان کو دیکھتی تو کوشش کرتی کہ وہ دہلیز سے ہی رخصت ہو جائیں۔ لیکن وہ خالہ بشیراں ہی کیا جو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لے لیں، وہ آرام سے فرح کو ہٹا کر گھر کے اندر داخل ہو کر پیر پسار کر بیٹھ جاتیں۔

فرح سخت ناگواری چہرے پر سجائے ان کی خاطر داری کرتی لیکن وہ مسکراتی رہتیں۔ کبھی کبھی فرح کا دل چاہتا ان کو ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال باہر کرے مگر کرے، وہ خود تو کسی سے ملتی نہیں تھی جہاں اس بلڈنگ میں متوسط طبقے سے بھی کم رہنے والے لوگوں میں عورت کو تقریباً سلائی آتی تھی، خالہ بشیراں نہ جانے کہاں، کہاں سے اس کے لیے سلائی کے کپڑے لاتی تھیں...... سو وہ بھی انہیں برداشت کر ہی لیتی۔

”اچھا خیر......“ اس نے اندر کی کڑواہٹ کو بہ مشکل اندر ہی رکھا، اب کیا تیمور کو بتاتی کیونکہ وہ جانتی تھی، بچوں کے معصوم ذہنوں میں پسند، ناپسند اختلافات، بڑے چھوٹوں کے رویّوں اور برائیوں کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنی چاہئیں کیونکہ ہمارا وقتی غصہ اور جذباتیت ہمارے بچوں کے ذہنوں کو پراگندہ کر دیتا ہے اور وہ مزاجاً چھری بن جاتے ہیں اور چھری پھر یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کیا اور کس کو کاٹ رہی ہے۔

”کیا باتیں کر رہی تھیں؟“ اس نے تیمور کو برابر میں بٹھا کر محبت سے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھا۔

”کچھ نہیں...... بس یہ کہہ رہی تھیں کہ تمہاری امی بہت ہمت والی ہیں، تمہارے ننھیال یا ددھیال میں سے کسی نے آ کر آج تک ان کی خبرگیری نہیں کی۔ اکیلے ہی ساری زندگی گزاری۔“

”اُف خالہ بشیراں، تم سے اللہ پوچھے، میرے معصوم سے بچے کے ذہن میں کیا انڈیل رہی تھیں، تم کو تو میں چھوڑوں گی نہیں......“ فرح نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنے آپ سے عہد کیا۔

”ویسے امی، سب کے رشتے دار ہوتے ہیں...... ہمارے کیوں نہیں ہیں؟“ تیمور کے سوال پر اس کے دل میں خالہ بشیراں کے لیے مزید نفرت ابھری۔

تیمور اس کا بیٹا اس کی زندگی کی واحد خوشی اور اس کا اکیلا رشتہ تھا۔ وہ اسے بہت سنبھال، سنبھال کر پال رہی تھی۔

”اچھا اور......“ اس کی آواز دھیمی لیکن لہجہ سرد تھا۔

”بس وہ کہنے لگیں کہ بیٹا تمہارا حساب بہت اچھا ہے۔ ذرا کبھی، کبھی اسجد اور امجد کو بھی بتا دیا کرو...... پھر میں نے انہیں کچھ سوال سمجھا دیے۔“ تیمور کے لہجے کی سنجیدگی پر وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

چھوٹا سا معصوم بچہ، جسے دنیا کے پیچ و خم کا اندازہ

ہی نہیں تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا، لوگوں کو کس طرح ٹریٹ کرنا چاہیے۔

☆☆☆

"امی پھر......" تیمور نے آس بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سالگرہ......" اس کے لبوں سے کپکپاتا ہوا نکلا۔

"جی امی...... لیکن دیکھیے میں اس طرح سالگرہ نہیں کروں گا۔ جس طرح آپ میری کرتی ہیں کہ ایک کیک کاٹ لیا۔ پھر ہم دونوں نے مل کر تالیاں بجالیں...... اور بس...... امی میرے تمام کلاس فیلوز کی...... birth days بہت شاندار طریقے سے ہوتی ہیں، کبھی کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں تو کبھی ان کے گھروں کے بڑے، بڑے گارڈنز میں، امی میں بھی اپنے دوستوں کو بلانا چاہتا ہوں۔ بس میں بھی اپنی اگلی سالگرہ خوب دھوم دھام سے کروں گا، میرے سارے دوست بھی کہتے ہیں کہ تم اپنی سالگرہ میں ہمیں کیوں نہیں بلاتے' امی اب میں انہیں کیا بتاؤں۔"

معصوم تیمور کے لہجے کی بیچارگی اور معصوم خواہش پر بے بسی نے اس کے دل میں کئی نشتر چبھو دیے۔

"یا اللہ تیری تقسیم...... کسی کو اتنا نواز دیا کہ ان کے پاس رکھنے کی جگہ نہیں اور کسی کو اتنی چھوٹی چادر دی کہ سر ڈھانپو تو پاؤں ننگے اور پاؤں ڈھانکو تو سر ننگا۔"

"انشاء اللہ میرے بچے انشاء اللہ......" فرح نے سوچوں کو پیچھے دھکیل کر معصوم سے تیمور کو سینے سے لگا کر کہا۔

آج تیمور کی سالگرہ تھی اور ہر سال کی طرح اس نے دو پونڈ کا کیک منگوایا اور تیمور کی پسندیدہ ڈش بریانی بھی پکائی لیکن آج ہی تیمور کی اس ننھی سی آرزو نے اس کے وجود کے پرخچے اڑا دیے۔

اس کا معصوم بیٹا، جس نے باپ کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ جس کی پیدائش پر مٹھائی بانٹی گئی اور نہ ہی نانی کے گھر سے اس کے کھلونے آئے، جس نے کبھی عید... بقر عید پر بھی دکانوں سے شاپنگ نہیں کی، ہر سال عید کے موقع پر بڑی، بڑی دکانوں کے باہر سے ہی گزرتا اور پھر وہ اسے بہلا پھسلا کر فٹ پاتھ پر سے جوتے اور کپڑے دلوا دیتی لیکن ہاں......! اس نے کبھی اس کی تعلیم پر سمجھوتا نہیں کیا، تیمور شہر کے ایک بڑے اسکول میں پڑھتا تھا فیس اور کتابوں کے خرچے نے اس کی کمر توڑ دی تھی لیکن اس کے بہتر مستقبل کے لیے اس نے رات دن کی تمیز بھلا دی تھی۔

"بیٹا دیکھو اس سال تو اس طرح کیک کاٹ لو، ہیں تم مجھ سے پہلے کہتے تو یقیناً ہم اسی طرح سالگرہ مناتے جیسی تمہاری خواہش ہے، خیر کوئی بات نہیں بیٹا۔" کپکپاتے ہونٹوں سے کہتے ہوئے فرح نے کیک کا پیس لرزتے ہاتھوں منہ میں دیا۔

"لیکن امی کیسے ...... ہم کیسے کر سکتے ہیں ہمارے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں۔" تیمور کے سوال نے اسے جیسے رلا ہی دیا۔

اُف اکیسویں صدی کے ذہین و فطین بچے۔

اس نے حلق میں پھنسے آنسوؤں کے گولے کو بہ مشکل نیچے اتارا۔

"کیوں نہیں بیٹا، مایوسی کفر ہے، یہ شیطان کا ہتھیار حربہ ہے، ہم کو بھٹکانے کا ہم آج ہی ایک گلک خریدتے ہیں' انشاء اللہ اگلی برتھ ڈے تک اتنے پیسے ضرور جمع ہو جائیں گے کہ ہم کسی اچھی سی جگہ پر تمہاری سالگرہ منا سکیں گے۔"

اور پھر رات گئے تک وہ تیمور کی خوشی کے لیے اس کی آنے والی برتھ ڈے کی پلاننگ کرتی رہیں۔ حتیٰ کہ مینیو تک سیٹ کر لیا گیا۔ فرح کو یقین تھا کہ آنے والے سال وہ اپنے بیٹے کی یہ معصوم خوشی ضرور پوری کر پائے گی۔

کیا واقعی......

☆☆☆

اس کی مصروفیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، وہ ویسے ہی لوگوں سے کم ملتی تھی لیکن اب تو اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ وہ اتنی مصروف ہو گئی کہ اس کے پاس کسی سے سوال کرنے یا کسی کے سوالوں کے جواب دینے کا بھی وقت نہیں تھا۔

تیمور کو روز اسکول جاتے ہوئے وہ بیس روپے دیتی تو تیمور وہ بھی گلک میں ڈال دیتا۔

گلک مستقل بھر رہا تھا۔

اور ان کی پلاننگ بھی روز کی بنیادوں پر چل رہی تھی۔

تیمور روز اسے اس کا وعدہ یاد دلاتا اور وہ کیلنڈر پر لگے مارک کو مزید گہرا کر دیتی۔

☆☆☆

"تم کو پتا ہے خالہ بشیراں تمہارے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں۔" اس کے گھر کے نیچے والے فلیٹ میں رہنے والی جمیلہ جب اسے سلائی کے لیے اپنا سوٹ دینے آئی تو سرگوشی میں بولی۔

وہ خاموش رہی لیکن اس کی آنکھیں ضرور پوچھ رہی تھیں "بتاؤ...... بتاؤ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔"

ساری زندگی کانٹوں پر چلتے گزاری، اگر ایک طوائف عورت کی زندگی میں سے کردار کو نکال دیا جائے تو سوائے ایک بدبودار جسم کے کچھ نہیں بچتا...اور وہ ایک کردار عورت نہیں تھی...... ہمیشہ کی طرح آنکھ سے بہتا بے رنگ پانی اس کی دائیں آنکھ کے کونے سے تیزی سے پھسلتا ہوا گریبان میں جذب ہو گیا۔

"خالہ کہہ رہی تھیں کہ تمہاری کوئی شادی وادی نہیں ہوئی تھی اور یہ تیمور تمہاری جوانی کی ایک غلطی ہے، اسی لیے تم اپنا آبائی شہر اور اپنے رشتے دار چھوڑ کر یہاں چھپی بیٹھی ہو۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آیا تم بتاؤ...... کیا بات ہے۔" جمیلہ نے کند چھری سے اس کے وجود، اس کے کردار، اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد مصنوعی ہمدردی سے پوچھا تھا۔

وہ چپ رہی؟ وہ کیا کہتی؟ کس کا دامن پکڑتی، ایک لمحے کو اس کا دل چاہا خالہ بشیراں کا منہ نوچ لے...... اپنی پاکیزگی کی واحد گواہی اپنا نکاح نامہ خالہ بشیراں کے منہ پر دے مارے اور کہے جاؤ اس کی کاپیاں بنوا کر ہر اس شخص کو دے آؤ جس سے تم نے کہا

خوشبو جیسی بات کرو

☆ جو خوشبو، انسان کے کردار، اخلاق اور عمل میں ہوتی ہے وہ کسی مشک و عنبر، عطر اور پھولوں میں بھی نہیں ہوتی مگر یہ خوشبو اس وقت چلی جاتی ہے جب انسان میں تکبر آ جاتا ہے۔

☆ زندگی میں ہمیشہ خوش اور مطمئن رہیں، پریشانیاں تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ پریشانیوں سے کبھی نہ گھبرائیں اور ہمیشہ حق پر ثابت قدم رہیں۔

از: تسلیم شیخ، ساہیوال

اگر سمجھیں تو

☆ مشکلیں دینے والوں سے بڑا مشکلوں سے نکالنے والا ہے۔ یہ بات سمجھ آ جائے تو مشکل کچھ مشکل نہیں لگتی۔

☆ تم دوسروں کے راستے کی رکاوٹیں دور کرتے جاؤ رب تعالیٰ تمہاری راہیں آسان بناتا چلا جائے گا۔

☆ لوگ منزل کو مشکل سمجھتے ہیں ہم مشکل کو منزل سمجھتے ہیں لوگوں میں اور ہم میں صرف اتنا فرق ہے...... کہ لوگ دل کو درد دیتے ہیں اور ہم درد دینے والے کو دل دے دیتے ہیں۔

☆ زندگی میں ہمیشہ ریاضی کی طرح رہو، دوستوں کو جمع کرو، دشمنوں کو تفریق کرو، خوشیوں کو ضرب دو اور پیار کو تقسیم کرو اور پھر ہمیشہ مسکراتے رہو۔

از: تسنیم گل، کوئٹہ

سالگرہ مبارک

چاند سے پیاری چاندنی
چاندنی سے بھی پیاری رات
رات سے پیاری زندگی
اور زندگی سے بھی پیارے آپ
ہیپی برتھ ڈے مائی ڈیئر پاکیزہ!

از طرف: گل شاد نذیر، اسلام آباد

ہے بلکہ جمعہ کی نماز کے بعد مسجد کے دروازے پر کھڑے ہوکر ہر نمازی کے ہاتھ میں اس کی کاپی تھماؤ، ایک بیوہ کی پاکدامنی کی گواہی دو......

''خالہ بشیراں تم سے اللہ پوچھے۔'' رات بستر پر لیٹتے ہی جمیلہ کی بات پھر یاد آئی مگر وہ بھولی ہی کہاں تھی، سو آنکھوں سے پانی بہتا رہا اور تکیہ بھیگتا رہا۔

اس نے برابر کے بستر پر آنکھیں موندے لیٹے تیمور کو دیکھا، سسکیاں ناقابلِ برداشت ہوگئیں تو منہ پر ہاتھ رکھ کر تیزی سے باہر کی طرف بھاگی تاکہ گھر کے کسی کونے میں بیٹھ کر پھوٹ، پھوٹ کر رو سکے۔

اس کی آہیں، اس کے نوحے...... اس کے بیٹے کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ روتی...... اسے بلڈنگ میں ایک عجیب سی ہلچل محسوس ہوئی۔ اس نے سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا، رات کے دو بج رہے تھے، اس وقت کیا ہو رہا ہے، وہ برآمدے کی طرف لپکی...... اور......

☆☆☆

آج پی سی کے مارکو پولو ہال میں ایک بڑی سی table اس کی برتھ ڈے کے لیے ریزروڈ تھی۔ وہ برتھ ڈے بوائے ہے آتے جاتے ویٹرز اور کچھ اور لوگ اس کو پیار سے وِش کر رہے ہیں، بڑا سا بلیو رنگ کا کیک تھا جو ہیٹ شیپ میں ہے، میز کے ایک طرف کونے میں ہنستی مسکراتی ہاتھوں میں شاید زندگی میں پہلی بار گجرے پہنے مسکراتی اس کی ماں فرح...... اس کے سارے دوست اس کے چاروں طرف کھڑے تھے، سیدھے ہاتھ پر اس کی امی تھیں، بہت سارے خوب صورت کاغذوں میں لپٹے تحائف، ہوٹل کی طرف سے اسے فلاور پیش کیے گئے تو ایک لمحے کو اسے احساس ہوا جیسے وہ پرنس ہوٹل کا سنگر مائیک ہاتھ میں لیے اس کی برتھ ڈے کا گیت گا رہا تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

اس کا خواب...... آج مجسم حقیقت بن گیا تھا۔

تیمور کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دھمال ڈالنا شروع کردے۔ بڑے، بڑے جگمگاتے فانوس اس کے چہرے کی چمک کے آگے ماند تھے۔ اور پھر زور دار تالیوں، سیٹیوں اور گیتوں کی گونج میں اس نے کیک کاٹا...... اس کے دوستوں نے اس کو snow spray میں جیسے نہلا دیا...... اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے خوشی سے بے حال اپنی ماں کو دیکھا اور لپک کر اپنی امی سے لپٹ گیا۔

''امی میری پیاری امی۔'' وہ زور سے چیخا۔

''ہاں، ہاں بیٹا!'' فرح نے لپک کر اس کا ہاتھ تھاما۔

وہ جو خواب میں اپنی سالگرہ کی برتھ ڈے منا رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

''اوہ...... وہ خواب تھا۔'' اپنی سرشاری میں تیمور نے ماں کے فکرمند چہرے کی طرف دیکھا تک نہیں۔

''تیمور......'' فرح کا لہجہ گھبرایا ہوا تھا۔

اور تیمور جو سالگرہ میں رہ جانے والے باقی دن گن رہا تھا، چونک اٹھا۔

اس کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

''کیا ہوا امی......؟'' اس کا لہجہ سہما ہوا تھا۔

''بیٹا...... وہ......''

☆☆☆

''ہمیں ہمیشہ ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہیے، ایک حدیث کا مفہوم ہے تم میں سب سے زیادہ اچھا وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے اور میری جان ہم تو اس نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی ہیں جو اپنے تو اپنے، وہ تو دشمنوں کے ساتھ بھی صلۂ رحمی کرتے تھے جب ہم کسی ایسے شخص کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہیں جس سے ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوتی یا ہمیں اس سے محبت ہوتی ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے وہ تو ہم اپنے دل اپنی محبتوں کے آگے مجبور ہوتے ہیں وہاں تو ہم خودغرض ہوتے ہیں، خودغرض...... کیونکہ جب وہ شخص خوش ہوتا ہے، جس کی خوشی ہماری خوشی ہوتی ہے، لہٰذا اس کے ساتھ ہونے والا حسنِ سلوک دراصل ہم اپنے ساتھ کر رہے ہوتے ہیں۔ اصل ہمارے ایمان کا امتحان یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ صلۂ رحمی کریں، حسنِ سلوک کریں، جو ہمیں تکلیف دیتے ہیں، جو ہمیں اچھے نہیں لگتے، اسی لمحے ہم اللہ کی رضا کو ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں، وہ لمحہ ہمارا امتحان ہوتا ہے اور ایک اچھا طالب علم وہ ہوتا ہے جو ہر سرپرائزنگ ٹیسٹ میں کامیاب ہو...... اور بیٹا بعض اوقات اللہ پاک بھی ہم سے سرپرائزنگ ٹیسٹ لیتا ہے...... جتنا اچھا طالب علم اتنا مشکل سوال اتنی انہونی قربانی...... تو جب کبھی اللہ آزمائے تو کچھ نہ دیکھنا، بس اس بات پر خوش ہونا کہ اللہ پاک نے اتنے سارے بندوں میں تم کو چنا اور میرا بیٹا یہ بھی یاد رکھنا، جب اللہ تم سے کوئی ایسی چیز لیتا ہے جس کی تم کو امید نہیں ہوتی تو یاد رکھنا اس کے پاس تمہارے لیے کوئی ایسی چیز ضرور رکھی ہوگی جس کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' وہ ماں کو تکتے جا رہا تھا۔

''بیٹا بس ہر معاملے میں اللہ سے تجارت کرلیا کرو اور اللہ سے تجارت میں بس نفع ہی نفع ہے۔''

''اللہ سے تجارت......؟ کیا میں اس قابل ہوں کہ اللہ پاک نے مجھے اپنے ساتھ تجارت کے لیے منتخب کیا۔''

برسوں پہلے ماں کی بات تیمور کو یاد آئی کہ جب اس فقیر کو دھتکارنے پر اس نے تیمور کو گھنٹوں سمجھایا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ کون سا جملہ کون سی بات اور کون سا سبق ہمیں کہاں کام آئے گا...... آج وہی اللہ سے تجارت کرنے کا وقت آگیا تھا۔

بلڈنگ میں دوبارہ خاموشی چھا گئی تھی۔ اسے جلد فیصلہ کرنا تھا لیکن اس فیصلے کا اختیار اس نے اپنے تیمور کے ہاتھ میں دے دیا تھا اس کو اپنی تربیت پر بھروسا تھا، فقط ڈر تھا تو تیمور کی کم عمری کی سمجھ کا......

وقت لمحہ بہ لمحہ تنگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے موبائل کے فون کی گھنٹی بجی۔

فرح نے اسکرین پر جگمگاتے نام کو دیکھا۔

اور پھر تیمور کو...... تیمور نے کہا۔

اور پھر جلدی سے وہ اپنی چادر لیے الماری کی طرف بڑھی۔

☆☆☆

سارے گھر میں ہنستا مسکراتا شور مچ رہا تھا، تیمور کی خوشی قابلِ دید تھی۔ اس نے ایک ناقابلِ یقین خوشی اور حیرت کے ساتھ کھلے دروازے سے اندر آتے تیمور کے دوستوں کو دیکھا۔ کمرے کی دیواریں خوب صورت کاغذوں سے سجی تھیں بہت سارے رنگ برنگے برتھ ڈے غبارے پھولے ہوئے چھت سے لٹک رہے تھے، بے شمار تحائف سے صحن میں رکھا تخت بھرا ہوا تھا۔ اس نے لکڑی کی بوسیدہ بالکنی سے نیچے گلی میں جھانکا تو گاڑیوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔

وہ جانتی تھی اللہ ایک کے دس دیتا ہے لیکن آج اسے ایمان کی حد تک یقین ہوگیا تھا کہ اللہ ایک کے ستر گنا دیتا ہے سارے سودے نیتوں کے ہوتے ہیں......

وہ مسکراتی ہوئی واپس کچن میں چلی آئی، اس نے پکوڑے تیل میں ڈالے تو اسے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا، اس نے پلٹ کر دیکھا، آنکھوں میں پانی لیے وہ کھڑی تھیں، اس نے ان کی طرف دیکھا پھر بے ساختہ اس نے کفگیر کڑاہی میں چھوڑی اور...... بے ساختہ ان سے لپٹ گئی اور اس کے منہ سے رندھی ہوئی آواز میں نکلا۔

''خالہ بشیراں......''

☆☆☆

''کیا ہوا ہے۔'' اس نے رات کے دو بجے افراتفری کی وجہ جاننے کو اپنی پڑوسن جمیلہ سے پوچھا۔

''خالہ بشیراں کے نواسے کی طبیعت خراب تھی، اسپتال لے کر گئے تو بچے کا اپنڈکس پھٹ گیا ہے، حالت بہت سیریس ہے، ڈاکٹر آپریشن کا کہہ رہے ہیں اگر فوری آپریشن نہ ہوا تو کچھ بھی ہوسکتا ہے، میرے پاس فون آیا تھا، خالہ بیچاری کا رو، رو کر برا حال ہے ان کا۔ اب بہن یہاں کس کے پاس رکھا ہے، اِدھر میاں کی تنخواہ آتی ہے اُدھر ختم، خدا کی قسم میں تو صرف ہاتھ میں لینے کی گناہ گار ہوتی ہوں۔ بیچاری خالہ

بشیراں..... "جمیلہ کا لہجہ حقیقتاً بہت دکھی تھا۔

"کتنے پیسوں کی ضرورت ہے خالہ بشیراں کو.....؟" اسے ان سے لاکھ شکایتیں سہی لیکن وہ ایک ماں بھی تو تھی۔

"18000 روپے....." جمیلہ نے بتایا۔

"18000!" اس کے منہ سے بے یقینی کی کیفیت میں نکلا..... حضرت علیؓ کا قول ہے میں نے اللہ کو اپنے ارادوں کو ٹوٹنے سے پہچانا.....

واقعی ہمیں پتا نہیں ہوتا کہ اللہ اب ہم سے کون سا کام لینا چاہتا ہے۔

اچانک یہ لمحہ اسے معلوم نہیں کتنے سال پیچھے لے گیا تھا۔

"بیٹا پانی آنے سے پہلے نالی بنادی جاتی ہے، وہ تو بصیرت کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتا.....اور جب کوئی تمہاری خواہش پوری نہ ہو تو مایوس نہ ہونا بلکہ خوش ہونا کہ تمہارا کام اس طرح نہیں ہوا جس طرح تم چاہتے تھے بلکہ اس طرح ہوگا جس طرح رب چاہے گا، اور رب کی چاہت میں ہی فلاح ہے، بھلائی ہے۔" کبھی کے سنے گئے جملے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"ہر کام رب کی مرضی سے ہوتا ہے تم ضد کروگے تو بھی وہی ہوگا جو رب چاہے گا لیکن تمہاری ضد تمہاری ہٹ دھری اور تمہارا انکار تمہارے راستے میں الجھنوں اور پریشانیوں کے بڑے، بڑے پہاڑ کھڑے کردے گا اور جو رب کی رضا میں راضی ہوجائے درحقیقت وہی اللہ کا وہ بندہ ہے جو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے جو آسمانوں پر شکر گزار بندہ پکارا جاتا ہے، میرے بچوں بس ہمیشہ رب کی رضا، میں راضی رہنا۔ اور دیکھو میرے بچوں کبھی کسی کی مدد کرنے سے نہ گھبرانا۔ کیونکہ تمہاری کوئی حیثیت نہیں کہ تم کسی کی مدد کرسکو بلکہ جب طلبگار، تمہارے دروازے پر آتا ہے تو وہ امانت لینے آتا ہے جو رب العزت نے تمہارے پاس رکھوائی ہے۔ تو بیٹا، خیانت نہ کرنا، خائن نہ بننا، ہم اس نبیؐ کی امت سے ہیں جنہیں لوگ امین اور صادق کہہ کر پکارتے تھے۔" اپنے کچے آنگن میں درخت کے گھنے سائے تلے تخت پر بیٹھے قرآن پڑھانے والی استانی کی باتیں اسے یاد آئیں تو جیسے دماغ میں کوند گئیں۔

"کیا سوچ رہی ہیں امی.....؟" تیمور کی آواز اسے حقیقت میں لے آئی۔

"استانی جی اللہ پاک آپ کو کروٹ، کروٹ جنت نصیب کرے، آپ کی یہ باتیں کتنی بروقت یاد آئیں" اس نے دل کی گہرائیوں سے استانی جی کو دعا دی۔

☆☆☆

"امی آپ فوراً یہ پیسے لے جائیں، ان کی طبیعت بہت خراب ہے، کوئی بات نہیں، میں اگلے سال سالگرہ منالوں گا۔" تیمور نے شاپر میں ڈالے بہت سارے 10,20,50,100 کے مسلے ہوئے نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمائے۔ ایک لمحہ اسے اپنے بیٹے پر فخر ہوا اور دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہوا اس کا بیٹا اب بڑا ہوگیا ہے۔

"بے شک بچے سانجھے ہوتے ہیں۔" کہتے ہوئے وہ تیزی سے گھر سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"مجھے معاف کردینا بیٹا، میں نے ہمیشہ تمہیں تکلیف دی، تم پر بہتان تک رکھ دیے لیکن تم نے اعلیٰ ظرفی کی انتہا کردی۔" وہ سسکیں۔

"تم انسان نہیں فرشتہ ہو، میرا بچہ موت کے منہ سے واپس آیا ہے، ساری زندگی میں اس لمحے کا قرض نہیں اتار سکتی جب تم نے اپنے ارمان، اپنے بچے کی خواہش، اپنے بچے کی خوشیاں میرے نواسے کی زندگی پر قربان کردیں۔" خالہ بشیراں اسے گلے سے لگا کر رو رہی تھیں۔

"لیکن خالہ....."

"بس میری بچی کچھ نہ پوچھ....." خالہ بشیراں نے ٹالا۔

"لیکن....." وہ ہکلائی چند لمحوں پہلے ڈیکوریشن والے صحن میں بڑی سی میز رکھ کر گئے تھے اس پر سجے لوازمات کو دیکھتے ہوئے وہ پھر سے بولی۔

"بس بیٹا اس رات بہت ایمرجنسی تھی، ڈاکٹر نے کہا کہ اگر فوری آپریشن نہ ہوا تو موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔ الحمدللہ آپریشن ہوگیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ پیسے تیمور میاں کی گلک کے ہیں جو انہوں نے اپنی سالگرہ کے لیے جمع کیے تھے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے تم میرے نواسے کے لیے اپنے بچے کی خوشیاں وار دو اور میں..... نہیں، میں تمہاری جیسی تو نہیں پر..... اتنی گئی گزری بھی نہیں..... میں نے اس کے اور اپنے نواسے کے مشترکہ دوست سے رابطہ کیا اور اسی سے مدد مانگی۔ اس نے سارے دوستوں کو بلایا اور پھر تیاری میں میرے ساتھ رہا۔" خالہ بشیراں نے بلیو رنگ کے خوبصورت کیک کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اتنی تیاریوں میں تو بہت سارے پیسے خرچ ہوئے ہوں گے....." فرح کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اس برتھ ڈے اور ایسے انتظامات تو وہ 18500 روپے میں بھی نہیں کرسکتی۔

"بس یہ مت پوچھو....." خالہ بشیراں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"اگر میں اسے یہ بتادوں کہ میں نے اپنا واحد سونے کا کنگن بیچا ہے تو شاید اسے اچھا نہ لگے۔" خالہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ بے شک ہمیں یہ پتا ہی نہیں کہ ہمارے پاس کون سی چیز کس کی امانت کے طور پر رب نے رکھوائی ہے۔

"الحمدللہ میں نے امانت اس کے حقدار کو لوٹادی۔"

"اچھا یہ تو بتائیں تیمور کے کس دوست سے آپ نے رابطہ کیا تھا۔" فرح کی آواز خالہ بشیراں کو حال میں واپس لے آئی۔

انہوں نے مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

کہا "اللہ سے۔"

"اللہ سے؟" فرح کو جھرجھری سی آگئی۔ لوگ گھروں سے اور پیسوں سے عظیم نہیں ہوتے، پیسے والے لوگ امیر تو ہوسکتے ہیں لیکن ہر کوئی عظیم نہیں ہوسکتا۔

"اگر کل میں تیمور کا گھر ڈھونڈتا ہوا یہاں تک نہیں آتا اور آنٹی بشیراں سے نہ ملتا..... تو شاید مجھے کبھی اندازہ نہیں ہوتا کہ میرا بہت خوددار اور ذہین دوست ایک بہت اچھی ماں کا بہت پیارا بیٹا ہے..... ہم سب دوستوں کو تیمور کی دوستی پر فخر ہونا چاہیے۔" اشعر جو ایک بیوروکریٹ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس نے ہنستے مسکراتے دوستوں کو دیکھتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔

☆☆☆

سارے گھر میں پیر رکھنے کی جگہ نہیں تھی، فرح نے جلدی، جلدی بلڈنگ کے بچوں اور خواتین کو بلوالیا تھا، سب بہت خوش تھے، ہنسی تھی، مسکراہٹیں تھیں، قہقہے تھے، برسوں سے لادی ہوئی احساسِ کمتری کی گٹھڑی تیمور نے سر سے اتار پھینکی تھی۔

اسے یقین ہوگیا تھا چیزیں، گھر، گاڑی اہم نہیں ہوتے انسان اور انسان کا کردار اہم ہوتا ہے، اپنے گھر کی پلستر اتری دیواروں پر آج اسے کوئی شرمندگی نہیں ہوئی۔ جس کو اس کے دوستوں نے گفٹ پیپر سے سجادیا تھا۔

سارا گھر تالیوں سے گونج رہا تھا، تیمور..... بالکل خواب میں دیکھا گیا جیسا کیک کاٹ رہا تھا، سب زور، زور سے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو تیمور گا رہے تھے اور تیمور کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کائنات کا ذرہ، ذرہ اس سے کہہ رہا ہو ہیپی برتھ ڈے تیمور..... فرح خوش تھی اس نے اللہ پاک کے ساتھ تجارت کی تھی اور اس کو پہلے ہی سودے میں توقع سے زیادہ نفع ہوا تھا۔

اس کی معمولی سی انویسٹمنٹ تھی بدلے میں اسے محبتیں ملیں، مان ملا، خوشیاں ملیں اور ایمان کی پختگی ملی..... اصل میں اپنے وسائل کو استعمال کرتے وقت ہم اسے ہی بھول جاتے ہیں جس کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہوتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

امرت

شیریں حیدر

"تخلیقِ کائنات سے لے کر اب تک . . . کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے ۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت ،نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی . . . اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کرلیتے ہیں ، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ . . . یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اُن کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو ہنس کر گزارتے ہیں یا رو کر،مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دار و مدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے ۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی پیچ و خم اور نشیب و فراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر......

قسط 17



پنکی کو سیما نے درخواست کر کے مجھ سے ایک وقت دودھ پلانے کے لیے کہا تھا مگر جب اسے گھر لے جا کر ڈبے کا دودھ شروع کروایا گیا تو اس نے وہ دودھ پینے سے انکار کر دیا، زبردستی کرنے پر اسے قے شروع ہوگئی اور اس حد تک کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے، کمزوری اس حد تک ہو گئی کہ اسے اسپتال میں داخل کروانا پڑا اور ڈرپ لگا دی گئی۔ مجھے ماما نے بتایا کہ ارسل بھائی نے کال کر کے ان سے درخواست کی تھی کہ میں اسپتال جاؤں اور......

''امو جان کیوں آپ لوگوں نے مجھے اس چکر میں ڈال دیا؟'' میں نے امو جان سے احتجاج کیا۔'' میرے لیے بھی یہ بہت مشکل ہو گیا ہے اور اس کے لیے اس سے بھی بڑھ کر۔''

''اس کی ماں زندہ نہیں رہی تھی بیٹا تو کیا اسے بھی مر جانے دیتے؟'' امو جان نے رسان سے کہا۔ ''لیکن اللہ نے اس بچی کی زندگی کے بچانے کا سامان تمہارے وسیلے سے کرنا تھا۔''

''مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا امو جان کہ زائنہ......'' میں سسک پڑی۔'' اوپر سے آپ لوگوں نے مجھ سے اتنے دن تک چھپائے رکھا، میں اس عرصے میں اس کے نہ آنے پر اس کے بارے میں کیسے، کیسے گمان کرتی رہی، کتنا منفی سوچتی رہی۔'' مجھے وہ سب سوچ کر بھی دکھ ہو رہا تھا۔

''تم کیوں اس کے بارے میں بدگمان رہیں؟'' امو جان نے حیرت سے پوچھا۔'' جب تمہیں آپریشن کے لیے لے جا رہے تھے تو اس وقت بتایا تھا کہ زائنہ گر گئی تھی اور اسے اسپتال لے جایا گیا تھا۔''

''شاید میں نے غور سے سنا نہیں، ممکن ہے کہ آپریشن کی وجہ سے بھول گئی ہوں یا مجھے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ اس کی حالت ایسی رہی ہو گی۔'' میں نے تاسف سے کہا۔ ''اور یہ تو سوچنا بھی مشکل تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ایسا ہو سکتا تھا۔''

''ارسل کے لیے تو بہت مشکل ہو گئی تھی۔'' امو جان نے بتایا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔'' ایک تو اس کے لیے بیوی کے جانے کا دکھ، موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا بچی اور اس پر مستزاد زیبا کی الزام تراشیاں۔''

''کیوں...... ماما نے کیا الزام لگایا ان پر؟'' میں اندر سے خوف زدہ ہو گئی تھی کہ جانے امو جان کو کیا علم ہو گیا ہو گا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ماما نے امو جان کے سامنے میرے اور ارسل بھائی کے بیچ کچھ ہونے کا بے بنیاد الزام لگا دیا ہو۔

''بس وہ زائنہ کی موت کی خبر سن کر پاگلوں کی طرح اس پر دوہتڑ برسانے لگی اور کہتی جا رہی تھی کہ وہی اس کی بیٹی کا قاتل ہے، اس نے جان بوجھ کر اسے گھر میں اس وقت تک رکھا جب تک کہ اس کے جسم کا سارا خون بہہ نہیں گیا۔''

''اوہو......'' اس صورت حال کا سوچ کر ہی میرا جسم لرزنے لگا۔ ''بس کریں امو جان۔'' میں رونے لگی۔

''اسی لیے تو تمہیں بتا نہیں رہے تھے امرت۔'' امو جان نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔'' جانتی ہوں کہ ایسے معاملات میں تم کتنے چھوٹے دل کی اور کم ہمت ہو۔''

''امو جان...... اس کی اتنی پیاری صورت...... مجھے کس طرح بھول سکتی ہے اور مجھے کیا علم تھا کہ جس بیٹی کے حوالے سے اس نے اتنے خواب دیکھے تھے اسے دیکھنا تک اس کے نصیب میں نہیں ہو گا اور وہ بدنصیب میرے دودھ پر پلے گی۔''

''اچھا تم تیار ہو جاؤ میری جان، چلتے ہیں اسپتال......'' امو جان نے کہا۔'' حبیب کو بھی ساتھ ہی لے چلیں

گے، ایسا نہ ہو کہ پیچھے بھوک سے یہ بلکنے لگے...... تو اسے کون سنبھالے گا؟''

''جی امو جان۔'' میں اٹھی۔'' اسے تو میں ویسے بھی چھوڑ کر نہ جاؤں کسی کے بھی پاس۔'' امو جان کی گود میں سکون سے سوئے ہوئے حبیب کا بوسہ لے کر میں نے کہا۔

''اللہ تمہیں اس کے حوالے سے لاکھوں، کروڑوں خوشیاں نصیب کرے۔''

''آمین...... امو جان، اس پر پڑنے والی ہر نظر میرے لیے ایک نئی خوشی لاتی ہے۔'' میں نے اسے منہ بسورتے ہوئے دیکھ کر کہا، پیار سے اسے دیکھا اور سوچا، جانے کیا خواب دیکھ رہا ہو گا۔

☆☆☆

''میں تیار ہوں امو جان۔'' میں نے... جلدی سے شاور لے کر لباس تبدیل کیا تھا اور جلدی، جلدی گیلے بالوں کو ہی جوڑے کی شکل میں لپیٹ لیا تھا۔

''ڈرائر سے بال تو سکھا لیتیں بیٹا...... کہیں گیلے سر ہوا لگ گئی تو بیمار پڑ جاؤ گی، چھلے میں زچہ کو اپنی اور بچے کی خاص احتیاط کرنا ہوتی ہے۔''

''بال سکھانے لگ گئی تو، تو وہ بھوک سے بلکتی رہے گی۔'' مجھے دل سے اس کی بھوک کی طلب کا احساس ہوا تھا۔

''چلو پھر...... چادر دُہری کر کے سر پر لپیٹ لو بیٹا۔''

''امو جان، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''چلیں آپ۔''

پہلی بار میں نے اسے ایک نئے احساس کے ساتھ گود میں اٹھایا تھا، اسے گود میں لیتے ہی میرا دل بھر آیا اور اپنے ساتھ لگا کر میں ہچکیوں سے رونے لگی...... یہ زائنہ کی نشانی تھی، زائنہ کے چہرے کی ساری خوب صورتی کی چھاپ اس پر تھی... میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا، میں نے کبھی بھولے سے بھی یہ خواہش نہ کی تھی کہ زائنہ کے ساتھ کچھ بھی برا ہو، ہمیشہ سوچتی تھی اور دعا کرتی تھی کہ اللہ اسے ہدایت دے اور وقت اسے دکھائے کہ میں ایسی نہ تھی جیسا کہ ان ماں بیٹیوں نے مجھے سمجھا اور ملامت کی تھی۔

ارسل بھائی سے بھی میں بچ کر رہتی، مبادا کہ وہ کوئی اور دم چھلا میرے ساتھ لگا دیں، ارسل بھائی تو اب بھی وہی تھے مگر حالات کیسے بدل گئے تھے۔ ماما نے تو ارسل بھائی سے بائیکاٹ کر رکھا تھا، امو جان نے ہی یہ راہ سجھائی تھی، آخر کو پنکی ہمارا اپنا خون تھی، زائنہ کی بیٹی اور اسے کچھ ہو جاتا تو غم اور بھی گہرا ہو جاتا۔

روتے ہوئے میں اسے دودھ پلا رہی تھی، میرے آنسو اس کے گالوں پر گر رہے تھے، مجھے وہ یوں ہی لگی جیسے کہ اسے بھی میں نے ہی جنم دیا ہو، وہ میرے حبیب کی رضاعی بہن تھی۔ حبیب کی نسبت اس کا سائز دوگنا تھا اور اسے بھوک بھی اس سے کہیں زیادہ لگتی تھی مگر حبیب کو اللہ نے صبر دیا تھا، اس کا پیٹ تھوڑے سے ہی بھر جاتا تھا، حالانکہ میں چاہتی تھی کہ وہ اور دودھ پیے مگر وہ چند منٹوں میں سو جاتا۔ اللہ کا کرم تھا کہ حبیب بھی تیزی سے روبصحت تھا، اسے میری بیماری نے چھوا تک نہ تھا، جس بات کا ڈاکٹر کو خطرہ تھا ایسی کوئی صورت حال درپیش نہ ہوئی تھی۔ میں اس کی جان بچ جانے کو، اس کی صحت کے بہتر ہو جانے کو اپنی اس نیکی کا اجر سمجھ رہی تھی جسے کرنے سے پہلے مجھے علم تک نہ تھا کہ وہ بچی ہمارا اپنا خون تھی، اس کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ بھی تھا۔

☆☆☆

''مجھے تو بہت مشکل لگ رہا ہے کہ میں پنکی کو ساتھ لے کر جا سکوں۔'' استقبالیہ کمرے میں، میں امو جان، سیما اور ارسل بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ ''دو دن میں ہی جس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کے بعد تو میں شش و پنج میں پڑ گئی ہوں۔''

"میں اسے کس طرح سنبھالوں گا؟" ارسل بھائی نے بے بسی سے کہا۔ "امی جان زندہ ہوتیں تو شاید وہ کسی نہ کسی طرح، کوئی ملازمہ وغیرہ رکھ کر اسے پالنے کا انتظام کر لیتیں مگر میں اور ابا کس طرح اسے سنبھالیں گے؟"

"کاش میں اسے ساتھ لے کر جا سکتی ارسل...... میری تو عمر بھر کی پہلی امید تھی یہ، بڑے ارمانوں سے میں نے ساری قانونی کارروائیاں پوری کر کے پاکستان کا سفر کیا اور سوچا تھا کہ واپسی پر میری گود میں بچی ہوگی، میں خود تہی دست و تہی دامن واپس لوٹوں گی تو اپنی زندگی کو نارمل انداز سے نہ گزار پاؤں گی۔"

"یہ میرے پاس آپ کی امانت ہی رہے گی آپا، جب یہ اس قابل ہو جائے گی کہ اسے امرت پر انحصار نہ کرنا پڑے تو آپ آ کر لے جائیں اسے۔" ان کے یوں کہنے سے میرا چہرہ شرم سے تپ گیا۔

"اللہ کا شکر ادا کرو ارسل کہ اس نے امرت کو تمہاری بیٹی کی زندگی کا وسیلہ بنا دیا ہے......"

"لیکن میں اسے اس سے زیادہ کہاں تک......" میں نے ہچکچا کر کہا۔

"وعدہ کرو امرت کہ تم اس بچی کی زندگی کو بچانے کے لیے ہمارا ساتھ دو گی؟" سیما نے میری بات بیچ میں سے کاٹ کر کہا۔ "ہم عمر بھر تمہارے اس احسان کو فراموش نہیں کریں گے۔" اس کی انگریزی بہت اچھی تھی مگر اردو بولتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں انگریزی کی چھاپ تھی۔

"لیکن سیما جی......" میں متردد ہوئی۔ "میں ایسا وعدہ کرنے یا ایسی ضمانت دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"بچی کی نانی سے کہو کہ وہ اس معصوم کو اپنے گھر میں تو رہنے دیں...... امرت بھی اسی گھر میں ہے، کم از کم ایک مسئلہ تو حل ہوگا۔" سیما نے ارسل بھائی سے کہا تھا۔

"ہونہہ آنٹی، جانے اُن کو کیا ہو گیا ہے۔" ارسل بھائی نے کہا۔ "وہ بہت غصے میں ہیں اور میں تو ان کے سامنے بھی نہیں جا سکتا...... کجا یہ کہ ان سے ایسی بات کروں۔"

"آنٹی آپ ان سے بات کریں پلیز۔" سیما نے امو جان کی منت کی۔

"میں؟" امو جان نے کہا۔ "میں ذرا مشکل صورتِ حال سمجھتی ہوں...... میں جمال سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔" انہوں نے صرف کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ "ویسے امرت اب زیادہ عرصہ اس گھر میں نہیں رہے گی، جلد ہی یہ اپنے نئے گھر میں منتقل ہو جائے گی۔"

"اوہو...... کہاں ہے ان کا نیا گھر؟" سیما نے پوچھا۔

"ہے تو اسی گھر کے نزدیک...... لیکن یہ کس طرح دو بچے سنبھال سکتی ہے، وقت کے ساتھ، ساتھ اس کے اپنے بچے کی خوراک کی ضرورت بڑھے گی تو......"

"میں دیکھتی ہوں کہ میں کس حد تک اور کس طرح اس معاملے کو ہینڈل کر سکوں گی۔" میں نے مداخلت کی۔ "میں اس ویک اینڈ تک شفٹ ہو جاؤں گی، اس کے بعد میں آپ سے رابطہ کر کے صورتِ حال کو واضح کر سکوں گی۔"

"آپ کو لگتا ہے کہ آپ کے شوہر کو اعتراض ہوگا؟" سیما نے پوچھا۔

"میں بات کروں زین کے ساتھ؟" ارسل بھائی نے کہا، میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ بات کرتے تو زین انہیں کیا جواب دیتا، کیا سوچتا اور کیا سمجھتا، اس بات کو کتنے رنگ دیتا۔ اگر ماما نے ارسل بھائی کو قاتل کہہ دیا تھا اور اس بچی کو اپنایا نہیں تھا تو یقیناً گھر کے باقی سب لوگ بھی اسی نہج پر سوچ رہے ہوں گے سوائے چاچو کے۔ امو جان نے بالکل درست سوچا تھا کہ اس سلسلے میں صرف چاچو سے سمجھداری کی امید کی جا سکتی تھی۔

"آپ واپس کب جا رہی ہیں؟" میں نے سیما سے پوچھا۔

"ایک ماہ کے لیے آئی تھی، ایک مہینہ چھٹی بڑھا لی ہے...... ارسل کو دیکھتی ہوں تو دل کٹتا ہے، اس کے لیے کچھ نہ کچھ کر کے جانا چاہتی ہوں۔"

"ہوں......" میں نے کہا۔ "سیما جی آپ سے علیحدگی میں کوئی بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"جی...... چلیں ہم باہر چلتے ہیں آنٹی۔" ارسل بھائی اٹھے۔

"آپ جائیں، امو جان کو یہیں رہنے دیں۔" میں نے ان سے کہا۔ وہ خاموشی سے چلے گئے اور میں نے آہستگی سے سیما کے قریب جا کر کہا تھا کہ میں بچی کے لیے دودھ کی بوتلیں بنا دیا کروں گی، وہ صبح اپنا ڈرائیور بھیج کر منگوا لیا کریں، اس پر انہیں خوشی تو ہوئی مگر میری تکلیف اور مشقت کا سوچ کر متردد ہوئیں۔

"کوئی بات نہیں سیما جی، بچی، زائنہ کی بیٹی بھی تو ہے، صرف ارسل بھائی کی نہیں اور اللہ نے اگر مجھے وسیلہ بنایا ہے تو میں چند دن کی تکلیف برداشت کر لوں گی۔"

"اللہ ہی تمہیں اس کا اجر دے گا پیاری۔" انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر بھینچ کر پیار کیا۔

"کوئی اپنے جیسی پیاری...... سمجھدار اور ایثار پسند لڑکی نظر میں ہو تو بتانا، میں ارسل کا کچھ کر کے جانا چاہتی ہوں۔"

"اتنی جلدی......" میرے منہ سے پھسل گیا۔

"اس بچی کا ہی مسئلہ ہے امرت، ورنہ میں کبھی بھی ایسا نہ چاہتی۔" ان کی آنکھیں بھر آگئیں۔ "ارسل کو زائنہ سے بہت پیار تھا، میں تو بہت خواہش رکھتی تھی کہ شفاف......"

"ارسل بھائی مان گئے ہیں کیا؟" میں نے سوال کیا۔ دل میں سوچا کہ ابھی زائنہ کو گئے ہوئے دو ہفتے ہوئے ہیں اور ارسل بھائی کی بہن نے اپنے بھائی کی شادی کا سوچنا شروع کر دیا ہے۔

"شوق سے تو نہیں مانا مگر بہت سمجھانے کے بعد اسے بھی علم ہوا ہے کہ اس مسئلے کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

"شفاف کی آپشن تو اب بھی موجود ہے......" میں نے تجویز دی۔

"آئی تھی میرے ذہن میں وہ آپشن بھی مگر نہ تو وہ اپنی اتنی اچھی نوکری اور ماں باپ کو چھوڑ کر پاکستان آنا چاہے گی اور نہ ارسل، ابا کو تنہا چھوڑ کر جائے گا۔"

"پہلے بھی تو آپ نے سوچا ہی تھا نا ں ایسا۔"

"اس وقت امی جان بھی زندہ تھیں، ارسل امریکا جا سکتا تھا۔ شفاف نئی، نئی پاکستان سے گئی تھی اور اسے اس وقت پاکستان سے بہت پیار تھا، اسے یہاں ملازمت مل جاتی تو وہ بھی یہاں آ کر رچ بس جاتی مگر اب اس کی سوچ اور ترجیحات بدل چکی ہیں۔"

"ہوں......" میں کچھ سوچ رہی تھی۔ "چلیں دیکھتے ہیں، اللہ نے کچھ بہتر رکھا ہوگا اس بچی کے لیے۔"

☆☆☆

"سو گئی ہیں امو جان؟" میرے بالوں میں انگلیاں سہلاتے سہلاتے شاید وہ نیند میں چلی گئی تھیں۔

"نہیں بیٹا۔" انہوں نے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"سوچ رہی تھی کہ کاش سارہ نے شادی نہ کر لی ہوتی تو میں ارسل بھائی کے ساتھ......"

"پاگل ہو تم تو۔" امو جان ہنسیں۔ "رات کے اس پہر یہ سب سوچ رہی ہو تم۔"

"ایک اور خیال بھی آ رہا ہے امو جان۔"

"وہ کیا خیال ہے؟" انہوں نے سوال کیا۔

"عباس چاچو کی ثانیہ (جسے سب ثانی کہتے تھے)......"

''ایک تو مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ تم لوگ عباس کو ماموں کے بجائے چاچو کیوں کہتے ہو؟'' ان کے لہجے میں ناراضی تھی۔

''ارے ہاں...... یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں امو جان؟'' میں نے بھی حیرت سے کہا۔ ''ہم نے تو جب سے بولنا شروع کیا، انہیں چاچو ہی کہا ہے۔''

''کیونکہ کبیر نے موسیٰ بھائی کے بچوں کی تقلید میں اسے چاچو کہنا شروع کیا، میں نے کبھی نہیں ٹوکا کہ چلو تمہارے ابو کی طرف سے چاچو بھی تو لگتا ہے۔''

''تو پھر اس میں ہمارا کیا قصور ہوا امو جان؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''مگر آپ نے میری بات سنی نہیں، اسے دوسری طرف لے گئیں...... میں کہہ رہی تھی کہ ثنا......''

''میرے ذہن میں بھی یہ خیال آیا تھا امرت۔'' امو جان نے کہا۔ ''چھوٹی دونوں کی منگنیاں ہو چکیں، تسنیم بھابی اب ان دونوں کی شادی پر اصرار کر رہی ہیں لیکن عباس کا کہنا ہے کہ جب تک ثنا (ثانیہ) کا کچھ نہیں ہوگا تب تک وہ چھوٹی دونوں کا بیاہ نہیں کرے گا، کم از کم دونوں چھوٹیوں کی شادی سے پہلے اس کی منگنی ہی ہو جائے۔''

''تو تائی جان دونوں کی شادی نہ کریں، اگر اپنے گھر میں خوشی دیکھنا ہی چاہتی ہیں تو حاتم کی شادی پہلے کر لیں، ہنی (ہانیہ) کو بیاہ کرلے جائیں اور تتلی (تانیہ) اور قاسم کی شادی کچھ عرصے کے بعد کر لیں جب ثنا کا رشتہ کہیں ہو جائے تو۔''

''دونوں بچے شادی کی عمر کو پہنچ چکے ہیں اور اپنے پیروں پر بھی کھڑے ہیں، اسے کیا پڑی ہے دو بار شادیوں کا خرچہ کرنے کی، نہ صرف موسیٰ اور تسنیم کا بلکہ عباس کا بھی خرچہ بچے گا۔''

''پھر تو عباس چاچو کو تینوں بیٹیوں کی شادیاں ایک ساتھ ہی کر دینی چاہئیں۔''

''میں واپس جاؤں گی تو عباس سے بات کر کے دیکھوں گی، ارسل اچھا بچہ ہے۔ خود جانچ پڑتال بھی کر لے اور ثنا سے پوچھ لے، رشتوں کے معاملات اتنے نازک ہوتے ہیں کہ انسان اپنے بچوں کے علاوہ کسی اور کے معاملات میں نہ ہی پڑے تو بہتر ہے۔''

''ثنا کوئی اور تو نہیں امو جان......'' میں نے کہا۔ ''وہ بھی ہماری طرح ہی آپ کی بیٹی ہے، اس کی ماں نہیں ہے جو اس کے لیے سوچے، نہ کوئی اور چاچی، تائی یا خالہ...... اکلوتی پھپھو ہیں آپ اس کی، آپ کو ہی سوچنا ہوگا۔''

''تسنیم ہے ناں اس کی تائی۔'' امو جان نے کہا۔

''انہوں نے ان دو کا سوچ لیا جن کے جوڑ کے رشتے ان کے گھر میں تھے......''

''چلو بات کر کے دیکھوں گی عباس سے......'' امو جان نے پُر خیال نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''اصولاً تو زیبا کو اس بارے میں سوچنا چاہیے اور جب بچی کی ماں جیسی گھر میں ہی موجود ہے تو ارسل کو کہیں اور دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''آپ حسنہ کے بارے میں کہہ رہی ہیں امو جان؟'' میں نے حیرت سے پوچھا، انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بھول کر بھی ایسا نہ سوچیے گا اور نہ ہی ایسی کوئی تجویز چاچو کو بھی پیش کیجیے گا۔''

''وہ تو میں بالکل نہیں کر سکتی......'' امو جان نے کہا۔ ''وہ سوچے گا، میں نے اپنی بیٹی کا رشتہ انہیں اپنے بیٹے کے لیے لینے کا کہا ہے اور یہ مجھے ارسل کی تجویز دے رہی ہیں۔''

''آپ نے بتایا نہیں یہ مجھے۔'' میں نے انجان بننے کی اداکاری کی۔

''تمہیں سب علم ہوگا، میں جانتی ہوں کہ تمنا کو کچھ علم ہو تو تمہیں اس کا علم ضرور ہوتا ہے اور تمہیں کچھ معلوم ہو تو تمنا کو بھی لازمی معلوم ہوگا۔''

''ضروری تو نہیں۔'' ان کا قیافہ غلط تھا، مجھے ہر بات کسی سے بھی کہنے کی عادت نہیں تھی اپنی بہت سی باتیں میں تمنا سے بھی شیئر کرنے سے پہلے دس بار سوچتی تھی۔

''تم جانتی ہو یہ بات...... اس کا مجھے علم ہے۔''

''شامیر کا کیا کہنا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''اسے کوئی اعتراض نہیں ہے...... میں نے اسے تمہارے حالات کی بابت کچھ بتایا تھا، وہ کہتا ہے کہ ممکن ہے اس رشتے کے ہونے سے تمہارے حالات میں بھی بہتری آ جائے۔''

''ہوں۔''

''اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جمال احمد نے اپنے بھائی کی خواہش کے آگے چوں چرا تک نہیں کی، اب اسے ان کی خواہش کو بھی اسی طرح تکریم دینی چاہیے۔''

''میرے حالات کے ٹھیک ہونے کی امید لے کر انہیں قربانی دینے کی ضرورت نہیں ہے امو جان۔'' میں نے کھوئے، کھوئے انداز میں کہا۔ ''نہ ہی میرے حالات میں بہتری اس طرح ہو سکتی ہے۔''

''کیوں کر رہی ہو تم اس طرح کی بات؟'' انہوں نے مجھے سرزنش کی۔ ''اس میں قربانی کی کیا بات ہے اور اگر اسے قربانی بھی سمجھ لیا جائے تو تمہارے بھائی تمہاری خاطر قربانی نہیں دیں گے تو اور کون دے گا؟''

''میرے حالات کو اب کوئی چیز نہیں بدل سکتی امو جان۔'' میں نے مایوسی سے کہا، امو جان بے سمجھے میرے چہرے کو گھور رہی تھیں۔

☆☆☆

چاچو کے چلا، چلا کر بات کرنے کی آواز آ رہی تھی، اتنا غصہ شاید انہیں کبھی نہیں آیا تھا۔ میں گھبرا کر کمرے

سے نکلی، اموجان غسل خانے میں تھیں۔ میں ابھی تک نیچے زائد والے کمرے میں ہی تھی، سیڑھیاں اترا اور چڑھ نہیں سکتی تھی۔

''خوش ہو تم اب؟'' وہ دھاڑے، میں رک گئی۔ سوچ میں پڑ گئی کہ مجھے ان کے سامنے جانا چاہیے یا کہ نہیں۔

''چیخو مت۔'' ماما کی آواز آئی تھی۔ ''چلا، چلا کر ملازموں کو اور گھر میں رہنے والے غیر متعلقہ لوگوں کے سامنے تماشا مت لگاؤ۔'' غیر متعلقہ لوگوں سے ان کی مراد یقیناً اموجان سے تھی۔

''چیخوں نہیں تو کیا کروں ...... خوشیوں کے شادیانے بجاؤں کیا؟'' چاچو نے نسبتاً آہستہ آواز سے کہا۔ ''تمہی ہو جس نے ساری اولاد کو بے لگام چھوڑ رکھا ہے، انہیں اچھے برے کی تمیز سکھائی نہ انہیں راہِ راست پر رکھا، ان کی وجہ سے میری پوری زندگی تماشا بن چکی ہے۔''

''تو تم خود کر لیتے ان کی تربیت ......''

''میں تمہاری خواہشات اور ان کی ضروریات کی تکمیل کے پیچھے گھوڑے کی طرح بھاگتا رہا اور تم نے بھی انہیں خود ہی اپنے لیے غلط سلط راہیں تلاشنے پر لگا دیا۔'' مجھے شرمندگی کا احساس ہوا کہ میں ان کی لاعلمی میں ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''فضول باتیں تم ہمیشہ سے کرتے آ رہے ہو اور ہمیشہ کرتے رہو گے ...... فی الحال اگر کچھ کر سکتے ہو تو کسی سے رابطہ کرو، کوشش کرو کہ کسی نہ کسی طرح یوسف سے بات ہو جائے اور علم ہو جائے کہ وہ کس جیل میں ہے اور کس جرم کی پاداش میں۔'' ماما کے الفاظ سے میرا سارا وجود سرد ہو گیا۔ میں دبے قدموں واپس کمرے میں لوٹ آئی، واپسی پر عقب میں دروازہ بند نہیں کیا تا کہ اس کی آواز سے انہیں علم نہ ہو کہ میں باہر تھی اور میں نے ان کی گفتگو سنی ہے۔

''کہاں تھیں تم؟'' اموجان، حبیب کو گود میں لیے ٹہلا رہی تھیں۔ ''بیچارہ رو رہا تھا۔''

''یہیں پر تھی۔'' میں نے غائب دماغی سے کہا اور حبیب کو ان سے لیا۔

''یہ جمال اور زیبا آپس میں تکرار کر رہے ہیں یا کسی ملازم کی شامت آئی ہوئی ہے؟'' اموجان نے پوچھا۔

''پتا نہیں امو ...... میں تو باہر نکلی اور ان کی آوازیں سن کر واپس آ گئی کہ جانے کیا معاملہ ہے، میں مداخلت نہ کروں تو بہتر ہے۔''

''دودھ پلاؤ اسے تم، بھوک سے رو رہا ہے۔''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو پیٹ بھر کر سوئے تھے تم ......'' میں نے اس کے گال پر چٹاچٹ کئی بوسے دیے۔ وہ مسکرایا اور میری روح تک سرشار ہو گئی۔

''میں اپنے لیے چائے بنوا لوں ذرا۔'' وہ کہہ کر باہر نکلیں۔ میں دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی۔

''ہائے۔'' زین کی آواز آئی اور ساتھ ہی میرے کندھوں پر اس کے ہاتھ آ ٹکے۔ ''کیسی ہو؟''

''تم دروازہ ناک کر کے اندر کیوں نہیں آتے؟'' میں نے چادر کو اپنے اوپر پھیلایا۔

''کیوں ...... میں کیوں دروازہ ناک کر کے آتا؟'' اس نے سامنے آ کر مسکرا کر پوچھا۔ ''یہ کیا تم مجھ سے پردہ کر رہی ہو؟''

''زین ...... میں مصروف ہوں اور دروازہ کھلا ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ تم یا کوئی بھی اور یوں کھلے دروازے سے اندر آ جائے۔''

''تم میرے ساتھ اس طرح غیریت کیوں برت رہی ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم سمجھتے ہو کہ تمہیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہے؟'' میں نے ابرو اچکا کر پوچھا۔ ''یا تمہیں اس کا جواب

معلوم نہیں ہے؟''

''امرت ...... تم مجھ سے یوں کترانا چھوڑو اور میرے ساتھ بیٹھ کر بات کرو کہ مسئلہ کیا ہے۔'' اس نے غصے سے کہا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر پرے کیا۔

''تم اس کمرے سے چلے جاؤ فی الحال۔'' میں نے سختی سے کہا۔

''تم سمجھنے کیا لگی ہو خود کو؟'' اس کا لہجہ بلند ہوا۔

''ارے ...... زین، کب آئے تم؟'' اموجان اس وقت کسی غیبی امداد کی طرح محسوس ہوئیں۔ ''چائے پیو گے بیٹا؟''

''جی تائی جان ...... آپ اپنے ہاتھ سے بنا کر پلائیں گی تو پی لوں گا۔'' اس نے چالاکی سے اموجان کو دوبارہ بھیجا۔ میں نے تو آج تک اسے کبھی چائے پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اٹھا اور اٹھ کر دروازہ بند کیا۔

''دروازہ کھلا رہنے دو زین۔'' میں نے درشتی سے کہا۔

''مجھے بند دروازے کے پیچھے اپنی بیوی سے بات کرنی ہے۔'' وہ کہتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں نے گود میں سو جانے والے حبیب کو سمیٹ کر گود سے نکالا اور اسے اس کے کاٹ میں لٹایا۔ وہ میرے قریب پہنچ چکا تھا، اس کے ہاتھ میری طرف بڑھے۔

''مجھے ہاتھ مت لگانا زین ...... ورنہ میں چیخ، چیخ کر سب کو بلا لوں گی۔'' میں نے اسے دھمکی دی۔

''کیا کہو گی سب سے چیخ چیخ کر؟'' وہ ہنسا۔ ''کہ میرا شوہر مجھے چھو رہا ہے؟'' خباثت اس کے چہرے سے ہی نہیں بلکہ اس کے الفاظ سے بھی ٹپک رہی تھی۔ ''وہ مجھ سے رومانس کر رہا ہے۔''

''میں اب تمہیں اپنا شوہر تسلیم نہیں کرتی۔'' میں نے سختی سے کہا۔

''کیوں تم نے خلع لے لی ہے مجھ سے کیا؟'' حیرت سے اس نے سوال کیا۔

''تم جانتے ہو کہ تم نے کیا، کیا ہے ...... اب ہمارے بیچ اس نام کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''ارے اتنے مضبوط رشتے یوں اتنی آسانی سے تو نہیں ختم ہو جاتے۔''

''تم نے مجھے تین بار، بقائمی ہوش و حواس، میرا نام اور ولدیت بول کر طلاق دی ہے زین۔''

''لگتا ہے کہ تم نے کوئی خواب دیکھا ہے، میری جان۔''

''فضول گفتگو مت کرو میرے ساتھ۔''

''دیکھو ...... پاگل لڑکی، تم معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرو، وہ اس احمق سی لڑکی کی خواہش تھی جو مجھے دل و جان سے چاہتی ہے ...... اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے تمہیں طلاق نہ دی تو وہ زہر کھا کر مر جائے گی۔''

''مرے یا جیے ...... وہ یا تم، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اب۔''

''وہ سب سمجھو کہ ایک ڈراما تھا، صرف اس کو مطمئن کرنے کے لیے۔''

''وہ جب بھی تمہیں اپنی جان لینے کی دھمکی دیتی ہے، تمہاری جان پر بن جاتی ہے ...... کبھی اس کو خوش کرنے کی خاطر تم بھی اسے زہر کھا کر دکھا دو۔''

''غصہ ...... غصہ، بھئی اتنا غصہ۔'' اس نے میرے بازو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''اور بھی حسین بنا رہا ہے تمہیں یہ غصہ۔''

''زین، میں نے کہا ہے کہ مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔''

''تم مجھے خود کو چھونے سے روک نہیں سکتیں۔'' وہ چیخا، میرے دونوں کندھوں سے پکڑ کر مجھے جھنجوڑا۔ ''بیوی ہو تم میری۔''

''نہیں ہوں میں تمہاری بیوی۔'' میں نے زور لگا کر خود کو اس کی گرفت سے چھڑوایا۔ پورے وجود میں درد کی

ایک لہر دوڑ گئی، میں سسکی، پیٹ پکڑ کر میں صوفے کے بازو پر ٹک گئی۔ ''بہتر ہے کہ تم اس کمرے سے نکل جاؤ، میری زندگی سے نکل جاؤ۔''

''واہ بھئی میری شیرنی۔'' وہ ہنسا۔ ''بڑی بہادر بن رہی ہو...... چند دن اور عیاشی کر لو اور دکھا لو مجھے یہ گریز کی ادائیں۔ پھر تو ہمارا اپنا گھر ہوگا، میں اور تم ہوں گے۔'' وہ منہ پھاڑ کر ہنسا۔ ''to live happily together''

میں خاموش رہی، درد برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی، مزید زور آزمائی کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

''آیئے، آیئے میری پیاری تائی جان۔'' اس نے دروازے پر دستک سن کر دروازہ کھولا۔ ''بڑی جلدی چائے بن گئی۔''

''اوہو...... لگتا ہے میں مخل ہوئی ہوں۔'' امو جان کھسیا گئیں۔

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کی بیٹی ویسے بھی ذرا مجھ سے ناراض سی ہے...... بے نیازی دکھا رہی ہے، اسے منانے کے لیے لگتا ہے کہ کوئی بڑا لالچ دینا پڑے گا۔''

''میری بیٹی لالچی ہرگز نہیں ہے، کسی بات پر تم سے ناراض ہے تو تم سوچو کہ کس طرح اپنا رویہ درست کر سکتے ہو، اب یہ بچہ تم دونوں کے بیچ پل بننا چاہیے، اس سے پہلے جو بھی بے پروائی ہوگئی سو ہوگئی۔ اب تم باپ بن گئے ہو، ذمے داری سے کام لو۔'' امو جان کو لگا کہ لوہا گرم ہے، انہوں نے چوٹ لگائی۔ وہ سعادت مندی سے ساری بات سنتا رہا۔

''آپ فکر نہ کریں تائی جان، اس کے بعد آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' اس نے چائے کا کپ اٹھا کر چسکی لی۔

☆☆☆

سارہ کو کئی بار کال کی تھی مگر اس کی طرف سے جواب نہیں آیا، میں نے اسے پیغام بھیجا جو کئی پہر تک چیک نہیں ہوا تھا تو میں نے اسے ای میل بھیجی۔ شام کو اس کا جواب آیا کہ اس کا فون گم ہوگیا ہے، اس کے پاس کوئی فون نہیں ہے اس لیے وہ میرے پیغام چیک نہیں کر سکی۔

''اپنا پی ٹی سی ایل کا نمبر بھیجو۔'' میں نے اسے مختصر ای میل بھیجی۔

''میرے پاس کوئی فون نہیں ہے......'' جواب آیا۔

''سخت ایمرجنسی ہے...... بات کس طرح ہو سکتی ہے؟''

''میرے پاس تو اس کا کوئی حل نہیں ہے......'' جواب آیا۔

''اچھا ٹھہرو...... میں کچھ کرتی ہوں۔'' اسے ای میل بھیج کر سوچنے لگی کہ ڈرائیور کے ساتھ چلی جاتی ہوں اور اس سے مل لیتی ہوں مگر حالت ایسی نہ تھی کہ جا سکتی پھر حبیب کو بھی ساتھ لے کر جانا ممکن نہ تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اوپر جا کر اپنا ایک پرانا فون نکالا، اس میں وہ سم تھی جو میں ملازمت کے دوران استعمال کرتی تھی۔ پچھلے سال میری سالگرہ پر چاچو نے مجھے نیا فون لے کر دیا تھا، تب سے یہ فون متروک ہوا... بیکار پڑا تھا۔ ڈرائیور کو وہ فون دے کر سارہ کا پتا سمجھایا، اسے پیسے دیے کہ راستے میں سے وہ ایک ہزار روپے کا بیلنس بھی اس نمبر پر لے کر فون سارہ کو دے آئے اور اسے بتائے کہ مجھے پیغام بھیج کر بتائے کہ فون اسے مل گیا ہے۔

''جی میڈم بتائیں کہ کیا اہم بات درپیش ہوگئی ہے؟'' اس کا مسکراتا ہوا پیغام آیا۔ ڈرائیور ابھی تک واپس نہ لوٹا تھا مگر اس کے پیغام سے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے فون اور بیلنس مل گیا تھا۔

''سارہ بہت ضروری تم سے ملنا ہے۔'' میں نے اسے کال کی۔

''آج تو ممکن نہ ہوگا پیاری۔'' اس نے کہا۔ مگر مجھے اس کے لہجے میں کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔

''آج کیا ہے سارہ؟'' میں نے پوچھا۔ ''مجھے بہت ایمرجنسی ہے۔''

''چھوٹو ٹھیک ہے ناں اور تم خود کیسی ہو؟'' اس نے سوال کیا۔ ''میں آئی تھی اسپتال، تمہاری ساسو ماں سے ملاقات ہوئی تھی، تم خود تو ابھی ہوش میں نہ تھیں، اس کے بعد میں اپنے ہی مسائل میں الجھی رہی۔''

''کوئی بات نہیں...... چھوٹو کا نام رکھ لیا ہے، حبیب اور وہ ٹھیک ہے۔''

''کل کوشش کر کے ملتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اب تمہارا فون واپس کیسے بھیجوں؟'' اس نے سوال کیا۔

''یہ فون اب تمہارا ہی ہے......'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''نمبر بھی تمہارا، یہ سم لی بھی تمہارے ہی نام سے تھی...... یاد ہے ناں۔''

''ارے ہاں۔'' وہ بھی ہنسی۔ ''اسی کو کہتے ہیں کہ پہنچی وہی پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔''

''کل ملیں گے پھر۔'' میں نے فون بند کرنے سے پہلے ایک بار پھر اسے یاد دلایا۔

☆☆☆

''تم بھی عجیب لڑکی ہو امرت۔'' امو جان مجھے تیار ہوتا دیکھ کر ناراض ہو رہی تھیں۔

''میں جلد آ جاؤں گی امو جان...... سارہ کو کوئی مسئلہ درپیش ہے اور وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے اور اب میں لڑکی نہیں رہی، ایک بچے کی ماں بن چکی ہوں۔''

''ماں باپ کی نظر میں بچے ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں۔'' انہوں نے پیار سے کہا۔

''آپ نے اس کا خیال رکھنا ہے امو جان، اسے ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑنا، باتھ روم جانا ہو تو اس وقت جائیں جب یہ سو رہا ہو، وہ بھی کمرے کا دروازہ لاک کر کے لیکن اس کی آواز پر دھیان رکھیے گا۔ دودھ کا ایک فیڈر بنا میں نے اس کے لیے بھی تیار کر دیا تھا، اسے گرم نہیں کرنا، اگر روئے تو دیں ورنہ امکان ہے کہ یہ سوتا رہے گا۔'' نکلتے ہوئے میں نے اسے پیار کیا، امو جان کو بھی گال پر بوسہ دیا اور اللہ حافظ کہا تھا۔

''آپ جائیں چاچا۔'' اس کے گھر کے باہر اتر کر میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ''جب مجھے واپس آنا ہوگا تو میں آپ کو کال کر لوں گی۔'' وہ نظر سے اوجھل ہوئے تو میں سارہ کے فلیٹ کی طرف بڑھی، بیل کر کے کافی دیر انتظار کرنا پڑا تھا تب کہیں جا کر دروازہ کھلا تھا۔ گھر پر وہ اکیلی ہی تھی، بچیاں اسکول گئی ہوئی تھیں۔

''تم آج اسکول کیوں نہیں گئیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''تم سے جو ملنا تھا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''تم نے خود کہا تھا کہ کل ملتے ہیں، میں بھی کسی وجہ سے چھٹی ہوگی۔'' میں شرمندہ ہوگئی کہ اس نے میری وجہ سے چھٹی کی تھی۔

''مذاق کر رہی ہوں، کہاں ایسے نصیب کہ جب جی چاہے چھٹی کر لو۔'' اس نے مجھے مزید شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔ ''طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے۔''

''تم روتی رہی ہو؟'' اس کی آنکھیں صرف سوجی ہوئی ہی نہ تھیں بلکہ ان کے گرد گہرے حلقے پڑے ہوئے تھے۔

''ہوں......'' اس نے ہولے سے کہا۔

''کیوں؟''

''بتایا ہے ناں کہ طبیعت خراب تھی۔''

''کیا ہوا تمہاری طبیعت کو؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''جو چند ماہ پہلے تمہاری طبیعت کو ہوا تھا۔'' اس نے نظر چرا کر کہا۔

"کیا؟" میں چیخی۔ "تم مذاق کر رہی ہو ناں۔"

"اوہوں۔" اس نے سستی سے کہا۔ "مذاق نہیں کر رہی ہوں لیکن میری زندگی مذاق ہی بن گئی ہے پیاری۔"

"میں سمجھی نہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تم ایسا چاہتی نہیں تھیں یا کوئی اور مسئلہ ہے؟"

"تم بتاؤ کیا پیو گی، چائے یا پانی؟" اس نے بات بدلی۔

"کچھ بھی نہیں، مجھے کچھ کھانا پینا نہیں ہے، میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی دودھ پیا تھا...... تم میرے سوال کا جواب دو۔"

"امرت...... وہ ایک دن آیا تو اس کی پہلی بیوی اس کے ساتھ تھی، وہ خوب لڑ جھگڑ رہی تھی، مجھے بھی اس نے کئی باتیں سنائیں اور بدکردار تک کہا۔ اس کے خیال میں ہم جیسی عورتیں ملازمت کرتی ہی اس لیے ہیں کہ مردوں کو پھانس سکیں۔" اس نے بتایا تو مجھے یاد آ گیا کہ ماما کے خیالات بھی کچھ ایسے ہی سنہرے تھے۔ "اس نے میرے سامنے اپنے اور میرے شوہر سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اسے یا مجھے...... کسی ایک کو طلاق دے، دے، ورنہ وہ اس کی زندگی سے نکل جائے گی اور ساتھ ہی وہ اس کو دنیا میں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑے گی۔" وہ رکی۔ "میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی دبنگ اور بدتمیز عورت نہیں دیکھی امرت۔" وہ کھوکھلی ہنسی ہنسی تھی۔

"کیونکہ تم نے ماما کا یہ انداز نہیں دیکھا۔" میں نے دل میں سوچا۔

"اور وہ اس سے کافی دیر بحث کرتا رہا، اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا مگر جیت نہ سکا اور پھر اس نے مجھے طلاق دے دی، اس کی بیوی کے ہاتھ میں طلاق نامہ تھا، وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی، اس نے اپنے شوہر کے ہاتھ میں وہ کاغذ اور پین پکڑایا اور اس سے کہا کہ اس میں خالی جگہ پر ہم دونوں میں سے کسی ایک کا نام تحریر کر دے......" وہ سسکی۔ "ہمارے اس دبو شوہر نے اس سے وہ کاغذ پکڑا، بغیر کسی لمحے کا توقف کیے اس میں میرا نام تحریر کیا اور مجھے صرف زبانی ہی نہیں بلکہ تحریری طلاق بھی دے دی۔" اس نے گہری سانس لی۔ "اس کے دماغ کو یہ فیصلہ کرنے میں دیر بھی نہ لگی کہ اس کی زندگی میں اہم کون ہے؟"

"اس طرح کسی کی دھونس سے طلاق دلوانے سے کیا طلاق ہو جاتی ہے؟" میرا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

"اس کی بیوی نے تو اس سے کہا تھا کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو طلاق دے...... اسی نے مجھے طلاق دینے کا فیصلہ کیا اور مجھے طلاق دی، ورنہ جو اپنے منہ سے مانگ رہی تھی اسے طلاق دے دیتا۔"

"مگر تم کہہ رہی ہو کہ تم پریگننٹ ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ مجھے دو تین دن پہلے ہی پتا چلا ہے۔"

"اوہو...... مگر اس حالت میں کیا طلاق ہو جاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے اسے بتایا ہے کہ تم پریگننٹ ہو، ممکن ہے کہ وہ اپنا ذہن بدل لے؟"

"طلاق تو طلاق ہے، جب شوہر بیوی کو یہ تحفہ دے، دے تو اسے واقع ہونے سے تو کوئی نہیں روک سکتا، اس نے رابطے کے سارے امکانات ہی ختم کر دیے ہیں...... طلاق زبانی بھی دے کر اور پھر اسے تحریری شکل دے کر بھی۔ اب فرق صرف یہ ہے کہ مدت عدت چار ماہ دس دن کے بجائے وضع حمل تک کی ہو گی۔" اس نے وضاحت کی۔

"اس نے زبانی یا تحریری طور پر تمہیں کتنی بار طلاق دی؟"

"ایک بار کہا ہے اور لکھی ہوئی میں بھی ایک بار لکھا ہوا ہے۔"

"اور تم سمجھتی ہو کہ اس سے طلاق فائنل ہو گئی ہے؟"

"ہاں مگر رجوع کے امکانات موجود ہیں۔"

"ہاں......"

"تو ایسا ہے ناں کہ اگر وہ رجوع کر لے تو سب ٹھیک ہو جائے گا؟" میں نے کہا۔

"اسے رجوع کرنا ہوتا تو وہ مجھے طلاق دیتا ہی کیوں؟"

"میں مسئلے کی بات کر رہی ہوں...... شرعی طور پر گنجائش کو دیکھ رہی ہوں۔"

"ہاں، شرعی طور پر تو گنجائش موجود ہے......"

"تو پھر اسے بتایا جا سکتا ہے اور دیکھتے ہیں کہ وہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔"

"میں بہتے پانی پر بنے ہوئے اس مکان کی مکین نہیں بننا چاہتی ہوں امرت......"

"تم صرف یہ بتاؤ کہ مذہب کی رو سے تو گنجائش موجود ہے ناں؟"

"ہاں۔"

"تمہیں کس نے بتایا ہے اس سب کے بارے میں؟" میں نے پوچھا۔ کیونکہ جانتی تھی کہ سارہ مذہب کے بارے میں کم ہی معلومات رکھتی تھی۔

"ہیں ایک مولانا صاحب، بہت پرانے دوست ہیں میرے ابا کے، انہوں نے خود بھی بتایا اور پھر مستند ذرائع سے معلوم کر کے بھی بتایا ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

"مجھے بھی لے چلو گی اُن کے پاس؟" میں نے اشتیاق سے کہا۔

"کیا تمہیں میرے بیان پر کوئی شک ہے؟" اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"نہیں...... مجھے اپنے کچھ شک رفع کرنا ہیں۔" میں نے کہا۔ "اسی لیے میں تم سے ملنا چاہ رہی تھی۔"

"کیا شک ہیں تمہارے...... کیا تمہیں مجھ پر کوئی شک ہے؟"

"فی الحال میں نہیں کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔" میں نے اس سے بات کر کے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کا ارادہ مؤخر کر دیا تھا۔

☆☆☆

"مولانا صاحب...... کچھ سوالات ہیں ذہن میں، کچھ الجھنیں، ان کے لیے آپ کی رہنمائی چاہیے۔" میں نے اُن کی طرف دیکھے بغیر سر جھکا کر کہا۔

"جی کہو بیٹا!" انہوں نے بھی سر جھکائے، جھکائے کہا۔ چھ کرسیوں کی مستطیل ڈائننگ ٹیبل کے ایک سرے پر رکھی کرسی پر میں بیٹھی تھی اور دوسرے پر وہ، سارہ باہر انتظار گاہ میں تھی جو اُن کے گھر کا لاؤنج تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھے کچھ ذاتی باتیں کرنی ہیں اس لیے وہ باہر ہی رکے، اسے کوئی اعتراض نہ ہوا تھا۔

"مولانا صاحب، کسی فرقے میں ایسا ہوتا ہے کہ اگر شوہر ایک ہی بار میں بیوی کو سو بار طلاق بھی کہہ دے تو وہ ایک ہی طلاق شمار ہو گی؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا یہی ایک سوال ہے تمہارا بیٹا؟" انہوں نے بدستور سر جھکائے پوچھا۔

"نہیں، اس ایک سوال سے وابستہ اور بھی بہت سے سوالات ہیں۔"

"تو پہلے تم سارے سوال ایک، ایک کر کے پوچھتی جاؤ پھر میں جواب دوں گا۔"

"اگر کوئی شوہر، اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور لڑکی کو خوش کرنے کے لیے، اس کی ضد ماننے کے لیے، اسے فون پر لائن حاضر رکھ کر، تین بار پورے الفاظ ادا کرے کہ میں مسمی فلاں، فلاں ابن فلاں، فلاں لڑکی بنت فلاں کو بقائمی ہوش و حواس طلاق دیتا ہوں تو کیا وہ طلاق واقع ہو جاتی ہے؟"

’’وہ دوسری لڑکی؟‘‘
’’اس مرد کی سو کالڈ دوست مولانا صاحب......ایک غلط دوستی۔‘‘
’’اگلا سوال؟‘‘
’’طلاق کے وقت اگر بیوی حالتِ حمل میں ہو تو طلاق ہو سکتی ہے؟‘‘
’’ہوں......اور کوئی سوال؟‘‘
’’کیا تین بار کہی ہوئی اس طلاق کو ایک طلاق شمار کیا جائے گا کیونکہ یہ ایک ہی بار میں تین دفعہ کہا گیا تھا...... بعد ازاں اگر شوہر اس کے بارے میں دعویٰ کرے کہ وہ مجبور ہو گیا تھا اور اس کا مطلب طلاق دینا ہرگز نہ تھا تو اس کے دعوے کو تسلیم کیا جانا چاہیے؟‘‘
’’مجبوری کی کوئی وضاحت؟‘‘ ہولے سے پوچھا گیا سوال......
’’مجبوری یہ کہ اس لڑکی نے فون کر کے یہ کہا ہو کہ وہ فون لائن پر موجود ہے اور ابھی اگر وہ اپنی بیوی کو طلاق کے الفاظ اسے فون پر حاضر رکھ کر نہیں کہے گا تو وہ خودکشی کر لے گی۔‘‘
’’اچھا......‘‘
’’اب شوہر یہ بھی کہتا ہے کہ اسے تو یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے تین بار وہ الفاظ کہے بھی ہیں کہ نہیں۔‘‘
’’کیا وہ شوہر قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ بات کہہ سکتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو تین بار طلاق کے الفاظ نہیں کہے ہیں؟‘‘
’’وہ قرآن یا مذہب سے اتنا دور ہے کہ مولوی صاحب ممکن ہے وہ اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے ایسا کر بھی دے۔‘‘
’’اونہوں......ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے، کسی شخص کے بارے میں ذرا سا بھی گمان ہو کہ وہ جھوٹا ہے اور قرآن اٹھا کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے تو ایسی صورت میں قرآن اس کے ہاتھ میں پکڑانا بھی نہیں چاہیے۔ یہاں عدالتوں میں ہر روز ہزاروں لوگ جھوٹے قرآن اٹھاتے ہیں اور پھر ہم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں کہ بھئی اس ملک میں حالات اتنے خراب کیوں ہیں......؟ قوموں پر عذاب اسی طرح آتے ہیں بیٹا۔‘‘
’’جی۔‘‘
’’کیا وہ بیوی قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتی ہے کہ اس کے شوہر نے اسے اسی طرح طلاق دی ہے جس طرح کہ تم نے وضاحت کی ہے بیٹا......گواہوں کی موجودگی میں؟‘‘
’’ہاں......بالکل۔‘‘
’’اور اگلا سوال؟‘‘
’’اگر کسی بھی طرح یہ نتیجہ نکلے کہ اسے ایک طلاق کا درجہ حاصل ہے تو کیا اس میں رجوع کی صورت موجود ہے؟‘‘
’’اور؟‘‘
’’اگر حالتِ حمل میں دی جانے والی طلاق کی عدت کی مدت، وضعِ حمل تک ہوتی ہے اور طلاق کے اگلے ہی روز بغیر رجوع کا موقع ملے، وضعِ حمل ہو جائے تو رجوع کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں یا کوئی اور صورت ہے؟‘‘
’’مزید کوئی سوال؟‘‘
’’کیا کسی بھی طرح یہ واضح ہو جائے کہ یہ طلاق وقوع نہیں ہوئی ہے مگر بیوی کے دل میں شوہر کے لیے اتنی نفرت پیدا ہو چکی ہو کہ وہ اس کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو وہ زبردستی اس سے رجوع کر سکتا ہے؟‘‘ میں رکی۔
’’شوہر سے نفرت کی کوئی ٹھوس وجہ؟‘‘
’’شوہر زانی ہو، جواری ہو، عیاش ہو، شرابی ہو، جھوٹا اور منافق......پھر بھی ایک نیک نیت عورت اس لیے اس

کی بیوی بنی رہنے پر مجبور ہوتی ہے کہ اس کے شوہر کا شرعی حق ہے اس پر جبکہ اس کا دل بھی اس کے ساتھ رہنے کو نہ مانتا ہو۔‘‘
’’اب میں کچھ سوالات پوچھ سکتا ہوں؟‘‘
’’جی، کیوں نہیں۔‘‘
’’اخفائے راز ہمارے درمیان پہلی شرط ہے...... تمہیں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ جو کچھ تم نے مجھے کہا ہے وہ تمہاری امانت ہے اور اس میں کوئی خیانت نہیں ہوگی۔‘‘
’’جی اچھا۔‘‘
’’یہ سارے واقعات جن کے بارے میں تم نے اپنے سوالات کیے ہیں، تمہارے اپنے متعلق ہیں یا کسی اور کے بارے میں پوچھ رہی ہو تم؟‘‘
’’اس سے کیا فرق پڑتا ہے مولانا صاحب؟‘‘
’’پڑتا ہے بیٹا، کچھ تفاصیل کا جاننا ضروری ہے، سوال کرنے والے کو یقینِ واثق ہونا چاہیے کہ وہ سوالات پوچھتے ہوئے معلومات کو خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر، منفی انداز میں پیش نہ کر رہا ہو، کم علمی میں کوئی رائے صائب نہیں دی جا سکتی، مجھے مزید کچھ سوالات کے جواب چاہئیں جو تمہارے ان سب سوالات کو سن کر میرے ذہن میں اٹھے ہیں۔ اگر یہ باتیں تم کسی اور کے لیے پوچھ رہی ہو تو مجھے اس سے ان سوالات کے جوابات پوچھ کر بتا دینا۔‘‘
’’جی پوچھیے، مجھے ساری تفصیل کا علم ہے۔‘‘ میرے لیے اس وقت تک بھی یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اگر میں انہیں سچ بتاؤں گی تو وہ راز رہ سکے گا یا پھر میں اُن کے سامنے خود اتنی شرمندہ ہوتی کہ اس کے بعد بات ہی نہ کر پاتی۔

"کیا طلاق کے الفاظ کہتے وقت وہ شوہر نیند یا نشے میں تھا؟"
"نہیں، ہرگز نہیں۔" میں نے فوراً کہا اور مجھے احساس ہوا کہ میرے لہجے کا وہ وثوق ہی کافی تھا جو انہیں بتا دیتا کہ میں کسی اور کے بارے میں معلومات نہیں حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔
"کیا اس کا یہ کہنا کہ وہ کسی لڑکی کی جان لینے کی دھمکی کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے، فقط ایک ڈرامے بازی تھی یا واقعی فون کے دوسری طرف کوئی لڑکی موجود تھی؟ کیا وہ لڑکی جو فون کے دوسری طرف تھی، اس بات کی گواہی دے سکتی ہے کہ اس شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق کے الفاظ من وعن اسی طرح کہے تھے، تین بار مکمل؟"
"فون پر وہ لڑکی موجود تھی۔" میں نے کہا۔ "گواہی دینے یا نہ دینے کا مجھے علم نہیں ہے۔"
"کیا شوہر کا شرابی، جواری، عیاش، جھوٹا، منافق اور......" وہ رکے۔ "زانی ہونا، محض ایک مفروضہ ہے یا اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود ہے؟"
"بیوی خود اس نوعیت کے واقعات کی چشم دید گواہ ہے۔"
"اگر کوئی صورت نکلتی ہو کہ شوہر قرآن پر حلف لے کر کہہ دے کہ اس نے طلاق نہیں دی، کسی بھی فرقے کے مطابق گنجائش بن جائے تو بیوی اس کے ساتھ آباد ہونا چاہے گی؟"
"ہرگز نہیں۔" میں نے بے سوچے سمجھے کہا۔ "وہ پہلے ہی اپنی زندگی اس کے ساتھ انتہائی جبر کے ساتھ گزار رہی ہے، اگر اس نے دعویٰ کیا کہ طلاق اس نے نہیں دی اور عدالت یا شریعت اس کے جھوٹ کو سچ ثابت کر بھی دے تو بیوی کے پاس کافی وجوہات موجود ہیں اس بات کے لیے کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں، اس کی بیوی بن کر نہیں رہنا چاہتی اور خلع حاصل کرنا چاہے گی۔"
"سمجھ گیا بیٹا...... عورت کو اللہ نے خلع حاصل کرنے کا اختیار اسی لیے دیا ہے کہ کوئی خاوند اسے اس کی مرضی کے خلاف اپنے نکاح میں نہ رکھ سکے۔ رہی بات ایسی اور کیسی نوعیت کی وجوہات کی تو ایک بیوی کے پاس تو اتنی سی وجہ بھی کافی ہے کہ اسے اپنے خاوند کی شکل پسند نہ ہو۔"
"مگر ایسا تو میں نے کبھی نہیں سنا۔"
"اصل میں ایسا ہی ہے۔"
"کیا آپ کو اس بات کا یقین ہے؟" میں واقعی نہ جانتی تھی کہ مجھے خلع حاصل کرنے کے لیے کسی ایسی وجہ کو بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی جسے سب لوگ تسلیم کر لیتے۔
"میری ناقص رائے کے مطابق تو یہ طلاق واقع ہو چکی ہے...... رجوع کے امکانات بھی مفقود ہیں، نہ صرف ان حالات کے باعث جو تم نے بیان کیے ہیں بلکہ رجوع کا عمل چونکہ دونوں فریقین کی باہمی رضامندی سے سرانجام پاتا ہے مگر اس کیس میں بیوی اس حد تک متنفر ہے کہ خلع حاصل کرنے کا سوچ رہی ہے تو یقیناً وہ رجوع نہیں کرنا چاہے گی۔"
"جی آپ بالکل صحیح سمجھے ہیں۔"
"ایسی صورت میں اس طلاق کو حتمی سمجھا جائے گا، اگرچہ قرآن میں طلاق کے بارے میں واضح طریقہ کار بتا دیا گیا ہے، یہی مرد کے لیے حکم ہے کہ وہ یک مشت تین بار طلاق نہ دے۔ غصہ ایک جن کی طرح انسان کے دماغ پر قابض ہو جاتا ہے، طلاق کا عمل ہوتا ہی غصے کی وجہ سے ہے اور اس کے باعث مرد کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ اگر مرد طلاق اسی طریقے سے دے جس کی قرآن پاک میں وضاحت کی گئی ہے تو اس میں ایک طویل عرصہ رجوع کے لیے میسر ہو جاتا ہے، ایک طلاق کے بعد چار ماہ، دوسری کے بعد چار ماہ اور پھر تیسری حتمی۔ قرآن

[پا]ک کو سب مسلمانوں کے لیے یکساں کتاب اور طرزِ زندگی کی دستاویز سمجھنا چاہیے نہ کہ مختلف فرقوں میں قرآن کی [وض]احت مختلف انداز سے کرنی چاہیے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ جسے جہاں اپنے لیے سہولت یا گنجائش نکالنا ہوتی ہے وہ [فر]قے کے نام پر قرآن کی تفسیر کو تبدیل کر لیتا ہے، کس امام کے ماننے والے کیا یقین رکھتے ہیں، اس نکتے نے [مذہ]ب کا چہرہ ہی مسخ کر دیا ہے۔ تاہم تمہاری تسلی کے لیے میں پھر بھی مختلف علما سے ضرور چیک کروں گا کہ اگر کسی [فر]قے کے مطابق اس میں کوئی گنجائش نکلتی ہو تو......"
"میرا خیال ہے کہ اس کی مزید تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... آپ نے جو کچھ بتایا ہے میں اس پر [مطم]ئن ہوں۔ میرے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ میرے حقوق کیا ہیں اس رشتے کو لے کر اور یہ کہ رجوع فریقین کی [مر]ضی سے ہوتا ہے نہ کہ جبر اور زور سے۔" میں ان کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلی تو سارہ جمائیاں لے رہی تھی۔ میں [اسے] اندر سے بھی دیکھ رہی تھی کیونکہ جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے اس کا دروازہ بند تھا مگر شیشوں والا دروازہ تھا، وہ [کا]فی بیزار بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر خوش ہو گئی۔
"شکر ہے تمہارا سوال ختم ہوا۔"
"چلو سارہ!"
"ذرا ٹھہرو میں سلام کر لوں ان کو اور کچھ پوچھنا بھی ہے مجھے ان سے۔" کہہ کر وہ اندر گئی اور چند منٹ کے [بعد نک]ل آئی۔ "ہو گئی کوئی تسلی تمہاری؟"
"ہاں...... پوری تسلی ہو گئی۔" میں نے کہا۔
"مولانا صاحب صرف مذہب کے نقطۂ نظر سے ہی نہیں بلکہ ایک بزرگ کے طور پر بھی بڑی مثبت راہنمائی [ک]رتے ہیں۔"
"اچھے انسان ہیں، میری بات توجہ سے سنی، تفصیل سے سمجھایا اور میرا ذہن بھی مطمئن ہے۔"
"مسئلہ کیا درپیش ہے تمہیں، کوئی سر پیر مجھے بھی پکڑاؤ گی؟"
"جب ملے گا تو پورے کا پورا ہی تمہیں پکڑا دوں گی سر پیر کے بجائے۔" میں نے مسکرانے کی سعی کی۔
"اب تم بتاؤ کہ تمہیں مولانا نے کیا مشورہ دیا تھا اس بارے میں؟" میں نے سارہ سے سوال کیا۔ اپنے مسئلے [کے] بارے میں اسے بتانے کا اگرچہ میرا کوئی ارادہ نہ تھا مگر اس کے مسئلے پر بارے میں جاننا چاہتی تھی کیونکہ اس نے [کچھ] حصہ مجھے بتایا تھا۔
"ان کا کہنا تو یہ ہے کہ میرے کیس میں کچھ گنجائش نکلتی ہے، وضع حمل تک امکانات ہیں کہ رجوع کر لیا جائے۔"
"تو تم نے کیا سوچا ہے؟"
"میں نے اب ان سے حالیہ صورتِ حال پر بات کی ہے، ان کا بھی یہی کہنا ہے جو کہ تم نے کہا تھا کہ اسے بتایا [جا]ئے کہ میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں، اس کے بعد دیکھیں کہ کیا ردِعمل ہے اس کا۔"
"یہ تو اچھا ہے کہ اگر کوئی نرم گوشہ اس کے دل میں پیدا ہو جائے۔" مجھے واقعی خوشی ہوئی تھی۔
"مجھے امید تو کم ہی ہے پیاری مگر......" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

☆☆☆

"تم بتاؤ بیٹا...... کب تقریب رکھی جائے، حبیب کی پیدائش کی خوشی میں؟" چاچو نے مجھ سے سوال کیا۔ "[می]ں چاہتا ہوں کہ سارا خاندان اسی بہانے جمع ہو جائے یہاں...... پھر زائنہ کی موت کا صدمہ ہے، اسے بھی تو کسی

طرح مٹانے کو پہلا قدم اٹھانا ہے!"
"اس کی ضرورت نہیں ہے چاچو۔" میں نے رنجیدگی سے کہا۔" کوئی موقع ہی نہیں بنتا اس کا۔"
"موقع کیوں نہیں بنتا بیٹا...... اللہ نے تمہاری اور حبیب کی جان بخشی، دونوں صحت یاب ہو کر گھر لوٹے۔"
"وہ ٹھیک ہے چاچو مگر جو صدمہ اور دکھ ہے، وہ ابھی تازہ ہے......" میری آنکھیں نم ہوگئیں۔" مجھے تو موقع ہی نہیں ملا چاچو کہ آپ کے اور ماما کے ساتھ بیٹھ کر افسوس کرتی، نہ ہی میرے پاس الفاظ ہیں کہ میں آپ دونوں کے زخموں پر مرہم رکھ سکوں۔"
"اللہ کی یہی رضا تھی بیٹا۔" چاچو نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔" وہ اتنی ہی زندگی لے کر آئی تھی۔"
"پتا نہیں کس کی بددعا لے گئی اسے۔" ماما سسکیں۔
"کوئی اسے بددعا کیوں دے گا ماما......" میں نے ہمت کر کے کہا۔" وہ اتنی پیاری اور اتنی اچھی تھی۔"
"اسے نظر لگ گئی ہے کسی کی، اس کا شوہر جو اس کے کلمے پڑھتا تھا، جانے اس کا دل کیوں بدل گیا؟ یقیناً اور کے ساتھ اس کا چکر چل رہا ہوگا جو میری بیٹی کو یوں مرنے دیا اس نے۔"
"اس طرح کی باتیں کر کے اسے شرمندہ مت کرو زیبا۔ وہ پہلے ہی احساسِ جرم سے نہیں نکل پا رہا۔" چاچو نے کہا۔" اوپر سے دکھ کی اس گھڑی میں ہم نے اسے اور اس کی بچی کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔"
"کیوں نکلے احساسِ جرم سے، اچھا ہے کہ وہ اس احساسِ جرم میں مبتلا رہے۔ جب وہ مجرم ہے، ہماری بیٹی کا قاتل ہے تو اسے سزا ملنی چاہیے...... دنیا کی کسی عدالت میں اگر ہم اسے قاتل ثابت نہیں کر سکتے تو اسے اپنے ضمیر کی عدالت کا مجرم تو ہونا چاہیے اور وہاں سے سزا عمر بھر کاٹنی چاہیے۔"
"وہ کیوں قتل کرے گا اسے زیبا؟" چاچو نے غصے سے کہا۔" اس نے اپنے سارے خاندان سے اختلاف کر کے زائنہ سے شادی کی تھی۔"
"تو پھر انہوں نے ہی اپنی مخالفت نکالی ہوگی۔" وہ چیخیں۔" انہوں نے ہی اپنے بیٹے کو ورغلایا ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو قتل کر دے......"
"صبر کریں ماما۔" میں نے ہمت کر کے ان کا ہاتھ تھپتھپایا۔
"تم نے تو بددعا نہیں دی میری بیٹی کو؟" انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچا اور پلٹ کر مجھے گھورا۔
"مم...... مم...... میں کیوں اسے بددعا دوں گی؟" میں ہکلائی اور بمشکل فقرہ پورا کیا۔
"تم جانتی ہو...... تمہیں معلوم ہے کہ تم کیوں بددعا دو گی۔" وہ پاگلوں کی طرح بول رہی تھیں۔" تم اور ارسل...... تمہیں یاد ہے ناں؟" وہ رکیں۔" میں جانتی ہوں، تمہی نے اسے بددعا دی ہوگی۔"
"نہیں ماما......" میں نے احتجاج کیا مگر اس سے زیادہ کچھ کہہ نہ سکی۔" ایسا کچھ نہیں ہے۔"
"اس نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے ناں کہ یہ بچہ جواب تم نے پیدا کر لیا ہے......" وہ اونچی آواز میں بڑبڑائیں۔ چاچو ہونقوں کی طرح ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔" اس نے کہا تھا ناں کہ چیک کروائیں یہ بچہ کس کا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ تمہارے اور زین کے بیچ میاں بیوی جیسے نارمل تعلقات نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ زین نے مجبوراً تم سے شادی کی تھی، اپنے باپ کی عاق کر دینے کی دھمکی سے ڈر کر...... یہ بچہ جو تم نے پیدا کیا ہے، یہ ارسل کا ہے ناں؟ یا کسی اور کا؟"
"تڑاخ!" کی آواز سے میں چونکی۔ چاچو نے پوری قوت سے تھپڑ ماما کے منہ پر مارا تھا، وہ بے حسوں کی طرح دیکھ رہی تھیں۔
"تمہیں کیا ہوا ہے؟" وہ چاچو کو گھور کر بولیں۔" تم نے مجھے تھپڑ کیوں مارا؟" غصے سے اٹھیں اور تن کر چاچو

سامنے کھڑی ہوگئیں۔" اسے مارو تھپڑ، اپنی اس بے حیا بھتیجی کو، اس بے غیرت کو...... جسے میں نے اور زائنہ نے... گھر کی چھت کے نیچے...... اس کمرے میں......" انہوں نے زائنہ والے کمرے کی طرف اشارہ کیا، جہاں ان میں اور امو جان سوتے تھے۔" وہاں! وہاں پکڑا تھا ہم ماں بیٹی نے ان دونوں کو...... رنگے ہاتھوں......"
"یا اللہ!" میں نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر سسکی لی اور چیخ کر کہا۔" کاش یہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں پناہ گزین ہو جاؤں۔" میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ جب ماما نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا وہاں پر کسی بت کی طرح ایستادہ امو جان کو دیکھ کر میں لرز گئی۔ میں یہ سب کچھ انہیں کبھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔
"بہت ہو گیا جمال احمد۔" امو جان چلّائیں۔" اپنی بیوی کے منہ کو بند کروا دو ورنہ میری برداشت کی حد بھی ختم ہو جائے گی۔"
"دیکھا...... ماں ہے ناں، برداشت نہیں کر سکی اپنی بیٹی کے بارے میں ایسی حقیقت۔" ماما ہنسیں۔
"زبان سنبھال کر بات کرو تم...... اپنی بیٹیوں کے بارے میں پہلے آنکھیں کھول کر رکھو تو تمہیں علم ہو کہ کتنی ... ماں ہو تم۔"
"میری بیٹیاں تمہاری بیٹی کی طرح بدکردار نہیں ہیں۔" وہ بھی جواباً چلّائیں۔
"پوچھو اپنے شوہر سے...... جس کی موجودگی میں کبیر نے کال کر کے اپنے باپ کے اور اس کے سامنے، میری اس بیٹی کو اپنے کمرے سے آدھی رات کو نکالا تھا جو اس کے کمرے میں ایک رات گزارنے کی خواہش لے کر ... اس کی مہندی کی رات...... اللہ اسے معاف کرے، اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔ میں عمر بھر اس ... کے ساتھ ... کر مر جاتی اور تمہیں نہ بتاتی جو تم میری اتنی پاک دامن بیٹی پر ایسا نیچ الزام نہ لگاتیں......"
"بکواس بند کرو...... میری مری ہوئی بیٹی کے بارے میں ایسے جھوٹ گھڑتے ہوئے تمہیں شرم بھی نہیں آ رہی...... ... کے ساتھ ایسے سفید جھوٹ بول رہی ہو۔" اتنی بدتمیزی کے ساتھ آج تک امو جان نے کسی سے بات نہ کی ... ان کا چہرہ تو لال ہو ہی تھا میرا پورا وجود غصے سے کانپنے لگا۔
"اگر تمہارے بیٹے میں کوئی شریف مردوں والی بات ہوتی تو تمہیں کبھی شک نہ ہوتا کہ اس کی بیوی دائیں ... منہ مار سکتی ہے۔ اب تمہاری چھوٹی، جس کے رشتے کے لیے جمال احمد نے خود مجھ سے بات کر رکھی ہے، میں اس لیے راضی ہو رہی تھی کہ وہ میرے بیٹے کی قسمیں کھا، کھا کر کہتی ہے کہ وہ اس کے بغیر مر جائے گی، وہ اسے ... تو اسے سانس بھی نہیں آئے گی۔ صرف یہ سوچتی ہوں کہ وہ میری بھی بیٹی ہے، اگر اسے شامیر پسند آ گیا ہے ... میں حرج ہی کیا ہے۔ میں اب تک اس گھر کی اور اس خاندان کی عزت کی خاطر خاموش تھی مگر اب نہیں رہوں ... گی۔"
"امو جان......" میں نے مداخلت کی۔
"جس طرح کے بدکردار تم لوگ ہو، اسی طرح کی تم لوگوں کی دوسروں کے بارے میں رائے ہے......" امو ... میں جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔" میں تو کہتی ہوں ایسے صبر کو بھی بزدلی کہنا چاہیے جو میری بیٹی نے کیا کہ ... ان کو غلاموں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دے...... اور تم......" انہوں نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا۔
"تم کیوں یہ سب سنتی رہیں...... کیا یہ سارے الزام جو تم پر لگا رہی ہے، سچ ہیں کیا؟ تم نے کیوں انہیں اس حد ... بڑھنے دیا کہ تمہیں اس گھر میں لونڈی غلاموں سے بدتر سمجھا گیا؟"
"امو جان۔" میں نے ہاتھ جوڑے۔" خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔"
"اور تم...... جورو کے غلام۔" امو جان گریں اور چاچو سے کہا۔" تم اپنے مرے ہوئے بھائی کی بیٹی کے ساتھ

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتے رہے اور خاموش تماشائی بنے رہے۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس جیسی عورت کو کب کی فارغ کر چکی ہوتی جس کے ساتھ تم نے اپنی ساری عمر گزار دی اور اسے سیدھا تک نہیں کر سکے، یہ کتے کی دم کی طرح ٹیڑھی ہی رہی، الٹا اس نے تمہیں مذہب اور خاندانی اقدار سے بھی دور کر دیا۔'' وہ رکیں۔ ''جو کچھ ہو چکا وہ تم نے برداشت کر لیا، اب میں تمہیں یہاں ایک پل کے لیے بھی نہیں رہنے دوں گی امرت...... اپنا سامان باندھو اور چلو...... ایک باپ کیا مرا، تم نے سمجھ لیا کہ تمہاری ماں بھی مر گئی، بھائی بھی مر گئے، تمہارے لیے ساری دنیا ختم ہو گئی؟''

''اموجان۔'' میں سسکی۔

''تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا؟ اب تم نے ایک لفظ بھی بولا یا میری مرضی کے خلاف ایک منٹ بھی یہاں رکیں تو سمجھنا کہ میں بھی مر گئی ہوں۔'' وہ مجھے کہہ کر رکی نہیں۔ ''میں کبیر کو کال کر رہی ہوں، وہ تین گھنٹے میں یہاں پہنچ جائے گا۔'' انہوں نے رک کر مڑ کر کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی واپس اسی کمرے میں چلی گئیں جہاں سے چند منٹ پہلے نکل کر آئی تھیں۔

☆☆☆

''میں تیار ہوں اموجان۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''میں پہلے سے ہی تیار ہوں۔'' میں نے ان کے پیچھے کمرے میں آ کر کہا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں عائشہ بھابی۔'' چاچو پیچھے آ گئے تھے، ہاتھ جوڑے اموجان کے سامنے کھڑے تھے، ان کے ساتھ کھڑی ماما خاموش، ان کے پاس کہنے کے لیے بچا ہی نہ تھا کچھ۔

''اس بچے کا ڈی این اے ٹسٹ میں نے آپ کی اسی سوچ کے تحت کروا رکھا ہے ماما۔'' میں نے دراز سے وہ لفافہ نکال کر انہیں دیا۔ ''اسے جہاں سے مرضی چیک کروا لیں۔'' میں چاچو کے پاس گئی۔ ''مجھے بہت دکھ ہوا ہے چاچو کہ اموجان نے بھی وہ سب انکشافات کیے ہیں جو کہ انہیں نہیں کرنا چاہیے تھے، وہ بھی شاید مجبور ہو کر...... زائنہ اب اس دنیا میں نہیں رہی میں نے اسے تو معاف کر دیا ہے کہ اسے زندگی نے اس کی مہلت نہیں دی تھی مگر ماما کو اس دن تک معاف نہیں کروں گی جس دن یہ مجھ سے اب تک کی گئی اپنی تمام زیادتیوں کی خود معافی نہیں مانگیں گی۔ اگر ان کی یا میری زندگی نے انہیں مہلت نہ دی...... تو یہ معافی پھر میدانِ حشر میں بھی نہیں ملے گی۔ آپ ماما سے صرف یہ کہہ دیں کہ وہ قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر صرف آپ کے اور زین کے سامنے کہہ دیں کہ انہوں نے جو پر اور ارسل بھائی پر جو الزام لگایا تھا وہ سچا تھا۔''

''خدا کے واسطے امرت...... مجھے اتنے بوجھ تلے چھوڑ کر مت جاؤ۔'' چاچو نے میرے سامنے ہاتھ باندھ دیے، میں نے شرمسار ہو کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''ایسا نہ کریں چاچو پلیز......''

''تمہیں یہ سب کچھ مجھے بتانا چاہیے تھا بیٹا۔''

''کیسے بتاتی چاچو، یہ آپ کے فون بھی چیک کر کے میرے پیغامات ڈیلیٹ کر کے مجھے دھمکیاں دیتی تھیں کہ اس کے بعد پیغام بھیجا تو جانے یہ کیا کر دیں گی اور آپ کو ملنے کا کیسے سوچتی چاچو؟ ماما کے خیال میں آپ کو تنہائی میں ملتی تو میں آپ پر بھی ڈورے...... '' یہ کہتے ہوئے میں سسکی۔

''لعنت ہے تم پر زیبا۔'' اموجان چلائیں۔ ''کتنی بے حیا اور بدزبان ہو تم...... اللہ تمہیں اسی دنیا میں حساب دے گا جو کچھ تم نے میری بیٹی کے ساتھ کیا ہے...... ارے کسی غیر کی بیٹی بھی ہو تو انسان اسے بیٹی بنا کر گھر لا کر ایسا نہیں کرتا مگر تم تو وحشی جنگلیوں سے بھی بدتر ہو۔ تم لوگوں کے خوب صورت چہروں کے پیچھے کیسے گھناؤنے کردار اور سوچیں

ہیں۔'' میں تو اموجان کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی، انہیں کبھی یوں غصے میں بولتے ہوئے نہ دیکھا نہ سنا تھا۔

''بھابی۔'' چاچو اسی طرح اموجان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

''مت کہو بھابی مجھے۔''

''میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔'' وہ واقعی اموجان کے پیروں میں گر پڑے۔ ''مجھے میری کوتاہیوں کی معافی دے دیں۔''

''ارے جس پیاری سی ہاجرہ کے ساتھ شادی سے انکار کیا تھا تم نے، اس بدزبان اور بے حیا عورت کی خاطر، اسی مرحومہ کی بیٹی ہے یہ، تم نے اس کی بیٹی کو تکلیف دے کر ایک بار پھر اس کی روح کو تڑپا دیا ہے۔'' اموجان نے انہیں سسک کر کہا تھا اور میں ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ بات کہہ چکنے کے بعد اموجان کو احساس ہوا کہ ان کے منہ سے کیا بات پھسل گئی تھی، وہ خود سکتے میں آ گئی تھیں۔

☆☆☆

میں کون ہوں...... اتنی بے شناخت کہ عمر بھر اپنی ماں کا پتا ہی نہ پا سکی تھی۔ اموجان کا وہ انکشاف جو انہوں نے غصے اور نادانستگی میں کر دیا تھا، اس نے میرے وجود کے پرخچے اڑا دیے تھے، اس نے مجھے ان سے بھی ناراض کر دیا تھا۔ میں ہمیشہ اس زعم میں رہی کہ میں اموجان کی اپنی اور تمنا، ہاجرہ پھپھو کی بیٹی ہے، ہم دونوں کا باپ ایک مگر جنم دینے والی مائیں جدا، جدا تھیں۔ قسمت سے ہم ایک ماں کے دودھ پر پلیں، مجھے دکھ یہ نہیں ہوا تھا کہ میں اموجان کی اپنی اولاد نہیں تھی، دکھ صرف یہ تھا کہ میں عمر بھر تمنا کو ہاجرہ پھپھو کی بیٹی سمجھتی رہی، انہیں ماں کے بجائے پھپھو سمجھتی رہی، وہ میری ماں تھیں، تمنا کی نہیں۔

''آپ نے تمنا کو کیوں تایا جی کو دے دیا؟'' میں نے اموجان سے سوال کیا۔ ''کیا غلطی سے؟'' ہم دونوں چند گھنٹوں کے توقف سے پیدا ہوئی تھیں اس لیے میرے ذہن میں آیا کہ شاید ایسا ہوا ہو۔

''غلطی سے کیوں ایسا ہوتا؟'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ آپ کو کیا پہچان تھی کہ ہم دونوں میں سے کون کس کی بیٹی تھی؟'' ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید میں ہی ان کی اپنی بیٹی ہوں گی۔

''تمنا کو پیدائش کے دوران ایک اوزار سے ٹانگ پر کٹ لگ گیا تھا۔ پھر اس کے بال کالے تھے اور رنگت گندمی، میری طرح اور تمہارے براؤن بال، سفید دودھیا رنگت اور بھورے بال...... ہاجرہ جیسے ہیں۔''

''تو آپ نے اپنی پیدا کی ہوئی بیٹی کیوں تایا کو دی...... مجھے کیوں نہیں دے دیا؟''

''یہ ایک بہت راز کی بات ہے......'' وہ مسکرائیں۔

''بتائیں ناں اموجان پلیز۔'' میں نے تجسس سے کہا۔ ''میں تو اپنا بیٹا کبھی کسی کو نہ دوں۔''

''میں نے تو شروع میں ہی، جب مجھے علم ہوا کہ میرے ہاں تمنا پیدا ہونے والی ہے، تبسم سے وعدہ کر لیا تھا کہ میرے ہاں جو اولاد پیدا ہوگی وہ میں اسے دے دوں گی۔''

''ہاجرہ پھپھو کے نہ رہنے سے آپ نے ان کی بیٹی انہیں کیوں نہیں دے دی اموجان؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہارے پاس اگر ہزار روپیہ رکھا ہو...... پھر میں تمہیں ہزار روپیہ امانت کے طور پر رکھنے کے لیے دے دوں۔'' انہوں نے کہا۔ ''پھر کوئی ضرورت مند تم سے کچھ رقم لینے آ جائے، تو تم کس رقم میں سے اسے رقم دو گی؟''

''ظاہر ہے کہ اپنی رقم میں سے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''تو پھر تم بتاؤ کہ تم میرے پاس ہاجرہ کی امانت تھیں...... وہ پہلے ہی میرے بھائی کی وجہ سے دکھی تھی۔ پھر

میرے شوہر کے ساتھ اس کا نکاح ہوگیا، اس نے ایک دن بھی مجھے سوتن بن کر نہیں دکھایا، نہ میرے سامنے تمہار ابو جان سے کوئی بات کی، نہ ان سے ملی، نہ رخصت ہو کر ہمارے گھر میں آئی۔ خاندان اور گاؤں میں کسی کو علم بھی ہوا کہ وہ تمہارے ابو جان کے نکاح میں تھی۔ اس نے اپنی بیماری میں مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اس کے بچے کو ا کی امانت سمجھ کر پالوں گی۔“

”انہیں کیا بیماری تھی امو جان؟“

”اسے بچہ دانی میں کینسر تھا۔“ انہوں نے کہا۔

”اوہو......“ میں نے حیرت کے مارے کہا اور بے خیالی میں بلند آواز سے بڑبڑائی۔ ”اسی لیے مجھے بھی کینسر ہوا۔“

”کیا......؟“ اب حیران ہونے کی باری ان کی تھی۔

☆☆☆

”میں نے کال کی تھی اسے۔“ سارہ کی کال تھی۔ یقیناً وہ اپنے شوہر کے بارے میں بات کر رہی تھی۔

”اچھا......“ میں نے فوراً کہا۔ ”کیا کہا اس نے، خوش ہوا ہوگا؟“

”ہاں ہوا تھا خوش۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مگر وہ چاہتا ہے کہ رجوع کا فیصلہ کرنے سے پہلے اسے پتا ہے کہ اس بچے کی جنس کیا ہے......اور......“

”اور کیا؟“ مجھے تو اتنا سن کر ہی غصے سے ابال آ گیا تھا کہ اس نے اتنی گھٹیا بات کی ہے۔

”اور وہ کہتا ہے کہ اسے کس طرح یقین ہوگا کہ یہ بچہ اسی کا ہے؟“

”اور تم نے سن لیا یہ سب کچھ؟“ میں نے غصے سے کہا۔

”تو اور کیا کرتی؟“ وہ سسکی۔

”تم کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے مارتیں۔“ میں نے اسے مشورہ دیا۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں نے اس سے فون پر بات کی تھی امرت......اور میرے فون میں ایسی کوئی سہولت موجود نہیں ہے کہ اس کے ذریعے کسی کو کچھ مارا جا سکے۔“ اس کے لہجے میں دکھ بھری شرارت تھی۔

”تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے؟“

”یہ مذاق نہیں ہے امرت......ہم سب عورتیں ایسی ہی مجبور ہوتی ہیں، بہت کچھ سننا پڑتا ہے۔“

”یہ تم ہو جو ہر کسی سے ایسی بے ہودہ باتیں سن لیتی ہو۔“

”نہیں، ایسی بے ہودہ باتیں تم بھی سنتی تھیں، سنتی رہی ہو، اب بھی سن رہی ہو اور سنتی رہو گی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تمہاری ساس اور اس کے بیٹے کو بھی ابھی تک تمہارے بیٹے کی ولدیت......“ اس کی بات پر میرا جسم سن ہو گیا، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، سامنے آئینے میں مجھے اپنا چہرہ نظر آیا۔ وہ چہرہ میرا تھا، کبھی وہ میرا بن جاتا اور کبھی سارہ کا، میں اسے گھورنے لگی، سارہ کچھ بول رہی تھی، میں سن ہی نہ رہی تھی جیسے......بس اس وقت میرا سارا وجود دماغ بن گیا تھا۔

”سنتی رہی ہوں سارہ......سچ ہے......مگر یہ بھی سچ ہے جو کچھ سن لیا سو سن لیا، جو غلط سلط سہنا تھا وہ سہہ لیا مگر اب مزید نہیں......اس کے بعد بالکل بھی نہیں، اب امرت نہ غلط سنے گی، نہ سہے گی۔“ میرا لہجہ اٹل تھا۔ ”امرت ایک کمزور لڑکی نہیں، وعدے کی ڈور میں الجھی ہوئی ایک بیٹی نہیں، ایک ڈری ہوئی بیوی اور دبو بہو نہیں رہی، وہ اب ایک مضبوط ماں ہے اور اس کے ساتھ وہ وجود ہے جو اسے طاقت دیتا ہے، اس کا نام ہے حبیب اللہ۔“

(جاری ہے)

ریشم کے ٹکڑے

سائرہ مشال خان



”اٹھ جا کرے دیکھ کتنا دن چڑھ آیا ہے۔“ امینہ ... پڑے کرم اللہ کا بازو ہلاتے ہوئے بیزاری ...

کرم اللہ نے آنکھوں پر رکھا بازو ہٹا کر آنکھیں کھولیں تو سر پر چلچلاتے سورج کی چبھن سے آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ ایک انگڑائی لے کر وہ اٹھا تو بان کی چارپائی چرچرانے لگی اس کے بوجھ سے۔

غسل خانے کے اندر بچوں میں سے کوئی ایک تھا،

پانی گرنے کی آواز سے اسے اندازہ ہوا، وہ دونوں ہاتھوں میں سر رکھ کر غسل خانے کے خالی ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اس چھوٹے سے کرایے کے مکان میں کمرا، ایک نام کا باورچی خانہ اور غسل خانہ تینوں ہی اکلوتے تھے، سو دیر سے اٹھنے کی پاداش میں ایسے ہی انتظار کی کوفت سے گزرنا پڑتا کیونکہ یہ وقت بچوں کے اسکول جانے کا ہوتا۔

عموماً وہ فجر کے وقت ہی اٹھ جایا کرتا تھا مگر کل رات دیر تک کروٹیں بدلنے کے باعث صبح آنکھ نہ کھل پائی۔ سات سالہ کاشف پانی ٹپکتے گیلے جسم پر یونیفارم کی شلوار پہنے ادھ ننگا سا باہر نکلا اور بھاگتا ہوا چولھے کے قریب بیٹھی ماں کے پاس جا بیٹھا۔ کرم اللہ پیروں میں ربڑ کی چپل اُڑس کر غسل خانے میں جا گھسا۔

جب تک وہ باہر نکلا تب تک نو سالہ نورین اور دس سالہ زرین بھی دو چوٹیاں بنائے ماں کے قریب ہی بیٹھی تھیں، وہ بھی تولیے سے گیلا منہ پونچھتا ہوا ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

امینہ نے دسترخوان میں لپٹی بنا گھی کی دو روٹیاں ان سب کے آگے رکھیں اور سلور کی چھوٹی سی پتیلی میں سے پیالیوں میں کالی سی چائے انڈیلنے لگی۔

''اماں تم بھی کھاؤ ناں......'' اسے صرف بدرنگ سی چائے پیتے دیکھ کر زرین نے چنگیری اس کی جانب کھسکائی۔

''تم لوگ کھاؤ، مجھے بھوک نہیں۔'' اس نے پھیکے پن سے خشک ہونٹوں کو زبردستی پھیلا کر جواب دیا اور گہری نگاہ اپنی سمجھدار و حساس بیٹی پر ڈالی، اندر کہیں غموں کا طوفان امڈا تھا۔ سختی سے لب دانتوں تلے دبا کر لبوں سے نکلتی دردآمیز آہ کو اندر ہی دبا دیا۔ کرم اللہ نے گہری افسردہ نظروں سے اس کے اترے ہوئے مایوس چہرے کو دیکھا جہاں تنگ دستی و غریبی کی عفریت نے عمر کی اکتیسویں بہار میں ہی بڑھاپے کی دراڑیں نمودار کر دی تھیں۔

تاریک چہرے پر تفکرات آمیز، پریشان کن تاثرات کے ساتھ دونوں ایک ہی بات سوچے جا رہے تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں مچلتا سوال ایک ہی نوعیت کا تھا سوچوں کا محور ایک ہی نکتے پر ٹھہرا تھا۔ خالی ... بھرنے کا کوئی انتظام ہو گا یا......

☆☆☆

''بیگم صاحبہ آج کھانے میں کیا بناؤں؟''

سک سے تیار دیدہ زیب ساڑی پہنے پُرتمکنت چال ... مسز وقار ملک کو باہر جاتا دیکھ کر برتن دھوتی صغراں ... چھوڑ چھاڑ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی پھرتی سے پکن ... نکل کر آئی اور مؤدب انداز میں استفسار کیا۔

''میں اور تمہارے صاحب تو سمنار میں جا ... ہیں، سیفی (بیٹا) کا فرینڈز کے ساتھ پکنک کا پروگرام ... لیے کھانے کا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ... لوگوں (ملازموں) کے لیے رات کا بچا سالن کافی ...'' مسز وقار نے اپنی آئی لائنر اور مسکارے کی تہوں سے ... بنائی آنکھوں کو ایک ادا سے گھماتے ہوئے جواب دیا۔

''جی ٹھیک ہے بیگم صاحبہ......'' صغراں ... پُرستائش نظروں سے اپنی گوری چٹی ماڈرن بیگم صا... دیکھتے ہوئے بولی۔

''اچھا بات سنو......'' کچھ یاد آ جانے پر مسز ... ٹھٹک کر دوبارہ اس کی طرف پلٹیں۔

''میں پارلر جا رہی ہوں سیفی صاحب سے پوچھ ... اس کے کپڑے استری کر دینا یاد سے ورنہ تمہیں اس ... غصے کا تو علم ہے۔'' ان کے تاکیدی انداز پر صغراں ... اثبات میں سر کو جنبش دی۔ وہ حیران تھی کہ اب پارلر ... لیے جا رہی ہیں۔ ''بال بنوانے ہوں گے۔'' وہ یہی ... سوچتے ہوئے اس نے بیگم صاحبہ کو جواب دیا۔

''آپ جائیں بیگم صاحبہ میں کر دوں گی سب ...'' وہ بھی مطمئن ہو کر سر ہلاتی ہوئی چلی گئیں۔

☆☆☆

بسوں کے اڈے پر بیٹھے صبح سے دوپہر ہو گئی تھی ... دیہاڑی کا جان افزا مژدہ نہیں ملا تھا۔

چلچلاتی دھوپ جسم میں سوئیاں چبھو رہی تھی۔ ... جسم پسینے سے شرابور تھا، سر پر تنا غصیلے تیور لیے سورج ... تپش سے جسم کو بھسم کر دینے کے درپے تھا۔ کرم اللہ ...

... یاسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔

... پندرہ روز سے اس کا یہی معمول تھا۔ صبح ... کر وہ اس اڈے میں مزدوروں کی قطار میں بیٹھ ... ان پندرہ دنوں میں بہ مشکل محض تین دن ہی ... اٹھانے کا کام ملا تھا۔

... کے تمام دن وہ مایوسی سے منہ لٹکائے رنجور و ... شام ڈھلے خالی ہاتھ گھر لوٹتا...... کچھ روز قبل ... اتنے بھی ابتر نہ تھے کم از کم پیٹ بھرنے کو ... اور تن ڈھانپنے کو سستا سا لباس مل ہی جاتا۔ ... داری کے سبب زندگی قدرے سہل تھی۔ وہ ایک ... میں کام کرتا تھا ایک مہینہ پہلے ورکرز چھانٹی ... لسٹ میں اس کا بھی نام آ گیا اور اسے نوکری ... دیا گیا۔

... دہ ہزار ماہانہ کا آسرا ہاتھ سے کیا گیا، پانچ ... امتحان میں پھنس کر رہ گئیں۔ پہلے بھی چودہ ... گزر اوقات ہی ہوتی تھی، کوئی جمع جتھا پس ... تھا، کئی دنوں تک تو وہ روز مختلف گارمنٹس ... کے باہر جا کھڑا ہوتا مگر......

... باورچی خانے کے خالی ہوتے ڈبے کو دیکھ کر مجبوراً ... کمپنیوں کا رخ ترک کیا اور اینٹیں ڈھونے کے ... لی۔ مگر یہاں بھی ہنوز مایوسی اور ناکامی ہی منہ ... تھی۔ دھوپ کی حدت و پیاس کی شدت سے حلق ... چبھنے لگے تو برگد کے درخت تلے رکھے مٹکے ... نیم گرم جیسا پانی کا گلاس بھر کے غٹاغٹ پی گیا ... دل میں بڑی شدت سے دعا مانگتے آس پاس ... کام والی جگہ کی جانب جانے لگا اس آس ... کے لیے بھی کوئی کام نکل ہی آئے۔

☆☆☆

''اب ہم بلانا چاہیں گے اپنے بے حد معزز قابلِ ... ورلڈ کے چمکتے ہوئے ستارے وقار ملک ... کو...... سر پلیز آپ اسٹیج پر تشریف لا کر اپنے اعلیٰ ... سے ہمیں مستفید فرمائیں۔''

بے پناہ پُرجوش و داد دیتی تالیوں کی گونج میں وقار

میرے دل و جان پاکیزہ

میری دعاؤں میں تم شامل ہو ایسے
جیسے...... پھولوں میں خوشبو
چاند میں چاندنی
میری دعاؤں میں تم شامل ہو ایسے
جیسے...... سیپ میں موتی
سمندر میں گہرائی
میری دعاؤں میں تم شامل ہو ایسے
جیسے...... جذبوں میں سچائی
دل میں دھڑکن
ہاں! میری دعا ہے کہ تم لمحوں کو قید کر لو
ہر خوشی کو اپنے اندر سمو لو......

دعا گو: نگہت آصف، لاہور

ملک فخریہ انداز سے چلتے ہوئے اسٹیج تک آئے اور اپنے مخصوص بردبار و بارعب لہجے میں گویا ہوئے۔

''میں آپ سب کا بے حد ممنون ہوں کہ آج اس خاص دن پر آپ لوگوں نے مجھے اظہارِ خیال کا موقع فراہم کیا...... مزدور ہم کاروباری لوگوں کے لیے ایک ستون کے مانند ہیں، ان کے تعاون کے بغیر ہم صفر ہیں۔ ان مزدوروں کی محنت و مشقت سے بنائی عمارتوں میں ہم بڑے اطمینان و سکون سے اپنے کام نبٹاتے ہیں انہی مزدوروں کے بدولت ہمارا کاروبار چلتا ہے۔ ان کی محنت و ذہانت کے بل پر ہم بزنس میں بامِ عروج تک پہنچتے ہیں، جب یہ لوگ اپنی تمام تر صلاحیتیں، تعلیم، ہنر ہمارے فوائد کے لیے وقف کر دیتے ہیں تو ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ ہم بھی ان کے حقوق کا خیال رکھیں اور انہیں بہترین معاوضہ و سہولیات فراہم کریں۔'' وقار ملک نے کچھ لمحے کا توقف کیا اور ہمہ تن گوش سامعین پر ایک گہری تفصیلی نگاہ ڈالی اور گلا کھنکھار کر دوبارہ سے سلسلۂ کلام کو جوڑا۔

''آج لیبر ڈے کے اس موقع پر میں آپ سب معزز حضرات سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عمارت بظاہر خواہ کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہو اس کا دارومدار بنیادی اینٹ

پر ہوتا ہے اور اس اینٹ کی مضبوطی و پائیداری کے طفیل ہی وہ عمارت کھڑی ہوتی ہے تو ہمارے انڈر کام کرنے والے ورکرز کی مثال بھی عمارت کی بنیادی اینٹ جیسی ہے۔ ہماری ترقی و کامیابی کا انحصار بھی ان کی مضبوطی پر ہے جب ان ورکرز کو ان کی محنت کا بہترین ثمر ملے گا تو وہ مضبوط رہیں گے اور... یوں ہماری ترقی و کامیابی کی عمارت بھی بلند قامت ہوتی جائے گی۔“

وقار ملک کے خاموش ہو جانے پر ہال میں گونجنے والی ستائشی تالیوں پر مسز وقار ملک نے بڑی فخریہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا ان کی شخصیت جتنی ساحرانہ تھی باتوں میں بھی اتنا ہی کمال کا ہنر رکھتے تھے، سننے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لینے کا فن بخوبی جانتے تھے۔

☆☆☆

”ذرا صبر کر میرا بچہ، ابھی تمہارے ابو آتے ہوں گے۔“ امینہ نے بلکتے کاشف کو اپنے سینے سے لگا کر پچکارا۔ گلے میں نمکین پانی کا گولا سا اٹکا تھا۔

”نہیں مجھے ابھی دودھ چاہیے۔“ کاشف ایڑیاں رگڑتے ہوئے بولا۔

”کاشی چپ کر جا ورنہ لگاؤں گی ایک زور سے۔“

اب دکھ و بے بسی پر پریشانی غالب آنے لگی تھی، شام ڈھل چکی تھی اور رات اپنے پر پھیلا چکی تھی مگر کرمے کا اب تک کچھ اتا پتا نہیں تھا۔

اس کے ڈپٹنے پر کاشی گلا پھاڑ کر اونچی آواز میں رونے لگا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید طیش زدہ ہو کر اسے مارتی۔ زرین نے لپک کر ننھے بھائی کو اٹھایا اور فوراً کمرے میں لے گئی اور اپنی عمر سے دگنی سمجھداری و بڑے ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے مختلف حیلے بہانوں سے کھیل میں الجھا کر اسے بہلانے لگی۔

☆☆☆

کرم اللہ نے شل ہوتی ٹانگوں کے ساتھ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر پیڑ سے ٹیک لگائی جسم بالکل بے جان ہو رہا تھا اور دل اپنے معصوم بچوں میں اٹکا ہوا تھا، اسے اندازہ تھا

کہ امینہ اس کے لیے بے حد پریشان ہو رہی ہو گی۔

مگر یونہی گھر جا کر اپنے بھوکے بچوں کی آس [illegible]

آنکھوں میں اس کے خالی ہاتھ دیکھ کر اترنے وا[illegible] یاس دیکھنے کا حوصلہ نہ تھا اس میں سو وہیں فٹ پاتھ [illegible] خالی پیٹ نڈھال سا بیٹھ گیا۔

”اے خدا تیری تقسیم بڑی نرالی ہے کسی کو اتنا [illegible] دیتا ہے کہ وہ سنبھال نہیں پاتا اور کوئی اناج کے [illegible] کے لیے در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔“

سامنے مہنگے سے ریسٹورنٹ میں جاتے بڑی [illegible] گاڑیوں سے نکلتے رئیس زادوں کو حسرت سے [illegible] ہوئے وہ خدا سے شاکی ہوا۔

☆☆☆

اکھڑے پلستر والی کھردری دیوار سے ٹیک لگا [illegible] بیٹھی امینہ کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے تھے بھو[illegible] سے بلکتا کاشف نیند کے غلبہ ہونے پر ماں کی گود میں [illegible] تھا۔ نورین اور زرین بھی باپ کا انتظار کرتے، کرتے تھا[illegible] کر سو گئی تھیں۔ مگر بھوک کا کرب ان کے معصوم چہروں [illegible] تھا اپنے جگر گوشوں کی حالت زار پر بے بسی سے اس کا [illegible] پھٹ رہا تھا۔ کٹ، کٹ کر لہو ہو رہا تھا۔

گود میں سر رکھے بے خبر سوئے کاشی کے [illegible] بوسہ دیتے بے بس و لاچار ماں کی آنکھوں سے در[illegible] قطرے نکل کر اس کے بالوں میں جذب ہوئے۔

☆☆☆

کچھ دیر قبل مزدوروں کے حقوق پر زور شور [illegible] کرنے والے رئیس زادے اب مٹمع ساز تقاریر سے فرا[illegible] پانے پر انواع و اقسام سے سجی لمبی سی میز کے گرد [illegible] دیسی و بدیسی کھانوں سے مکمل انصاف کر رہے تھے۔

مزدوروں کے عالمی دن پر بھی غریب مزدو[illegible] بچے خالی پیٹ ہی بلکتے تڑپتے سو گئے تھے۔

یہ کیسا مزدوروں کا عالمی دن تھا۔

یہ مزدور ڈے تھا؟

یا پھر رئیس ڈے؟



محبت کی راہ گزر پر

قرۃ العین سکندر

حجاب کا یونیورسٹی میں آج پہلا دن تھا۔ وہ بہت گھبراہٹ سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ ابھی تو اس کے ساتھ عالی تھی اگرچہ اس کے ساتھ اس کی دوستی بہت پرانی نہیں تھی چند دن قبل ہی ایڈمشن کے دوران ہی ہوئی تھی اب عالی اس کی روم میٹ بھی تھی۔ حجاب ایک دور افتادہ قصبے سے یہاں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آئی تھی۔ اس کی شروع سے یہ آرزو تھی کہ بہت اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور اپنی اس خواہش کا اظہار اس نے بارہا اپنے والدین

کے سامنے بھی کیا تھا۔ سلطان صاحب بہت سادہ سے انسان تھے کئی مربع اراضی کے مالک تھے مگر اُن میں سادگی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا، وہ دولت ہونے کے باوجود بہت ملنسار تھے۔ قصبے میں ان کی بہت عزت تھی۔ ان کو اللہ پاک نے اولادِ نرینہ سے محروم رکھا تھا بس ان کی دو ہی بیٹیاں، نایاب اور حجاب تھیں۔ وہی ان کے لیے سب کچھ تھیں۔ وہ اپنی بیٹیوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے ان کی حتی الامکان یہی کوشش ہوتی کہ ان دونوں کی کسی بھی خواہش کو رد نہ کریں اس لیے انہوں نے بہ خوشی حجاب کو اعلیٰ تعلیم کی اجازت دے دی تھی اور اسے ہاسٹل میں داخل کروادیا گیا تھا وہیں قریب ہی اس کے ماموں، زاہد کا بھی گھر تھا۔ ماموں نے ہی اس کے داخلے میں اس کی مدد کی تھی، اس کا بہت خیال رکھ رہے تھے ان کی تو آرزو تھی کہ حجاب ان کے پاس ہی رہے اور اس کے لیے انہوں نے بہت اصرار بھی کیا تھا مگر ان کو معلوم تھا کہ بہن، بہنوئی کو یہ بات کسی طور پسند نہیں آئے گی اس لیے انہوں نے اصرار تو بہت کیا مگر سلطان صاحب نے بڑی شائستگی سے انکار کردیا تھا اور یہ کہہ کر بھی تسلی دی کہ حجاب ہر ویک اینڈ ان کے ہاں آجایا کرے گی۔ یوں حجاب ایڈمیشن ہوتے ہی چند دن پہلے ہاسٹل میں شفٹ ہوگئی تھی اور اس کی علیک سلیک عالی سے بھی ہوگئی تھی۔ عالی بھی دوسرے شہر سے تعلق رکھتی تھی مگر عالی بہت پُراعتماد لڑکی تھی کیونکہ وہ پچھلے دو سال سے یہاں ہی تھی یہاں کے ماحول میں ڈھل چکی تھی، اس کا ازلی اعتماد دیکھ کر حجاب کو بھی حوصلہ ملا تھا۔ آج یونیورسٹی میں ان کا پہلا دن تھا۔ حجاب بڑی سی چادر اوڑھے کچھ ہراساں سی لگ رہی تھی۔ کئی نگاہیں اس سے الجھی تھیں وجہ اس کا بے پناہ حسن تھا۔ وہ اس چادر میں بھی چاند کا ٹکڑا دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے حسن میں تصنع و بناوٹ کا کوئی نام و نشان نہیں تھا اس کی نسبت بہت سی الٹرا ماڈرن لڑکیاں فل میک اپ اور تیاری کے ساتھ آئی تھیں۔

"اے لڑکی بات سنو، اے میں تم سے مخاطب ہوں، اماں جی کے حلیے والی۔" ایک آواز پر حجاب بری طرح سے چونکی تھی، اپنے آپ کو چھپانے کے لیے وہ عالی کے عقب میں ہوگئی تھی مگر پھر بھی وہ دوسروں کی نظروں سے او نہیں ہوسکتی تھی اس وقت اس کے چہرے پر ایک طاری ہوگیا تھا، اس کی آنکھوں میں ہراس پھیل اسے معلوم تھا کہ اب اس کی ذات کو نشانہ بنایا جا وہ اپنے وجود کو سب سے چھپا دینا چاہتی تھی۔ عالی حیرت سے اس ٹولے کو دیکھ رہی تھی وہ دو لڑکیوں لڑکوں کا ٹولا تھا یقیناً یہ لوگ سینئر کلاسز سے تعلق ر تبھی ان کے بلاوے میں بھی استحقاق تھا۔

"جی کچھ کہا آپ نے، ہم ذرا جلدی میں ہیں اپنی کلاسز کا شیڈول معلوم کرنا ہے۔" عالی نے اس چھڑانا چاہی تھی کیونکہ وہ خود تو پتھر کی مورت بنی کھڑی

"کلاس بھی دیکھ لینا پہلے ہم تو کلاس لے کیوں بھئی کیا نام ہے تمہارا اپی بی اور ہاں ذرا کان اٹھک بیٹھک تو کرو فوراً چلو شاباش اور تم اپنا را ورنہ ساتھ شامل ہو جاؤ۔" اس نے عالی سے کہا۔

علیم نے سختی سے کہا تھا اس کے ساتھ مو حلقۂ احباب بھی ہنسی کرنے لگا تھا عالی نے ایک خواہانہ نگاہ حجاب پر ڈالی اور خاموشی سے الگ ہو گئی کچھ دیر میں ہی نظروں سے اوجھل بھی ہوگئی تھی جھیل جیسی آنکھوں میں طغیانی امڈ آئی تھی جیسے نازک لمحے کی لپیٹ میں آکر پھوٹ پھوٹ کر رو اس کا دل بے پناہ بوجھل تھا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا نام ہے تمہارا؟" وہ حجاب مخاطب تھا۔

"جی حجاب، پلیز مجھے جانے دیں۔" ملتجی کسی کا بھی دل گداز کرسکتا تھا مگر وہ ایک امیر گھر اوباش اور دل پھینک لڑکا تھا لڑائی بھڑائی میں طاق اس لیے اس کا انداز بھی بے باک تھا۔

"اب اور دیر کی تو یہ کومل اپنے ہاتھوں سے تمہیں اٹھک بیٹھک کرائے گی، کیوں کومل؟"

"بالکل میرے ہاتھوں میں ویسے بھی کھجلی ہو ہے۔" کومل کی بات پر حجاب نے مسمسی سی شکل بنا کر بیٹھک شروع کردی تھی چاروں اطراف قہقہے گونج تھے، حجاب کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں اسی دھند

اس نے دیکھا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے نیچے بیٹھنے سے روکا تھا اس نے پلٹ کر دیکھا ایک بھرپور مردانہ وجود لمبا تڑنگا سا اس کی ڈھال بن گیا تھا وہیں اس کے سامنے کھڑا ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کتاب تھی جس سے اس نے اسے روکا تھا۔

"سعدون تمہارا اس معاملے میں کچھ لینا دینا نہیں تم اپنا راستہ ناپو۔" علیم نے بدذائقہ ہوکر کہا تھا جیسے بادام کھاتے، کھاتے ایک دم ہی کڑوا بادام منہ میں آگیا ہو۔

"یہی بات اگر میں تم سے کہوں تو تمہارا ردِعمل کیا ہوگا تم اپنا یہ شغل اپنے ساتھی نمونوں پر آزمایا کرو اس طرح معصوم لڑکیوں پر نہیں اسے جانے دو ورنہ بات بڑھ جائے گی اور ذمے دار تم ہوگے۔"

حجاب حیرت اور شکر گزاری کے ملے جلے احساس سے اپنے مسیحا کو دیکھ رہی تھی جو واقعی اس وقت اس کے لیے مہربان بن کر آیا تھا۔ اس نے سنا ہوا تھا کہ کالج، یونیورسٹی میں ایسے ہی نئے آنے والوں کو تنگ کیا جاتا ہے اس لیے خاموش رہی تھی۔

علیم نے ناگواری سے سعدون کو دیکھا اور وہ بل کھائے سانپ کی طرح اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ یقیناً کسی اور کو الو بنانے کے لیے مگر اس کی نگاہوں میں جاتے ہوئے بھی واضح دھمکی تھی۔ سعدون کی شخصیت کا ایک خوف تھا ورنہ آج حجاب کو نہ جانے کن، کن حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔

"آپ ٹھیک ہیں ناں۔"

سعدون کے پوچھنے پر حجاب نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا تھا وہ زیرِ لب مسکرا دیا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں یہ لاتوں کے بھوت ہیں جو باتوں سے نہیں مانتے آئیں میں آپ کو کلاس تک چھوڑ دیتا ہوں اور آئندہ کسی قسم کی بھی کوئی پریشانی کوئی مسئلہ ہو تو کسی سے بھی میرا نام لے کر پوچھ لیں مجھ تک رسائی ہو جائے گی میرا نام سعدون ہے اور آپ کا؟"

وہ بے حد ہلکے پھلکے انداز میں بول رہا تھا شاید اس کو ریلیکس کرنا چاہ رہا تھا اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوگیا تھا کیونکہ حجاب نے اسے اپنا نام بتادیا تھا یہاں تک کہ کلاس روم آگیا تھا۔ اسے کلاس میں داخل ہوتے دیکھ کر عالی نے اپنی نظریں چرالی تھیں۔

تھوڑے دنوں میں حجاب اپنی پڑھائی میں منہمک ہو گی تھی اس کا دل لگ گیا تھا یوں بھی وہ بہت پڑھاکو ٹائپ لڑکی تھی خود اعتمادی صرف کلاس روم تک محدود تھی باہر نکلتے ہی انجانے خوف سر اٹھانے لگتے تھے بسا اوقات اس کی ٹانگیں کانپنے لگتی تھیں، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی تھیں پزل سی ہو جاتی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ اس کا عرصہ دراز تک گھر تک ہی محدود رہنا تھا۔ پھر یہاں کا ماحول بھی گھر سے بہت مختلف تھا رفتہ، رفتہ وہ خود کو اس ماحول میں ڈھال رہی تھی۔ چند دنوں میں ہی حجاب ایک لائق فائق طالبہ کے طور پر ابھری تھی سب استاد اس کی تعریف کرتے تھے۔ کافی دنوں بعد اس دن راہداری عبور کرتے ہوئے سعدون دکھائی دیا تھا نہ جانے کیوں حجاب کے قدموں کی رفتار سست ہوگئی تھی سعدون کی نگاہ جیسے اس پر پڑی وہ بھی ٹھٹک کر رک سا گیا تھا۔

"کیسی ہیں آپ، کیسی جارہی ہے آپ کی پڑھائی سنا ہے کہ آپ بہت قابل اسٹوڈنٹ ہیں ماشاء اللہ یوں ہی محنت اور لگن سے پڑھائی کریں۔" سعدون کا انداز بے حد مشفق سا تھا نہ جانے کیوں حجاب اس کے انداز اور تعریف دونوں سے ہی بالکل بھی خوش نہیں ہوئی تھی۔

ویک اینڈ پر وہ ماموں کی طرف آئی تھی، ممانی کے لیے بابا جانی کی طرف سے بہت سی سوغاتیں لائی تھی جو کل شام کو ہی سلطان صاحب اس کے لیے لائے تھے..... خالص دیسی گھی اور دیسی گھی میں تیار حلوا خشک میوہ جات اور موسمی پھل یہ سب دیکھ کر اور وصول کرنے کے بعد ممانی جان کی تیوریوں کے بل کچھ کم ہو گئے تھے اور اب وہ خوشگوار موڈ کے ساتھ اس کے لیے کچن میں رات کا کھانا تیار کررہی تھیں۔

"اچھا ہوا تم آگئی ہو، آج کچھ مہمانوں نے بھی آنا ہے۔"

وہ ساری عمر اپنے قصبے میں ہی رہی تھی۔ وہ بہت کم ماموں کے گھر آئی تھی۔ اس لیے ایک فطری جھجک حائل تھی، ماموں تو اکثر ملنے آتے تھے مگر یہ لوگ دوری کی وجہ سے نہیں آپاتے تھے اس لیے وہ ممانی کے عزیز و اقارب

کے متعلق بھی کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی تو ممانی کے خوشگوار موڈ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی اور یہ خاطر تواضع اسی کے لیے نہیں تھی بلکہ دوسرے مہمانوں کی آمد کے لیے بھی تھی۔

فری پھوپی کی آمد پر اس نے ادب سے آگے بڑھ کر سلام کیا تھا۔ ان کے ساتھ سعدون کو دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئی تھی، سعدون بھی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ارے آپ یہاں؟"

"تم جانتے ہو اس کو؟" ممانی کے انداز میں کرید تھی۔

"جی ہاں یہ میرے ساتھ ہی ہوتی ہیں یونیورسٹی میں۔"

"اچھا، اچھا۔" ممانی نے کچھ سمجھ کر سر ہلایا تھا۔

"یہ میرے ماموں کا گھر ہے۔" حجاب نے کہا۔

"ارے ممانی کا بھی کہہ دیتیں تو ٹھیک تھا کیوں بیگم!" زاہد صاحب نے مسکرا کر کہا تھا کیونکہ انہوں نے بیگم کے چہرے پر ناگواری دیکھ لی تھی۔

کھانا لگنے تک فری اس کا انٹرویو لیتی رہی تھی جبکہ سعدون اسد اور زاہد صاحب سیاست اور دور حاضر کے مسائل پر گفت وشنید کر رہے تھے، وہ گومگو کی کیفیت سے دوچار تھی اور نگاہیں بار، بار بھٹک کر سعدون پر پڑتی تھیں۔

محبت کی راہوں پر قدم رکھتے ہی راستہ بھی نظر آنے لگتا ہے۔ یہ اتفاق تھا مگر اس سے بھی حسین اتفاق یہ تھا کہ سعدون بھی ہر ویک اینڈ پر آنے لگا تھا اور وہ بھی اب اپنی خوب صورتی کو نکھارنے لگی تھی۔ سعدون کی نگاہوں میں اجنبیت کی جگہ گہری اپنائیت در آئی تھی مگر دونوں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حجاب تو ظاہر ہے مشرقی لڑکی تھی کیسے اپنے جذبات کا اظہار کر کے خود کو ارزاں اور بے مول کرتی مگر سعدون بھی لب بستہ تھا اس معاملے میں، اس کی زبان پر تو تالا تھا مگر نگاہیں بولتی تھیں، اس کا استحقاق سے حجاب کو دیکھنا اپنے اندر بہت معنی رکھتا تھا شاید یہ خاموشی چھائی ہی رہتی اگر ایک دن علیم ایک سنسان جگہ پر حجاب کا راستہ نہ روک لیتا۔

"کتنے دنوں سے اس موقع کے انتظار میں تھا۔ تمہارے بے پناہ حسن کی تعریف کیے بنا ہی یونیورسٹی چھوڑ کر جانا مجھے منظور نہیں ہے چلو آؤ پیار بھری باتیں کرتے ہیں۔" وہ اس کی خباثت بھری مسکراہٹ سے ڈر سی گئی تھی۔

کیونکہ علیم نے گھٹیا پن سے کہا تھا سامنے راستہ بھی تنگ تھا، وہ بے حد پریشان ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرا راستہ چھوڑ دیں خدا کے لیے مجھے جانے دیں۔" وہ روہانسی ہوئی مگر اپنی ہمت مجتمع کر کے بول پڑی تھی۔

علیم نے اس کی چادر کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ سرتاپا لرز کر رہ گئی تبھی عقب سے آ کر سعدون نے پوری شدت سے علیم کے منہ پر گھونسا رسید کیا تھا۔ خون کی ایک لکیر علیم کے ہونٹ کے کنارے پھوٹ گئی تھی۔

"رذیل انسان یہ مکتب گاہ ہے، مقدس جگہ ہے، جہاں روح علم کے نور سے سیراب ہوتی ہے مگر تم جیسے گھٹیا لوگ ہی اس مقدس جگہ کی بے وقعتی کا سبب بن جاتے ہیں اور معصوم لڑکیاں تم جیسے نفسیاتی ہوس کے مارے درندوں کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑ جاتی ہیں آئندہ اگر حجاب کی طرف یا کسی بھی باکباز لڑکی کی طرف نگاہ بھی اٹھائی تو میں اس نگاہِ غلط کو کچل ڈالوں گا۔ حجاب میری کزن ہی نہیں میری عزت بھی ہے اس کی طرف آئندہ رخ بھی نہ کرنا۔"

سعدون کے ہاتھوں سے پڑتے لگاتار تھپڑ علیم کا منہ سرخ کر رہے تھے اور حجاب کے چہرے پر حیا کی لالی پھیل گئی تھی۔ اس طرح بھی کوئی کسی کا محافظ بن کر اظہار محبت کرتا ہے۔

چند دن بعد اس کا اور سعدون کا سادگی سے نکاح ہو گیا تھا، حجاب کو تو بعد میں معلوم ہوا تھا کہ فری آنٹی اس دن اس سے اسی لیے اتنے سوال کر رہی تھیں کیونکہ انہیں یہ سادہ سی لڑکی اپنے بیٹے کے لیے پسند آ گئی تھی اور پھر وہ خاموشی سے اس کے گھر جا کر رشتے کی بات بھی طے کر آئی تھیں۔ یوں سعدون اور وہ بڑی آسانی مگر سادگی کے ساتھ نکاح کے بندھن میں بندھ گئے تھے اور تعلیم سے فراغت کے بعد شادی تھی اس خوب صورت بندھن میں بندھ جانے کے بعد ایک دم سے وہ باہمت لڑکی بن گئی تھی اس لیے کہ اب اسے کسی اوباش علیم کا ڈر نہیں تھا۔ اس کا محافظ اس کے ساتھ تھا۔ زندگی ایک دم ہی حسین ہو گئی تھی۔

▲▲▲

ماں جی

نفیسہ سعید

"عائشہ او عائشہ!" وہ گہری نیند میں تھی جب ماں جی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، شاید وہ اس کا پاؤں پکڑ کر ہلا بھی رہی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہو گیا ماں جی کیوں چلا رہی ہو؟" نیند میں ڈوبے اپنے حواس بہ مشکل بحال کرتے ہوئے وہ مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔"

"لو جی پھر وہی سیاپا، ایک تو میں ان کے بار، بار کھانے سے تنگ آ گئی ہوں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی۔ سامنے لگی گھڑی پر ایک نظر ڈالی جو اس سے رات کے تین بجا رہی تھی۔

"ماں جی یہ بھوک کا کون سا ویلا ہے، ابھی ایک بجے تو میں نے آپ کو روٹی کھلائی تھی۔" جانتی تھی انہیں کچھ کہنا بیکار ہے کیونکہ یہ تو اُن کی



روز کی عادت تھی جسے کم از کم پچھلے دو سالوں سے عائشہ بھگت رہی تھی اسی سالہ ماں جی (جو ربیعہ باجی کی ساس تھیں) کھانا کھاتے ہی بھول جاتیں اور پھر دوبارہ کھانے کی فرمائش شروع، جس پر ربیعہ باجی کو سخت اعتراض ہوتا کیونکہ بقول ان کے بار، بار کھانے سے ماں جی نے اپنا ہاضمہ خراب کرلیا تھا جس کی وجہ سے انہیں پیمپر بھی لگانے پڑتے اور گھر میں یہ گندگی ربیعہ باجی کو قطعی برداشت نہ تھی مگر مجبوری تھی جو انہیں ماں جی کو اپنے ساتھ رکھنا پڑا کیونکہ ان کی ایک ہی نند تھی جو تمام تر محبت کے باوجود ماں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی اور جب بھی ماں سے ملنے آتی ہمیشہ یہی جتاتی کہ ماں کو سنبھالنا بیٹے اور بہو کی ذمے داری ہے۔ اکلوتا دیور تو اٹلی میں رہتا تھا جس کے باعث وہ بھی ماں کی ذمے داری سے بری الذمہ تھا اور اب لے دے کے ربیعہ باجی رہ گئی تھیں جنہیں ساس کو اپنے ساتھ رکھنا پڑ... رہا تھا اب اس سے عائشہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے اسی لیے ہمیشہ کی طرح ماں جی کو نظر انداز کر کے تکیہ سیدھا کرتی ہوئی دوبارہ فرش پر لیٹ گئی۔ ابھی اسے آنکھیں بند کیے بہ مشکل ایک سیکنڈ بھی نہیں ہوا ہوگا جب ماں جی نے اپنی لاٹھی اس کے پاؤں پر آہستہ سے مارتے ہوئے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”مجھے کھانا تو دے دو۔“

”اُفوہ ماں جی، کہاں سے کھانا دے دوں‘ چپ کر کے سو جائیں ابھی صبح ہوگی تو کھانا مل جائے گا۔“ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”مجھے بھوک لگی ہے۔“ پوپلے منہ کے ساتھ ماں جی ایسے بولیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی عائشہ کو ترس آ گیا اور وہ بہ مشکل اپنا جسم گھسیٹتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

”مجھے کھانا دو خود کھا کر سو گئی، میں بھوکی بیٹھی ہوں۔“ اس کے اٹھتے، اٹھتے ماں جی ایک بار پھر سے بول پڑیں۔

”صبر کریں ماں جی مجھے کچن میں تو جانے دیں، اللہ جانے وہاں کچھ ہے بھی کہ نہیں۔“

بڑ بڑاتی ہوئی وہ باہر نکلی، سب کمروں کے دروازے بند تھے جن کے اندر چلنے والی اے سی کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی جبکہ ماں جی کا چھوٹا سا کمرا جو اوپر جانے والی سیڑھیوں کے ساتھ تھا اس وقت وہاں اتنا حبس تھا کہ اس کے مقابلے میں عائشہ کو بنا پنکھے لاؤنج بھی ٹھنڈا محسوس ہوا۔ وہ خاموشی سے کچن میں آ گئی، فریج کو ہاتھ لگایا وہاں حسب روایت لاک لگا تھا کیونکہ ربیعہ باجی جانتی تھیں کہ ماں جی رات میں بار، بار کھانا مانگتی ہیں جس کے باعث وہ اپنا فریج لاک کر کے سوتیں، عائشہ نے آہستہ، آہستہ تمام الماریوں کے پٹ کھول کر دیکھے تھے۔ جہاں کہیں بھی کھانے کے سامان کی امید تھی وہاں لاک موجود تھا ورنہ دوسری الماریاں کھلی ہوئی تھیں جن میں مرچ مسالا بھرا پڑا تھا۔ جو رات کے اس سمے عائشہ کے لیے بالکل بیکار تھا، کولر سے ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کر وہ جیسے ہی واپس پلٹی دروازے کے عین درمیان کھڑی ربیعہ باجی سے ٹکرا گئی۔

”یہ تم اتنی رات گئے کچن میں کیا ڈھونڈ رہی ہو؟“

”وہ جی‘ ماں جی کو کھانا چاہیے تھا۔“ ربیعہ کو ایک دم اچانک اس طرح سامنے دیکھ کر وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

”انہیں تو چوبیں گھنٹے کھانا چاہیے اور اس کے بعد جو گند مچاتی ہیں تو مانو سانس لینی مشکل۔ سب چھوڑ گئے میں اس عذاب کو پکڑی گئی۔“ ربیعہ کی بات بہت غلط بھی نہیں تھی مگر ظاہر ہے اس میں عائشہ کا تو کوئی قصور نہیں تھا اس لیے وہ خاموش سر جھکائے کھڑی ان کی باتیں سنتی رہی۔

”اب تم جاؤ یہاں سے اور جا کر سمجھاؤ اس بڑھیا کو سکون سے سو جائے اور دوسروں کو بھی سونے دے۔“

اسے سامنے سے ہٹاتی وہ کچن میں داخل ہوئیں۔ عائشہ نے دیکھا وہ بھی ٹھنڈا پانی لینے آئی تھیں۔

”میں تو کتنی دیر سے... سمجھا رہی ہوں مگر وہ مانیں تب ناں۔“ انہیں آہستہ سے جواب دے کر وہ ماں جی کے کمرے میں آ گئی جہاں رات کے اس سمے ایک نئی

مصیبت اس کا انتظار کر رہی تھی، کمرے میں داخل ہوتے ہی ناک سے ٹکرانے والی ناگوار بُو نے بنا پوچھے ہی اسے سمجھا دیا...... پانی کا گلاس پیے بغیر ہی اس نے قریب موجود ٹیبل پر پٹخ دیا۔

”ساری مصیبت ہم غریبوں کے لیے ہے جو چار پیسوں کی خاطر ان لوگوں کا گند صاف کرتے ہیں اور وہ بھی آدھی رات کو جب ساری دنیا مزے سے سو رہی ہوتی ہے۔“ وہ بڑ بڑاتی ہوئی ماں جی کی جانب بڑھی کیونکہ جانتی تھی کہ اس حال میں انہیں گھسیٹ کر باتھ روم تک لے جانا کتنا مشکل امر تھا اور پھر وہاں لے جا کر انہیں صاف کر کے دوبارہ پیمپر لگانے میں ہی اب صبح ہو جانی تھی جس کے ساتھ ہی ان کا پھر وہی بھوک‘ بھوک والا راگ شروع ہو جاتا۔

☆☆☆

”السلام علیکم......“ فہد نے گھر میں داخل ہوتے ہی حسب روایت زوردار آواز میں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ ربیعہ ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ وہ دیکھ چکی تھی کہ فہد کے ہاتھ میں کچھ سامان تھا جو اس نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی وہاں موجود ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ تیزی سے ڈائننگ ٹیبل کی جانب بڑھی تاکہ دیکھ سکے ان تھیلوں میں کیا ہے جو فہد لے کر آیا ہے اور اتفاق سے پہلا تھیلا کھولتے ہی اس کے ماتھے پر ڈھیروں بل پڑ گئے۔

”یہ اتنے ڈھیر سارے پیمپرز کہیں مفت میں بٹ رہے تھے کیا؟“ جب وہ بولی تو چہرے کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی ناگواری تھی۔

”دانیال نے ماں جی کے لیے کچھ پیسے بھیجے تھے، میں نے سوچا اکٹھے پیمپرز خرید لیتا ہوں کام آ جائیں گے ورنہ ہر دوسرے دن بیکٹ لانا پڑتا ہے۔“

”شکر ہے تمہارے بھائی کو بھی ماں یاد آ گئی، تم نے بتایا نہیں کہ کام والی لڑکی کو بھی ماہانہ بیس ہزار دیتے ہیں دن رات ہمارے ساتھ رہتی ہے، کھانا پینا الگ اس میں بھی اپنا حصہ ڈالے یہ کیا دو چار ہزار بھیج کے

انجم باجی کے لیے

نہیں آسان ہے جاناں
کسی سے یوں جدا ہونا
بہت دشوار ہوتا ہے
کسی کو الوداع کہنا
تم ہی نے راہ کے خاروں کو
گل و گلزار میں بدلا
تم ہی نے سوچ کے دھاروں کو
اِک مہکار میں بدلا
تمہارے وصف کے صدقے
محبتیں تقسیم ہوئیں ہر سُو
تمہارے لہجے کی شبنم سے
بکھری خوشبوئیں ہر سو
یہ رشتہ کیسا رشتہ ہے
کوئی تم سا تھا نہ تم سا ہے

کاوش: ظل شاہین، رحیم یار خان

ماں کی ذمے داری سے فارغ......“ پیمپرز کا پیکٹ بند کرتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

”سب پتا ہے اسے، اب میں زبردستی چھین تو نہیں سکتا بہرحال اس دفعہ اس نے پچاس ہزار بھیجے ہیں اس لیے سوچ رہا ہوں ماں جی کو دو جوڑے بھی بنوا دوں کیونکہ ان کے کپڑے سارے ختم ہو گئے ہیں۔“

”رہنے دو تم ماں جی کے جوڑے، ہر کپڑا گندا کر کے پھینک دیتی ہیں اب بھلا بتاؤ ان کی عمر رہ گئی ہے نیا کپڑا پہننے والی۔“ وہ ناگواری سے ناک چڑھاتے ہوئے بولی۔

”سارے گھر کو بدبودار کر دیا کل پڑوس سے... مسز اکرم آئیں تو لاؤنج میں گھستے ہی واپس بھاگ گئیں کہ اتنی بدبو یہ تو نری بیماری ہے۔“

”اچھا لیکن عائشہ تو بہت صاف ستھری ہے، ہر وقت ماں جی کی صفائی کا خاص خیال رکھتی ہے، میں

نے تو کبھی اپنے گھر میں اتنی بدبو محسوس نہیں کی کہ سانس لینی مشکل ہوجائے..... لوگوں کو تو عادت ہے باتیں بنانے کی۔"

"اس لیے کہ تم اس بدبو کے اب عادی ہوچکے ہو مگر دنیا عادی نہیں ہوئی۔"

ایک کے بعد ایک تھیلی کھول کر سارا سامان چیک کرتے ہوئے اس کے ماتھے پر پڑی تیوریاں پہلے سے خاصی کم ہوگئی تھیں۔ فہد نے اس کی بات کا جواب دینا شاید ضروری نہیں سمجھا اس لیے خاموشی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

ربیعہ نے جیسے ہی تربوز کا باؤل اپنے آگے کیا کمرے کا دروازہ کھول کر ماں جی لاؤنج میں داخل ہوگئیں۔ عائشہ نے انہیں بازو سے تھام رکھا تھا۔

"یہ کہاں جارہی ہیں؟" کانٹے میں لگا تربوز ربیعہ نے واپس باؤل میں رکھتے ہوئے عائشہ سے پوچھا۔

"پتا نہیں جی، کہہ رہی ہیں میرا جی گھبرا رہا ہے مجھے باہر لے کر چلو۔"

"ظاہر ہے ساری زندگی کبھی گھر تو بیٹھے دیکھا نہیں، ہر وقت پھرتی تھیں کبھی یہاں کبھی وہاں تو اب بھلا کیسے گھر میں جی لگے گا۔" جواباً ربیعہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

"مجھے تربوز کھانا ہے۔"

باتوں کے دوران اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب ماں جی اس کے سر پر آن کھڑی ہوئیں اور فوراً ان کی نگاہ ربیعہ کے سامنے موجود باؤل پر بھی پڑگئی۔

"لو جی پہلے تھوڑا گند کیا ہوا ہے سارا دن جواب تربوز کھانا ہے۔" ربیعہ..... تربوز سے بھرا باؤل اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی مبادا ماں جی اس باؤل پر قبضہ ہی نہ کرلیں۔

اب وہ ربیعہ کو چھوڑ کر عائشہ سے مخاطب ہوئیں جس بیچاری کے پاس ان کی یہ فرمائش پوری کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

"کھانے کی تو اس قدر ہوس ہے کہ سو سال کی ہونے پر بھی ختم نہیں ہورہی ہے جو ملتا ہے بس کھالو چاہے ہضم ہویا نہیں ہو۔"

اس بار ربیعہ قدرے چڑتے ہوئے بولی۔

"ارے انہیں صوفے پر مت بیٹھنے دو، اندر کمرے میں واپس لے جاؤ، بلاوجہ یہاں گند کردیں گی، نئے صوفے کا ستیاناس ماردینا ہے انہوں نے۔"

باتوں کے دوران ماں جی نئے صوفے پر براجمان ہوگئیں اور یہ دیکھتے ہی ربیعہ کی تو مانو جان ہی نکل گئی، اس کی غصے سے بھری آواز سنتے ہی عائشہ نے جلدی سے ماں جی کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر شاید وہ بھی بڑھاپے میں ایک بچے کے مانند ہوگئی تھیں جو ضد ان کے اندر بڑھتی جارہی تھی۔ عائشہ کے بازو پکڑ کر کھڑا کرنے پر بھی وہ ذرا ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ بلکہ ان کی ساری توجہ کا محور اس وقت وہ باؤل تھا جو ربیعہ نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

"پہلے مجھے تربوز دو پھر کمرے میں جاؤں گی۔"

فرمائش کے ساتھ، ساتھ وہ للچائی ہوئی نظروں سے باؤل تک رہی تھیں ایسے جیسے ربیعہ کے ہاتھ سے چھین کر کھا جائیں گی اور ظاہر ہے عائشہ بیچاری اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتی تھی سوائے اس کے کہ انہیں بازو سے تھام کر کھڑا کرنے کی اپنی کوشش مزید تیز کردی۔

"اب یہ تربوز مجھے ہضم نہیں ہوتا، بڑی پیٹ پھاڑ نظر ہے ان کی۔" ربیعہ انہیں غصے سے گھورتی اندرون میں چلی گئی۔

"تربوز ختم ہوگیا ماں جی آپ کمرے میں آئیں، میں اور منگواتی ہوں۔" عائشہ کے پاس سوائے انہیں بہلانے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

"اچھا۔" اب ایک تابعدار بچے کے مانند ماں جی اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔

"میرا جب بھی جی گھبراتا ہے میں تربوز کھاتی ہوں گرمی میں ٹھنڈ ڈال دیتا ہے۔"

عائشہ کے ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے وہ مسلسل بولے جارہی تھیں جبکہ عائشہ جانتی تھی کہ خرابی ہاضمہ کا

بہانہ تراشتے ہوئے انہیں کبھی تربوز دیا ہی نہیں جاتا مگر وہ اس حالت میں نہ تھیں کہ ان کی کسی بھی بات پر ٹوک کر انہیں جھوٹا ثابت کیا جاتا۔

اس لیے وہ بھی خاموشی سے ماں جی کی ساری باتیں سنتی رہی۔

☆☆☆

آج گھر میں صبح سے ہی بڑی گہما گہمی تھی ایسے جیسے کوئی خاص مہمان آنے والا ہو، ربیعہ باجی کے علاوہ ان کے دونوں بیٹے اور بیٹی فاریشہ بھی خوب تیار تھی۔ کچن میں بنتے مزے، مزے کے کھانے کی خوشبوئیں... عائشہ کے نتھنوں سے ٹکرا کر اس کی بھوک کو مزید بڑھا رہی تھیں۔ باہر خوب صفائی کے بعد لاؤنج کو غبارے اور ربن سے سجا دیا گیا۔ اس سارے کام میں تینوں بچے بڑے جوش وخروش سے حصہ لے رہے تھے اسے محسوس ہوا شاید آج گھر میں کسی کی سالگرہ ہے جس کا یقین الماس آپا کی آمد کے ساتھ ہوگیا جو اپنے، ساتھ مختلف گفٹ پیکٹ کے ساتھ، ساتھ ایک بڑا سا کیک کا ڈبا بھی لے کر آئی تھیں جو انہوں نے آتے ہی باہر لاؤنج میں رکھی ٹیبل پر دھر دیا۔

"ماں جی کہاں ہیں؟"

پورے دو ماہ بعد بیٹی کو ماں کی یاد آئی تھی اور وہ بھی ایسے جیسے بے چین ہوتی جارہی ہوں، عائشہ لاؤنج میں کھلنے والی کھڑکی سے یہ سارا نظارہ دیکھ رہی تھی جبکہ ماں جی کرسی پر بیٹھے، بیٹھے سوگئی تھیں کیونکہ وہ سارا دن بستر پر پڑے رہنے سے اکثر ہی تھک جایا کرتیں اور ایسے میں خوب شور مچاتیں جس کی بنا پر عائشہ انہیں اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیتی اور جہاں بیٹھے، بیٹھے وہ سوجایا کرتیں مگر بستر پر نہ لیٹنے کی اپنی ضد مسلسل برقرار رکھتیں جیسے کہ ابھی، وہ کھڑکی سے باہر ہونے والی ہلچل دیکھنے میں اس قدر محو تھی کہ کب الماس آپا کمرے میں آئیں اسے پتا ہی نہیں چلا۔

"ارے لڑکی تم نے ماں جی کو ایسے کرسی پر کیوں ٹانگا ہوا ہے۔" اندر داخل ہوتے ہی ان کا

اعتراضی عمل کا وہ مرحلہ شروع ہوگیا جس سے پہلے بھی عائشہ کئی بار گزری تھی۔

"خود تم مزے سے لیٹی ہو اور جن کی خدمت کے لیے ہم تمہیں ہر ماہ ہزاروں کی رقم دیتے ہیں، وہ بیچاری منہ کھولے کرسی پر پڑی ہیں۔"

عائشہ بنا جواب دیے چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی، ویسے بھی وہ اس وقت بہت تھکی ہوئی تھی کیونکہ ایک تو ماں جی ساری رات نہ سوئی تھیں دوسرے وہ صبح سے بار، بار اپنے کپڑے خراب کررہی تھیں انہیں جب بھی عائشہ انہیں پیمپر لگاتی وہ ضد میں آکر اتار پھینکتیں بقول ماں جی وہ کوئی چھوٹی بچی نہ تھیں جنہیں ایسے کاغذ کی تھیلیاں لگائی جائیں اور صبح سے کی جانے والی ان کی اس ضد نے عائشہ کو اب تھکا دیا تھا، اس لیے اس میں اس لمحہ کسی سے بھی سوال جواب کرنے کی بالکل ہمت نہیں تھی اس لیے خاموش رہی۔

"تم نے آج انہیں نہلایا نہیں، کمرا بھی دیکھو کس قدر گندا ہورہا ہے۔" عائشہ کی طرف سے جواب نہ پا کر بھی الماس آپا مسلسل بولے جارہی تھیں اس طرح کہ اس لمحہ انہیں اپنی ماں سے ملنا بھی یاد نہیں رہا تھا اور شاید یاد بھی نہیں آتا اگر ماں جی ان کی آواز سن کر انہیں پہچان نہ لیتیں۔

"یہ الماس کی آواز ہے؟" ماں جی نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ماں جی، میں آئی ہوں۔" اب الماس سب کچھ بھول کر ماں کی جانب بڑھیں۔

"سلام ماں جی۔"

"وعلیکم السلام...... آج میری بچی بڑے دنوں بعد آئی۔" الماس کی آواز سن کر ہمیشہ کی طرح ماں جی کھل اٹھیں۔

"تم انہیں نہلا کر اچھے سے کپڑے پہناؤ اور باہر لاؤنج میں لے آؤ۔"

"اچھے کپڑے۔"

عائشہ ٹھٹکی، جانتی تھی کہ ماں جی کے پاس تو کوئی

ڈھنگ کا سوٹ ہی نہیں ہے بلکہ کوئی مکمل سوٹ بھی ان کے پاس نہیں تھا شلوار کوئی قمیص کوئی...... اس نے عائشہ کی بات کا جواب دیے بنا آگے بڑھ کر ماں جی کی الماری کھولی جو ساری کی ساری خالی تھی۔ سوائے ایک خانے کے جہاں دو چار کپڑے بہوٹ کے نام پر رکھے تھے جنہیں اس نے اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اپنی جگہ واپس رکھ دیا۔

''اچھا تم انہیں نہلاؤ تو سہی۔'' اچھے کپڑے تلاش کرنے کی اپنی کوشش میں ناکام ہو کر وہ ایک بار پھر عائشہ سے مخاطب ہوئیں۔

''جی اچھا۔'' ماں جی کی وہیل چیئر گھسیٹتی وہ باتھ روم کی جانب بڑھ گئی یہ بھی احسان تھا دانیال بھائی کا کہ جنہوں نے وہیل چیئر کے لیے پیسے بھیج دیے اور اس طرح عائشہ انہیں گھسیٹ کر یہاں وہاں لے جانے کی اذیت سے بچ گئی۔ ماں جی کو نہلا دھلا کر پرانی قمیص کے ساتھ کہیں سے ڈھونڈ کر ایک سفید شلوار پہنا دی گئی ساتھ ہی ایک صاف ستھرا دوپٹا بھی تھا جو غالباً ربیعہ باجی کا تھا، ان دو سفید کپڑوں نے بھی ماں جی کا حلیہ خاصا بہتر کر دیا تھا اب وہ پہلے کے مقابلے میں خاصی معزز نظر آ رہی تھیں۔

''انہیں باہر لاؤنج میں لے آؤ۔'' الماس ہدایت دے کر خود باہر نکل گئیں۔ عائشہ نے ماں جی کے بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی کی اور پھر انہیں وہیل چیئر پر بٹھا کر باہر لاؤنج میں لے آئی جہاں سب جمع تھے انہیں دیکھتے ہی سب سے پہلے فہد آگے بڑھا۔

''ہیپی مدرز ڈے ماں جی۔''

اوہ تو آج ماؤں کا خاص دن تھا جو یہ امیر لوگ ہر سال بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے، فہد کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سنتے ہی جیسے عائشہ کو یاد آ گیا اس نے دیکھا بھائی فہد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ماں جی خاصی خوش تھیں پھر یکے بعد دیگرے سب آ گئے۔ آ کر ماں جی سے ملے، ربیعہ، الماس اور ان دونوں کے سارے بچے سب ہی آج بہت خوش تھے پھر اسکائپ لگایا گیا دوسری طرف دانیال بھائی بھی اپنی فیملی کے ساتھ ماں کو وش کرنے کے لیے موجود تھے۔ ماں جی تو مانو نہال ہی ہو گئیں۔

''ماں جی کے ساتھ اچھی، اچھی فوٹو لے کر بھیجنا ہم واٹس ایپ اور فیس بک پر لگائیں گے۔'' یہ دانیال کی بڑی بیٹی تھی جو الماس کی بیٹی رومیصہ سے مخاطب تھی اور پھر بڑا والا کیمرا لایا گیا سب نے مل کر ماں جی کے ساتھ خوب تصاویر بنوائیں، مختلف پوز، فیس بک پر اسٹیٹس ڈالے گئے، دادی کے ساتھ بھرپور محبت کے اظہار والی تصاویر ڈال دی گئیں اور پھر ایک دم الماس کو وہ کیک یاد آ گیا جو وہ ماں جی کے لیے لے کر آئی تھیں۔

''ارے کیک تو لاؤ ماں جی نے کیک کاٹنا ہے۔'' بچے بھاگ کر گئے اور بڑا سا کیک لا کر ماں جی کے سامنے رکھ دیا۔

''میں کیک کھاؤں گی، مجھے کیک بہت اچھا لگتا ہے۔'' اپنے ہاتھ میں چھری پکڑے ماں جی نے فوراً فرمائش کر دی۔

''جی پہلے کاٹ تو لیں پھر کھا بھی لیجیے گا۔'' ان کی بات سنتے ہی الماس ہنس دیں اور تالیوں کی گونج میں ماں جی نے کیک کاٹا سب نے گیت گایا۔ کیک کاٹتے ہی ربیعہ نے اٹھا لیا۔

''مجھے کیک تو دے دو' سارا اٹھا کر لے گئے۔'' کیک جاتا دیکھ کر ماں جی نے دہائی دی۔

''پہلے کھانا کھا لیں پھر کیک دیتی ہوں۔''

''میں نے آج بریانی کھانی ہے۔'' سب کو موجود دیکھ کر ماں جی سمجھ گئی تھیں کہ آج کوئی خاص دن ہے جس کے لیے یہ سب اہتمام ہو رہا ہے۔

''انہیں کمرے میں لے جاؤ عائشہ، یہ بہت تھک گئی ہیں، میں ان کا کھانا وہیں بھیج رہی ہوں۔ انہیں سلا کر تم باہر آ کر کھا لینا ورنہ یہ کھانے نہیں دیں گی۔''

''اچھا پھر کیک تو دے دو۔'' اس سارے شور شرابے میں ماں جی کی ساری توجہ سامنے موجود بڑے سے کیک پر تھی۔

''بھابی، ماں جی کو تھوڑا سا کیک دے دیں۔'' ماں جی کے ساتھ سیلفی بناتے ہوئے الماس نے پکارا۔

''یہ چاکلیٹ کیک ہے جو ماں جی کا ہاضمہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اب تم تو کھلا کر گھر چلی جاؤ گی باقی ساری مصیبت ہمارے لیے ہو گی۔'' کچن سے آئے جواب نے الماس کو بالکل خاموش کر دیا جبکہ عائشہ ماں جی کی وہیل چیئر کو کمرے کی جانب لے کر چل دی اور تھوڑی ہی دیر میں ربیعہ کی ملازمہ کھانے کے نام پر ایک ٹرے ماں جی کے لیے رکھ گئی۔ عائشہ نے دیکھا پتلی سی کھچڑی اور ایک پانی کا گلاس، اس نے لاؤنج میں کھلنے والی کھڑکی سے باہر جھانکا سب لوگ اپنے آپ میں مست مزے، مزے کے کھانے اڑا رہے تھے جو مدرز ڈے کے نام پر پکائے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک نظر لاؤنج میں لگے غباروں اور ان مختلف کارڈز پر ڈالی جو ماں جی کی محبت میں تیار کیے گئے تھے اور جو یہ ظاہر کر رہے تھے کہ ان کی اولاد اپنی ماں سے بہت محبت کرتی ہے۔ لاؤنج میں رکھی چھوٹی ٹیبل ان مختلف تحائف سے بھری پڑی تھی جو ماں جی کے بیٹے اور بیٹی کے علاوہ پوتے، پوتیاں اور نواسے، نواسیاں لائے تھے اور وہ بظاہر نظر آنے والے نظارے میں گم تھی جب ماں جی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ارے مجھے کچھ کھانے کو دو، بڑی بھوک لگ رہی ہے۔'' عائشہ تیزی سے آگے بڑھی اور ٹرے میں رکھی کھچڑی کی رکابی سے چمچ بھر کر ماں جی طرف بڑھایا جس پر نظر پڑتے ہی انہوں نے اپنے ہاتھ سے پرے کر دیا۔

''مجھے کیک اور بریانی کھانی ہے۔''

بڑھاپے کو شاید اس لیے بھی بچپن سے تشبیہ دی جاتی ہے کہ اس عمر میں انسان بچوں کی طرح اپنی من پسند چیزیں کھانے کی خواہش کا اظہار کیے بنا نہیں رہ پاتا، چاہے وہ چیز اس کی دسترس میں ہو یا نہیں ہو۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ماں جی ابھی کھچڑی کھا لو صبح میں آپ کو کیک لا دوں گی۔''

اور پھر بڑی مشکل سے عائشہ نے بہلا پھسلا کر ماں جی کو کھچڑی کے نام پر پکے اس ملغوبے سے دو چمچ کھلائے باقی پلیٹ ڈھک کر رکھ دی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب ماں جی نے ساری رات بھوک، بھوک کا شور مچا کر یہ ساری پلیٹ ایک، ایک چمچ کر کے ختم کر دینی ہے لیکن اس رات دو سالوں میں پہلی بار عائشہ نے ربیعہ باجی کی حکم عدولی بھی کی وہ اس طرح کہ اپنے حصے کے کیک کا کچھ حصہ اس نے ماں جی کو بھی کھلا دیا وہ جانتی تھی کہ اگر ماں جی کا پیٹ خراب ہوا تو اسی نے سنبھالنا ہے اس لیے ان کی گندگی کی پروا کیے بغیر اس نے مدرڈے پر ایک ماں کی چھوٹی سی وہ خواہش پوری کر دی جو اس کی سگی اولاد چاہ کر بھی پوری نہ کر پا رہی تھی۔

آج پورے پندرہ دن بعد وہ اپنے گھر جا رہی تھی ورنہ ربیعہ باجی تو جانے ہی نہیں دیتی تھیں بہت مشکل سے وہ صرف دو چار گھنٹے ہی گھر گزار کر آئی مگر آج چونکہ الماس نے اپنی ملازمہ بھیج دی تھی ماں جی کو سنبھالنے کے لیے جس کی بنا پر اسے بہ مشکل ایک دن کی چھٹی مل گئی، وہ خوشی، خوشی جانے کے لیے تیار ہو کر باہر نکلی جہاں لاؤنج میں ربیعہ باجی موجود تھیں جو اسے دیکھتے ہی بولیں۔

”یہ شاپر اٹھا لو رات کا بچا ہوا کھانا ہے اور ساتھ کیک بھی رکھ دیا ہے کیونکہ میرے بچے تو باسی کوئی بھی چیز نہیں کھاتے۔“ عائشہ نے بنا جواب دیے ٹیبل پر رکھا ہوا بڑا سا تھیلا اٹھا لیا اور باہر کی طرف بڑھی جب ایک بار پھر ربیعہ باجی نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

”بات سنو عائشہ، یہ بھی لے جاؤ۔“ عائشہ نے دیکھا ان کے ہاتھ میں وہ سارے گفٹ پیک تھے جو رات الماس آپا لائی تھیں جس میں ماں جی کا سوٹ، ایک چپل اور وہ سفید چادر تھی جو رات انہوں نے اوڑھی ہوئی تھی۔

”لیکن یہ تو ماں جی کا سامان ہے۔“

”ہاں تو انہوں نے تیار ہو کر کون سا کہیں باہر جانا ہے لے دے کے یہ کمرا ہی ہے جس میں پڑی سارا دن گند کرتی ہیں، تم اٹھا لو یہ سامان اور لے جاؤ۔“

عائشہ نے خاموشی سے سارا سامان اٹھا لیا اور باہر نکل آئی اور پھر پندرہ منٹ بعد ہی ربیعہ باجی کا ڈرائیور اسے اس کے گھر کے دروازے پر چھوڑ گیا۔ وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی پہلی نظر سامنے صحن میں بچھی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پڑی جہاں پاؤں لٹکائے اس کی دادی بیٹھی ہوئی تھیں جو عمر میں تو ماں جی سے کافی چھوٹی تھیں لیکن بیماری نے انہیں خاصا لاغر کر دیا تھا۔

”السلام علیکم دادی۔“

دادی کو دیکھتے ہی وہ آگے بڑھی اور ان کے سینے سے لگ گئی اور دادی بھی جیسے اسے دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔

”میں صدقے جاؤں میری بچی آئی ہے۔ تو کب آئی؟“

دادی کی آواز سن کر اکلوتے چھوٹے سے کمرے سے ماں اور اس کے دونوں بہن، بھائی بھی باہر نکل آئے۔

”ارے آپا، یہ کیا لائی ہو؟“ منا چارپائی پر رکھے شاپرز دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھا اور جلدی سے انہیں کھول کر اندر جھانکا۔

”ارے چاکلیٹ کیک، میں تو یہ سارا کھا جاؤں گا۔“ اس کی للچائی آواز عائشہ کے کان سے ٹکرائی۔

”میں بھی کھاؤں گی۔“ یہ اس کی چھوٹی بہن ننھی تھی۔

”اور میں بھی......“ وہ جانتی تھی کہ دادی کو بھی میٹھا بہت پسند ہے۔

”مگر یہ سارا سامان آیا کہاں سے پہلے تو کبھی ربیعہ باجی نے اتنا کچھ نہیں دیا۔“

اماں ایک کے بعد ایک تھیلا کھول کر دیکھتے ہوئے حیرت سے بولیں۔

”اور یہ سوٹ، چپل، چوڑیاں یہ تو سب نئی ہیں۔“

”ہاں یہ سب ماں جی کا سامان ہے۔“

”ماں جی کا سامان......انہوں نے تمہیں کیوں دے دیا؟“ اماں کو حیرت ہوئی۔

”پتا نہیں اماں......“ وہ تھکے، تھکے انداز میں وہیں دادی کے پاس ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

”دراصل کل مدرز ڈے تھا ناں۔“ جواب دے کر اس نے ایک نظر اپنی ماں اور بوڑھی دادی کے چہرے پر ڈالی وہ سمجھ گئی کہ وہ شاید اس کی بات نہیں سمجھ پائیں۔

”مدرز ڈے ماں......یہ ماؤں کا عالمی دن ہوتا ہے جسے سارے امیر لوگ بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں اپنی ماں کے لیے بہت سے تحائف لاتے ہیں، خوب کھانے پکتے ہیں اور پھر ایک کیک کاٹا جاتا ہے اور ہاں تصویریں بھی بنتی ہیں جو کمپیوٹر پر ڈال دیتے ہیں تاکہ ساری دنیا دیکھ سکے کہ ہم اپنی ماں سے کتنی محبت کرتے ہیں۔“ یہاں تک کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رکی تو دیکھا دادی اور ماں کے ساتھ، ساتھ منا اور ننھی بھی اس کی باتیں بڑے اشتیاق سے سن رہے تھے۔

”اچھا تو پھر ٹھیک ہے اگلے سال ہم بھی یہ دن منائیں گے۔“ اس کے خاموش ہوتے ہی ننھی کی تیز آواز سنائی دی عائشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں آپا ہم اپنے صحن میں غبارے لگائیں گے، میں پیسے جمع کر کے نکڑ والی بیکری سے چھوٹا سا کیک لے آؤں گا جو دادی اور اماں مل کر کاٹ لیں گی۔“

ننھی کا ساتھ دینے کو منا بھی تیار ہو گیا، عائشہ نے دیکھا اس کی بات سن کر ماں کے چہرے پر بھی خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی جب اسی پل اس کے کان سے دادی کی پُرسوچ آواز ٹکرائی۔

”کیوں بیٹا کیا امیر لوگوں کے پاس ماں کے لیے صرف ایک ہی دن ہوتا ہے۔“ وہ بات جو وہ کہنا چاہتی تھی دادو بنا کہے ہی سمجھ گئیں۔ عائشہ نے جلدی سے انہیں اپنے گلے لگا لیا۔

”ہاں دادی مگر ہم غریبوں کے پاس تو سارا سال ہی اپنی ماں اور دادی کے لیے ہوتا ہے تو پھر بھلا ہم کسی ایک دن ماؤں کا یہ دن کیوں منائیں۔“ یہ کہہ کر اس نے منا اور ننھی کے چہرے کی جانب تکا۔

”ماں صرف ایک دن کی ماں نہیں ہوتی وہ تو ساری زندگی کے لیے ماں ہوتی ہے اور یہ رشتہ وہ واحد رشتہ ہے جسے کسی کی گواہی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی تو پھر کیوں ہم صرف ایک دن مدرز ڈے منائیں۔“ ساتھ ہی اس کی نگاہوں کے سامنے ماں جی کا جھریوں بھرا چہرہ گھوم گیا جنہیں اس عمر میں ان کی اولاد اپنے ساتھ رکھنے کو تیار نہ تھی مگر دنیا دکھاوے کے لیے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے مدرز ڈے منایا گیا۔ اس سے تو زیادہ بہتر ہوتا اگر ان کے تینوں بچے ماں کی ذمّے داریاں بانٹ لیتے اور صرف ایک ربیعہ باجی کو وہ بوجھ محسوس نہ ہوتیں جس کی بنا پر وہ اس طرح ہر پل انہیں دھتکارا نہ کرتیں۔

”عائشہ ٹھیک کہہ رہی ہے، ہم تو فارغ اور ویلے لوگ ہیں امیروں کی طرح مصروف نہیں کہ گھر میں موجود ماں کے لیے صرف ایک دن ہو۔“ یہ آواز اس کے معذور باپ کی تھی جو اُن کی باتیں سن کر جانے کب خود کو گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر آئے انہیں علم بھی نہیں ہوا۔

”بابا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، ہم اپنی ماں کے لیے ہر پل فارغ اور ویلے لوگ ہیں، اماں مجھے کھانا دو سخت بھوک لگی ہے۔“ اپنے باپ کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ساتھ ہی اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ربیعہ باجی کے گھر سے آئی ہوئی کھیر اور کیک ماں نے پلیٹ میں ڈال کر دادی کے سامنے رکھ دیا، یہ پروا کیے بنا کہ وہ اسے ہضم بھی کر سکتی ہیں یا نہیں اس نے ہمیشہ دیکھا تھا کہ اس کی ماں نے کبھی اپنی ساس کے کپڑے دھوتے ہوئے کراہیت کا ویسا اظہار نہیں کیا جیسا ربیعہ باجی اور الماس، عائشہ کو دھوتا دیکھ کر کرتی تھیں یہاں تک کہ ربیعہ باجی تو صرف اسی بنا پر کہ وہ ماں جی کا گند صاف کرتی ہے اسے کبھی اپنے برتنوں کو بھی ہاتھ نہ لگانے دیتیں، اس گھر میں اس کے اور ماں جی کے برتن الگ تھے جبکہ یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے وہ صحن میں لگے نلکے کی جانب بڑھ گئی تاکہ منہ ہاتھ دھو کر وہ بھی کھانے میں شریک ہو سکے۔



ناولٹ

کوئی شہرِ یارِ وفاؤں کا

نگہت سیما

اپنا بھاری ٹرالی بیگ گھسیٹتے ہوئے بڑے سے سیاہ گیٹ کے سامنے رک کر گیٹ پر لگے بلب کی روشنی میں نیم پلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اطمینان بھری سانس لی۔ سنہری پلیٹ پر سیاہ حروف بہت نمایاں تھے۔

ایڈووکیٹ مرزا خلیل بیگ 21، عمر بلاک

"تھینک گاڈ......"

اس نے پھر ایک اطمینان بھری سانس لی۔ پچھلے ایک گھنٹے سے وہ اسی بلاک میں خوار ہوتی پھر رہی تھی۔

پُرسکون سا ہو کر اس نے ڈور بیل بجائی۔ اندر کہیں موسیقی کی مدھم سی آواز سنائی دی تھی۔ وہ کچھ دیر منتظر کھڑی رہی لیکن اندر کہیں قدموں کی چاپ سنائی نہیں دی تھی۔ ذرا سے توقف کے بعد اس نے دوبارہ بیل پر ہاتھ رکھا اور اب کے دیر تک اس نے بیل سے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ لیکن اندر اسی بیل کی موسیقی کی مدھم آواز کے سوا کوئی ہلچل نہیں تھی۔ اب کے وہ گھبرائی۔

''تو کیا انکل خلیل اور آنٹی گھر پر نہیں ہیں۔'' اس نے ایک بار پھر بیل پر ہاتھ رکھا۔

''یا اللہ اگر وہ گھر پر نہیں ہیں تو میں...... میں کیا کروں گی، رات کے اس وقت کہاں جاؤں گی۔'' دو ہفتے پہلے جب انکل خلیل کا فون آیا تھا تو انہوں نے کہیں جانے کا ذکر تو نہیں کیا تھا بلکہ بہت اصرار کیا تھا کہ وہ کچھ دن کے لیے ہی سہی ان کے پاس آجائے...... لیکن تب...... ہاں تب...... اس کے گمان تک میں نہیں تھا کہ صرف دو ہفتے بعد ہاں صرف دو ہفتے بعد وہ یوں تن تنہا بے آسرا ہو کر ان کے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوگی۔ اس نے آنے سے پہلے کتنی ہی بار کوشش کی تھی ان سے بات کرنے کی لیکن کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ تب اس نے خود ہی فرض کر لیا تھا کہ ان کا فون خراب ہوگا۔ ان کا سیل نمبر تو اس کے پاس تھا ہی نہیں ورنہ اس پر ٹرائی کرتی، ابا کی ڈائری میں سے بھی نہیں ملا۔ شاید ان کے فون میں محفوظ ہوگا لیکن ان کا قیمتی موبائل تو سنی نے لے لیا تھا۔ حالانکہ ابا کا فون وہ خود رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن بھابی نے یہ کہہ کر اسے خاموش کروا دیا تھا۔

''بچہ ہے ضد کر رہا تھا فون لینے کی...... دو چار روز میں دل بھر جائے گا تو دے، دے گا۔'' گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے بھی اس نے کوشش کی تھی کہ انہیں اپنی آمد کی اطلاع دے، دے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ایڈریس تو اس کے پاس تھا ہی اور خلیل انکل نے بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا حالانکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر وہ آنا چاہے تو بس فون کر دے۔ وہ خود اسے آکر لے جائیں گے لیکن وہ کیا کرتی کیسی اچانک افتاد آپڑی تھی اس پر...... اس کے پاس اور کوئی جائے پناہ تھی ہی نہیں سوائے اس کہ وہ خلیل انکل کے پاس آجاتی۔ ابا نے بھی تو کہا تھا کہ ''اگر کبھی کسی مشکل میں پڑ جاؤ تو خلیل کی طرف چلی جانا۔ یہاں اس ملک میں اس سے بڑھ کر کوئی تمہارا ہمدرد نہیں ہوگا۔'' لیکن کیا خبر...... کیا خبر وہ اس وقت گہری نیند میں سو رہے ہوں، نو بجنے والے ہیں، شاید وہ جلدی سو جاتے ہوں۔'' ایک موہوم سی امید پر اس نے دائیں کندھے پر لٹکے شولڈر بیگ کی زپ کھول کر اندر ہاتھ مارا اور اندر بھرے سامان سے کچھ دیر بعد ایک اسمارٹ فون برآمد کر لیا۔ ''کمال ہے مجھے پہلے اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔'' اور وہاں ہی کھڑے کھڑے فون کا نمبر ملایا۔ لیکن بیل بج، بج کر بند ہوگئی تھی۔ دو تین بار کوشش کرنے کے بعد اس نے دوبارہ فون واپس بیگ میں پھینک کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس پوش رہائشی کالونی میں اس وقت خاموشی تھی، گھروں کے پورچ اور آس پاس گیٹ پر جلتے بلبوں کی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ یہاں بہر حال لوگ رہتے بستے ہیں۔ حالانکہ ابھی تو صرف نو ہی بجے تھے اور یہاں پتا نہیں اتنی خاموشی کا عالم کیوں تھا۔ روڈ پر وہ رکشا ابھی تک کھڑا تھا جس میں وہ اسٹیشن سے یہاں تک آئی تھی۔ رکشا ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس طرح تقریباً پچھلے ایک گھنٹے سے اس بلاک کی مختلف اسٹریٹس میں وہ چکرائی پھر رہی تھی اس سے غالباً رکشے والے کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس شہر میں اجنبی ہے۔

''اُف...... اب کیا کروں میں؟''

اس نے فوراً ہی رکشے والے کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ اور سوچا ساتھ والے گیٹ کی بیل بجائے شاید ان لوگوں کو کچھ پتا ہو۔ کیا خبر وہ کہیں باہر نکلے ہوئے ہوں یا کسی عزیز رشتے دار سے ملنے گئے ہوئے ہوں، اس نے بیگ کا ہینڈل پکڑے، پکڑے اپنا رخ ساتھ والے گیٹ کی طرف کیا اور ابھی ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ گھر کا ذیلی گیٹ کھول کر کوئی باہر نکلا، کندھے پر گن لٹکائے وہ یقیناً اس گھر کا گارڈ تھا جو اس پر نظر پڑتے ہی اس کی طرف بڑھا تھا۔

''بی بی تم اِدھر کھڑا کیا کرتی ہے، چوری ووری کا نیت سے تو نہیں آیا اور اِدھر کھڑا ہو کر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرتی ہے۔'' وہ اس کے سامنے کھڑا مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تو اب یہ وقت بھی آنا تھا تم پر ایمن مرتضٰی کہ اچھی خاصی معقول شکل صورت اور پرسنیلٹی رکھتے ہوئے بھی تمہیں چور سمجھا جائے۔

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں اِدھر انکل خلیل بیگ کے گھر آئی ہوں، بھتیجی ہوں ان کی۔''

''او ئے تم کیسا بھتیجی ہو کہ تم کو خبر نہیں ہے کہ وہ اِدھر گھر پر نہیں ہے۔'' وہ اب بھی مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا وہ جز بز ہوئی۔

''دو ہفتے پہلے میری ان سے بات ہوئی تھی تو وہ اِدھر ہی تھے۔''

''ہاں تو دو ہفتے پہلے تو وکیل صاحب اِدھر ہی تھے پر اب نہیں ہیں، آنے سے پہلے فون کر کے پوچھ لینا تھا۔''

''اور یہ اب ان پڑھ چوکیدار مجھے عقل دے گا۔''

''آپ کو کچھ پتا ہے کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کب تک واپس آئیں گے؟''

''او بی بی مجھ کو کیا معلوم، کامل خان کو پتا ہوگا...... وہ ہی گھر کا دیکھ بھال کرتا ہے پر اِدھر اس کی برادری میں کوئی فوتگی ہوگئی ہے اُدھر گیا ہے۔ کل تک آجائے گا تو پوچھ لینا آکر...... مجھے تو دو دن کے لیے گھر کا خیال رکھنے کو بول گیا تھا۔'' بات کرتے، کرتے یکایک اس کی نظر اس کے ٹرالی بیگ پر پڑی۔

''بی بی آپ کسی دوسرے شہر سے آئی ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو اِدھر کوئی اور رشتے دار عزیز ہے تو اس کی طرف چلی جاؤ۔''

اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا اور اپنے ٹرالی بیگ کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے روڈ پر نظر ڈالی۔ وہ رکشا ڈرائیور اب بھی وہیں روڈ پر اپنے رکشے سے ٹیک لگائے کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اس وقت وہ کہاں جائے، کیا کرے، کیا واپس بہاول پور چلی جائے۔ بہاول پور کے تصور سے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی اور درد جیسے پورے جسم میں پھیلتا چلا گیا۔ یہاں اس اجنبی شہر میں وہ سوائے خلیل بیگ کے کسی کو جانتی تک نہیں تھی اور واپس بہاول پور جا کر بھی کہاں جائے گی۔ ہاں ساجدہ آپا کے پاس، ایک دو دن تو وہ رکھ ہی لیں گی اور پھر کسی ورکنگ ویمن ہاسٹل میں رہ لے گی۔ عارب کے آنے تک...... اور آرب نے کہا تھا کہ وہ جلد آئے گا۔ وہ بیگ دھکیلتی ہوئی ہولے، ہولے آگے بڑھ رہی تھی لیکن اس وقت واپس ریلوے اسٹیشن پر کیسے جائے گی۔ وہ رکشا جس پر وہ ریلوے اسٹیشن سے آئی تھی ابھی تک کھڑا تھا۔ ''اس میں تو ہرگز واپس نہیں جاؤں گی۔ کیسے گھور، گھور کر دیکھ رہا تھا۔'' اس نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مونچھوں کو بل دیتا شکل سے ہی خوفناک لگ رہا تھا۔ کئی سنے سنائے واقعات ذہن میں آگئے تھے۔ آگے مین روڈ پر جا کر شاید کوئی سواری مل جائے۔ کوئی وین یا بس رات کے نو بجے وہ کسی رکشے یا ٹیکسی میں تو ہرگز نہیں بیٹھے گی۔ آخر اسٹیشن کی طرف ویگنیں، بسیں تو جاتی ہی ہوں گی۔ لیکن پتا نہیں اس وقت بہاول پور کے لیے کوئی گاڑی ملے گی یا نہیں۔ پتا نہیں کب جائے گی، تب تک کا وقت ویٹنگ روم میں گزار لے گی، کتنی غلطی ہوئی تھی اس سے...... ساجدہ آپا کے گھر ٹھہر کر اسے انکل خلیل بیگ کے فون کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ ساجدہ آپا نے تو اسے روکا بھی تھا وہ اسے یوں اکیلا آنے سے منع کر رہی تھیں۔ رکشے والے نے اب رکشا اسٹارٹ کر دیا تھا۔

''یا اللہ میری مدد کر۔''

بے اختیار اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور اس کا جی چاہا کہ وہ وہاں ہی بیٹھ جائے اور دھاڑیں مار، مار کر رونا شروع کر دے۔ رکشا اچانک

ہی اس کے قریب آ کر رکا اور ڈرائیور نے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”آپ نے کہاں جانا ہے، میں لے چلتا ہوں۔ لگتا ہے آپ کے یہ والے رشتے دار گھر پر نہیں ہیں۔“

وہ بے حد عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دل میں ایک خوف کی لہر سی اٹھی لیکن اس نے جی کڑا کر کے کہا۔

”نہیں بھائی شکریہ...... یہ ساتھ ہی جانا ہے۔“

بیگ گھسیٹتے ہوئے چند قدم چل کر اس نے ذرا سا رخ موڑ کر دیکھا۔ رکشا گویا اس کے ساتھ، ساتھ رینگ رہا تھا۔ اس نے فوراً نظریں ہٹا کر دائیں طرف دیکھا۔ براؤن گیٹ کے ساتھ ذیلی گیٹ نیم وا تھا۔ وہ گیٹ کو ہلکا سا دھکیلتی اندر چلی گئی اور گیٹ کو بند کر دیا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی گیٹ سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ پھر رکشے کی پھٹ، پھٹ کی آواز سنائی دی۔ اس کی واپسی سے مایوس ہو کر شاید اب وہ واپس جا رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کچھ دیر بعد گیٹ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ کھل نہیں پا رہا تھا۔ اس کے بند کرنے سے بڑ آٹومیٹک لاک لگ گیا تھا۔ اس کے اپنے گھر کے لاک تو اندر کی طرف سے بغیر کی کے بٹن دبانے پر ہینڈل گھمانے سے کھل جاتے تھے البتہ باہر سے کھولنے کے لیے چابی کی ضرورت ہوتی تھی لیکن اس لاک کا سسٹم اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بڑے گیٹ کی طرف دیکھا لیکن اس میں بڑا سا تالا لٹکا ہوا تھا۔ ایک دم اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

”پتا نہیں اس گھر میں کیسے لوگ رہتے ہیں کہیں آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات نہ ہو۔ یا اللہ......“ اس نے پھر اللہ کو مدد کے لیے پکارا۔ ”یا اللہ میری مدد فرما۔“

آنسو اس کی آنکھوں میں چمکے اور اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دائیں طرف لان تھا اور بائیں طرف کار پورچ تھا...... جہاں دو گاڑیاں کھڑی تھیں ایک بلیک، ہنڈا سٹی تھی اور ایک مہران...... سامنے تین سیڑھیاں چڑھ کر برآمدہ تھا۔ اس کے بالکل سامنے برآمدے میں لکڑی کا منقش دروازہ تھا جو شاید اندر لاؤنج میں کھلتا ہوگا۔ دروازے کے ساتھ ہی دائیں طرف بڑی سی کھڑکی تھی۔ جس کے آگے گرل تھی؛ لمحہ بھر سوچنے کے بعد بیگ کو وہاں ہی گیٹ کے ساتھ دیوار کے قریب چھوڑ کر خود سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آئی اور...... اس نے سوچا کہ دروازے پر دستک دے اور ایک رات، ہاں صرف آج کی رات کے لیے پناہ مانگ لے۔ اس نے اونچے منقش دروازے پر ہاتھ رکھا لیکن پھر فوراً ہی اٹھا لیا تھا۔ ”پتا نہیں کیسے لوگ ہوں گے۔“ وہ ذرا سا دائیں طرف ہوئی تاکہ کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھ سکے لیکن کھڑکی بند تھی اور اندر دبیز پردے پڑے تھے۔

”کیوں نہ میں رات یہاں ہی برآمدے میں بیٹھ کر گزار دوں گھر والوں کو کیا پتا چلے گا کہ باہر برآمدے میں کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ صبح ہوتے ہی میں چلی جاؤں گی۔ جو کوئی گیٹ کھولنے آیا اسے اپنی مجبوری بتا کر معذرت کر لوں گی۔ کوئی اتنا ظالم کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنی سی بات پر کہ رات میں برآمدے میں بیٹھی رہی تھی، مجھے تھانے لے جائے۔ بھول گئیں ایمن مرتضیٰ لوگ اس سے بھی زیادہ ظالم ہوتے ہیں۔“ اس کے اندر سے آواز آئی اور دل میں جیسے درد کی ٹیس سی اٹھی تھی۔ گہرا درد زخموں کو چھیلتا ہوا...... بہر حال...... اس نے درد پیتے ہوئے خود سے کہا۔

”رات تو میں نے گزارنی ہے اور یہاں اس چار دیواری کے اندر میں باہر سے تو محفوظ ہی ہوں، کیا خبر کہیں آگے جا کر وہ رکشا ڈرائیور کھڑا ہو...... اور......“ اس نے جھرجھری سی لی۔ ”گیٹ کا لاک بند ہو جانے میں بھی یقیناً کوئی مصلحت ہوگی۔ صبح ہوتے ہی مین روڈ سے کوئی رکشا لے کر سیدھی اسٹیشن جاؤں گی اور بہاول پور کے لیے ٹکٹ لے لوں گی اور پھر یہ بھی تو ممکن ہے صبح تک کامل خان واپس آ جائے اور انکل خلیل بیگ کے متعلق مجھے پتا چل جائے یا پھر ان کا نمبر مل جائے، وہ ضرور اسے اپنا کوئی رابطہ نمبر دے کر گئے

ہوں گے۔ اگر وہ کسی دوسرے شہر میں بھی ہوئے تو میں فون پر ان سے بات کر سکتی ہوں اور وہ کہیں نہ کہیں میرا بندوبست کر دیں گے۔“ وہ خود کو کسی نہ کسی حد تک مطمئن کرتے ہوئے دروازے کے پاس ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ لیکن پھر فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی اس کے سر کے عین اوپر برآمدے کی لائٹ جل رہی تھی۔ اگر کوئی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تو اور اسے گھر سے نکال دیا تو......شاید کوئی گیٹ چیک کرنے باہر آ نکلے...... آخر وہ چھوٹا گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا جو تھا۔ سیکڑوں وسوسے اس کے دل سے لپٹے ہوئے تھے۔ اس نے پورچ کی طرف دیکھا جہاں برآمدے کے مقابلے میں کچھ اندھیرا تھا۔ وہ ایک بار پھر سیڑھیاں اتر کر پورچ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ ہنڈا سٹی کی اوٹ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور جتنی بھی قرآنی آیات یاد تھیں دل ہی دل میں ان کا ورد کرنے لگی۔ فروری کا آخری ہفتہ تھا اور اس نے ایک ہلکا سا سوئیٹر پہنا ہوا تھا اور شال بھی ہلکی تھی۔ اس نے شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ وہ جس ذہنی اذیت اور تکلیف سے پچھلے دنوں گزری تھی اس وقت اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ سارے مناظر بار، بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔

”کیا کوئی اتنا بھی شقی القلب ہو سکتا ہے اتنا ظالم......“ ساری دنیا اس کے مخالف ہو جاتی پر ایک عاطف مرتضیٰ اس کے خلاف نہیں ہوتا لیکن کیا خون کے رشتوں میں بھی اتنا زہر بھر جاتا ہے، عاطف کا تو خون کا رشتہ تھا اس کے ساتھ، بھلے مائیں الگ تھیں لیکن باپ تو ایک ہی تھا ناں......

”آپ کے سارے اندیشے کتنے صحیح تھے ابا...... کاش میں نے تب آپ کی بات سمجھ لی ہوتی۔ اے کاش......“ اس نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ پہلے آنکھیں نم ہوئیں اور پھر جیسے سیلاب آ گیا تھا اور وہ رو رہی تھی۔ بے تحاشا رو رہی تھی حالانکہ کل رات...... کل رات ہی تو اس نے عہد کیا تھا کہ جتنا رونا تھا اس نے رو لیا تھا اور یہ کہ اب وہ کبھی نہیں روئے گی۔ ہاں کبھی نہیں روئے گی، اسے اب رونا نہیں تھا... بلکہ ان سب کو روتے ہوئے دیکھنا تھا جنھوں نے اسے رُلایا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ انہیں ایسے ہی روتے ہوئے دیکھے گی. جیسے وہ خود روئی تھی اور اتنا ہی بے بس اور مجبور جتنی وہ تھی کیونکہ اس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا اور اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔ پھر بھی صرف چوبیس گھنٹوں بعد اس کا عہد ٹوٹ گیا تھا اور وہ ایک اجنبی گھر کے پورچ میں گھٹنوں پر سر رکھے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد حمائل کیے روئے جا رہی تھی اور آنسو تھے کہ امڈے چلے آ رہے تھے۔ پتا نہیں اتنا پانی کہاں سے اس کے اندر اکٹھا ہو گیا تھا۔ پھر روتے، روتے اسے لگا جیسے ابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا ہو۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جب وہ بے بس ہو جاتے کچھ نہ کہہ پاتے تھے تو اسے روتے دیکھ کر یوں ہی خاموشی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے تھے۔

”ابا......“ اس کی سسکی سی نکل گئی اور اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر پیچھے دیکھا اور پھر دائیں بائیں لیکن ابا بھلا کہاں تھے۔ بہاول پور کے ایک قبرستان میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ جب وہ گھٹنوں پر سر رکھے رو رہی تھی تو شاید اس کے دل کی گہرائیوں میں اندر کہیں یہ خواہش سر اٹھاتی تھی کہ کاش ابا کہیں سے آ جائیں اس کے سر پر ہاتھ رکھیں اور اسے گلے سے لگا کر اس کے آنسو پونچھیں۔ کبھی، کبھی آدمی کا تخیل اتنا پاورفل ہو جاتا ہے کہ حقیقت کا گماں لگتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ کبھی ابا کو دیکھ نہیں پائے گی پھر بھی وہ سوچتی تھی کہ ابا اچانک کہیں سے آ جائیں اور وہ ان کے مہربان سائے تلے ہر دکھ و غم سے خود کو آزاد کر لے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اچانک ہی لڑکے، لڑکیوں کے ہنسنے اور بولنے کی آوازوں سے چونک کر بائیں طرف دیکھا۔ یہ آوازیں دیوار کی دوسری طرف سے آ رہی تھیں۔ اس نے دھیان سے سنا

تو ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ آئس کریم کھانے جارہے تھے۔خوش اور مطمئن، ہنستے مسکراتے لوگ......اسے ان پر رشک آیا پھر ساتھ گھر کا گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔گاڑی اسٹارٹ ہونے اور پھر گیٹ بند ہونے کی آواز......

اس پوش کالونی اور اس کے پرانے محلے میں زندگی کتنی مختلف تھی۔اگر جو اس کا پرانا محلہ ہوتا تو وہ کسی کے بھی گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر چلی جاتی بغیر کسی خوف وخطر کے، پرانے محلوں میں کتنی اپنائیت اور زندگی محسوس ہوتی ہے اور ان پوش علاقوں میں کیسی ویرانی اور اجنبیت ہے۔وہ یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں سوچ رہی تھی کہ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار سے بلی کودی اور بلیک ہنڈا سٹی کے پاس سے گزرتی ہوئی گیٹ کی طرف چلی گئی۔اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بہ مشکل اپنی چیخ کو روکا تھا۔

"یا اللہ یہ رات اتنی لمبی کیوں ہوگئی ہے۔" اس کی نظریں بلی پر تھیں جواب برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔

تب ہی لکڑی کا بھاری منقش دروازہ ایک چر چراہٹ کے ساتھ کھلا اور ساتھ ہی ایک بھاری مردانہ آواز......

"اللہ حافظ اماں جی...... اور ہاں میری بات ہوگئی ہے صابر حسین سے وہ فیصل آباد سے چل پڑا تھا۔ زیادہ سے زیادہ گھنٹے تک پہنچ جائے گا۔ میں پہلے ہی لیٹ ہوگیا ہوں ورنہ اس کے آنے تک رک جاتا۔"

خاتون کی بات وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔البتہ مرد کی آواز پھر آئی تھی۔

"نہیں، نہیں اماں جی...... آپ کو آنے کی ضرورت نہیں...... میں گیٹ بند کرکے چابی آپ کو دے جاتا ہوں۔"

"یا اللہ اس بندے کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔" وہ دیوار سے چپک گئی تھی اور کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرکے سر گھٹنوں پر رکھ دیا تھا۔اور دل ہی دل میں آیت الکرسی پڑھنے لگی تھی اور پھر اس کی سماعت نے اس کے قدموں کی چاپ وصول کی تھی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

"یا اللہ، یا اللہ!" اس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔وہ پیچھے دیکھے بغیر گیٹ کی طرف بڑھا تھا۔اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر دیکھا۔وہ مین گیٹ کا تالا کھول رہا تھا۔پھر اس نے گیٹ پورا کھول دیا۔پھر وہ اپنی مہران میں بیٹھ کر اسے گیٹ سے باہر نکال کر لے گیا اور پھر مہران باہر چھوڑ کر واپس آیا۔اب اس کے سامنے صرف وہ بلیک ہنڈا سٹی تھی اور ذرا جو وہ نظر اٹھا کر غور سے پورچ کی طرف دیکھتا تو وہ اسے دیوار سے چپکی بیٹھی نظر آجاتی۔ اس نے مارے خوف کے پھر آنکھیں بند کرلی تھیں۔

"یا اللہ لائٹ چلی جائے۔" یوں تو ہر وقت لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے لیکن اس وقت اس کی دعا کے باوجود لائٹ نہیں گئی تھی......اور قدموں کی چاپ جیسے قریب سے آئی تھی اور پھر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے کی آواز......وہ مین گیٹ کو تالا لگا کر واپس آرہا تھا۔یقیناً وہ ذیلی گیٹ سے باہر جاتا جو خود بخود لاک ہوجاتا۔

"یہ لیں اماں جی گیٹ کی چابیاں اور اب آپ آرام کریں......فون اپنے پاس ہی رکھیے گا۔ صابر حسین کے پاس پچھلے گیٹ کی چابی ہے، وہ اُدھر سے ہی آکر اپنے کوارٹر میں چلا جائے گا۔کوئی بھی پرابلم ہو تو اسے کال کرلیجیے گا۔" لکڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز اور پھر اس کے سیڑھیوں سے اترنے کی آہٹ اور اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ چھوٹے گیٹ کے پاس کھڑا اسے کھولنے کی کوشش کررہا تھا اور ساتھ ہی اس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

"اوہ......نو......میں تو اسے تھوڑا سا کھلا چھوڑ کر گیا تھا۔پتا نہیں کیسے بند ہوگیا۔کتنی بار صابر حسین سے کہا ہے کہ اس کا لاک خراب ہوگیا ہے۔ٹھیک کروالے لیکن یہ صابر حسین بھی جب تک دس بار کوئی بات نہ دہراؤ اسے یاد نہیں رہتا۔"

وہ پھر مڑا تھا۔ برآمدے کی لائٹ اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔اچھا خاصا وجیہہ مرد تھا۔سلکی بال

پیشانی پر بکھرے تھے اور وہ جھنجلایا ہوا سا واپس آرہا تھا۔نیلی جینز پر نیلی باریک دھاریوں والی سفید شرٹ وہ بہت دھیان سے اسے دیکھ رہی تھی جب چھت پر سے ایک چھپکلی پٹ سے اس کے پاؤں پر آکر گری تو بے اختیار اس کی چیخ نکل گئی اور برآمدے کی طرف بڑھتا وہ شخص ایک دم چونک کر رکا تھا۔اور پھر اس کی نظروں نے اسے کھوج لیا تھا۔

"کون......کون ہو تم اور یہاں کیا کررہی ہو؟"

وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا کسی ڈاکوؤں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہو؟"

"نہیں، نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں ایمن ہوں ایمن مرتضٰی۔"

"میں آپ کا نام نہیں پوچھ رہا محترمہ......آپ کی یہاں موجودگی کا مقصد جاننا چاہتا ہوں۔"

اب وہ گاڑی پر ہاتھ رکھے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"وہ میں......بس میں ایک رات......بس یہ رات یہاں گزارنا چاہ رہی تھی۔ صبح ہوتے ہی میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔" کالج اور یونیورسٹی کی بہترین ڈیبیٹر اس وقت ہکلا رہی تھی۔وہ ایمن مرتضٰی جو سب کو لاجواب کردیتی تھی اور بقول اس کی یونیورسٹی فیلوز کے سب کے چھکے چھڑا دیتی تھی۔بے بسی سے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی اور وہ تمسخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بہت خوب......ایک رات یہاں گزارنی ہے، کس کی اجازت سے...... محترمہ سیدھی طرح سے بتائیں یہاں کس سے چھپ کر بیٹھی ہیں، پولیس پیچھے لگی ہوئی تھی یا ساتھیوں کا انتظار کررہی ہیں، لوٹنے کے لیے اور اندر کیسے آئیں۔"

اب کے لہجے میں پہلے سے زیادہ سختی تھی۔

"نہیں، نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو آپ سوچ رہے ہیں، میں تو اِدھر انکل خلیل کے گھر آئی تھی......خلیل بیگ ایڈووکیٹ......یہ اِدھر 21 نمبر میں۔" اس نے تھوک نگلا۔اور تیز، تیز بولنے لگی۔اسے لگا تھا کہ اگر وہ ذرا سا رکی تو پھر ہکلانے لگے گی۔

"انکل اور آنٹی گھر پر نہیں ہیں اور وہ رکشے والا، میں اس سے ڈر گئی تھی اور یہ......وہ چھوٹا گیٹ کھلا تھا تو میں اندر آگئی۔" ساری بات بتا کر اس نے نظریں اٹھائیں، وہ اب بھی مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تو آپ نے یہ کہانی ابھی، ابھی گھڑی ہے۔21 نمبر کی نیم پلیٹ پر سے خلیل بیگ کا نام پڑھ لیا ہوگا۔"

"نہیں، نہیں میں بہاول پور سے آئی ہوں، وہ دیکھیں میرا بیگ......"

اس نے ذرا سا رخ موڑ کر دیکھا چھوٹے گیٹ کے ساتھ دیوار سے لگا بیگ قدرے اندھیرے میں تھا۔شاید اس لیے کہ اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔

"پتا نہیں کس سے لوٹ کر مال بھر کر اِدھر لے آئی ہیں۔"

اس نے بیگ سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کو شکل سے چور ڈاکو لگتی ہوں؟" اس کی فطری خود اعتمادی یک دم ہی بیدار ہوئی تھی۔

"بندے کی شکل پر یہ نہیں لکھا ہوتا محترمہ کہ وہ چور ہے یا نہیں۔" اب کے اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ لیں چابی......" اس نے شولڈر بیگ کی زپ کھول کر اندر سے چابی برآمد کی۔

"چیک کرلیں میرا بیگ؛ اس میں میرے ذاتی استعمال کے کپڑے اور کتابیں ہیں، صرف یہ ایک رات میں یہاں برآمدے میں بیٹھ کر گزارنا چاہتی تھی، اس سے آپ کو کیا نقصان ہونا تھا۔لیکن نہیں تو واپس چلی جاتی ہوں، مین روڈ سے کوئی نہ کوئی رکشا تو مل ہی جائے گا......اور وہاں سے جب بھی بہاول پور کی گاڑی ملی تو......"

"اس وقت یہاں سے کوئی رکشا نہیں ملے گا اور شاید بہاول پور کے لیے گاڑی بھی اب صبح ہی ملے گی۔" اب کے اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

آئے تھے خلیل بھائی سے ملنے۔ میں اس وقت فاطمہ بھابی کی مزاج پرسی کے لیے اُدھر ہی گئی ہوئی تھی۔"
"ہارٹ اٹیک......" باوجود کوشش کے آنسو آنکھوں سے پھسل، پھسل کر گرنے لگے۔
"مجھے تو بس ہفتہ بھر پہلے ہی پتا چلا مرتضٰی بھائی کا، میں فاطمہ بھابی سے ملنے گئی تھی تو انہوں نے بتایا تھا۔ کب ہوا ان کا انتقال؟"
"پچیس دن ہوگئے ہیں۔"
اور پچیس دن پہلے ابا زندہ تھے۔ اس رات وہ کتنی ہی دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے تھے۔ تب...... تب اسے کیا خبر تھی کہ یہ آخری بار ہے جب وہ ان کی آواز سن رہی ہے اور پھر وہ یہ آواز، یہ مہربان آواز کبھی نہیں سن سکے گی۔ یہ شفیق چہرہ ہمیشہ کے لیے اس کی نظروں سے اوجھل ہوجائے گا۔ ڈاکٹر نے کتنی تسلی دی تھی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں، انجائنا کا معمولی اٹیک ہے اور اسپتال سے گھر آنے کے صرف دو ماہ دس دن بعد......وہ۔
"پچیس دن ہوئے تمہارے ابا کی وفات کو اور تم یہاں؟" وہ حیرت سے پوچھ رہی تھیں۔
اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔
"وہ......ابا...... ابا نے کہا تھا کہ اگر کبھی مشکل میں پڑ جاؤ تو خلیل کے پاس چلی جانا۔"
"تو کیا مشکل آن پڑی تم پر بچی......" وہ اب اسے ہمدردی سے دیکھ رہی تھیں۔
"وہ بس ایسے ہی ابا کے بعد دل بہت گھبرایا تو میں...... اور وہ خلیل انکل نے بھی ابا کی وفات کے بعد فون کیا تھا اور کہا تھا کہ ان کے پاس چلی آؤں تو......!" اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ اس پر کیا افتاد آپڑی تھی۔
"لیکن بیٹا اس طرح بغیر اطلاع دیے تمہیں اچانک یوں اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔"
"جی بس غلطی ہوگئی۔"
"ہاں بچے، غلطی تو بڑی ہوگئی تم سے، خلیل بھائی اور بھابی تو امریکا چلے گئے ہیں چار دن پہلے دراصل ان کی چھوٹی بیٹی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی. شادی کے آٹھ سال بعد ماں بننے والی ہے۔ واش روم میں پاؤں پھسل گیا تھا۔ خیر سے بچت ہوگئی لیکن ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ بتایا ہے تو خلیل بھائی اور بھابی فوراً چلے گئے۔ ویسے خلیل بھائی تو شاید اگلے ماہ آجائیں گے البتہ بھابی تو اب بچے کی پیدائش تک وہاں ہی رہیں گی۔"
یک دم اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور دل ڈوب سا گیا۔ اب وہ کہاں جائے گی۔ ایک بڑا سا سوالیہ نشان اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔
"کیا تھا اگر انکل آنٹی وہاں نہ جاتے آخر [illegible] آپی بھی تو وہاں ہی تھیں۔ وہ رہ جاتیں ثنا باجی کے پاس۔" اس نے انتہائی بے بسی سے سوچا اور اپنی سوچ کو زبان بھی دے دی۔
"شادی شدہ بیٹیاں تو پرائی ہوجاتی ہیں اور وہ کسی دوسری اسٹیٹ میں رہتی ہے۔ اپنا گھر، شوہر، بچے چھوڑ کر وہ کب تک وہاں رہ سکتی ہے۔ پھر بھی خلیل بھائی اور بھابی کے پہنچنے تک وہی رہی اس کے پاس......تم بتاؤ اب کیا کروگی۔" انہیں اس سے ہمدردی ہورہی تھی۔
"میں صبح واپس بہاول پور چلی جاؤں گی۔"
وہ آنسو پینے کی کوشش کررہی تھی۔
لیکن بہاول پور میں کہاں جائے گی کس کے پاس......دل میں جیسے کسی نے بھالا اتار دیا تھا۔ اس کی سب سے گہری دوست فلزا نے بھی صاف انکار کردیا تھا کہ وہ اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی۔ اس کے سسرال والے اور شوہر بہت عجیب وغریب مزاج کے ہیں، حالانکہ وہ الگ گھر میں رہتی تھی اور شوہر ملک سے باہر، کل تک وہ اسے اپنی سب سے گہری دوست سمجھتی تھی۔ یہ وہی فلزا تھی جس کی ہر مشکل میں وہ اس کے ساتھ کھڑی ہوتی تھی اور کئی بار اس نے اس کی مالی امداد بھی کی تھی اور ایک بار جب اس کے باپ نے گھر گروی رکھ کر کاروبار کے لیے رقم ادھار لی تھی تو گھر

[چھڑ]وانے کے لیے اس نے اماں کے کنگن فروخت کر کے اسے رقم ادھار دی تھی۔ اور ابا تب کتنے ناراض ہوئے تھے اس سے......اور وہی فلزا اب اسے چند دن اپنے گھر میں رکھنے کی روادار نہیں تھی...... پتا نہیں یہ دوست اور دوستی کیا ہوتی ہے محض لفاظی اور اس رشتے سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ ہاں ساجدہ آپا......وہ ان کے گھر میں کچھ دن رہ سکتی تھی۔ بھلے گھر چھوٹا تھا لیکن دل بڑا تھا ان کا۔
اسفند پھر دیوار سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بہت غور سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔
"تمہارا ایک بڑا بھائی بھی تو ہے ناں خلیل بھائی کی پہلی بیوی سے۔"
"جی......" اس نے یوں تھوک نگلا جیسے کوئی کڑوا گھونٹ حلق سے نیچے اتارتا ہے۔
"کہاں ہوتا ہے، وہ......کیا بہاول پور میں ہی؟"
کاش، کاش وہ اس سے اس وقت کوئی اور سوال نہ کریں، اس نے لرز کر سوچا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔
"جی......وہاں ہی ابا والے گھر میں......"
"ہائے وہاں ہی تھا پھر کیوں جوان بہن کو تن تنہا بھیج دیا۔ راستے میں سو اونچ نیچ ہوسکتی تھی۔ خود کیوں ساتھ نہیں آیا تمہارے۔"
وہ حیران ہوئی تھیں اور آنسو جیسے پھر بغاوت پر اتر آئے تھے اور وہ انہیں پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں نڈھال ہوئی جاتی تھی۔ اسفند نے ایک تاسف بھری نظر اس پر ڈالی۔ وہ انہیں منع نہیں کرسکتا تھا کہ خواہ مخواہ اس سے سوال نہ کریں۔ ایک رات کی تو بات ہے اور جب یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ خلیل انکل کے کسی دوست کی صاحبزادی ہے تو ایک مزید نظر اس پر ڈال کر وہ کچن میں چلا گیا۔
"پر اسے کہاں خیال ہوگا تمہارا......اس کا تو سارا ننھیال ہی خودغرض اور بے حس لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ فاطمہ بھابی نے بتایا تھا مرتضٰی بھائی کی پہلی بیوی بہت مزاج والی تھیں۔ مرتضٰی بھائی جیسے شریف آدمی نے اتنے سال گزارہ کرلیا کوئی اور ہوتا تو چار دن بھی نہ رکھتا، خیر اللہ اگلے جہان میں اللہ سکھ دے۔" وہ تبصرہ کررہی تھیں۔ اور ابا کو تو سب پتا تھا عاطف بھائی کا بھی اور ان کے ماموں، ممانی کا بھی تب ہی تو بار، بار کہتے تھے کہ اگر کوئی مشکل آپڑے تو خلیل کے پاس چلی جانا لیکن انہوں نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ اگر خلیل انکل بھی نہ ہوئے تو وہ کہاں جائے گی۔ کس کے پاس؟
"مجھے عاطف پر ذرا اعتبار نہیں ہے ایمن وہ ماموں، ممانی کے ہاتھوں میں کھیلتا ہے۔"
وہ دونوں ہاتھ گود میں دھرے اپنے ہاتھوں پر نگاہیں جمائے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کچل رہی تھی جب اسفند نے کچن سے باہر آکر پہلے تو اس کے سامنے صوفے کے دائیں طرف پڑی کافی ٹیبل رکھی اور پھر کچن سے ٹرے لا کر اس پر رکھی جس میں چائے کا ایک کپ اور جار میں بسکٹ تھے۔ بھاپ اڑاتی چائے کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو اس نے...... بے اختیار اسفند کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھا۔ اس وقت اسے چائے کی سخت ضرورت تھی۔ صبح صرف چند گھونٹ ہی لیے تھے۔ حالانکہ ساجدہ آپا نے کتنا اصرار کیا تھا کہ وہ تھوڑا بہت ناشتا کرلے کہ سفر لمبا ہے لیکن تب تو ایک گھونٹ پانی بھی حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔
"راستے میں کچھ کھالوں گی۔" اس نے انہیں تسلی دی تھی لیکن راستے میں اس سے کچھ بھی کھایا نہیں گیا تھا۔ بے اختیار اس نے کپ اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔ اسفند کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوکر معدوم ہوگئی۔
"تھینکس......" اپنی بے اختیاری پر نادم سا ہوکر اس نے اسفند کی طرف دیکھ کر کہا۔
اسفند نے سرہلا کر اپنی کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔
"مجھے تو باتوں میں خیال ہی نہیں رہا۔ بچی بھوکی بھی ہوگی......لمبا سفر تھا جانے کچھ راستے میں کھایا بھی یا نہیں۔" انہوں نے اسفند کی طرف دیکھا تو پتا نہیں

کیوں وہ جھلا گیا۔
”تو کیا اب کھانا بھی گرم کر کے لاؤں۔“
”میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا اسفند، تمہیں دیر ہوجائے گی جاؤ اب۔“ انہوں نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔
”دیر ہوجائے گی نہیں ہوچکی ہے۔“
وہ پاکٹ سے اپنا فون نکال کر چیک کر رہا تھا۔
”تم چائے پیو بیٹا، میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔ میں تو کھانا عشا سے پہلے ہی کھا لیتی ہوں، اسفند کو آج دوست کی طرف جانا تھا اس کے گھر میں مہندی کا فنکشن تھا۔ دوستوں نے مل جل کر ہلا گلا کرنا تھا۔ مہندی کا مشترکہ فنکشن تو کل ہوگا۔“ تھوڑی سی تفصیل بتا کر وہ کھڑی ہوئیں تو ایمن نے بے اختیار منع کیا۔
”نہیں، نہیں آنٹی مجھے بالکل بھی بھوک نہیں ہے، بس چائے کی طلب تھی...... اس کے لیے بہت شکریہ......“
اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسفند کی طرف دیکھا۔
”آپ اس ایک کپ چائے کے لیے کتنی بار شکریہ ادا کریں گی۔“ وہ مدھم سا مسکرایا۔ اور اپنی والدہ کی طرف دیکھا جو ایمن کے منع کرنے کے باوجود کچن کی طرف جارہی تھیں۔
”اماں جی میں کردیتا ہوں گرم آپ بیٹھیں۔“
لیکن وہ کچن میں جاچکی تھیں۔ وہ بھی ایمن پر ایک نظر ڈالتا ہوا ان کے پیچھے ہی چلا گیا۔ اور ناراضی سے ان کے ہاتھ سے ڈونگا پکڑ کر مائیکرو ویو میں رکھا۔
”کہا تو تھا کہ کردیتا ہوں گرم اس بن بلائی مہمان کے لیے۔“
”ایسا نہیں کہتے اسفی مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔“ انہوں نے ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھایا۔
”روٹیاں تو تین چار رکھی ہوئی ہیں، میں نے زیادہ ہی منگوالی تھیں کہ شاید صابر حسین نے بھی کھانی ہوں۔“
”صابر حسین تو سسرال سے کھانا کھا کر چلا تھا۔ اس لیے تو دیر کردی۔“ وہ ٹرالی میں پلیٹ رکھ رہا تھا اور وہ بے حد شفقت و محبت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔
”مجھے لگتا ہے اسفی اس بچی کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ بھائی اس کا سوتیلا ہے، مرتضیٰ بھائی کے بعد یقیناً بھائی بھابی نے اچھا سلوک نہیں کیا ہوگا تب ہی تو یوں......“
”زیادہ ہمدردی جتانے کی ضرورت نہیں ہے اماں جی صبح چلتا کریں۔“
اس نے ان کے ہاتھ سے ہاٹ پاٹ لے کر ٹرالی میں رکھا۔ اور ٹرالی دھکیلتا ہوا باہر لاؤنج میں آیا تو اسے آتے دیکھ کر اس نے فوراً ہاتھوں کی پشت سے رخسار پونچھے۔
”میں نے کہا تھا مجھے بھوک نہیں ہے، آپ نے خوامخواہ زحمت کی......“
”چلیں اب زحمت تو کرلی ہے اب کھالیں کچھ یہ نہ ہو کہ رات کو اٹھ کر کچن میں کھانا تلاش کرتی پھریں۔“ وہ شرمندہ سی ہوگئی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ بھوک سے پیٹ میں بل سے پڑ رہے تھے اور خالی چائے نے تو جیسے معدے میں آگ لگادی تھی، دو دنوں سے اس کے اندر سوائے پانی اور چائے کے کچھ نہیں گیا تھا یا وہ رسک جو ساجدہ آپا نے زبردستی کھلایا تھا۔
”اب میں چلتا ہوں اماں جی، شیزی تو اب باقاعدہ گالیوں پر اتر آیا ہے۔“
اس نے ہاتھ میں پکڑے فون پر نظر ڈالی اور مسکرایا فون تو سائلنٹ پر تھا اور شیزی کے میسج پر میسج آرہے تھے اور مسڈ کالز تو نہ جانے کتنی تھیں۔
تب ہی اسکرین پر صابر حسین کا نام چمکا تو اس نے یس کا بٹن دبایا۔
”آگئے ہو صابر حسین، ٹھیک ہے مجھے اب اطمینان رہے گا۔ ہاں، ہاں میں ابھی جا نہیں سکا۔ تم گیٹ پر ہی رکو...... بند کر کے اپنے کوارٹر میں جانا، میں آرہا ہوں بس......“
”اوکے اماں جی، صابر حسین آگیا ہے، اب مجھے اطمینان رہے گا۔ پھر بھی آپ محتاط رہیے گا۔ اور یہ بیگ اسے بھی چیک کرلیجیے گا کیا خبر اسلحہ یا کوئی بم وغیرہ چھپا رکھا ہو۔“ اب کے اس کی آنکھوں میں شرارت تھی لیکن ایمن نہیں دیکھ سکی تھی سو جھنجلا گئی۔
”آپ خود کیوں نہیں اپنی تسلی کرلیتے بیگ کھول کر دیکھ لیں۔ پولیس کو کال کرلیں اور باہر دو تین گارڈ

ین کر دیں۔“ اسفند نے رخ موڑ کر بے اختیار اٹھ نے والی مسکراہٹ کو چھپایا تھا۔
”اسفند بچی کو تنگ مت کرو۔“ خاتون نے ...ہ کی۔
”اچھی طرح جانتی ہوں میں مرتضیٰ بھائی کو اللہ نے کیا افتاد پڑی اس پر کہ گھر چھوڑ آئی۔“
ایمن نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا ...۔ اسفند نے اس کے جھکے سر کو دیکھا اور پھر ہولے ... کھنکھارا۔
”سوری اگر آپ کو برا لگا ہو تو لیکن احتیاط کرنا تو ...زاحق ہے۔“
”سوری تو مجھے کرنا چاہیے۔“ وہ شرمندہ ہوگئی۔ ...ھے اس طرح کہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ آپ جس ...ح چاہیں اپنی تسلی کرلیں۔“
”اسفند تمہیں دیر ہورہی ہے۔“
ماں کی بات پر وہ کچھ کہتے، کہتے رک گیا۔ اور ...ی سے داخلی دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے ... ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مڑ کر انہیں ...ھا اور معمول کی ہدایات دہرائیں۔
”فون اپنے پاس رکھیے گا کوئی پرابلم ہو تو صابر ...ین کو کال کرلیجیے گا۔ میں اب صبح ہی آؤں گا۔“ وہ ...وازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
”بیٹی تم بے فکر ہو کر اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ اور ...فند کی باتوں کا خیال نہ کرنا اس کی تو عادت ہے ...ول بولنے کی...... مجھے اپنی پھپو کی جگہ سمجھو...... میں ...ر احسان ہوں، مرتضیٰ بھائی نے یقیناً تم سے میرا ذکر ...ہوگا۔ وہ جب بھی خلیل بھائی کی طرف آتے تو ...ان صاحب کی زندگی میں ان سے ملنے ضرور گھر ...تے تھے۔ بعد میں بھی خلیل بھائی کے گھر اُن سے ...ات ہوتی رہتی تھی۔“
”جی ابا نے کئی بار آپ کا ذکر کیا تھا۔ اور آپ کی ...نگ کی بے حد تعریف کرتے تھے۔“ ایمن کو بھی یاد ...تھا۔
”اب تو کچن میں کم ہی جاتی ہوں لیکن ہماری شمو کے ہاتھ میں بھی بہت ذائقہ ہے، مجھ سے ہی سب سیکھا ہے اس نے...... صبح سویرے آجاتی ہے اور رات آٹھ بجے سے پہلے چلی جاتی ہے۔ اسفند رات کو کسی بھی ملازم کو گھر رکھنے کے خلاف ہے کہ بعض اوقات اسے دوسرے شہر جانا پڑتا ہے تو کہتا ہے کہ آپ اکیلی ہوتی ہیں گلا گھونٹ کر لوٹ مار کر کے چلی جائے تو...... بس میرے معاملے میں بہت وہمی ہے...... آس پاس ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ برسوں پرانے ملازم دھوکا دے گئے۔ بس صابر حسین پر اعتبار کرتا ہے صرف...... پہلے

پاکیزہ کے نئے سال پر دعا

میرے خدایا ثواب رکھنا
تمام کھلتے گلاب رکھنا
تمام روشن چراغ رکھنا
یہ دن جو آئیں
سکون لائیں
محبتوں کی بہار آئے
مسرتوں سے جہان مہکے
تمام چہرے گلاب بن کر
زمیں کے سب ماہتاب بن کر
خوشی کے سارے ہی خواب رکھنا
مسرتوں کے گلاب رکھنا

میرے خدایا اے میرے مالک
تجھی سے چاہوں تجھی سے مانگوں
میری دعائیں قبول کرنا
خوشی کی ہر سو بہار آئے
زباں پہ شکر ہزار آئے
نئے دنوں میں، نئی رتوں میں
عداوتوں کے دیے بجھا کر
کدورتوں کو بھی مٹا کر
خوشی زمیں پر شتاب رکھنا
مسرتوں کے گلاب رکھنا

کلام: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

نذر حسین اس کا باپ ہمارا ڈرائیور تھا اس کے بعد یہ صابر حسین ہے، خاندانی لوگ ہیں، سارا سودا سلف بھی یہی لاتا ہے۔“

وہ چھوٹے، چھوٹے لقمے لیتی ہوئی خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”اسفند کا دوست ہے شیراز اس کی شادی ہے، کل بارات ہے، آج دوستوں نے رتجگے کا پروگرام بنایا تھا، نہ جاتا تو شیزی ناراض ہوجاتا ورنہ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ مجھے اکیلا نہ چھوڑے۔“

اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں اسفند کے لیے محبت تھی۔ مان تھا، فخر تھا، ممتا کا غرور ان کی آنکھوں میں چمکتا تھا۔ کاش ابا کو بھی عاطف پر ایسا ہی مان ہوتا، اتنا ہی یقین...... لیکن عاطف نے تو ہمیشہ ہی ابا کو تکلیف دی۔ ان کا مان توڑا۔ وہ جب اسپتال میں تھے تو کتنی پُر امید نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے تھے اور وہ جیسے ان کے دل کا حال جان کر انہیں تسلی دیتی۔

”عاطف بھائی آتے ہی ہوں گے، میں نے بھابی سے کہا تھا کہ جیسے ہی عاطف بھائی گھر آئیں، وہ انہیں آپ کی طبیعت کا بتا دیں۔“

لیکن اس کا یقین ہی نہیں ابا کا مان بھی ٹوٹ گیا تھا۔ وہ چار دن اسپتال میں رہے تھے اور عاطف نہیں آیا تھا۔ فون تک پر ان کا حال نہیں پوچھا تھا اور اسپتال سے آنے کے بعد سے ہی انہیں اس کی زیادہ فکر ستانے لگی تھی۔

”مجھے عاطف پر اعتبار نہیں ہے ایمن...... میں نے عارب کو فون کیا ہے اس نے وعدہ کیا ہے کہ یہ اس کا آخری سمسٹر ہے جیسے ہی ختم ہوگا وہ آجائے گا۔“

”اس کی پڑھائی اور جاب بہت ٹف ہے ابا...... اسے پریشان نہ کریں...... پھپو کی وجہ سے وہ ویسے بھی بہت پریشان رہتا ہے۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا ابا...... آپ ہیں ناں تو پھر مجھے کیا ڈر......“ اور وہ اپنی ہی کہتے جاتے تھے۔

”اور اگر اس کے آنے سے پہلے ہی مجھے کچھ ہو گیا تو...... ایمن مجھے کسی روز بینک لے چلو، میں لاکر تمہارے نام کر دوں...... اس میں تمہاری اماں کا زیور ہے اور عاطف کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کی ماں کا سارا زیور میں نے اس کی شادی پر اسے دے دیا تھا۔ میرے بعد وہ ہر شے پر قبضہ کر لے گا۔ وہ تمہیں کچھ نہیں دے گا۔“

اور وہ ابا کی باتیں سن کر بس روتی رہتی تھی۔ انہیں بینک لے کر نہیں گئی تھی۔ ابا نے ان کے دیے ہوئے دس، دس لاکھ کے دونوں چیک بھی اس نے اکاؤنٹ میں جمع نہیں کروائے تھے۔ وہ ابا کے جانے کا سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ابا ہیں ناں وہ رہیں گے اس کے ساتھ۔ پھر بھلا وہ کیوں...... ضرورت پڑے گی ابا سے لے، لے گی۔ پہلے بھی تو تھی ناں...... اس کے نام کا اکاؤنٹ بھی ابا نے زبردستی کھلوایا تھا اور اس میں کچھ نہ کچھ ہر ماہ جمع کرواتے رہتے تھے لیکن اس نے کبھی کوئی رقم نہیں نکلوائی تھی۔ ابا تھے ناں اس کی ہر ضرورت پوری کرنے کو......

اس نے کھانا ختم کر کے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے۔

”صبح تمہاری بات کروا دوں گی خلیل بھائی اور بھابی سے...... اسفند کے پاس نمبر ہے۔“ انہوں نے اس کے چہرے پر پھیلتے کرب کو محسوس کر کے تسلی دی۔ ”اور یہ تو بہت اچھا ہوگا وہ خلیل انکل کو سب بتا دے گی۔ تو وہی اس کا کوئی حل بتا سکیں گے۔ ان کے آنے تک وہ شاید اس کے ٹھہرنے کا کوئی بندوبست کر دیں گے۔

”میرا خیال ہے اب تم آرام کرو، سو جاؤ، یہ سامنے اسفند کا کمرا ہے، اسفند تو صبح ہی آئے گا اِدھر ہی سو جاؤ۔“

”نہیں، نہیں۔“ وہ گھبرا سی گئی۔

”میں اِدھر آپ کے کمرے میں ہی نیچے کارپٹ پر سو جاؤں گی۔“

”میں تو تمہارے ڈسٹرب ہونے کے خیال سے کہہ رہی تھی، میں تو رات کو کئی بار اٹھتی ہوں، کبھی کھانسی آتی ہے تو رکتی ہی نہیں۔“

”نہیں، میں ڈسٹرب نہیں ہوتی۔“

”چلو ٹھیک ہے آجاؤ۔“

انہوں نے ٹرالی کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔

”میں لے جاتی ہوں، مجھے بتائیں کہاں رکھنا ہے۔“

”سالن والا باؤل فریج میں رکھ دینا اور ہاٹ پاٹ کاؤنٹر پر ہی رکھ دینا۔“

وہ کچن کی طرف گئی تو انہوں نے دروازہ چیک کیا اور لاک سے چابیاں نکالیں۔

”میرا بیڈ روم اوپر ہے۔“ انہوں نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ جو لاؤنج سے ہی اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔

”ہمارا روم فرسٹ فلور پر اور لڑکوں کے گراؤنڈ فلور پر ہیں۔“

سارے دروازے چیک کر کے وہ اسے اپنے آنے کا اشارہ کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔ وہ خاموشی سے ان کے پیچھے چلنے لگی تھی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر لاؤنج تھا۔ اور لاؤنج سے گزر کر ان کا بیڈ روم تھا۔ سادہ سا بیڈ روم لائٹ گرین کلر اسکیم...... دو سنگل بیڈ دونوں دیواروں کے ساتھ، ایک طرف اسٹڈی ٹیبل اور ڈریسنگ ٹیبل تھی۔

”کچھ عرصہ پہلے ہی اسفند نے نئے سرے سے سیٹ کیا ہے۔ بہت وہمی ہے، جب بھی میری ذرا طبیعت خراب ہو تو وہ میرے کمرے میں ہی سوتا ہے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں لیکن وہ ابھی تک کھڑی تھی۔

”وہ مجھے نماز پڑھنی ہے۔“ اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں...... یہ تمہارے دائیں طرف واش روم ہے، اور جانماز وارڈ روب کے نچلے خانے میں ہے اور واش روم سلیپر، واش روم کے باہر ہی رکھے ہیں۔“

وہ بیڈ پر لیٹ گئی تھیں اور اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

”میں بہت سویرے اٹھتی ہوں اس لیے جلدی سونے کی عادت ہے، تمہارے نماز پڑھنے تک اگر میں سو گئی تو سونے سے پہلے بڑی لائٹ آف کر دینا اور نائٹ بلب جلا دینا۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ اسے اللہ کا شکر بھی ادا کرنا تھا آج رات...... اس نے اس کے لیے چھت مہیا کر دی تھی۔ آئندہ بھی وہی کارساز ہوگا۔ یہ ابا کی دعائیں اور اللہ کا کرم تھا کہ ہر مشکل گھڑی میں وہ کچھ نہ کچھ سبب پیدا کر دیتا تھا۔ رکشے والے کا تصور کر کے اس نے ایک جھرجھری سی لی اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ وضو کر کے آئی تو مسز احسان سو چکی تھیں اور ان کے ہلکے، ہلکے خراٹے پورے کمرے میں گونج رہے تھے۔ ابا کہتے تھے یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ کبھی پوری رات جاگتے رہو تو نیند نہیں آئے اور کبھی تکیے پر سر رکھتے ہی بے خبر ہو جاؤ اور ابا کی باتیں بھی جنہیں اس نے کبھی دھیان سے نہیں سنا تھا کب، کب اور کیسے، کیسے یاد آئی تھیں۔ اسے کیا پتا تھا کہ صرف ابا کی باتیں رہ جائیں گی اور وہ خود نہیں رہیں گے۔ اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ نماز کے بعد جب وہ بیڈ پر لیٹی تو یوں تھکن سے نڈھال تھی جیسے صدیوں کا سفر کر کے آئی ہو۔ لیکن نیند آنکھوں سے دور تھی۔ دیوار کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں اور بند آنکھوں کے سامنے گزرے مناظر ایک، ایک کر کے آنے لگے تھے۔ ابا کو اکیلے اسپتال لے کر جانا، عاطف کا ان کی خبر تک نہیں لینا اور پھر عاطف کے متعلق ابا کے تحفظات......

”ایمن مجھے عاطف پر اعتبار نہیں ہے، اس کے ماموں، ممانی نے اس کے اندر زہر بھر دیا ہے۔“

وہ جو ہمیشہ عاطف کا دفاع کرتے تھے۔ اس کے اور اماں کے دل میں عاطف کے لیے محبت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اب اسے عاطف کے شر سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔

”تمہاری اماں کہتی تھیں کہ اسے اس کے ماموں اور ممانی سے زیادہ میل جول نہیں رکھنے دوں، وہ اس کے دل میں نفرت پیدا کر رہے ہیں لیکن میں سوچتا تھا

میں اس کے سگے رشتوں سے اسے کیسے دور کردوں لیکن میں غلط تھا، میں نہیں جانتا تھا کہ بعض اوقات سگے رشتوں میں بھی اتنا زیادہ زہر پایا جاتا ہے جو تن من سب نیلا کردیتا ہے۔ اسے اب اپنا سگا باپ بھی دشمن لگتا ہے، تمہاری اماں نے سگی اولاد کی طرح ہی چاہا اسے...... پانچویں میں پڑھتا تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہوا۔ شروع، شروع میں تو وہ بہت عزت کرتا تھا تمہاری اماں کی...... جب تم پیدا ہوئی تھیں تو بہت خوش ہوا تھا۔ ہر وقت گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ پھر جب سے اس نے اپنے ماموں کے گھر جانا شروع کیا، بدلتا چلا گیا۔ ماں سے بدتمیزی کرنے لگا، تمہیں بلاوجہ مارتا پیٹتا، مجھ سے سیدھے منہ بات نہ کرتا اور بائیس سال کی عمر میں ماموں زاد بہن سے نکاح کرلیا اور مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔ تمہاری اماں نے گلہ کیا تو صاف کہہ دیا کہ مجھے آپ پر اعتبار نہیں تھا کہ آپ لوگ میرا رشتہ ماموں کے گھر لے کر جائیں گے۔ اس لیے ماموں نے کہا پہلے زرین سے نکاح کرلو پھر بتانا...... اور اس کے باوجود تمہاری اماں نے اس کے لیے بہترین بری تیار کی۔ اور بہت دھوم دھام سے شادی کی سب رسمیں کیں......" اور عاطف کی شادی تو اسے بھی یاد تھی۔ تب وہ پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی اور اس کے دو سال بعد اماں فوت ہوگئی تھیں اور عاطف ان کے جنازے میں شریک ہونے کے بجائے ماموں کے گھر چلا گیا تھا اور ابا نے اسے سمجھا دیا تھا۔

"تمہارا اور عاطف کا خون کا رشتہ ہے ایمن اگر عاطف کو تمہاری اماں سے کوئی ناراضی تھی بھی تو وہ چلی گئیں، تم تو اس کی اکلوتی بہن ہو۔ اور وہ تمہارا اکلوتا بھائی......" اور وہ کتنے فخر سے اپنی سہیلیوں کو عاطف بھائی اور بھابی کے متعلق بتاتی تھی اور جب سنی پیدا ہوا تھا تو وہ کتنی خوش تھی لیکن بھابی، سنی کو اس سے دور ہی رکھتی تھیں اور عاطف اس نے تو کبھی بہن کے لیے اپنے دل میں کوئی گنجائش پیدا ہی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی اس سے غصے اور نفرت سے بات کرتا تھا اور جب اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا تو اس کے بعد کئی بار اس نے اسے ابا سے بھی بدتمیزی کر... دیکھا تھا۔ ان دنوں ابا اس کے رویے کی وجہ... پریشان رہنے لگے تھے۔ اور تب ہی پہلی... انہوں نے عاطف کے متعلق خدشات کا اظہار کیا... ان دنوں وہ پھپو کو بھی اکثر فون کرنے لگے تھے اور... تک ان سے بات کرتے تھے۔ ان کی اکلوتی پھپو... امریکا میں سیٹل تھیں۔ ان کے دو بیٹے تھے عارب ا... جاذب اٹھارہ سال پہلے جب وہ پانچ سال کی... پھپو اپنے سسر کے انتقال پر پاکستان آئی تھیں... اسے یاد نہیں تھا یوں بھی میکے میں وہ دو دن... تھیں۔ شادی کے فوراً بعد ہی وہ اپنے شوہر کے... امریکا چلی گئی تھیں جو بہت سخت مزاج تھے اور ا... پاکستان آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے بلکہ فون پر... بات نہیں کرنے دیتے تھے۔ یوں بھی کبھار ہی ابا... ان سے بات ہو پاتی تھی۔ وہ انہیں بہت یاد کر... تھے اور اکثر ایمن سے ان کی باتیں کرتے رہتے... لیکن ایک سال قبل ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا... تب سے ابا اور وہ مسلسل رابطے میں تھے۔ اس... کبھی، کبھی پھپو کی بات ہوجاتی تھی اور اب... سال بعد وہ پاکستان آرہی تھیں۔ اور ابا بہت خوش... پُرجوش تھے اور وہ ان کی خوشی میں خوش تھی۔ ابا نے ا... کے متعلق اتنا کچھ بتا رکھا تھا کہ جب وہ آئیں تو ا... بالکل اجنبی نہ لگیں۔ بالکل ابا کی طرح شفیق سی... سے دھیمے لہجے میں بات کرتی ہوئی...... پھپو کے آ... کے چند دن بعد ابا نے اس سے کہا۔

"ایمن میں نے اور تمہاری پھپو نے تمہاری ا... عارب کی شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ عارب اچھا لڑکا... ڈاکٹر ہے، اسپیشلائزیشن کررہا ہے۔ تمہاری پھپو... اپنے فون پر تمہیں عارب کی تصاویر دکھائی ہیں، تم... تک سوچ کر مجھے بتا دینا لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے... پہلے ایک لمحے کے لیے یہ سوچ لینا کہ میں اپنی ز... میں ہی تمہیں محفوظ ہاتھوں میں سونپ دینا چاہتا ہوں...

...ہر لمحہ اس خوف میں مبتلا رہتا ہوں کہ اگر مجھے کچھ ...یا تو عاطف تمہارے ساتھ برا سلوک کرے گا، میں ...سے کسی اچھائی کی توقع نہیں رکھتا۔"

اور کتنا سچ کہا تھا ابا نے...... آنسو پلکوں کی باڑ توڑ ...کیے میں جذب ہونے لگے۔

ابا کو تو جیسے پہلے ہی خبر ہوگئی تھی کہ اس کے ساتھ ...ہونے والا ہے اور وہ کتنی نادان تھی عاطف اور ...ن کے جھوٹے التفات کو سچ سمجھ بیٹھی تھی۔ ابا کے ...عاطف نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ گلے لگا کر ...دی تھی۔

"میں ہوں ناں تمہارا بھائی، تم کبھی خود کو اکیلا ...سمجھنا۔" اور عاطف کے ان دو جملوں نے ساری ...ورت ختم کردی تھی اور اس نے سوچا تھا۔ "ابا کو ...ہم ہوتا تھا۔ بھائی ہے میرا، بھلا میرے ساتھ برا ...کیوں کرے گا؟" آتے جاتے وہ اس کی ...ت پوچھتا، پاس بیٹھ کر کچھ دیر بات کرتا تو وہ نہال ...اتی۔ زرین بھی ان دونوں اس پر بڑی مہربان تھی ...پھر کیا ہوا تھا! ابا کے مرنے کے صرف بائیس دنوں ...وہ رات...... وہ بھیانک رات جیسے اس کی آنکھوں ...سامنے مجسم ہوگئی تھی۔ وہ رات جب سب کچھ ختم ...یا تھا اس کا یقین، مان، اعتماد سب مٹی میں مل گیا ...بس ابا کا ڈر سچ ہوگیا تھا۔ اس رات وہ گھر ...اکیلی تھی۔ عاطف اور زرین کسی دوست کے ہاں ...گئے ہوئے تھے۔ جانے سے پہلے زرین اس کے ...رے میں آئی تھی۔

"...ن، ہم عاطف کے دوست کے ہاں اس ...والدہ کی مزاج پرسی کے لیے جارہے ہیں، دروازہ ...سے لاک کرجائیں گے اور جلدی آجائیں گے، ...ں میرے کمرے میں سورہی ہیں، ڈرنے کی ...ورت نہیں۔"

اور ان کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے ...بیٹھ کر قرآن شریف پڑھنے لگی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر ...انہیں گئے ہوئے، شاید آدھا گھنٹا یا اس سے کچھ زیادہ جب اسے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی تھی پڑھتے، پڑھتے اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا اور دوازے پر اختر کو کھڑا دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ وہ قرآن تکیے پر رکھ کر یک دم کھڑی ہوگئی تھی۔ بھابی نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ ان کی اماں کے ساتھ ان کا بیٹا بھی گھر پر ہے۔ ورنہ وہ دروازہ لاک کرکے بیٹھتی۔ جب سے ابا کا انتقال ہوا تھا۔ عاطف کی ممانی، ماموں اور ان کا یہ نکما بیٹا ہر وقت اِدھر ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ ایک بار منشیات فروخت کرنے کے سلسلے میں جیل بھی جا چکا تھا۔ عاطف نے کئی بار ابا کو مجبور کیا تھا کہ وہ ایمن کا رشتہ اختر سے کردیں لیکن ظاہر ہے ابا نے صاف انکار کردیا تھا بلکہ عاطف کے اصرار پر اسے ڈانٹا بھی تھا۔

"آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں، نکلیں میرے کمرے سے باہر۔"

"تمہارے پاس آیا ہوں جانم...... اور کمرے سے نکلنے کے لیے نہیں، کمرے میں بیٹھنے کے لیے آیا ہوں۔" اس نے قدم اندر کمرے میں رکھا۔ سرخ آنکھیں ہونٹوں پر خباثت بھری مسکراہٹ، ایکسرے کرتی غلیظ نظریں۔

"اللہ قسم بہت زبردست شے ہو۔" آگے بڑھ کر اس نے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"اے زیادہ اکڑ مت دکھاؤ۔" اس نے کمرے سے باہر جانے کی کوشش کی تو وہ راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔

"ہٹیں میرے راستے سے...... میں مامی کو آواز دیتی ہوں۔"

"اچھا آواز دے کر دیکھ لو۔" وہ تمسخر سے ہنسا تھا اور ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا تھا۔

"چھوڑیں، چھوڑیں مجھے مامی، مامی......" اس نے پوری طاقت لگا کر اپنا ہاتھ چھڑایا تھا اور باہر کی طرف بھاگ کر اونچی آواز میں مامی کو پکارا تھا۔

"خواہ مخواہ حلق مت پھاڑو اور سیدھی طرح اندر چلو...... بڑا تمہارا باپ نخرے کررہا تھا کہ اختر میری بیٹی

کے قابل نہیں ہے، اب دیکھنا میں تمہیں کسی کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔ پھر خود ہی میرے قدموں پر گرو گی۔'' اس نے پیچھے سے آ کر اس کے بالوں سے پکڑ کر اسے کھینچا۔

''خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، تمہیں اللہ کا واسطہ......'' وہ رو رہی تھی اس کی منتیں کر رہی تھی۔ لیکن وہ اسے دھکیلتا ہوا پھر کمرے میں لے آیا تھا اور بیڈ پر دھکا دیا تھا۔

''دیکھتا ہوں آج مجھ سے تمہیں کون بچائے گا۔''

''اللہ......اللہ بچائے گا مجھے تم سے۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا تب ہی گیٹ کھلنے کی آواز آئی تو اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تب ہی مامی دروازے پر نمودار ہوئیں۔

''ہائے، ہائے بے غیرت، بے حیا......'' انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

''چار دن صبر نہیں ہوا تجھ سے، چار دن بعد تیری ڈولی لے جاتی، باپ کو مرے دن ہی کتنے ہوئے، کئی دن سے دیکھ رہی تھی تیرے چھن، میرے بچے کے پیچھے پڑی تھی۔ بھائی، بھابی گھر سے کیا نکلے بلا بھیجا میرے بیٹے کو اپنے کمرے میں...... ہائے میں.... بے وقوف سمجھی کہ بازار سے کچھ منگوانا ہے، مجھے کیا پتا تھا کہ آگ لگی تھی تیرے اندر......''

وہ ہکا بکا سی مامی کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں تو اماں سچ میں یہ زرین کی نند بڑی بے حیا ہے۔'' اس کی نظریں دروازے میں کھڑے عاطف اور زرین پر پڑی تھیں اور وہ جیسے ہوش میں آ کر عاطف کی طرف بڑھی۔

''بھائی، یہ میرے کمرے میں زبردستی گھس آیا تھا۔''

''ارے ایسی منھی چوزی ہے ناں کہ میرا بچہ تیرے کمرے میں زبردستی گھس آیا۔ اللہ میاں کی گائے ہے یہ تو معصوم...... جہاں بٹھا دو بیٹھ جائے جہاں سے اٹھا دو اٹھ جائے۔'' مامی نے ہاتھ نچا، نچا کر کہا تو اس نے بے بسی سے عاطف کی طرف دیکھا تھا۔

''بھائی میرا یقین کریں...... یہ جھوٹ ......مامی، جھوٹ بول رہی ہیں۔''

''بے غیرت، بے حیا، یہ گل کھلا رہی تھی۔'' عاطف کا تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔

''بھائی...... بھائی میں نے کچھ نہیں کیا، میری بات تو سنیں......'' وہ رو رہی تھی منتیں کر رہی تھی لیکن عاطف نے اس کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔

''نکل جاؤ ابھی اسی وقت میرے گھر سے، نکل جاؤ۔'' وہ اسے دھکے دے رہا تھا، غصے سے مار رہا تھا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑی تھی۔

زرین نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

''بس کرو عاطف کیا مار ڈالو گے۔''

''اس بے غیرت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا میں...... تم یہاں کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہو، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اس نے اختر سے کہا تو وہ فوراً ہی وہاں سے کھسک گیا تھا۔

''ایک لمحہ...... ایک لمحہ بھی...... اب میں یہاں برداشت نہیں کروں گا تمہیں...... ابھی...... ابھی اسی وقت نکل جاؤ۔''

''رات کے اس وقت کہاں جائے گی؟'' زرین نے ابھی تک اس کا بازو پکڑا ہوا تھا۔

''جہاں مرضی جائے لیکن مجھے اس کی شکل نظر نہ آئے۔'' اس نے زمین پر گری ایمن کو پھر پاؤں سے ٹھوکر ماری تھی۔ زرین اسے لے گئی تھی۔ مامی بھی ان دونوں کے پیچھے چلی گئی تھیں۔ بیڈ پر پڑا اس کا فون بج رہا تھا۔ اس نے بہ مشکل اٹھ کر فون اٹھایا تھا۔ دوسری طرف ساجدہ آپا تھیں۔

''ساجدہ آپا۔'' وہ بلک پڑی تھی۔ ''خدا کے لیے اس وقت مجھے آ کر لے جائیں، ابا سچ کہتے تھے آپا، عاطف۔''

''کیا ہوا ایمن......؟''

''آپا، آپا آپ کو اللہ کا واسطہ......'' وہ رو رہی تھی تڑپ رہی تھی۔

''اچھا، اچھا حوصلہ کرو، میں آ رہی ہوں......اور

ابھی وہ بیڈ پر بیٹھی ہی تھی کہ ایک بار پھر عاطف اور اس کے پیچھے، پیچھے مامی اور زرین کمرے میں داخل ہوئے تھے......اور عاطف نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھا لیا تھا۔

''تم ابھی تک بیٹھی ہو یہاں۔'' وہ اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا گیٹ کی طرف لے جا رہا تھا پھر اس نے اسے گیٹ سے باہر دھکا دے کر گیٹ بند کر دیا تھا۔

''نہیں، نہیں بھائی، ایسا مت کرو دروازہ کھولو......''

وہ دروازہ بجا رہی تھی، رو رہی تھی۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی اسے یوں ہی پکارتے دروازہ بجاتے...... جب ساجدہ آپا اپنے شوہر کے ساتھ رکشے سے اتری تھیں۔

''آپا......''

وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔

''آپ نے اتنی دیر کر دی آپا...... عاطف بھائی نے مجھے گھر سے نکال دیا۔''

''گڑیا......''

ساجدہ آپا نے اسے گلے لگا لیا تھا اور وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

''میں پوچھتی ہوں عاطف سے۔'' ساجدہ آپا کو غصہ آ گیا تھا۔

''صرف وہ اس گھر کا مالک نہیں ہے تمہارا بھی حق ہے تمہارے باپ کا گھر ہے۔'' انہوں نے ڈور بیل پر ہاتھ رکھا تھا۔

''نہیں ساجدہ اس وقت ایمن کو لے کر گھر چلو، وہاں ساری بات آرام سے پوچھو پھر صبح آ کر بات کریں گے۔''

ساجدہ آپا کے شوہر محسن رضا نے منع کر دیا تو ساجدہ آپا اسے لے کر رکشے میں بیٹھ گئیں۔ سر پر صرف دوپٹا پاؤں میں جوتے ندارد اس حالت میں ساجدہ آپا اسے گھر لائی تھیں۔ وہ تو کبھی چادر کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔

ساجدہ آپا کو ساری بات بتاتے ہوئے وہ تڑپ، تڑپ کر روئی تھی۔

''ہائے ابا کیوں چلے گئے آپا۔''

''وہ اپنی مرضی سے نہیں گئے ایمن......'' ساجدہ آپا نے اسے گلے سے لگا کر سمجھایا تھا، تسلی دی تھی۔

''کاش وہ اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی میں ہی تمہیں رخصت کر جاتے۔''

وہ پوری رات اس نے جاگ کر گزاری تھی اور ساجدہ آپا بھی اس کے ساتھ جاگی تھیں۔ ساجدہ آپا کا گھر چھوٹا سا تھا ایک کمرا، برآمدہ جس میں گرل لگا کر اور آگے چقیں ڈال کر بچوں کے لیے کمرا بنا دیا تھا۔ دونوں بیٹے جن کی عمریں نو اور دس سال کی تھیں یہاں ہی سوتے تھے۔ اس رات محسن دونوں بچوں کو لے کر کمرے میں اپنے ساتھ لے گئے تھے اور ساجدہ آپا کے ساتھ وہ ساری رات برآمدے والے کمرے میں بیٹھی رہی تھی۔ وہ کتنی بھیانک رات تھی کتنی تکلیف دہ......اگر مرنا اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اسی وقت مر جاتی۔ پتا نہیں کب رات ختم ہوئی تھی اور کب صبح ہوئی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں، صبح ساجدہ آپا کے اصرار پر بہ مشکل ایک کپ چائے کے ساتھ آدھا رسک لے کر ساجدہ آپا اور محسن بھائی کے ساتھ وہ گھر آئی تھی۔ لیکن عاطف اور زرین تو ایک بات سننے کے بھی روادار نہیں تھے۔

''ہمارے لیے یہ مر گئی ہے، ہماری طرف سے جہنم میں جائے۔''

''خدا کا خوف کرو عاطف...... آدھی رات کو کوئی غیرت مند بھائی یوں بہن کو دھکے دے کر گھر سے نہیں نکالتا......''

ساجدہ آپا نے اسے سمجھانے کی کتنی ہی کوشش کی تھی۔ محسن بھائی کے ساتھ عاطف کی بہت دوستی رہی تھی وہ چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتے تھے اسے لیکن اس نے ان کی بھی نہیں سنی تھی۔

''لیکن یہ کہاں جائے گی عاطف تمہارے سوا اس کا کون ہے اپنا۔''

''اس جیسوں کے لیے بہت ٹھکانے ہیں۔'' زرین بھی مسلسل بول رہی تھی...... تب محسن رضا نے ساجدہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

ماں تجھے سلام

میں ایک مدت سے اپنی ماں کے
اداس لہجے کو سوچتی ہوں
تو ایسے لگتا ہے جیسے میں نے
اندھیر نگری کے وسوسوں میں
کہیں چراغوں کی روشنی کو
بجھا دیا ہو
میں اپنی ماں کے
اداس لہجے کو سن رہی ہوں
وہ کہہ رہی ہے طویل راتوں کے سب اندھیروں میں
روشنی کو ترس رہی ہو؟
تمہیں پتا ہے بچھڑتی لہروں کے
سب سمندر بھی تیری آنکھوں میں رقص کرتے
بھنور کی صورت بکھر رہے ہیں
تمہاری سوچوں میں اب زمانے کی داستانوں
کے قافلے ہیں
کہیں پہ صحرا کی دھوپ آنکھوں میں
دھیرے، دھیرے اتر رہی ہے
تمہارے بالوں میں رقص کرتی ہوئی یہ
مٹی عجیب وحشت اگا رہی ہے
میں اپنی ماں کے اداس چہرے سے
دشت و صحرا کی وسعتوں کے
قدیم منظر پہ رو رہی ہوں
کہ اس کی آنکھیں مسافتوں کے سفر میں گم ہیں
میں اس کی دوری کی یہ مسافت

"جب دل پتھر ہو جائیں اور آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی چڑھی ہو تو پھر کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"گھر تو بہت چھوٹا ہے عاطف لیکن دلوں میں بہت وسعت ہے۔ یہ بچی ہم پر بوجھ نہیں ہے، اگر تم اجازت دو تو یہ اپنے پہننے کے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں لے لے۔"

عاطف نے نگاہیں جھکا لی تھیں...... لیکن زرین نے چمک کر کہا تھا۔

"ارے ہم نے کیا اس کی اترن کا اچار ڈالنا ہے، اٹھا لے اپنا سامان اور ہمیں اپنی شکل نہ دکھائے پھر......"

ساجدہ آپا کی چادر اوڑھے اور ان کے ہی جوتے پہنے وہ اپنے ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح کھڑی تھی۔

"ایمن گڑیا اپنا ضروری سامان لے لو۔"

ساجدہ آپا کے کہنے پر اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی خالی، خالی آنکھوں میں اتنی ویرانی تھی کہ ساجدہ آپا کا دل کانپ گیا تھا۔ اور پھر وہ خود ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے کمرے میں لے گئی تھیں۔ محسن رضا یہ کہہ کر باہر چلے گئے تھے کہ وہ رکشا لے کر آتے ہیں، کمرے میں آ کر اس کا جی چاہا وہ دیواروں سے سر پٹخ، چیخ چیخ کر روئے۔ ابا کا بیڈ خالی تھا، پچھلے تین سال سے وہ ابا کے کمرے میں ہی سوتی تھی۔ سنی بڑا ہو گیا تھا اسے الگ بیڈروم چاہیے تھا سو اس نے اپنا بیڈروم سنی کو دے دیا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ کر ابا کے خالی پلنگ کو دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

"محسن رکشا لے کر آ جائیں گے تم اپنی چیزیں اکٹھی کر لو۔" ساجدہ آپا نے پیار سے اس کا ہاتھ سہلایا تھا۔

"کوئی بیگ اور اٹیچی وغیرہ تو ہوگا ناں......" اس نے بیگ نکال کر ساجدہ آپا کو دیا تھا اور پھر ساجدہ آپا نے ہی اس کے کپڑے وغیرہ اس میں رکھے تھے۔ ایک دوسرے بیگ میں کتابیں وغیرہ...... ابا کی وارڈ روب خالی تھی۔ سوائے ایک ویسٹ کوٹ کے جسے اس نے ان کی نشانی کے طور پر کپڑوں والے بیگ میں رکھ لیا تھا۔

نہ جانے کب تلک سہہ سکوں گی
میں اس زمانے کی وحشتوں میں
نئے چراغوں کو کس طرح سے جلا سکوں گی؟
میں اپنے گھر کی خستہ حالی کو دیکھتی ہوں
تو سوچتی ہوں میں ایک تنہا
اداس لڑکی
عجیب لوگوں میں آ بسی ہوں
بس ایک سایہ جو میری ہمت بڑھا رہا ہے
وہ کہہ رہا ہے کہ تم زمانے کی ہر برائی کو
نیکیوں میں بدل کے دیکھو
زمانے والوں سے لڑ کے دیکھو
مجھے چراغوں کو پھر سے گھر میں
جلا کے دیکھو
میں اپنی ماں سے یہ کہہ رہی ہوں
تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں کے
سمندروں سے مجھے گلہ ہے
تمہیں خبر ہے تمہاری بیٹی
نئے زمانے کے قافلوں میں
تمہاری یادوں کے زخم لے کر
یہ کیسی بستی میں آ بسی ہے
میں اپنی ماں سے یہ کہہ رہی ہوں
میں ایک مدت سے اپنی وحشت کے
سارے لمحے گزارتی ہوں
تمہیں میں اکثر پکارتی ہوں

کلام: تمثیلہ لطیف، پسرور
پسند: مہرین ضیا...... کراچی

"تمہارا زیور کہاں ہے؟"

"یہاں ہی تو تھا سیف میں......" اس نے اٹھ کر سیف کھولا...... جو خالی پڑا تھا۔ اپنی وفات سے چند دن پہلے ہی تو ابا اس کے لیے چوڑیاں اور دو سیٹ لائے تھے۔ وہ چپکے، چپکے اس کی شادی کی تیاری کر رہے تھے۔ اسی میں ابا کے پیسے بھی تھے۔ پھر اس نے بیڈ سائیڈ، دراز الماریاں سب ہی دیکھ ڈالی تھیں۔ اماں کی رسٹ واچ، ان کی شادی والی انگوٹھی جو انہوں نے کبھی پہنی ہی نہیں تھی لیکن دراز میں پڑی رہتی تھی...... کچھ بھی نہیں تھا۔ اور جب ساجدہ آپا نے زرین سے زیورات کے متعلق پوچھا تو وہ مکر گئی۔

"ہمیں کیا پتا......"

"اپنی وفات سے ہفتہ بھر پہلے ہی تو ایمن کی شادی کے لیے بنوا کر لائے تھے، مجھے بھی دکھائے تھے۔"

"ارے تو کیا ہم نے چوری کر لیے...... دے دیا ہوگی اپنے کسی ہوتے سوتے کو...... ایسی لڑکیوں کا کیا اعتبار جانے کس، کس سے۔"

"بس کرو زرین تمہاری بھی ایک بیٹی ہے۔"

اور یوں وہ ساجدہ آپا کے ساتھ ان کے گھر آ گئی تھی۔ اس نے اپنے گھر کے در و دیوار کو حسرت سے دیکھا تھا۔ دس سال پہلے ابا نے یہ گھر بنوایا تھا۔ اماں کا انتقال اسی گھر میں ہوا تھا۔ تین بیڈروم کا دس مرلے کا یہ سنگل اسٹوری گھر بہت خوب صورت تھا۔ وہ ساجدہ آپا کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ اسے انکل خلیل کے پاس جانا تھا لیکن ان سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ تب اس نے سوچا تھا کہ جب تک خلیل انکل سے اس کی بات نہیں ہوتی وہ ثلزا کے پاس رہ لے گی جو اس کی دوست تھی...... ہاں دوست ہی تو تھی...... لیکن اور پھر ایک اور رات اس نے ساجدہ آپا کے گھر گزار کر انکل خلیل کے گھر آنے کا فیصلہ کر لیا تھا اگرچہ ساجدہ آپا نے بہت روکا تھا۔ لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے محسن بھائی کو برآمدے میں سونا پڑے کہ اس دوسری رات کو محسن اور بچے برآمدے میں سوئے تھے اور وہ ساجدہ آپا کے ساتھ

ان کے بیڈ روم میں، ساری رات وہ شرمندہ سی ہوتی رہی تھی اور پھر صبح اس کے اصرار پر محسن بھائی اور ساجدہ آپا اسے اسٹیشن پر چھوڑنے آئے تھے۔ گاڑی روانہ ہونے تک ساجدہ آپا اسے ہدایات دیتی رہی تھیں۔

”کسی سے بے تکلف نہ ہونا، کسی سے کوئی چیز لے کر نہیں کھانا، رونا بالکل نہیں کہ کوئی خواہ مخواہ کا ہمدرد پیدا ہو جائے۔ اپنے کو پریشان مت ظاہر کرنا کہ تمہیں کمزور سمجھ کر کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔“ وہ اس کی کچھ نہیں لگتی تھیں لیکن اس کے لیے کتنی فکرمند تھیں اور وہ جس کے ساتھ اس کا خون کا رشتہ تھا، اس نے کیا، کیا تھا۔ اس کی سسکی نکل گئی۔ ابا کے مرنے کے پچیس دن...... صرف پچیس دن بعد...... وہ گھر سے بے گھر ہو کر ایک اجنبی گھر میں پڑی تھی۔

”ابا آپ کیوں چلے گئے آپ کے بغیر میں کیا کروں گی......“ آنسوؤں نے ایک بار پھر یلغار کی تھی۔ وہ دیوار کی طرف رخ کیے رو رہی تھی۔ ہولے، ہولے گھٹ، گھٹ کر پھر اس کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔ مسز احسان کی آنکھ اچانک ہی کھلی تھی۔ انہوں نے نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں دیکھا اور وہ دیوار کی طرف رخ کیے لیٹی ہوئی تھی اور ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔

ان کا دل اس کے لیے دکھی ہوا، وہ آہستگی سے اٹھیں اور اس کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”بس کرو بیٹا کتنا روؤ گی؟“ اس نے کروٹ بدل کر ان کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ سرخ سوجی ہوئی آنکھیں...... ان کا دل کٹ گیا۔

”سوری آنٹی، میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ارے نہیں، میری آنکھ تو پیاس کی وجہ سے کھلی تھی۔ شاید تم سوئی نہیں تب سے رو رہی ہو۔“

وہ نگاہیں جھکائے نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔

”دیکھو بیٹا تمہارے دکھ کا اندازہ کر سکتی ہوں...... جو تمہارا نقصان ہوا وہ پورا نہیں ہو سکتا۔ حوصلہ کرو۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے۔

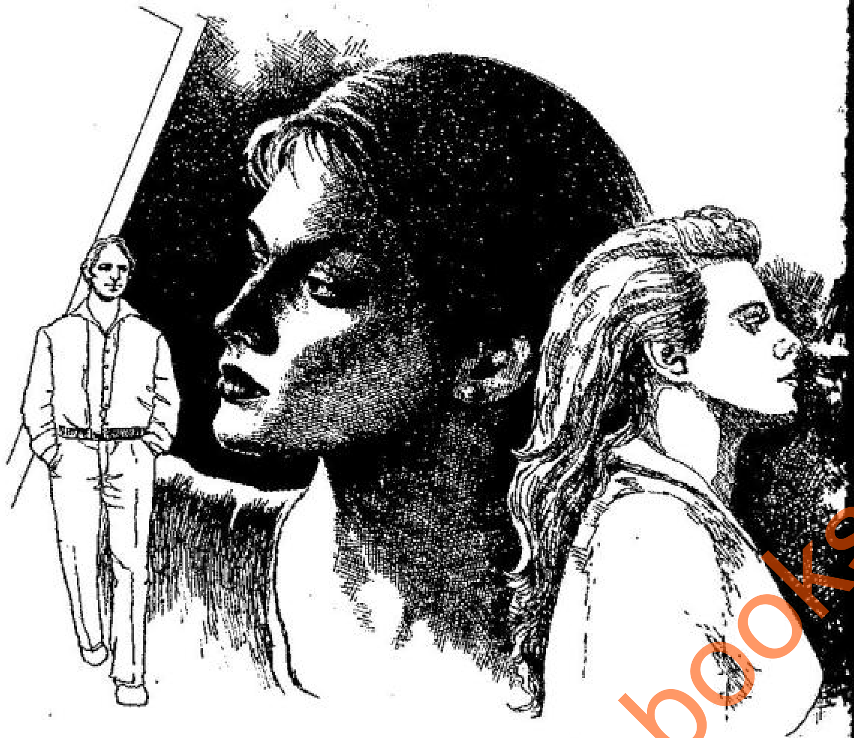
”اللہ پر یقین رکھو بیٹا وہ تمہارے دکھوں کا ازالہ ضرور کرے گا۔ سو جاؤ...... جانے کب سے کتنے دنوں سے اس حال میں ہو۔“ ان کی اس محبت پر ایک بار پھر آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”نہیں، بس اب رونا نہیں، سو جاؤ شاباش۔“

اور وہ ممنون نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے لیٹ گئی اور وہ ہولے، ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ کیسا ممتا بھرا لمس تھا۔ بچپن میں بھی، وہ اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتی تھی اور اماں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ہولے، ہولے باتیں کرتی تھیں اور وہ ان کی باتیں سنتے، سنتے سو جاتی تھی...... اس کی بند آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی تھی اور مسز احسان کی انگلیوں کے جادو بھرے لمس نے اس کے تھکے ہوئے ذہن کو اتنا سکون دیا کہ پتا نہیں وہ کب سو گئی تھی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کا پردہ اٹھا تھا اور روشنی شیشوں سے آ رہی تھی اس کی نظر سامنے دیوار پر لگے کلاک پر پڑی، ساڑھے سات بج رہے تھے۔ فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

مسز احسان کا بیڈ خالی تھا، وہ کمرے میں نہیں تھیں یقیناً وہ نیچے چلی گئی ہوں گی...... کچھ دیر وہ یوں ہی بیٹھی رہی۔ بہاول پور سے یہاں آنے تک جو کچھ بیتا تھا سب سوچ ڈالا...... ایک رات گزر گئی تھی۔ ایک رات کے لیے اسے چھت میسر آ گئی تھی...... لیکن اب کیا ہوگا وہ نہیں جانتی تھی۔ بہاول پور واپس جا کر آخر کتنے دن وہ ساجدہ آپا کے پاس رہ سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ دو تین دن...... اس کے بعد...... ہاں اس کے بعد اسے کوئی ہاسٹل تلاش کرنا ہوگا...... اسے بہرحال اس وقت تک کے لیے کہیں رہنا تھا۔

اختتامی حصہ اگلے ماہ



ہیپی اینورسری

ہما بیگ

حسن جہاں واقعی حسن جہاں ہی تھی۔ والدین نے بچپن میں اس کی خوب صورتی کو سراہنے کے لیے اس کے لیے یہ منفرد نام چنا۔ اور خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ بچپن ہی سے اسے اپنا آپ منوانے اور سب سے منفرد نظر آنے کا شوق تھا جو جوانی میں کچھ سوا ہو گیا تھا۔ نصیب بھی اللہ سے اچھا لکھوا کر لائی تھی۔ ہر میدان میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑتے ہوئے وہ بڑی ہوتی گئی۔ شادی بھی شہر کے کامیاب بزنس مین سے ہوئی...... چاہنے والا شوہر ملا تو دماغ ساتویں آسمان سے بھی اوپر چلا گیا۔ دن رات دعوتیں، پارٹیز، ایک پاؤں ملک میں تو دوسرا بیرون ملک...... انہی مصروفیات میں شادی کے پچیس سال گزر گئے۔ قدرت نے ایک بیٹا اور ایک بیٹی سے بھی نواز دیا۔ مگر جوان بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی حسن جہاں کی دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنے بچوں کے ساتھ جب نکلتی تو ان کی بڑی بہن ہی لگتی۔ حلقۂ احباب رشک کرتا رہ جاتا۔

موسم بہار کی ایک خوب صورت شام حسن جہاں

اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں لنچ پر موجود تھی۔ ایک سے ایک ماڈرن لیڈیز مگر سب کے چہروں پر حسن جہاں کے لیے ستائش اور حسد کے ملے جلے تاثرات تھے۔ تسنیم جو اس کی سب سے قریبی سہیلی سمجھی جاتی تھی وہ آج کچھ چپ، چپ سی تھی۔

حسن جہاں حسب عادت بے فکری سے قہقہے لگا رہی تھی۔ اتنے میں اس کی نظر تسنیم پر گئی۔

”ارے کیا ہوگیا ہماری پیاری تسنیم کو؟ کیوں خاموش بیٹھی ہو؟ لائف انجوائے کرو بھئی۔“

”حسن جہاں سب تمہاری طرح خوش قسمت نہیں ہوتے...... آج پھر اشعر نے صبح سے لڑ، لڑ کر دماغ گھما دیا تھا۔“ اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

” پتا نہیں ایسے شوہر کے ساتھ کیسے اتنے سال گزر گئے اور اب باقی کی زندگی بھی جانے کیسے گزرے گی، بیس سال کی تھی جب وہ بیاہ کر لائے تھے، ان کی، ان کے خاندان والوں کی، ان کے بچوں کی خدمت میں اب اگر ایسی ہوگئی ہوں تو میرا کیا قصور...... ظاہر ہے پچیس سال بعد کچھ تو فرق پڑے گا ہی ناں۔ اور وہ بھی تو پہلے جیسے نہیں رہے... تو کیا میں ان کو چھوڑ دوں؟“

اس کی بات پر حسن جہاں نے پیار سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

”ایسا نہیں سوچتے ڈیئر...... نہ ہی بولتے ہیں، اشعر بھائی اتنا تو تمہارا خیال رکھتے ہیں، کبھی تو غصہ آ ہی جاتا ہے، اتنا بھی کیا دل پر لینا کچھ غلطی تمہاری بھی ہوگی۔“

فوزیہ جو اُن خواتین کے گروپ میں نئی بھی تھی اور کم عمر بھی...... اس نے فوراً کہا۔

”میرے شوہر کا بھی برتاؤ میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہے، شادی کو پندرہ سال ہوگئے ہیں اور ہم پندرہ منٹ بھی لڑے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہر بات پر نکتہ چینی، روک ٹوک حد ہوتی ہے، دو روٹیوں کے لیے اتنی بک، بک...... میں بھی آخر تعلیم یافتہ ہوں، خود ان سے زیادہ کما سکتی ہوں مگر کیا کروں رہ رہی ہوں۔“

”فوزیہ بی بی بات کمانے کی نہیں، عزت سے رہنے کی ہے۔ کیا گھر سے باہر نکل کر کمانے میں تمہیں زیادہ خوشی ملے گی؟“ حسن جہاں نے تدبر سے کہا۔

”پھر آپ ہی بتائیں شادی شدہ زندگی گزارنے کے گُر...... آپ کو دیکھ کر تو پتا ہی نہیں چلتا کہ آپ شادی شدہ ہیں۔“ فوزیہ نے تو مبالغہ آرائی کی حد ہی کر دی تھی۔ اس کی بات سن کر حسن جہاں ہنس پڑی۔

”ارے چھوڑو بھئی ایسی کوئی خاص ترکیب نہیں ہے میرے پاس...... بس اللہ کا کرم ہے۔“

”کیسی دوست ہو تم جو اپنی سہیلیوں کی رہنمائی نہ کر سکو۔ ہمارا تم پر کیا اتنا بھی حق نہیں؟“ تسنیم نے شکوے سے کہا۔

”ارے آپ سب تو ناراض ہو رہی ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ آپ اپنے شوہر کو خوش رکھیے، وہ آپ کو خوش رکھے گا۔ کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا تو دور کی بات آپ کے پلو سے جدا ہی نہیں ہوگا۔“ حسن جہاں نے انداز دلربائی سے کہا۔

”مگر کیسے خوش رکھیں؟“ عفت جو اب تک خاموش بیٹھی سن رہی تھی بول پڑی۔ ”ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کریں پھر بھی اپنے دوستوں کی بیویاں اور پڑوسنیں ہی ان کو پسند آتی ہیں۔“

”اچھا میں دوسری طرح سمجھاتی ہوں، آپ لوگ اپنے شوہروں کی محبوبہ بن جائیں۔ بحیثیت شوہر ان کا آپ پر شرعی حق ہے، آپ اسے ہنسی خوشی ادا کیجیے...... پھر دیکھیے گا، کیسے وہ آپ کے غلام بنے پھرتے ہیں۔“ حسن جہاں نے اپنی کامیاب شادی شدہ زندگی کا راز اپنی سہیلیوں پر آشکار کیا۔ جسے سن کر سب حیرت اور کچھ، کچھ پریشانی سے دم بخود رہ گئے۔

”کیا ہوگیا ہے تمہیں، ہماری عمر دیکھو اور چونچلے......“ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد تسنیم بولی۔

”بھئی یہ سب جوانی میں اچھے لگتے ہیں، گھر

میں بچے ہیں، کیا کہیں گے۔“

”واہ تسنیم، بچے کیا ہر وقت تمہارے کمرے میں رہتے ہیں؟ اور شادی کس لیے کی ہے؟ مرد کی خواہش، وہ بھی جائز خواہش پوری کرنے کو کہہ رہی ہوں...... اس کی خوشی اور رضامندی کے لیے اپنے آپ کو سنوارو اور اس کے بھی نخرے اٹھاؤ اور اپنے ناز بھی دکھاؤ۔ گھر والی جب اپنے فرض سے غافل ہو جاتی ہے تبھی مرد اِدھر اُدھر تانکا جھانکی کرتے ہیں۔“

”حسن جہاں تمہاری بات اور ہے، تمہیں شمیم جیسی کام والی ملی ہوئی ہے، جس نے تمہاری شادی کے پہلے دن سے گھر اور پھر تمہارے بچوں کو سنبھالا۔ تم پر کوئی ذمے داری نہیں آئی کبھی۔ عورت پر جب ذمے داریوں کا بوجھ ہوتا ہے تو وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھکی، تھکی سی رہتی ہے اور اپنے آپ کو سنوارنے کا دل ہی نہیں چاہتا...... بلکہ کبھی، کبھی تو ایک دوسرے کا منہ بھی دیکھنے کو دل نہیں کرتا۔ کاش شمیم جیسی عورت ہمیں بھی مل جاتی۔“ تسنیم ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

حسن جہاں کو تھوڑا برا لگا۔

”شمیم کوئی احسان نہیں کرتی، ہماری شادی سے کچھ پہلے ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ شوہر گاؤں میں رکھنا چاہتا تھا جبکہ شمیم کو شہری زندگی پسند تھی اسی لیے اس نے شوہر کو چھوڑ دیا۔ میں نے بھی اس کے شوہر کو نہیں دیکھا۔ صرف اس کے بارے میں سنا ہے۔ ہم نے زندگی بھر اسے گھر کے فرد کی طرح ہی رکھا ہے، اس کے بچے اسی اسکول میں جاتے تھے جہاں ہمارے اور اب بھی ان کو اسی... یونیورسٹی میں بھیج رہے ہیں جہاں جانے کی ان کی خواہش ہے، آپ سب اپنی کام والیوں کو اس طرح رکھ سکتے ہیں؟ انیس صاحب تو اپنے بچوں سے زیادہ شمیم کے بچوں کا خیال رکھتے ہیں، وہ الگ انیکسی میں رہتی ہے اور اب تو صرف سپروائز کرتی ہے سارے کام والوں کو۔“

اتنے میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

”جی ٹھیک ہے، مجھے یاد ہے، فلائٹ میں تو ابھی تین گھنٹے باقی ہیں، سامان کار میں رکھا ہے بچے ڈائریکٹ پہنچ جائیں گے، یاد دہانی کا شکریہ...... ہم آپ کو بہت مس کریں گے، آپ کھانا وقت پر کھا لیجیے گا۔ love you“ حسن جہاں نے فون بند کیا اور اٹھنے لگی۔

”سہیلیوں ہم چلے، گپ شپ میں پتا ہی نہیں چلا کتنا ٹائم ہوگیا ہے، میری اور بچوں کی اسلام آباد کی فلائٹ ہے، ہم بھوربن جا رہے ہیں لونگ ویک اینڈ ہے تو انیس صاحب نے بکنگ کرا دی ہے۔ بسنت اسپیشل انجوائے کر آؤ۔“

”ارے کہاں چلی اکیلی، اکیلی! بھول گئیں۔ عشرت کے بیٹے کی شادی ہے، آج مہندی، کل بارات پھر ولیمہ...... تم کو تو خاص طور پر ہمارے ساتھ وہاں شریک ہونا ہے۔ اتنی پرانی دوستی ہے آخر...... وہ ناراض ہو جائیں گی، تمہیں بالکل یاد نہیں رہا اتنا خاص ایونٹ؟“ ایک اور سہیلی لبنیٰ نے کہا۔

”ساری پلاننگ تمہاری تھی، مہندی میں ہم سہیلیوں کی طرف سے جانے کی، اب خود جا رہی ہو، ابھی فلائٹ کینسل کراؤ...... کیا انیس بھائی ساتھ نہیں جا رہے؟“

”نہیں، انیس کو اپنے کاروبار سے کب فرصت ملتی ہے۔ بس ہمیں بھیج دیتے ہیں اکثر، یہ پروگرام بھی انہوں نے ہی بنایا اور صبح ہی بتایا تھا۔ میرا تو لنچ آج ڈیو تھا اس لیے میں آ گئی، مہندی کا مجھے بالکل یاد نہیں رہا تھا۔“ حسن جہاں کے لہجے میں پریشانی تھی۔ اُدھر بچوں کے ساتھ پروگرام...... دوسری طرف سہیلیوں کی ناراضی......

”حسن جہاں بچوں کو جانے دو، اب وہ بڑے ہو گئے ہیں اپنے آپ کو خود سنبھال سکتے ہیں، تم رک جاؤ اور ہاں تمہاری ویڈنگ اینورسری بھی تو ہے، انیس بھائی کو سرپرائز دینا کہ آپ کی وجہ سے رک گئی ہوں ویسے بھی مردوں کو یہ دن کہاں یاد رہتے ہیں۔“

بے اختیار حسن جہاں ہنس پڑی۔

”ابھی مجھ سے سبق لے رہی تھی کامیاب ازدواجی زندگی کے، اور اب مجھ کو سمجھا رہی ہے میری سہیلی۔“ حسن جہاں بولی۔

”ائے واہ تمہیں خوب یاد رہا، میں تک بھول گئی اور کہیں ایسا تو نہیں کہ انیس ہمیں وہاں اسی لیے بھیج رہے ہیں اور بعد میں...خود بھی جوائن کریں گے۔“ حسن جہاں نے دور کی سوچی۔”چلو پھر رات کو ملتے ہیں۔“

فلائٹ میں ٹائم کم رہ گیا تھا، حسن جہاں گیٹ پر ہی اتر گئی اور ڈرائیور کو ائرپورٹ بھیج دیا کہ گاڑی میں بچوں کا سامان تھا۔

”بیگم صاحبہ سلام......“ گارڈ نے سیلوٹ مارا......سر کی ہلکی جنبش سے حسن جہاں نے جواب دیا اور پوچھا۔

”دلاور، شمیم بی بی کہاں ہیں؟“

”بیگم صاحبہ وہ انیکسی میں آرام کر رہی ہیں، آپ تو اسلام آباد جا رہی تھیں، واپس کیسے آگئیں؟“

حسن جہاں نے جواب دیے بغیر انیکسی کی طرف قدم بڑھائے، دور سے شمیم اپنے کمرے کی کھڑکی سے نظر آئی۔ وہ ابھی ابھی شاید نہا کر باہر نکلی تھی۔ سر پر تولیا لپٹا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کسی سے باتیں کر رہی ہے، حسن جہاں کھڑکی کے تھوڑا قریب ہوگئی۔ کمرا اونچائی پر تھا تو دوسرا شخص نظر نہیں آرہا تھا۔ کھڑکی کے نزدیک کھڑی شمیم ہی سامنے تھی چونکہ پردے بھی ہٹے ہوئے تھے۔

”ایسا کب تک چلے گا میرے سائیں؟ کبھی، کبھی دل بہت گھبراتا ہے، رات کی تنہائی میں خوف میری روح کو گھیر لیتا ہے۔ اب بچے بڑے ہوگئے ہیں، اگر انہیں پتا چل گیا تو کیا سوچیں گے۔ ہمارے بارے میں...... وہ کبھی معاف نہیں کریں گے۔“ شمیم کی آواز آئی۔

”اسی لیے انہیں اپنے سے دور ہاسٹل میں داخل کرادیا۔“ جواب میں مرد کی سرگوشی سی سنائی دی۔ حسن جہاں بالکل کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہوگئیں۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مجھے آپ کی محبت پر کوئی شک نہیں، جہاں اتنے سال گزر گئے، باقی زندگی بھی آپ کے ساتھ گزر جائے گی مگر بچوں کی شادی کے وقت کیا ہوگا، نکاح نامے پر باپ کا نام کیا لکھواؤں گی، جتنے منہ اتنی باتیں۔“ شمیم کے لہجے میں نمی سی تھی۔

”ساری زندگی آپ کی باندی بن کر گزار دی، اب بچوں کے مستقبل کی فکر مجھے کھائے جا رہی ہے، ضمیر میں ایک خلش سی رہتی ہے، آج بھی سارے کام والوں کو چھٹی پر بھیجتے وقت جیسے کوئی اندر سے روک رہا تھا۔“

”شمی میری جان، میری زندگی...... تم ایک ذہین اور سمجھدار عورت ہو، ایسی عورت کا ملنا مرد کے لیے قدرت کی طرف سے انعام ہے، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، مجھ پر بھروسا رکھو...... کبھی کسی کے سامنے تمہیں شرمندہ نہیں ہونے دوں گا، آخر کو پہلی بیوی تو تم ہی ہو ناں......“

”نہیں، میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہے، یہ آواز انیس ان کی نہیں ہوسکتی۔“ حسن جہاں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔”یہ نہیں شمیم میری غیر موجودگی میں کیا گل کھلاتی رہی ہے۔ کون ہے اس کے کمرے میں۔

”ہاں بیٹا فلائٹ کا وقت ہوگیا ہے، آپ لوگ وقت پر پہنچ گئے تھے ناں......؟ سیٹ اچھی ملی ہے؟“ فون کی بیل ہوئی اور دوسری طرف کی بات سن کر مردانہ آواز نے گھبرا کر کہا۔

”کیا......؟ امی تمہارے ساتھ نہیں گئیں؟ کیوں، کہاں ہیں وہ؟ ڈرائیور نے کیا بتایا؟“ باتیں کرتے، کرتے مرد کی آواز کھڑکی کے نزدیک ہوگئی تھی۔

”کیا کہہ رہے ہو گھر پر آدھے گھنٹے پہلے ڈراپ کیا ہے؟ اچھا...... نہیں، ...... میں تو آفس، میں ہوں، کام زیادہ ہے بس وہاں پہنچ کر فون کر دینا۔“

اس کے ساتھ ہی شمیم کے کمرے کی کھڑکی کھل گئی۔ سامنے کوئی اور نہیں حسن جہاں کی کائنات اس کا شوہر انیس کھڑا تھا، جس کی چاہت پر اسے بڑا مان تھا، یک بیک اس کی کہی ہوئی ہر بات جھوٹی ثابت ہوگئی، اس کے آدرش کا بت ایک چھناکے سے ٹوٹ کر زمیں بوس ہوگیا تھا...... اس کے منہ سے نکلا تو فقط اتنا نکلا......

"happy anniversary"



عورت ٹھوکر

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے . . . مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنفِ مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار **فرحین اظفر** نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

چکنی مٹی کی پکی سڑک گرد کے بگولے پھونک رہی تھی۔ راجی نے آتے ساتھ ہی ڈول بھر، بھر آس پاس نہر کے پانی سے چھڑکاؤ کیا تھا تو گرم بھبکا سا نکلا اور تھوڑی بہتری آگئی۔

اب کچے ٹیلے پہ بیٹھنا تندور کے اندر بیٹھنے سے تھوڑا بہتر تھا۔ شام آتے، آتے گھنے املتاس کے سائے تلے اور ٹھنڈک پڑ جاتی تھی مگر اتنا وقت کس کے پاس تھا۔

وہ تو جیون کی بے انت تپیا میں سے جو چار پل

غنیمت جان کر کھینچ لاتی تھی۔ اسی میں سودھڑ کے روگ لگا کے بیٹھ رہتے تھے۔ اس کے پلو سے بندھی گرہ کی طرح جو، وہ کبھی، کبھی کوئی کام یا کچھ بات یاد رکھنے کے لیے لگا چھوڑتی تھی۔

ایک دن یوسف نے اس کا پلو تھام کر اس سے پوچھ لیا تھا تو وہ سوچتی رہی تھی کہ اسے کیا جواب دے۔ ایسی ہزار گرہیں وہ کبھی ایک اور کبھی دونوں پلوؤں میں باندھ، باندھ کر کھولتی رہی تھی۔

یہ کسی دیہاتن کا بڑا آزمودہ نسخہ تھا۔

”سن...... اوڑھنی کے کنارے ایسی گانٹھ باندھ کے رکھا کر، جب کسی چیز کو بھولنے کا ڈر ہو تو...... تو جب، جب اسے دیکھے گی تجھے وہ بات یاد آ جائے گی۔“

اس نے ماسٹر جی کی اماں کو بجوائی گئی چٹھی کی طرح وہ نسخہ سنبھال لیا تھا۔ اب تو مدتیں گزر گئی تھیں۔ اس گانٹھ نے اسے بہتیری بار نجمہ کے ہاتھوں پٹنے سے بچایا تھا۔

شروع، شروع میں اسے بار، بار یہی بھولتا رہا کہ وہ، ونی میں آئی ہوئی نار ہے۔ صبح چڑھتی تو نجمہ کوسنوں سے اس کو جگاتی یاد دلاتی۔

”او...... او پوتی اٹھ بھی جا اب...... تیرے باراتی آئے کھڑے ہیں۔ اٹھ کے روٹی کی فکر کر لے کچھ۔“ کبھی، کبھی اسے کروٹ بدلنے میں دیر ہوتی تو ٹھڈا بھی بے تکلف دے مارتی۔

آدھی رات کو مشقت سے ٹوٹتا جسم آرام مانگتا تھا۔ اس سے تو پیدا ہونے سے اب تک سب ہی نے کچھ نہ کچھ مانگا ہی تھا۔ صرف ایک ہی تھا جس نے اسے کچھ مانگنے کے بجائے کچھ دان کیا تھا اور وہ تھا اس کا نصیب......

اچھا یا برا جس نے زندگی بھر کی ذلت و خواری اسے دے کے پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کی قسم اٹھا کے ہمیشہ کے لیے جان چھڑا لی تھی۔

پیدا ہوئی تو ماں نے بیٹے کی دعائیں مانگیں اور کیا خوب جھولی بھر، بھر کے مانگیں کہ اگلے ہی سال اس کی گود من چاہی مراد سے بھر گئی۔

ذرا سا قد نکالا تو پھوپی نے اسے ہی مانگ ڈالا۔ کسی سے بیاہنے کے لیے نہیں، اس سے اپنی خدمت کروانے کو کہ وہ گٹھیا کی مریض تھی۔ اور پانچ، پانچ بچوں کو پوسنا اس کے بس سے باہر ہو چلا تھا۔ پھر کئی سال تک پھوپی اور اس کے بچے اس سے کچھ نہ کچھ مانگتے رہے۔ کبھی اس کی نیند تو کبھی اس کی ننھی ننھی خوشیاں۔ البتہ پھوپھڑ ایک دن ایسا کچھ مانگ بیٹھا کہ اس میں دینے کی سکت نہ بچی تو راتوں رات بھاگ کر ماں کے پاس واپس آ گئی۔ اور اس کے پہلو سے لگ کر بلک پڑی۔

ماں کیا اتنا بھی نہ سمجھتی مگر اس کے دان کے دن ابھی تمام نہیں ہوئے تھے۔

لڑکپن کی ڈور ابھی عمر کی چرخی سے ڈھیل بھی نہ لے پائی تھی کہ اک روز کھیتوں میں پانی پہ جھگڑا ہوا اور اس کے بھائی کی اک ذراسی غلطی نے اسے بھگتان بھگتنے کے لیے زمینداروں کے خودساختہ قانون کی بھینٹ چڑھا دیا۔

ماں باپ کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ہرجانہ دینے کو اس کی ننھی جان کے سوا بچا نہ تھا۔ لینے والوں نے بھی صرف جان لینے کی ہی کسر چھوڑ رکھی تھی ورنہ اس کے کھیسے میں اب عزت کے سنہرے سکے کے سوا کچھ باقی نہ بچا تھا۔

پھر اس کے دام لگنے کی باری آئی تو یوسف نے تو حد ہی کر دی۔ بیسیوں بار دسیوں طرح کی مار کھانے کے بعد بھی اس کی اٹھتی جوانی پہ ایک نظر ڈال کر ٹھٹک جانے کے بعد اس سے دل ہی مانگ لیا۔

دل بھی کیا چیز ہے صاحب، زندگی سے جڑے سارے دنگل اسی کی فرمائش پہ تو لڑے جاتے ہیں۔

راجی جیسی دبو، ونی بدنصیب نے اپنے نصیب کا ستارہ دیکھا بھی تو ٹمٹیالے آسمان پر۔ جس کے ابر میں حبس ہوتا ہے تپش ہوتی ہے۔ نہ سورج کی شعاعیں نمی تک پہنچا پاتا ہے، نہ ناریل میٹھے پانی سے بھر پاتے ہیں۔

☆☆☆

”یہ تو بات کرتے، کرتے کہاں کھو جاتی ہے۔ گھڑی بھر کو ہم ملتے ہیں اس میں بھی تیرا سکتہ رک، رک کے ٹوٹتا ہے...... بول ناں۔ کیوں لگا کے رکھتی ہے یہ گانٹھیں۔“

”نصیب کے لکھے کو مٹانے کے لیے۔“

شعور کو سیڑھیاں چڑھنے کے لیے کتابوں کی بیساکھی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

”اوئے پاگلے...... نصیبوں کا لکھا کبھی مٹتا ہے بھلا......“

”ہاں مٹ بھی جاتا ہے، بدل بھی جاتا ہے اور دھندلا بھی جاتا ہے۔ نصیب ہمیشہ ایک سی لکھائی میں نہیں ہوتا۔ کہیں پانی پہ، کہیں ریت پہ اور کہیں پتھر پہ نقش ہوتا ہے۔“

کبھی، کبھی شعور کے لمبے ڈگ ایک ساتھ دو، دو زینے بھی پھلانگتے ہیں۔

”اچھا...... کیسے مٹاتی ہے تو نصیب کے لکھے کو یہ ذراسی گٹھان لگا کے۔“

یوسف کی بات سن کر اس کے ہونٹ عجیب انداز سے مسکرائے جیسے چڑھی ہوئی ندی کے بالکل ساتھ کنارے کی کچی تپش سے چیخ پڑی ہو۔

”جب مجھے ڈر ہوتا ہے کہ میں نے نجمہ کا دیا کام وقت پہ نہیں کیا تو میرے نصیب میں لاتیں لکھی ہیں۔ میں یہ گرہ باندھ کے یاد رکھتی ہوں کہ مجھے ان سے بچنا ہے۔“

یوسف آنکھوں میں حیرت و تاسف کی جدا، جدا دو دنیائیں لیے اسے دیکھتا رہ گیا۔

”اور تیرے خیال میں تو اپنا نصیب بدل لیتی ہے۔“ اب کی بار اس کے لہجے میں چھوٹے بچے کی نادانی پہ امڈنے والا افسوس تھا۔

راجی نے بڑے وثوق سے سر ہلایا۔

”اگر تیرا نصیب اتنا ہی تیرے بس میں ہے تو پورے کا پورا کیوں نہیں بدل لیتی۔“

راجی نے تیر کو چبھنے والی نظروں سے اسے دیکھا تھا مگر یوسف پہ اثر نہ ہوا۔

”چل میرے ساتھ بھاگ لے۔ شہر لے جاؤں گا تجھے۔ رانی بنا کے رکھوں گا تجھے رانی۔“

"تیرا دماغ اتنا بھی کام نہیں کرتا یا عشق نے تیری مت ہی ماردی کہاناں کہ کہیں نصیب پتھر پہ کھدی لکیر سا بھی ہوتا ہے......" بات ختم کر کے وہ غلیل سے چھوٹے کنکر کی طرح اٹھی اور تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔

"عشق نے مت ماردی ہے۔" پیچھے اس کے قدموں کی اڑتی دھول میں آنکھیں جھپکاتا یوسف مسکرا کے خود سے بولا تھا۔

"بڑے زمیندار کے نکاح میں آئی عورت کیسے بھاگے۔"

نم آنکھوں میں دھول پڑ جانے کا بہانہ کر کے آنکھیں مسلتی راجی، پیروں کی ٹھوکر سے وہی دھول اڑاتی راہ بھٹکے مسافر کی طرح اِدھراُدھر ڈولتی اپنی حویلی کو جارہی تھی۔

☆☆☆

"کہاں مرگئی تھی پچھل پیری۔ سڑی دھوپ میں ندی کے پاس تیرا یار آیا تھا جس کے ساتھ......"

نجمہ تندور دہکا کے اس کے انتظار میں خود بھی تنور کے اندر جا بیٹھی تھی۔ اس کے منہ سے ایسی شرمناک باتیں، اسی روانی سے اچھلتی باہر نکلتی تھیں، جیسے غیظ کے عالم میں باچھوں سے تھوک اچھلتا تھا۔

اسے حیا آ گئی۔ یوسف کا ساتھ اور ایسی بات کا تصور، دل میں گدگدی ہوتی تو مسکان کو لبوں سے پھوٹ نکلنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔

اس نے ہمیشہ کی طرح چپ سادھ کر اپنی قسمت میں لکھی ایک اور چھترول کو خود تک آنے سے روکا اور روٹی لگانے بیٹھ گئی۔

نجمہ کو کسی اور ہی بات کی تپ چڑھی تھی۔ ورنہ اس کے سر جھکا لینے پہ اس کے غضب میں اب بھی، کبھی کمی آنے لگی تھی۔ اب، جب راجی سترھواں سن پار کرتی جوانی کا گلابی پہاڑ بڑی سبک خرامی سے چڑھ رہی تھی اور وہ خود اسی پہاڑ کے عقب سے پیرانہ سالی کی طرف تھکے، تھکے قدم بڑھاتی تھی۔

اسے معلوم تھا اس کا فالج زدہ بوڑھا شوہر صرف زمیندار رہ گیا تھا بڑا نہیں۔ اسے ان دونوں کی آنکھوں سے خوف آنے لگا تھا۔ خاوند کی گدلی، سرمئی اور نم...... اس کی بھی نم لیکن شفاف اور سنہری۔

شفافیت اور گدلاہٹ کا بھلا کیا سنگم، سرمئی اور سنہری کا کیسا جوڑ......؟

نجمہ خود زندگی بھر راجی کو ذلیل و خوار کر کے بھی خود کو کم نصیب کہتے ذرا نہ شرمائی تھی۔ یہ اس کی قسمت کا پت جھڑ ہی تھا کہ چوہدری دو بیویاں پا کے بھی دوبارہ وارث نہ پا سکا۔

اپنے نئے دنوں میں اس نے خباثت کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے راجی کی بے بسی پہ بھی کھل کے عیش کیے تھے۔ اس کی ہوس کی تپش سے نجمہ دن رات سلاخ میں پروئی بجی کی طرح چھن، چھن سلگتی تھی...... پر اپنی کم سن سوتن کی معصومیت پہ نہ اسے کبھی ترس آیا نہ بڑے زمیندار کو......

وہ ونی تھی ناں، بیٹے کی لاش کے بدلے لائی گئی زندہ جان۔ اب اسے زندہ لاش بنانا ہی ان دونوں کی زندگی کا مقصد تھا۔ ترس آتا تو بڑا مضحکہ خیز و ہتک آمیز ہوتا۔

کچھ دن جاتے کہ راجی بھی حویلی کا وارث زمیندار کی گود میں ڈال کر اس کی ہیک کا ارار وٹ اور اکڑا دیتی پر اس سے پہلے ہی۔ یعنی پگڑی کا شملہ اونچا ہونے سے پہلے ہی وہ مفلوج ہو گیا۔

چوہدراہٹ' گلے کی خرخراہٹ میں بدل گئی۔ وہ پورے قد سے کھڑا ہونے کے قابل بھی نہ رہا۔

اس روز چوہدرائن نجمہ نے اسے اپنے ہاتھوں سے جلتی لکڑی سے داغ، داغ دیا۔ ان داغوں کے نشان تو جاتے، جاتے چلے ہی گئے پر جلن ہمیشہ کے لیے کھال میں بیٹھ گئی۔ رینگتی، رینگتی دل تک جا پہنچی۔ اب اس کے پورے وجود پہ اسی جلن کا قبضہ تھا۔ اس کا روم، روم ان دیکھی آگ میں جھلستا تھا۔

اس دن کے بعد نجمہ کے منہ کو جیسے لہو کی طرح آگ کا مزہ لگ گیا۔ وہ آتے بہانے کچی انگیٹھی میں سلگتی انگارہ سی لکڑی اٹھاتی، راجی کی آہ و بکا آسمان کو

چھوتی، نجمہ کا جنون بڑھتا جاتا اور سرور آمیز نشہ رگ و پے میں سانپ کی طرح بل کھاتا۔

جس رات اسے یقین ہوتا کہ راجی درد و اذیت کی انتہا پہ کھڑی نیند کو ترسے گی۔ اس رات وہ بے سدھ سوتی۔ اور راجی کے لبوں پہ چیخ، چیخ کر دم توڑتی آہیں۔ بددعا کی صورت اوپر کو اٹھتی سیدھے عرش سے جا ٹکراتیں۔

خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے بے انداز نہیں۔ بالکل ٹھیک ٹھیک نشانے پر اور اس انداز سے پڑتی ہے کہ بلبلانے کا دم نہیں بچتا۔

"بول کہاں گئی تھی مرجاییے۔ منہ میں کیا گڑ ڈال کے بیٹھی ہے۔"

راجی کا دل کیا کہ اس کے منہ میں زہر دے، دے۔

کچھ باتیں صرف دل کی حد تک کرنے ہوتی ہیں۔

"ایویں میں چلی گئی تھی۔"

بات ابھی لبوں کی بیڑیاں توڑ کر پوری طرح باہر بھی نہیں نکلی تھی کہ جلتا شعلہ اس کی کلائی پہ پڑا۔

اس نے تڑپ کر روٹی چھوڑ دی۔ گول، سفید پھیلا ہوا آٹا، بے ہنگم ڈھیری بن کر اندر جا پڑا۔

اس کے پلو سے آج کوئی گانٹھ نہیں بندھی تھی۔

☆☆☆

رات کی بے سمت آہٹوں میں چوہدری کی سرسراتی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔

"میں...... ایں...... تت...... تو تو کہہ...... کہت...... کہتا...... تا ہوں...... ں...... اوں...... نجمہ...... ے سے طط...... طل...... طلا...... لاق دو...... ے دوں...... اوں۔" چوہدری کی آدھی ادھوری بات حلق سے پھنس، پھنس کے نکلتی پر سمجھ آ ہی جاتی تھی۔

دروازے کی طرف آتی راجی کے دل نے شکرے کی طرح فضا میں غوطہ کھایا۔ پھر زمین پر اتر کر بلی کی طرح دبے پاؤں بند دروازے سے چپک گئی۔

"دماغ ٹھکانے پہ ہے تیرا۔"

راجی نے بن دیکھے ہی نجمہ کو اپنی جگہ سے اچھلتا دیکھ لیا۔ اسے بھی اور اپنے دل کو بھی جو چوہدری کی بات سن کر حلق سے باہر آنے کو تھا۔

"گل سن...... ابھی اس کی عمر کم ہے۔ مجھ سے تڑا کے، شفیق سے کر دے اس کا نکاح۔ ایک بار وارث ہو جائے تو پھر شفیق جانے اور وہ......"

کمرے میں موت کا سا سناٹا ہو کے بھرنے لگا۔ چند سے جو خاموشی کے بیتے، گویا راجی کی موت کے پروانے پہ دستخط کی تاخیر میں بیتے تھے۔

"وارث......؟ اپنا وارث؟"

"اور وہ تو جیسے دے، دے گا ناں......" نجمہ تڑخ گئی۔

"دو...... دے...... ے...... گگ...... گا۔"

☆☆☆

"ہونہہ...... کہتا ہے ونی کی اولاد سے اسے کیا مطلب۔" اس نے ایک زوردار گالی کے ساتھ کف اڑایا اور پیر کی ٹھوکر سے کنکر پہ رکھ کے اپنے خاوند کا سر بھی......

دوپہر کی چنختی دھوپ میں املتاس تلے افسردگی اپنا بچھونا بچھا کے سو گئی۔

دو محبت کے روگی اپنے روگ سمیٹے بے سمت سوچوں کے ساتھ سفر کرنے لگے۔ دھیمی...... بے حد دھیمی ہوا کی سرسراہٹ کے عقب میں کہنے کو کچھ بھی نہ بچنے والی کیفیت میں گھری راجی کے کانوں میں یوسف نے صور پھونکا۔

"ان کو مرضی کر لین دے۔"

راجی کا جھٹکے سے اٹھا سر اٹھا ہی رہ گیا۔ یوسف کی پاتال جیسی آنکھوں میں سے کون سا مستقبل باہر آنے کے لیے راستہ ڈھونڈ رہا تھا، اسے بتانے کی ضرورت تھی نہ راجی کو پوچھنے کی۔

اٹھارہ کا سن لگتے ہی وہ بھی تو اپنی مرضی کی مالک ہو گئی تھی۔

ایک بار چوہدری اس کے لیے نہ کر دیتا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے شفیق کے لیے ہاں کرنے پہ مجبور نہیں کر سکتی۔

وہ واپسی کے لیے اٹھی تو اس طرح جیسے بھوک مٹ

جانے کا یقین لے کے شیرنی شکار پہ جست لگاتی ہے۔

☆☆☆

ابھی خزاں کا موسم گزرنے میں کئی صدیوں کا سفر باقی تھا۔ کیا پتا یہ موسم گزرتا بھی کہ نہیں۔ وہ ہر طرف سے جی چھڑا کر اپنی بسنتی اوڑھنی کا سوت کاتنے بیٹھ گئی۔

اس روز نجمہ پڑوس کے گاؤں بھائی شفیق سے یقیناً یہی بات کرنے گئی تھی۔

راجی نے تو یوسف کو اپنی آزادی کے پروانے کا دن تاریخ تک مہورت نکال کے دے دیا تھا۔

”چوہدری اپنی زندگی سے بڑا مایوس ہو گیا ہے۔ جبھی تو زور زبردستی کر کے مجھے اپنے بھرا کے پاس بھیج رہا ہے۔“

”تو بس چپکی بیٹھ جا، سنیچر تک اگر چوہدری مطلب کی بات کرے تو ٹھیک رات بارہ بجے حویلی سے نکل کے یہیں آجانا۔“

راجی کا دل یکبارگی ایسے ڈوبا کہ سنہری چہرہ زرد ہو گیا۔

”کیا ہوا ڈر گئی ہے۔“ یوسف کی نگاہیں بھی پکے عاشقوں والی ہی تھیں۔ محبوب کا چہرہ تو یوں بھی کھلی کتاب ہوتا ہے۔ سات پردوں کے پار سے صرف آنکھیں بولتی ہیں اور بات سن لی جاتی ہے۔ یہاں تو کوئی پردہ ہی نہیں تھا۔

راجی نے کچھ نہ کہا بس خفیف سا سر ہلا دیا۔

”ڈرنے دی کی گل ہے۔ میں اِدھر ہی ہوں گا۔ تجھے بس کسی طرح اِدھر تک آنا ہو گا۔“

وہ اب بھی کچھ بولے بنا کلائی کے ادھ بھرے زخم پہ ہاتھ پھیرتی رہی۔ یوسف چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر کلائی تھام لی۔

ایسا لمحہ پہلی بار آیا تھا۔ بن بلائے مہمان کی طرح راجی کے چہرے پہ ناگواری چھا گئی۔ اس نے جھٹکا دے کر خود کو چھڑانا چاہا لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔

”دیکھ راجی، تیرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اگر تو نے اب کی بار ہمت نہ دکھائی ناں تو یہ لوگ تجھے ایک دن بھی کھلا نہیں چھوڑیں گے۔ سوچ بچار میں وقت ضائع کرنے کی بے وقوفی نہ کرنا۔ بس تو سوچ لے۔ نصیب نے تجھے اتنی ٹھوکریں لگائی ہیں۔ اور تیری ذرا سی بزدلی تجھے زندگی بھر کے لیے شفیق کی لاتوں پہ لے جا کے رکھ دے گی۔ میں نے دیکھ رکھا ہے اسے۔ چوہدری سے کچھ کم ہے پر بہت بُرا ہے...... اور تجھے اب اور نہیں سہنا۔ نہ یہ جلے کے نشان نہ کسی کی مار...... تو سمجھ رہی ہے ناں۔“

راجی کی سنہری آنکھوں میں خوف اور ارادوں کے ملے جلے رنگ اس کے چہرے کو دھوئیں دے کے سرخ کر رہے تھے۔

☆☆☆

نجمہ اور چوہدری میں بحث کی گرما گرمی بڑھتی جاتی تھی۔ وہ ہر روز چھپ کے ان کی تو، تو، میں، میں سنتی اور آنے والے وقت کے لیے ہمت کی کرنسی، روپیہ روپیہ جوڑ کے دل کے گلک میں ڈالتی رہتی۔

کبھی اسے لگتا اس کے دن کبھی نہیں پلٹیں گے۔ مایوسی اور نا امیدی کی ایسی کمر توڑتی کیفیت طاری ہوتی جیسی اس وقت طاری ہوئی تھی جب اس نے اپنے ماں باپ کے گھر تیسرا بیٹا پیدا ہونے کی خبر سنی تھی۔ اوروں کے لیے ہوتی خوشخبری لیکن نجمہ اور راجی نے تو اس خبر کے سنتے، اپنے، اپنے انداز میں ماتم کیا تھا۔

نجمہ نے اسے روئی کی طرح دھنکا تھا۔ اور سر ہاتھوں، پیروں، کمر پہ برستے ڈنڈوں کی یلغار میں اسے صرف حیرت یاد رہ گئی تھی۔

اپنی اولاد کو کسی کے بے رحم، جلاد اختیار میں دینے کے بعد بھی اس کے ماں باپ میں اتنی زندگی باقی تھی کہ وہ بچے پیدا کرتے اور پھر اس پر خوشیاں بھی مناتے۔

اس کا دل چاہا تھا کہ ایک بار مائیکے کی دہلیز پہ کھڑی ہو کے اپنے باپ سے سوال کرے۔ اگر دوسری بار تمہارے بیٹوں نے کسی اور کے گھر کا چراغ گل کر دیا تو پھر کس کو ونی کے نام پہ بھینٹ چڑھاؤ گے۔

ایک بار...... بس ایک بار ان کی خوشی کو ایسی ٹھوکر

اچھی باتیں

☆ اللہ کی راہ بظاہر کانٹوں سے بھری ہے مگر درحقیقت اطمینان اور سکون کی دولت سے بھری پڑی ہے۔

☆ انسان کو اپنے اندر جھانکنا آجائے تو وہ دوسروں کے احساسات کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

☆ جب تک انسان مشکلات کے مصائب میں گرفتار نہیں ہوتا اس کے جوہر نہیں کھلتے۔

☆ کچھ لوگ اپنے خلاف تو ایک لفظ برداشت نہیں کر سکتے لیکن اپنا زیادہ تر وقت دوسروں پر تنقید کرنے میں صرف کرتے ہیں۔

مرسلہ: سعدیہ وحید سعدی، اسلام آباد

مار کے آئے جیسی انہوں نے اس کے نصیب کو ماری تھی۔ ایک بار اُن سے یہ پوچھ کے، زندگی بھر کے لیے ان کے بیٹوں کے کھٹولوں میں خدشے کا کھجور رکھ آئے۔ پھر بھلے سے وہ قیامت تک بیٹے جنتے رہیں۔ مگر بیٹی کی کمی کا احساس ہمیشہ دماغ کے کسی کونے میں ڈنگ اتارتا رہے۔

نجمہ کی بحث کی دم توڑتی کیفیت، اس کا دم بحال کرتی جاتی۔ پھر سنیچر آیا۔ نجمہ بکتی جھکتی ساتھ والے گوٹھ روانہ تو ہو گئی پر جاتے، جاتے اس کے منہ پہ تھوک کے گئی۔ اس نے چٹخے ہوئے آئینے میں اپنے گیلے رخسار کو دیکھ کے تسلی دی کہ صبر کی کتاب کے یہ آخری باب اسے اتنی ہی خندہ پیشانی سے برداشت کرنے ہوں پھر انشاء اللہ ... شکر کا نصاب بھی شروع ہو ہی جائے گا۔

☆☆☆

سنیچر کی رات، نجمہ بہت دیر سے گھر لوٹی۔ آتے ہی اگیٹھی دہکا کے خاص چمن کے سوکھا خشک بالن ڈالا اور سب سے اوپر لمبی سی سلاخ لگا کے چوہدری کے کمرے میں گھس گئی۔

وہ رات بھی کیسی عجیب رات تھی۔

راجی کا سانس آخری اسٹیشن جھٹکے لے، لے کر چلتے انجن کی طرح اکھڑ گیا تھا۔ پسینہ شیشے کی اور جاتی برف کی طرح پگھل، پگھل کر اسے نہلا رہا تھا۔ نجمہ کی مٹھی میں دبوچے بال اتنی زور سے کھنچے تھے کہ اس نے شدت سے چاہا اس کے سر کی کھال چھوڑ کے نجمہ کے ہاتھ میں ہی رہ جائیں۔

دن پلٹنے کو تھے بلکہ شاید پلٹ ہی گئے تھے مگر سیدھے ہونے کے بجائے اوندھے منہ......

”بول کون تھا تیرا یار جس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کے بھاگی تھی۔ بول...... خود دیکھا ہے شفیق کے کمی نے۔ وہ تو اچھا ہوا اس نے ہماری بات سن کر سب بتا دیا۔ ورنہ تجھ جیسی بدچلن......“

بولتے چلاتے اس کی سانس ہانپ گئی۔ راجی چوہدری کی مسہری کے پاس چپل کھائے لال بیگ کی طرح پڑی تھی۔ ادھ مری، بے جان سی۔

یہ تو ان دونوں نے بارہا سوچا تھا۔ الگ، الگ سوچا تھا، ساتھ بیٹھ کے بھی۔ ملنے سے پہلے اور ملنے کے بعد بھی... کہ کسی روز ان کا ملنا کسی کی نظروں میں آگیا تو کیا ہو گا لیکن اب یہاں تک آ کر...... اتنے جتنوں کے بعد...... اب جب کے اس کی پیاس، محض ایک اوک بھر کے پینے تک رہ گئی۔ اب کھلنا ضروری تھا۔

کتنا سیدھا اور صاف تھا سب کچھ۔

زندگی میں پہلی بار اس کی مرضی ہونے چلی تھی۔ اس نے کبھی اپنے نصیب کے پھرنے کی دعا نہیں مانگی تھی۔ اس کے لب سدا خاموش رہے تھے۔ اس نے یوسف سے ملنے سے پہلے مقدر کے لکھے کو ہی بس جانا تھا۔ اس پہ شکر نہ سہی صبر تو کیا تھا۔ جس کا صلہ اسے اس بھیانک شکل میں مل رہا تھا۔ نجمہ کی گالیاں، اونچی چھت سے ٹکرا رہی تھیں۔

سب کو پتا تھا وہ آئے دن نجمہ کے کٹہرے میں ناکردہ جرم کی پاداش میں کھڑی ہوتی اور چار چوٹ کی مار کی حقدار قرار پا جاتی تھی۔ ایسے واویلے کسی کے لیے انوکھے نہیں تھے۔ نجمہ اور اس کی آوازیں حویلی کے دالان سے بھاگ کر باہر نکلتیں بھی تو کوئی کانوں تک پہنچ جانے کے بعد بھی دادرسی کو نہ آتا تھا۔

"ایسے نہیں بولے گی۔ اس کی زبان کھلوانے کا انتظام میں کرکے آئی ہوں۔"
نجمہ پھولی سانس کو برابر کرنے کا انتظار کیے بغیر ہی باہر نکل گئی۔
"کک...... کیو......وں......اوں...... یو...... وہت......پل......پل......نکل آ......ئے......ئے...... تے......ررررر...... چوہدری کے لیے بھی اپنے غیظ پہ قابو پانا مشکل تھا بس نہیں چلتا تھا اپنے مفلوج جسم کو گھسیٹتا ہوا لے جاکر راجی پہ برس ہی جائے۔
راجی کی سماعتوں میں نجمہ کی سلگائی ہوئی سلاخ گھس گئی۔ وہ ہمیشہ کے لیے بہری ہوگئی۔ کانوں میں گونجتی یوسف کی آواز کے سوا کچھ نہ رہا۔
"تیرے پاس اب کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اب اور نہیں سہنا مارنہ یہ جلنے کے نشان۔"
اس کی ادھ مری آنکھوں میں کسی ڈائن کا عکس لہرایا۔ جس کے لہو ٹپکاتے پنجوں میں سرخ انگارہ دبا تھا۔
"کیوں...... بہت اتراہٹ ہے تجھے اپنی اس شکل پہ۔ میں تیری یہ شکل ہی بگاڑ دوں گی۔"
☆☆☆
سمے کے پیالے میں قطرہ، قطرہ لہو کی طرح ٹپکتی گھڑیاں اس کی بے بسی پہ تاسف کرتی، رک رک کر آگے چلتی تھیں۔
پوری حویلی راجی کے سوگ میں ڈوب کر بوجھل ہو گئی تھی۔ اس کے گال پر جلتا انگارہ ٹھہر گیا تھا......
چھوٹے اور اندھیرے کمرے کی سپاٹ دیوار سے کھڑکی کھول کے یوسف اندر جھانک رہا تھا۔
"کس لیے...... کس کے لیے...... اور نہیں سہنی...... مارنہ ظلم اور نہ ٹھوکریں۔"
اس نے کرلاتے ہوئے چہرہ صاف کیا۔ جلے ہوئے نم داغ پر نمکین پانی گر کر مرچیں سی لگاتا تھا۔
"تو نے کہا تھا نصیب ہمیشہ ایک سا نہیں لکھا ہوتا۔ کہیں پانی پہ کہیں پتھر پہ کہیں مٹی پہ...... رجھلی...... الگ، الگ تختی کے لیے لکھائی بھی الگ ہوتی ہے۔ کہیں سیاہ، کہیں سفید، کہیں سرمئی، کہیں سنہری...... چل اٹھ...... آجا...... ٹھوکروں میں اڑا کے سب کی مرضی اور ان کی زندگیاں، اپنے نصیب کی سیاہی کو سنہری خط میں بدل دے۔"
یوسف اس کے ٹخنے میں باریک دھاگا باندھ کے اسے کھینچ رہا تھا۔
وہ بار، بار کہنیوں پہ زور ڈال کر اٹھتی کہ دھاگا ٹوٹ جاتا۔ وہ منہ کے بل گر کر سسکنے لگتی۔
جانے کتنا سمے بیتا تھا۔ اس کی کوششوں کو کامیابی کا پانی ملا تو وہ سرکتی ہوئی، اپنے خاوند کے کمرے کے دروازے تک پہنچی۔
چوہدری آدھا منہ کھولے گہری نیند میں غرق تھا۔
"تن...... ہی...... ایں...... ددوں ل ل...... لک کا...... طلاق......"
اس کے سر میں ہٹ دھرمی کے بم پھٹنے لگے۔
نفرت کے فلک بوس جن نے پر پھیلا کے اسے ڈھانپ لیا اور وہ ان ہی کالے پروں کی اماوس تلے رسم و رواج کی قید سے ہمیشہ کے لیے باہر نکل آئی۔
"قسمت کے پھندے کنکر بن کر پیروں تلے آجاتے ہیں۔ اگر انہیں ٹھوکر سے اڑایا نہ جائے تو سدا تلوے کے نیچے چبھ، چبھ کر تکلیف دے دے کر ہمیں غلطی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔"
حویلی چھوڑنے سے پہلے چوہدری کی چادر کا کونا مٹی کے تیل میں بھگو کر چراغ کی لپکتی لو کو اس کے نیچے رکھ آئی تھی۔
باہر سے بند دروازے کی کنڈی کھلتے، کھلتے اس کی قسمت بھی کھل ہی جاتی تھی۔
املتاس کے گھنے اندھیرے تلے حرکت کرتا شعلہ دور ہی سے دیکھ کر، اس نے پلو سے بندھی گرہ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے کھول دی۔ اب کچھ یاد رکھنے کی ضرورت تھی نہ یاد کرنے کی۔
بلی کی بھینٹ چڑھائے گئے نیم جان تن نے اپنے نصیب کے پتھر سے جلتی یادوں کے کاغذ باندھ کر انہیں ٹھوکر سے اڑا دیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کا جائزہ لیا...... نقاب ایک ہاتھ سے اٹھائے کرسی پر عجلت سے بیٹھنے پر اس کا برقع بے ڈھنگے انداز میں کرسی کے ہتھے پر لٹکا ہوا تھا...... پیشانی گو کہ نقاب میں چھپی ہوئی تھی مگر پسینے کی بوندیں شاید پیشانی سے ہی خارج ہو کر چہرے پر تیرتی پیلی رنگت کو اور بھی زرد کرتی لگ رہی تھیں...... سوکھے ہونٹ، آبدیدہ گہری آنکھیں...... میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اسے کبھی اس حلیے میں دیکھوں گا۔ یوں تو میں ہزار ہا بار اس کو اپنے سامنے گڑگڑاتے، معافی مانگتے اور روتے تصور کرچکا تھا اور ہر بار مجھے اپنے اس قدر ڈرامائی تصور میں نشے جیسا سواد آتا تھا...... مگر آج...... آج جبکہ وہ واقعی میرے سامنے سراپا التجا بنی ہوئی تھی تو میرے لیے اپنے لہجے کی سختی اور چہرے پر نخوت کو برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا...... میں نے خود پر قابو پانے کے لیے جلدی سے انٹرکام پر سیکرٹری کو پانی بھجوانے کی ہدایات دے دیں...... تھوڑی ہی دیر میں ملازم پانی کی بوتل اور دو گلاس رکھ کر چلا گیا...... ملازم کے آنے پر اس نے

راز

ہاجرہ ریحان



نقاب واپس چہرے پر ڈال لیا تھا مگر مجھے کوئی فکر نہیں تھی...... کیونکہ اس شہر میں وارد ہوتے ہی میں نے بہت سی فلاحی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا تھا اور اکثر ہی میرے آفس میں غریب خواتین اپنے کسی نہ کسی مسئلے کو لیے آجاتی تھیں...... ایسے میں رونے دھونے کا سلسلہ چل نکلنا اب آفس میں کام کرنے والوں کے لیے عام سا معاملہ تھا۔

میں نے اسے بات کرنے کا موقع ہی کم دیا تھا...... بس دوٹوک اپنی ڈیمانڈ رکھی تھیں اور اب اس کا... گڑگڑانا، التجائیں، منتیں سن کر بھی کج روی سے کرسی پر براجمان تھا...... میں کرسی گھما کر منہ کھڑکی کی طرف کر کے بیٹھ گیا مگر کن انکھیوں سے دیکھ سکتا تھا کہ وہ ہلکی، ہلکی ہچکیوں سے روتی چلی جارہی ہے...... برقع میں چھپے اس کے کندھے مسلسل ہچکولے کھارہے تھے...... اس نے کپکپاتے ہاتھ سے بھری بوتل کو ہلکے سے اٹھایا اور واپس رکھ دیا...... پھر سر میز کے کنارے سے ٹکا کر وہ ایک دم خاموش ہوگئی...... مجھے خوب اندازہ ہورہا تھا...... اب رونے تک تو ٹھیک ہی تھا...... مگر میرے آفس میں اپنے مسئلے کے لیے آنے والی خواتین میں سے آج تک کوئی غم و دکھ سے بے ہوش نہیں ہوا تھا...... اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ اس طرح بے ہوش ہونے والوں کو کیا طبی مدد درکار ہوتی ہے...... میں نے ایک بار اسے نام لے کر پکارا اور جواب نہ ملنے پر اٹھ کر اس کے قریب پہنچا...... جیسے سوکھی ریت کا محل بس ذرا ہاتھ لگانے سے بکھر جاتا ہے ویسے ہی میرے اس کے کندھے کو ذرا سا ہلانے پر ہی وہ کرسی سے زمین پر گر پڑی...... میں نے مجبوراً اسے اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر دیوار سے لگے صوفے پر احتیاط سے لٹا دیا...... نقاب اٹھایا...... اور پانی کے دو چار گھونٹ بھی کسی طرح پلادیے...... مگر اس کی بے ہوشی برقرار تھی...... ڈاکٹر کو بلانے کے میں حق میں نہیں تھا کیونکہ...... بات کھل سکتی تھی...... وہ کوئی غریب معمولی عورت نہیں تھی۔ ایک بہت ہی امیر اور مشہور فلم پروڈیوسر کی بیوی تھی...... اکثر ہی فلموں کے پریمیر پر اس کی اپنے شوہر کے ساتھ تصویریں اخباروں اور رسالوں میں چھپتی رہتی تھیں...... وہ میرے پاس برقع میں آئی تھی اور مجھے خوشی تھی کہ اس نے یہ احتیاط اختیار کی گو مجھے اس بات پر الگ غصہ تھا کہ وہ اس وقت لوگوں سے نہیں بلکہ اپنے شوہر اور بیٹے سے چھپ کر مجھ سے ملنے کے لیے آئی تھی...... وہ اپنے شوہر کو ہمارے بارے میں اب تک نہ بتا نہیں پائی تھی...... مگر مجھ سے ملنے...... مجھ سے اپنی بات منوانے کے زعم میں بھی بہرحال مبتلا تھی...... اور یہ غلط فہمی میں نے چند ایک جملوں میں ہی مٹا دی تھی...... جس کے بعد وہ روتے، روتے بے ہوش ہوگئی تھی۔ میں تھوڑی دیر تو بیچ آفس میں کھڑا سوچتا ہی رہا کہ کیا کروں اور پھر آخر کار یہی فیصلہ ہوا کہ یمی کو بلالیا جائے...... ویسے بھی وہ راز کی پہلی تہ تک تو رسائی رکھتی ہی تھی۔ اسے خود بخود ہی اندازہ ہوجائے گا کہ وہ یہاں مجھ سے نقاب میں ملنے کون سی التجا لے کر آئی تھی...... اور راز کی اس تہ سے نیچے کی تہوں تک پہنچنے کی یمی کو ضرورت بھی نہیں تھی۔

یقیناً ایسا ہی ہے کہ راز کی بھی مختلف تہیں ہوتی ہیں...... ایک کے اوپر ایک صدیوں سے پڑی، ایک دوسرے سے جڑی یہ تہیں آپس میں کچھ یوں گڈمڈ ہوجاتی ہیں کہ کبھی کھولنے پر آئیں تو زندگی کو ہی الجھا دیں...... اس لیے ہم سب اپنے، اپنے راز کی تہوں کو ملنے والوں کی مجال، دماغ اور ہمت تک ہی کھولتے ہیں...... وہ کوئی خاص ہی ہوتا ہے جو آہستہ، آہستہ ہمارے راز کی ہر تہ کو کھولتا چلا جاتا ہے اور آخر کار ہماری ذات کے خالی پن تک میں جھانک لیتا ہے۔ ہر ملنے ملانے والا نہ تو اتنی ہمت رکھتا ہے اور نہ ہی وقت......

اور راز کی پہلی تہ تو بس اسی بات پر محیط تھی کہ عدنان کا رشتہ یمی کے لیے آیا تھا اور میں بحیثیت یمی کے والد...... رشتے پر سوچ بچار کا وقت لے چکا تھا۔ اب یمی اگر اسے میرے آفس میں اس طرح بے ہوش پا بھی لیتی ہے تو یہی سمجھتی ہے کہ عدنان کی والدہ اپنے بیٹے کی سفارش لے کر آئی تھیں اور میرے انکار کو سہہ نہ سکیں...... جبکہ راز کی دوسری تہ تک تو یمی کبھی نہیں پہنچ سکے گی...... رشتے سے انکار کی وجہ عدنان کے والد کا فلم پروڈیوسر ہونا نہیں بلکہ میرا اپنا بدلہ...... میری اپنی انا کی تسکین اور ضد ہے...... بھلا یمی یہ بات کیونکر جان سکتی ہے کہ اس بدلے کی آگ نے مجھے کس قدر کرب میں مبتلا رکھا...... اب تک کس قدر بے چین رہا ہوں میں، کیسی آگ تھی جو نہ بجھی نہ ہی کبھی بھڑک سکی...... میں اندر ہی اندر جلتا گیا اور ہر دم میرے دماغ میں بدلے کی دھن سوار رہی...... یمی تو کیا...... کوئی بھی کبھی نہیں جان سکے گا کہ اس راز کی ایک اور جان لیوا تہ بھی موجود ہے...... اور وہ یہ کہ میں نے اپنی ہی بیٹی کو انتقام کی آگ بجھانے کے لیے استعمال کیا۔ کسی بھی انسان تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہوتے ہیں...... بس اس انسان کو ذرا غور سے دیکھ لو تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ کس طرح...... کس ذریعے سے اس تک رسائی ہوسکے گی اور یہ بھی خوب اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس تک رسائی کی ضرورت ہے بھی یا نہیں...... مطلب یہ کہ بلاوجہ میں کسی سے راہ و رسم بڑھانے کا عادی نہیں...... میری طبیعت ہمیشہ سے ایسی ہی تھی...... اس وقت بھی جب میں ایک خاص حلقۂ احباب رکھ سکتا تھا اور اب تو شاید زیادہ ملنا ملانا میرے لیے نقصان دہ ہے...... کیونکہ زیادہ ملنے ملانے سے آپ کی اصل شخصیت سامنے آنے لگتی ہے۔ اور اصلیت دکھانے کا ابھی میرا وقت نہیں آیا۔

میں ابھی چند مہینوں پہلے ہی مستقل طور پر پاکستان رہنے آیا تھا...... ساری عمر دیارِ غیر میں گزار کر اب اپنا کاروبار اپنے ہی ملک میں جمارہا تھا...... یمی بھی اپنی ماں کے انتقال کے بعد سے میرے لیے زیادہ ہی حساس ہوگئی تھی۔ مگر میرے یہاں قدم رکھتے ہی راز ایک کے بعد ایک کر کے میرے دل و دماغ میں کروٹیں لینے لگے...... اور پھر جیسے ہی مجھے پتا چلا کہ عدنان کی ماں کون ہے، میں نے کسی نہ کسی طرح اسے نیچا دکھانے کا پلان تیار کرلیا...... اور اس حساب سے مجھے اسے مکمل طور پر ناکام کرنا تھا۔ یمی نے عدنان کی ماں کی جتنی بھی تعریف کی میرے دل کی جلن بڑھتی چلی گئی...... مجھ سے بے وفائی کر کے وہ بڑے مزے میں گھر بنائے، سجائے بیٹھی ہے۔ اسے، اس کے گھر میں ہی ذلیل و خوار کرنا ہے، اس کی عزت کی جب تک سرِ عام نیلامی نہیں ہوگی مجھے چین نہیں ملے گا اور شاید چین تو مجھے اس کے بعد بھی نہیں ملے گا مگر تھوڑا بہت اطمینان ضرور ہوجائے گا...... گیا وقت واپس نہیں آتا۔ مگر بدلہ مل جائے تو صبر آجانے میں مدد ضرور مل جاتی ہے...... لہٰذا یمی میری اپنی بیٹی انجانے میں میرے لیے وہ راستہ بن گئی جس کے ذریعے میں نے اپنے دشمن کے دل پر کاری ضرب لگائی ہے گو وہ اب تک بے ہوش، بے سدھ تھی مگر مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ منزل قریب آچکی ہے۔ میں چند ایک دنوں میں انتقام لے چکوں گا اور یمی یا کوئی بھی کبھی یہ نہیں جان پائے گا کہ اس رشتے سے میری اس قدر مخالفت آخر ان چند دنوں میں ہی کیوں ظاہر ہوئی...... یمی تو ہر دو چار دن بعد مجھے اپنے یونیورسٹی کے دوستوں کے ساتھ گروپ فوٹو بھیجتی رہی ہے۔ جس میں ہر بار عدنان اس کے بالکل برابر میں کھڑا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے فون پر بھی عدنان اور اس کے خاندان کے بارے میں مجھے بتایا تھا مگر میں اب تک خاموش رہا تھا۔ میں نے ایک بار بھی یمی کو عدنان سے الگ یا دور ہونے کا کوئی بچاؤ نہیں دیا تھا...... پھر اچانک عدنان کے گھر والوں سے ملتے کے ساتھ ہی کیا ہوا......؟ اور کس قدر گہری ہے راز کی وہ تہ جس پر میں اب بھی خود کو کئی بار شاباشی دے چکا ہوں۔

”کیا کوئی بیٹے کی پسند کے رشتے سے انکار پر اس طرح بے ہوش ہوا ہے...... اس قدر بے سدھ ہوا ہے؟“

نہیں...... اس بے ہوشی کی اصل وجہ میرا انکار نہیں بلکہ یہ ڈیمانڈ ہے کہ وہ اپنے شوہر اور اپنے بیٹے عدنان کے سامنے یہ اعتراف کرے کہ شادی سے پہلے اس نے مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچایا تھا...... پھر ہوسکتا ہے کہ میں یمی اور عدنان کے رشتے کے لیے ہاں کردوں...... وہ اپنی گم شدہ محبت کا واسطہ دینے آئی تھی میں نے بھی اسی گم شدہ محبت کے اعلان پر فیصلہ رکھ دیا تھا...... وہ پہلے تو انکار کرتی رہی...... اپنی بدنامی، رسوائی اور موت سے ڈراتی رہی۔ میں بے پروائی سے

اپنی بات پر ڈٹا رہا...... اس پر تو گزری سو گزری میں اپنے آپ میں بہت مطمئن تھا...... بہرحال ایسوں کو سزا دینی چاہیے تاکہ اگلوں کو سبق ملے...... اب اس کے ہنستے بستے گھر کی آگ ہی میرے اندر کی آگ بجھا سکے گی...... وہ ہوش میں آ کر بھی سیمی کو یا عدنان کو کچھ نہیں بتا سکتی...... اپنے بیٹے کا گھر آباد کر لے یا اپنا اجاڑ لے...... میرے لیے دونوں ہی باتوں میں جیت تھی۔

اپنے راز کی اس قدر گہری اور تاریک تہوں کو دل میں چھپائے میں نے بڑی معصومیت سے سیمی کو فون ملا لیا...... وہ یونیورسٹی سے واپس گھر جا رہی تھی اور میرے کہنے پر آفس آنے پر فوراً ہی تیار ہوگئی...... میں نے فون رکھ کر یونہی اس کی طرف نظر کی...... اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے اور چہرے پر وحشت ناک مردنی چھا گئی تھی...... میری سانس تھم گئی اور دل بے قابو سا دھڑکنے لگا۔

میں نے ایک بار پھر سے پانی کے چند ایک چھینٹے اس کے چہرے پر مارے مگر اس کی حالت بدستور رہی جانے کب مجھے اس پر رحم آنے لگا...... میں نے قریب بیٹھ کر دو چار بار اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا...... اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلایا کہ شاید وہ جاگ جائے...... مجھے یاد آیا کہ سیمی نے یا پھر عدنان نے ہی کبھی بتایا تھا کہ وہ باقاعدہ شاید کسی ذہنی بیماری کی دوائیاں لیتی ہے۔ میں نے کرسی کے پاس قالین پر رکھے اس کے پرس کو بے دھڑک کھول کر دیکھا...... پرس کی بیچ کی جیب میں مجھے ایک چھوٹا سا دوائی کا ڈبا نظر آ گیا تھا...... لیبل کو دیکھا تو ایک گولی دن میں تین بار اور نیچے ہنگامی صورت کی ہدایات تھیں کہ ضرورت ہو تو ایک ساتھ تین گولیاں کھائی جا سکتی ہیں...... میں نے جھٹ گلاس میں تھوڑا سا پانی لے کر تین گولیاں چور کر کے ملائیں اور اچھی طرح محلول بنا کر اسے پلانے لگا...... اسے سہارا دے کر میں نے صوفے پر بٹھا دیا تھا...... وہ تمام محلول پانی سمجھ کر جلدی سے پی گئی اور پھر ایک طرف لڑھک گئی...... اسے پھر سے صوفے پر لٹا کر میں کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب ہی براجمان ہو چکا تھا...... پتا نہیں کب میرا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ ذرا سی ہی دیر کو سہی آنکھیں کھولے...... ایک دو لفظ ہی سہی کچھ تو کہے...... اتنے میں سیمی اندر آئی...... وہ پہلے تو برقع میں لپٹی صوفے پر لیٹی خاتون کو دیکھ کر ٹھٹکی مگر پھر اس کو پہچان کر ہماری طرف لپکی...... میں نے سیمی کو صرف اتنا ہی بتایا کہ کس طرح وہ عدنان اور سیمی کے رشتے پر نظرِ ثانی کی درخواست لے کر آئی تھی مگر میرے انکار پر بے ہوش ہوگئی...... سیمی نے جلدی، جلدی اس کے پھنسے ہوئے برقع کو اتارا...... اس کے سر کے نیچے دو چار کشن رکھ کر اس کی حالت کو قدرے آرام دہ کرنے کے درمیان یہ بھی پوچھ لیا کہ میں نے دوائی کب اور کتنی پلائی ہے...... جس طرح سیمی اس کے بارے میں بات کر رہی تھی مجھے بڑی حیرت ہوئی...... ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی بیماری اور حالت کے بارے میں سب جانتی ہے۔ اپنی ماں کے گزرنے کے بعد کافی عرصہ سیمی اکیلی رہی اور شاید اسی اکیلے پن میں عدنان کی ماں کے ساتھ اس کے روابط مضبوط ہوگئے...... اپنی ہی بیٹی کا اس کے لیے اس قدر حساس ہونا میرے لیے برداشت کرنا پھر سے بہت مشکل ہو رہا تھا...... میں پلٹ کر اپنی میز پر رکھی چیزوں کو خواہ مخواہ ہی اِدھر اُدھر کرنے لگا...... سیمی اچانک میری طرف پلٹی اور تھوڑے سخت لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگی۔

”پاپا پلیز...... سچ، سچ بتایئے گا...... انہوں نے آپ سے کیا کہا؟“ میں ایک لمحے کو تو گڑبڑا گیا تھا مگر پھر فوراً ہی خود پر قابو پا کر میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”یہی کہ اسے عدنان عزیز ہے اور تم کو بھی دل سے چاہتی ہے وغیرہ وغیرہ......“

سیمی میز کے سامنے رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ چکی تھی...... مگر اس کی سنجیدگی اب مزید گہری ہوگئی تھی۔

اب کی بار وہ جیسے کہیں گہرائی سے گویا ہوئی۔

”پاپا...... مجھے...... بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس محبت کے نام پر لوگ کیسے، کیسے گھناؤنے کام کرتے

ہیں...... کس طرح ایک دوسرے کو استعمال کرتے ہیں، رد کرتے ہیں، خود آگے بڑھ جاتے ہیں مگر پھر بھی چین نہیں ملتا...... محبت کو جنگ بنا لیتے ہیں، انا کا مسئلہ سمجھ لیتے ہیں، پلٹ، پلٹ کر وار کر دیتے ہیں...... محبت تو دلوں میں وسعت ڈالتی ہے، معاف کرنا سکھاتی ہے، یہ کیسی محبت کرتے ہیں کچھ لوگ کہ ان کے دل اور بھی چھوٹے، کٹھور اور پتھر بن جاتے ہیں؟“ میں دل ہی دل میں مسکرا اٹھا...... میری بیٹی نے بالکل میرے ہی دل کی بات کہہ ڈالی تھی...... میں جو اپنے ہی راز میں مگن تھا، یہ نہیں دیکھ پا رہا تھا کہ آخر سیمی یہ سب کس کے لیے کہہ رہی ہے...... میں نے اسے دلاسا دینے کے لیے کہا۔

”یہ خود غرض لوگ ہوتے ہیں بیٹا...... جن کو صرف اپنی خوشی اور اپنا سکھ نظر آتا ہے...... یہ محبت کے نام کا صرف ڈھونگ رچاتے ہیں...... ان کو صرف اپنے دل کی فکر ہوتی ہے بس ان کا اپنا دل مگن رہے دوسرے دل کے ٹوٹ جانے کی آواز تو کیا...... انہیں خبر تک نہیں ہوتی...... ایسے خود غرض لوگ زندگی میں تنہا رہ جاتے ہیں، ان کا انجام صرف تنہائی ہوتا ہے اور کچھ نہیں......“

اب کی بار سیمی مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی اور میں خود کو چور محسوس کر رہا تھا...... یہ میں انجانے میں کس کے بارے میں بتا گیا...... یوں تھا کہ میں اپنی ہی بات کر رہا تھا۔

”پاپا...... سوری کہ میں آپ کو اب بتا رہی ہوں کیونکہ پہلے یہ سب بتانا مجھے ضروری نہیں لگا تھا مگر اب لگا ہے کہ اب آپ کو بتانا بہت اہم ہے کہ عدنان...... پاپا عدنان آنٹی کی سگی اولاد نہیں ہے۔“ میں اس انکشاف پر ڈگمگا گیا اور سہارے کے لیے میز کی دوسری جانب اپنی کرسی پر جا بیٹھا...... سیمی نے مجھے سنبھلنے کے لیے دو چار لمحے دیے اور پھر اچانک کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتی بتانے لگی۔

”اور آپ کو معلوم ہے کہ عدنان کے والد نے آنٹی سے کیا کہا...... ہر قدم پر ہر مقام پر انکل کس قدر تکلیف دہ حرکتیں کرتے رہے ہیں کہ جب، جب عدنان نے مجھے کچھ بتایا میں کانپ کر رہ جاتی تھی۔ عدنان کو آنٹی نے اپنی اولاد سے بڑھ کر محبت دی...... عدنان بھی انہیں اپنی سگی ماں جیسا ہی چاہتا ہے اور بس یہی بات انکل کو اس قدر ناگوار لگتی...... کہ وہ آئے دن آنٹی کو زچ کرتے رہتے...... ہر خوشی کے موقع پر کوئی نہ کوئی فضیحتہ بناتا تو جیسے انکل کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو...... اللہ جانے ان کے پاس ایسی چالوں کے لیے عقل کہاں سے آ جاتی ہے...... آپ نے کہا ایسے لوگ تنہا رہ جاتے ہیں...... میں پوچھتی ہوں مگر جس دل کو ایسے لوگ اس قدر دکھ دے چکے ہوتے ہیں جن کے ساتھ اس قدر سفاکی کر چکے ہوتے ہیں آخر وہ کہاں جائیں...... کس سے فریاد کریں؟“

سیمی بے تکان بولتی چلی جا رہی تھی جیسے آج وہ بھی راز کی کئی تہوں کو کرید، کرید کر اکھاڑ رہی تھی اور میں دم بخود بیٹھا تھا۔

”اور اب یہ نیا تماشا...... جیسے ہی انکل کو معلوم چلا کہ آنٹی اور عدنان دونوں ہی اس رشتے سے خوش ہیں انہوں نے پھر سے ایسی گھناؤنی حرکت کی...... مجھے عدنان کا نہیں معلوم مگر میں نے آنٹی سے صاف کہہ دیا تھا کہ انہیں کوئی ضرورت نہیں کہ وہ آپ سے کسی بھی قسم کا کوئی اعتراف کریں...... بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی...... صرف آنٹی کا فرض تو نہیں کہ وہ اس قدر ذلت اٹھاتی رہیں اور دوسروں کی محبت میں خود کو تکلیف دیتی رہیں...... آخر وہ بھی انسان ہیں...... کبھی کوئی اچھا بھی لگ سکتا ہے۔ اب اگر قسمت میں نہیں تھا ملنا تو قسمت سے لڑا تو نہیں جا سکتا ناں...... ایسے میں انسان اپنے ساتھی سے ہمدردی چاہتا ہے...... اور ساتھی کا ساتھ ہوتا ہی کس لیے ہے مگر انکل...... اس قدر گھٹیا بات...... انہوں نے آنٹی سے ڈیمانڈ کی کہ پہلے وہ اپنی شادی سے پہلے کے افیئر کا اعتراف آپ سے کریں...... آپ کو کھل کر بتائیں کہ انہیں کبھی کوئی پسند تھا...... مگر شادی انہوں نے نہیں کی...... اس کے بعد ہی بات آگے بڑھے گی...... ایسی چھوٹی، گھٹیا بات توبہ، توبہ......“ سیمی تو اپنی دُھن میں بولتی چلی جا رہی

تھی، یہاں مجھے اپنی ڈیما نڈ یاد آ گئی۔

میں اندر ہی اندر کانپ گیا۔

”اے خداوندا...... یہ کیا...... یہ دو مرد اتنے سالوں سے محض ایک کمزور سی عورت کو توڑنے...... اس کی انا کو زچ کرنے، اس کے سر کو ندامت سے جھکانے کے لیے حالتِ جنگ میں رہے۔ ہم دونوں نے اس سے محبت کے دعوے کیے اور ہم دونوں ہی اس سے انتقام لیتے رہے اور بدلے کے موقع تلاشتے رہے...... یہ میں نے کیا کر دیا ہے...... یہ مجھ سے کیا ہو گیا ہے؟“

جانے کب عدنان آفس میں داخل ہو چکا تھا...... شاید سیمی نے اسے فون کر کے بلا لیا تھا...... اس نے شرمندہ نظروں سے مجھے دیکھا...... اور فوراً ہی اپنی ماں کی طرف متوجہ ہوا...... وہ اپنی ماں کو بانہوں میں بھر کر ہوش میں لانے کے لیے ہلکے، ہلکے آواز دینے لگا جبکہ سیمی پانی لیے اس کے ساتھ ہی لگ کر کھڑی تھی۔ دونوں بچوں کی اس کے لیے اس قدر محبت دیکھ کر میں حیران رہ گیا...... میں تو ابھی چند منٹوں پہلے تک اسے خود غرض کہہ رہا تھا...... خود غرض لوگ ایسی..... بے لوث محبت کبھی نہیں پا سکتے۔ ایسی محبت تو بس ان لوگوں کے حق میں آتی ہے جن کے اپنے دل محبت سے چھوٹے، کٹھور، پتھر نہیں ہوتے...... بلکہ محبت کے چھوئے جانے پر ان کے دل اور بھی گداز، درد مند اور نرم پڑ جاتے ہیں۔ ایسی محبتیں تو ایسے ہی گداز دلوں کے سائے میں پلتی ہیں...... عدنان کا اپنی ماں کو محبت سے اپنی بانہوں میں بھر کر احتیاط سے آوازیں دینا...... سیمی کا پانی لیے ساتھ ہی کھڑے ہونا...... جیسے ایک مکمل جامع لمحہ تھا...... یہ سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ ہی اچھے لگیں گے۔ عدنان اپنی ماں کو سیمی کی مدد سے گاڑی میں بٹھا آیا تھا اور اب میرے سامنے شرمندہ سا سر جھکائے کھڑا تھا۔

”سر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ جیسی بھی ہیں میری والدہ ہیں اور مجھے ان کی عزت دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ آپ کا جو بھی فیصلہ ہو مگر آپ سے میری ماں نے جذبات میں جو کچھ بھی کہا ہے، آپ پلیز اس بات کو اپنی حد تک رکھیے گا...... میں آپ کا احسان مند رہوں گا......“ عدنان بہت مؤدبانہ انداز میں [illegible] کر رہا تھا اور مجھے اس پر اچانک پیار آنے لگا...... اچھا لڑکا ہے...... میں نے گلا کھنکھار کر موضوع بدلا۔

”تمہاری ماں کب تک ٹھیک ہو جائیں گی مطلب یہ دورہ...... سیریس تو نہیں؟“

عدنان اس اچانک سوال پر چونک گیا...... پھر سنبھل کر بولا۔

”تکلیف دہ تو ہے مگر ان کو اور ہمیں عادت ہو گئی ہے...... انشاء اللہ...... چند ایک ہفتوں میں ان کی طبیعت سنبھل جائے گی...... میں ان کے پاس ہی رہوں گا......“

”ہاں ٹھیک ہے، چاہو تو سیمی کو بلا لیا ہو...... مجھے کوئی اعتراض نہیں......“ میری اس فراخ دلی پر وہ ایک بار پھر سے چونک کر مجھے غور سے دیکھنے لگا...... اور اثبات میں زور، زور سے سر ہلانے لگا...... میں پھر گویا ہوا۔

”اصل میں...... مجھے چند سالوں کے لیے پھر سے بیرون ملک جانا پڑے گا لہٰذا میں چاہ رہا ہوں کہ یہ شادی جتنی جلد ہو سکے نمٹا دوں...... کیونکہ اس کے بعد مجھے دوسرے پلان بھی بنانے ہیں۔“ عدنان کے چہرے کے افسردہ تاثرات مسکراہٹ سے معدوم ہو گئے...... اس نے بڑی احتیاط سے پوچھا۔

”سر اگر محسوس نہ کریں تو پلیز بتائیں کہ امی نے آپ سے کیا کہا...... کیا بتایا آپ کو......؟“ میں نفی میں سر ہلانے لگا...... پھر عدنان سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے گویا ہوا۔

”کچھ راز اس قدر تہ میں چھپے ہوتے ہیں کہ ان کو کریدنے سے صرف ماضی کی راکھ ہی ملتی ہے، اس لیے ینگ مین تم سکون سے گھر جاؤ اور سیمی کو جلد واپس بھجوا دینا...... یاد رہے ابھی اس پر صرف میرا حق ہے...... ناؤ گیٹ آؤٹ......“



تعویزِ حُب

فرح طاہر

اس نے ایک نظر اُس پتھر دل انسان کی طرف دیکھا اور گہری سانس بھر کر رہ گئی...... وہ آج بھی پہلے دن کی طرح اس کی طرف سے بے نیاز تھا...... اس کی اس قدر بے نیازی.... اسے توڑ کر رکھ دیتی مگر پھر وہ سر جھٹک کر نئے سرے سے شمع کے گرد پروانے کے مانند لپکنے لگتی...... کیا کرتی دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اب جو وہ دل کی منہ زوری پر سر جھکا دیتی تھی تو خواری تو مقدر ہونا ہی تھی...... عشق بھی تو کمال تھا، وہ خوار ہونے کو جی جان سے

تیار تھی...... مگر مقابل...... وہ کٹھور ایک نظر تک ڈالنے کا روادار نہ تھا...... وہ سلگتی، بلکتی...... موم بن کر لحہ، لحہ پگھلتی...... مگر پھر نئے دن کے نکلتے سورج کی روپہلی روشن کرن کے ساتھ ہی نئے سرے سے جی اٹھتی کہ ”شاید“ آج...... اب ایک نظر...... اور اس شاید ہی نے شاید اسے خوش فہمیوں کی بے جواز دنیا میں الجھایا ہوا تھا...... تبھی وہ ہر دن کا آغاز اچھی امید سے کرتی پر دن ڈھلنے تک بے دم ہو کر سسکتی رہ جاتی۔

☆☆☆

وہ اس سے ایک سال سینئر تھا...... یونیورسٹی کے پہلے دن جو اُس کی نظر اس پر پڑی تو پہلے ہی مرحلے پر اس کا دل اسے دغا دے گیا...... اور وہ...... اپنے دل کی اس بے وفائی پر بری طرح کراہ کر رہ گئی تھی...... حالانکہ وہ اسے جانتی تک نہیں تھی...... اسے تو تب یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ اسٹوڈنٹ ہے یا یونیورسٹی کا کوئی ٹیچر...... اس نے تو بس ایک نظر دیکھا...... اور اپنا آپ اس پر ہار دیا...... وہ تو بعد میں باقاعدہ کلاسز اسٹارٹ ہوئیں تو اسے خبر ہوئی کہ وہ اس سے ایک سال سینئر ہونے کے ساتھ، ساتھ اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز سب کی فیورٹ لسٹ میں ٹاپ پر تھا۔ پھر جب اس نے ہر زبان، ہر آنکھ میں اس کے لیے پسندیدگی محسوس کی تو پہلے تو اس کا سر آپوں آپ فخر سے بلند ہونے لگا...... پھر جو ملنگ ہو کر اس کے دل نے اتراہٹ بھری دھمال ڈالنا چاہی تو دماغ نے فوراً سرزنش کرتے ہوئے اس کے پیروں میں اعتراض کی بیڑی ڈالتے ہوئے کہا۔

”تم کاہے کو اڑنے کو ہو......؟“ دماغ نے تیکھی نظر سے گھوری ڈالی۔ وہ جھوم کر مسکرائی...... بالکل ایسے جیسے کوئی دانشور کسی ناسمجھ بچے کے معصوم سے سوال پر دھیرے سے مسکراتا ہے...... بالکل ایسے ہی مسکراتے ہوئے اس نے میٹھے انداز میں کہا۔

”میں کاہے کو نہ اڑوں...... وہ میرا ہے، میری پسند، میری محبت اور......“ جذبات کی رو میں نہ جانے وہ کہاں تک بہکتی...... جب دماغ نے درمیان میں ہی ٹوک کر اس کی بات اچک لی۔

”ہاں...... تمہاری پسند...... تمہاری محبت...... تمہاری اور صرف تمہاری...... اس کی نہیں...... تو اس طرفہ محبت میں تم کاہے کو باؤلی ہوئی جا رہی ہو۔“ دل اپنے اصولوں پر اس کو روبوٹ بنائے ہوئے تھا تو دماغ نے اپنے قاعدے اس پر عیاں کرنے کی ٹھان لی...... دل و دماغ کے ان اصول و قواعد میں گھن چکر ہوئی وہ بری طرح چکرائی تھی۔ دل کی فر، فر چلتی زبان پر زوال اتر آیا تھا...... کچھ غلط نہیں کہا تھا دماغ نے...... اس کا تھا...... مگر صرف اس کی سوچ کی حد تک حقیقت تو اس کے بالکل برعکس تھی...... پھر وقت کے پہیے نے سرکتے لمحے کے ساتھ یہ حقیقت بہت اچھے سے واضح کر دی تھی کہ اس کے جذبات سراسر ایک طرفہ تھے مقابل تک اس کے جذبات کی آنچ تک نہ پہنچی تھی۔ شعلوں کی بھڑکن کی تو پھر امید ہی کہاں تھی...... اور وہ تھی کہ شعلوں کی لپیٹوں میں آنے کی خواہش میں گیلی لکڑی کے مانند سلگتی جاتی تھی۔

تیز بخار ہونے کے باوجود بھی آج وہ اس کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر یونیورسٹی آئی تھی اور اب کاریڈور میں بیٹھی اس کی منتظر تھی مگر وہ تھا کہ آ کے نہیں دے رہا تھا۔

”یہاں بیٹھ کر انتظار میں گھلنے سے اچھا ہے کہ تم جا کر اس کے فرینڈز سے معلوم کر لو...... ہو سکتا ہے وہ آج آیا ہی نہیں ہو...... اور تم یہاں بیٹھی انتظار ہی کرتی رہ جاؤ۔“ اس کی بیسٹ فرینڈ یمنیٰ نے لحہ بہ لحہ بگڑتی اس کی حالت دیکھ کر اس کے لیے فکرمند ہوتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔

”پاگل ہوئی ہو تم......“ چکراتے سر کے ساتھ اس نے بخار کی شدت سے بند ہوتی آنکھوں سے اس کی طرف برہم نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جس سے بات کرنے کی چاہ میں، میں مری جاتی ہوں آج تک اس سے بات کر نہ سکی اور اب جا کر اس کے دوستوں سے اس کی بابت دریافت کروں۔ کمال کرتی ہو تم بھی یمنیٰ......“ آخر میں وہ ناراض ہونے لگی تو یمنیٰ نے محبت سے اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔

”ہاں تو کس نے کہا ہے تم یوں خود کو اذیت میں مبتلا

[کر]تی ہو......؟ شروع دن سے تمہیں کہہ رہی ہوں تم اس سے [محبت] کرتی ہو...... اسے پسند کرتی ہو تو جا کر اسے بتاؤ...... [نہیں] بتا سکتیں تو کم از کم کسی طرح اس کو اپنا اور اپنی محبت کا احساس دلانے کی کوئی کوشش تو کرو۔ جب تم اس کو اپنی [محبت] کا احساس دلاؤ گی تبھی تو وہ دیکھے گا، سوچے گا تو پھر [شاید] خود ہی جائے گا مگر تم ہو کہ میری بات پر عمل کر کے [ہی نہیں] دیتیں۔“ خفا سے لہجے میں آخر میں وہ اپنے لفظوں پر [زور] دیتے ہوئے مزید بولی۔ ”محبت کرتی ہو تم اس [سے]...... اور محبت ہمیشہ اظہار کی تمنائی ہوتی ہے۔“ یمنیٰ سنجیدگی [سے بو]لی۔ ”دریہ...... تم اگر محبت کو اظہار کا پانی نہیں دو گی تو [یہ پودا] بھلا یہ کیسے پروان چڑھے گی؟“ استفہامیہ نظروں سے [یمنیٰ] نے اس کی طرف دیکھا تو دریہ نے درد بھری مسکان کو [لبوں] پر سجا کر بس اِک پل کو دیکھا...... دوسرے پل سر جھکا [کر اس] نے بہت دھیمی آواز میں کہا تھا۔

”جانتی ہوں، محبت اظہار کی تمنائی ہوتی ہے...... مگر [اظ]ہار اگر مرد کی جانب سے ہو تو محبت خود اپنے ہونے پر [نازاں] ہو کر سرخروئی کے درجے تک رسائی حاصل کر لیتی [ہے]...... جبکہ عورت کی طرف سے اظہار کا نتیجہ صرف ذلت و [خوا]ری اور رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا...... بھیک سمجھتا [ہے] مرد، عورت کے اظہارِ محبت کو...... اور تم چاہتی ہو میں [اس] کے پاس جا کر اس سے بھیک مانگوں......؟“ سوالیہ [نظرو]ں اس کے چہرے پر ٹکاتے ہوئے آخر میں وہ بہت [دکھ] بھرے لہجے میں بولی تھی۔

”میری محبت مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی [کہ می]ں اس کو جا کر بتاؤں میں دریہ عظیم تمہاری محبت میں داسی بن [کر تم]ہاری اِک نظر کی چاہ میں اپنا آپ تم پر لٹانے کو تیار [بیٹھی] ہوں......“

اس کی بات توجہ سے سنتی یمنیٰ آخر میں بری طرح [ہنس] دی۔

اس کا منہ ہی تو کھل گیا۔

”آں...... محبت اور خودداری ایک ساتھ......“

”یہ کیا کہہ رہی تھی دریہ عظیم...... محبت کی دعویدار ہو [تم]، کیا اس بات سے واقف نہیں تھی کہ محبت کو نام ہی

رواج و وجود دونوں کو مٹا دینے کا ہے...... اور بٹ جانے والی چیزوں میں کاہے کی خودداری...... کاہے کی انا......؟ تو پھر مطلب یہ ہوا کہ اس نے محبت کے پاٹ کو پڑھ تو لیا...... مگر ابھی وہ حفظ کی منزل سے دور تھی۔

”یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے دریہ عظیم...... چھوڑ دو تم محبت کرنا۔“ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے یمنیٰ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

”سیدھا سیدھا یہ کیوں نہیں کہہ دیتی کہ تم مر جاؤ دریہ......“ اس کی بات پر وہ تڑپ کر دوبدو بولی...... تو یمنیٰ ایک دم بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس دی...... اور پھر کتنی ہی دیر پاگلوں کی طرح ہنسنے کے بعد اس کی غصیلی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے پُرمزاح انداز میں بولی۔

”وہ تو میں نہیں بھی کہوں گی...... تب بھی تم مر جاؤ گی...... ذرا حالت دیکھو تم اپنی...... موت کی دہلیز سے بس ایک قدم کے فاصلے پر کھڑی دکھائی دے رہی ہو تم......“ آخر میں وہ باقاعدہ طنز پر اتر آئی تھی...... جبھی تیکھی نظروں سے دیکھتی مزید بولی۔

”خود اپنی حالت پر ترس کھانے کی اشد ضرورت ہے تمہیں...... رحم کرو اپنی ذات پر نہ جانے کون سی قسم کی محبت کا راگ الاپے ہوئے ہو تم......؟ میں اگر تمہاری جگہ ہوتی ناں تو سیدھا سیدھا آفان حیدر کے سامنے جا کھڑی ہوتی...... اور سیدھا سیدھا ہی بولتی......“

”دیکھو صاحب تم سے محبت کرنے کی جسارت کر بیٹھی ہوں...... اب بتاؤ اپنے ساتھ کی خوشی سے نوازنے کا ارادہ رکھتے ہو یا نہیں......؟ اگر تو وہ ہاں کرتا تو اپنی خوش نصیبی پہ نازاں ہو کر میں اس کے سنگ محبت کے اگلے سفر پر چل پڑتی اور اگر وہ نہ کر دیتا تو...... ٹھیک ہے میرے لیے مشکل ہوتا...... مگر پھر بھی میں آگے ہی کی طرف قدم بڑھاتا تھا...... اب بھلے سے آگے کا وہ سفر میرا محبت کا سفر نہ ہوتا...... مگر زندگی کا سفر بھی تو اپنی جگہ اٹل حقیقت رکھتا ہے ناں رکتا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ آگے کا سفر سبھی کو کرنا

ہوتا ہے...... پھر چاہے وہ سفر جیسا بھی ہو...... مگر تم ہو کہ ایک ہی مقام پر رک کر دھرنا دیے محبت کا راگ الاپ رہی ہو، محبت کے اصولوں پر چلنے کے بجائے محبت کو اپنے اصولوں پر چلانے کی ضد کرکے بیٹھ گئی ہو...... آخر کیا بنے گا تمہارا دریہ......؟'' بخار کی حدت سے سرخ پڑتے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں پیار سے بھرتے ہوئے اس نے اس کے لیے بے حد پروا کا اظہار کیا تھا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے تمہاری اس چکوری محبت سے دریہ......'' خوف زدہ لہجے میں کہتے ہوئے آخر میں اس نے جیسے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''تم اس چکوری محبت کو چھوڑ کر سیدھی سادی محبت کیوں نہیں کر لیتیں لڑکی......؟'' اس کے چہرے پر جمی اس کی استفہامیہ نظروں میں کسی خیال کے تحت چمک ابھری تو وہ ایک دم پُرجوش ہو کر بولی۔

''سنو...... تم نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی ناں...... اب تم ایک کام کرو...... اس سارے کھڑاگ کو اِک طرف کرو اور بس دعا کرو...... اپنے لیے، اپنی محبت کے لیے چھوڑ دو اس کو اس سے مانگنا...... اب تم اس کو خدا سے مانگو...... پھر دیکھنا کیسے وہ پتھر موم ہو کر تمہارے قدموں میں آن بیٹھے گا......'' یقین بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے جیسے یقین کی پختہ ڈور اس کے ہاتھوں میں تھمائی تھی۔ دریہ عظیم کی ڈوبتی ابھرتی آس کی ناؤ ایک دم کنارے سے لگی۔

''دعا سے وہ مجھے مل جائے گا؟'' اس نے بچوں کی سی معصومیت سے سوال کیا تو یمنیٰ نے شدومد سے سر ہلایا۔

''ہاں، ہاں بالکل...... تم اللہ سے مانگ کر تو دیکھو......'' اس نے پُریقین لہجے میں کہا۔

اور پھر واقعی اس نے پاؤں سمیٹ کر مصلیٰ سنبھال لیا۔

ایک دن...... دو دن...... اور پھر دونوں کی گنتی بھلائے سر جھکا کر آنکھیں بند کیے خاموش لبوں سے وہ بارگاہِ خداوندی میں سراپا دعا بن گئی۔

''یا اللہ......! مجھے میری محبت عطا فرما دے۔''

''پیارے اللہ مجھے آفان حیدر دے دے۔''

''رب العالمین! مجھے آفان چاہیے......''

جوں، جوں مانگتی گئی شدت بڑھتی گئی...... بالآخر اس کی شدت کی طلب نے اسے اس قدر [illegible] کیا...... کہ وہ آفان حیدر کے لیے خدا کے حضور [illegible] بن کر سسک اٹھی۔

''مجھے وہ چاہیے اللہ...... مجھے آفان [illegible] چاہیے......'' بلند ہوتی سسکیوں کا گلا گھونٹتی وہ آنکھیں [illegible] کیے بے دم ہو کر مصلے پر جیسے ڈھیر ہوئی کراہ رہی تھی۔

''میں مر جاؤں گی اللہ...... مجھے میرا آفان [illegible] دے......'' اور شاید یہی وہ گھڑی تھی...... جس [illegible] میں اس کی دعا عرشِ معلیٰ کے دروازے پر کھڑی [illegible] خداوندی کی منتظر تھی۔ مگر کون جانے قبولیت کا نزول [illegible] صورت میں وقوع پذیر ہوتا تھا...... یا پھر شاید نزول [illegible] تھا...... جیسے ابن آدم کی چاہ میں اس کی جانب ایک [illegible] بڑھایا گیا تو اس نے سارے راستے اس کے لیے [illegible] کرتے ہوئے روشن کر دیے...... جن پر آنکھ بند کر چلتی وہ محبت کے در [illegible] آ گری آگے بڑھتی [illegible] تھی...... جب ایک مقام پر چونکا کر اسے رک جانے کا [illegible] ہوا...... اور وہ رک گئی۔

''فرمایا گیا دیکھو......'' اس نے نظر کی چلمن [illegible] اٹھا دیا۔

حکم ہوا ''سنو'' اس نے اپنے بدن کے [illegible] سماعت بنا کر دھیان لگا دیا...... کہا جا رہا تھا۔

''اے ابن آدم ایک چاہت ہے تیری...... اور ایک چاہت ہے میری...... اگر تو چاہے گا وہ جو میری چاہت ہے تو میں کروں گا وہ جو تیری چاہت ہے...... اور اگر [illegible] چاہے گا وہ جو تیری چاہت ہے تو پھر ہو گا وہی جو [illegible] چاہت ہے۔ بس تو چاہ وہ جو میری چاہت ہے۔''

کیا سمجھایا جا رہا تھا؟ اس کے سمجھنے کے لیے وہ [illegible] کے سارے دھارے اس سمت موڑ دیے......

''اے ابن آدم......! ایک چاہت ہے میری دوسری چاہت ہے تیری۔'' نمائندگی چاہت کو دے [illegible] گئی تھی۔

[illegible] تیری میری اور میری، تیری کے درمیان شرط رکھ دی گئی تھی تیری اور میری کا فلسفہ اب سمجھنا اسے تھا...... وہ سمجھنے کی سعی کرنے لگی...... اور جب سمجھ آئی تو اس کی سانسوں کی روانی پر جیسے زوال اتر آیا۔

ایک تیری، ایک میری...... میری، تیری...... تیری، میری...... اور میری پر اٹک کر اس کا وجود ساکت ہو گیا...... بند آنکھیں مکمل کھل گئیں...... ہلتے لب پتھر ہو گئے...... اور اسی پل ہر طلب دم توڑ گئی...... اب بس ایک سوچ باقی تھی کہ یہ وہ کیا کر رہی تھی......؟ اس کے سامنے بیٹھ کر ''اس کی'' بھلا کر ''اپنی، اپنی'' کیے جا رہی تھی...... تو پھر اس کی کہاں تھی؟ وہ جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔

وہ اس کے سامنے گئی بھی تو ''اپنی'' کی غرض سے...... لب بھینچ کر اس نے ندامت سے سر جھکا لیا...... دعا کو اٹھے ہاتھ بے جان ہو کر اس کی گود میں آن گرے...... وہ نظر نہیں اٹھا پا رہی تھی...... خود سے نظر ملانا دشوار ہونے لگا تو جھکا سر ندامت کے بوجھ سے مزید جھک گیا۔

پھر یہ اس کا معمول بن گیا...... وہ خشوع و خضوع سے اس کے سامنے حاضر ہو کر اس کے لیے جھکتی...... مگر دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے بنا وہ سر جھکا کر بن مانگے اٹھ جاتی...... اپنے لیے سزا اس نے خود ہی مقرر کر لی تھی...... مگر پھر بھی یہ شرمندگی مٹ کے کیوں نہ دے رہی تھی؟ درد بڑھتا گیا جوں، جوں دوا کی عملی تفسیر بنی...... بے قراری مزید اس سے لپٹ، لپٹ جاتی تھی...... ایسے ہی بے قراری کے دنوں میں نم آنکھوں کے ساتھ وہ عصر کی نماز کے معمول کے مطابق دعا کو ہاتھ اٹھائے بنا بن مانگے اٹھنے لگی تو امی نے اسے ٹوک دیا۔

''دریہ! دعا تو مانگو بچے......''

وہ کافی دنوں سے اس میں در آتی تبدیلی کو نوٹ کر رہی تھیں...... پہلے وہ اس کی نماز، قرآن کی طرف توجہ دیکھ کر خوش ہوئیں...... مگر جلد ہی انہیں چونکنا پڑا...... اور چونکنے کے بعد انہوں نے مزید غور کیا تو وہ پریشان ہو گئیں۔

''دریہ نے خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانے چھوڑ دیے تھے...... مگر کیوں......؟'' کافی دن خاموشی سے نوٹ کرنے کے بعد بالآخر آج انہوں نے اس کو ٹوک ہی دیا...... مگر ان کی بات سنتی دریہ نے ان کو جواب دینے کے بجائے زیرِ لب انہی کے کہے لفظ دُہرائے تھے۔

''دعا، مانگوں...... میں......؟'' اس نے نظر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا۔

''ہاں...... تم دعا مانگو...... جس بھی چیز کی تمہیں خواہش وہ دعا میں خدا سے طلب کرو...... مگر یوں دعا کو مت......'' وہ مزید بھی کچھ کہہ رہی تھیں...... مگر ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دریہ نے رسانیت سے کہا۔

''میری کوئی خواہش باقی نہیں رہی امی...... اب مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔''

اس نے کہا اور سر جھکا لیا...... اب وہ ان کو کیا بتاتی کہ وہ اس ذات باری تعالیٰ سے شرمسار ہے...... اس کی شرمندگی اور ندامت کا بوجھ اسے اس ذات کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے روکے ہوئے ہے...... اور پھر وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اب مانگے بھی تو کس منہ سے...... اس سے پہلے کہ اس کی سوچ کا طائر پرواز بھر کر خیالات کی وادی میں اسے مزید آگے کی طرف دھکیلتا...... اس کے جواب پر دہل کر امی نے کہا۔

''اگر تمہیں اس سے کچھ نہیں چاہیے...... تو کیا اسے تم سے تمہاری عبادت چاہیے ہو گی؟'' امی کی بات پر اس نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ کچھ بولنے کو لب وا ہوئے تھے مگر امی نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا تھا۔

''وہ عاجزی پسند کرتا ہے...... اور دعا میں عاجزی ہے...... دعا یہ ظاہر کرتی ہے کہ انسان کتنا بے بس ہے...... کس قدر عاجز ہے، وہ محتاج ہے اس ذات باری کا جس کے قبضۂ قدرت میں سارا جہان ہے...... تو کیا تم دعا سے انکار کر کے اس کی قدرت سے اس کی شانِ کریمی سے انکاری ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہو دریہ......؟'' شدتِ جذبات سے امی جان کا چہرہ سرخ ہو گیا...... ان کے

لفظوں پہ دریہ کے لب سل کر سختی سے آپس میں جڑ گئے...... مگر دماغ نے چیخ، چیخ کر اودھم مچایا۔

”نہیں...... ایسا نہیں ہے...... ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ غم وغصے کی زیادتی کے باعث امی لب بھینچ کر اس کے پاس سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھیں۔ پیچھے بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتی دریہ عظیم اکیلی بیٹھی سسک پڑی تھی۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے امی...... میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہوں امی...... میں...... اور مجھ جیسی گناہ گار جو اپنے گناہوں میں لتھڑے ہاتھ اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتی ہے...... تو میں اس کی ذات سے اس کی شانِ رحمانی، شانِ کریمی سے بھلا انکار کیسے کرسکتی ہوں...... میں اس کی ذات سے انکار کر ہی نہیں سکتی...... ایک اسی کی تو ذات ہے جو رحمان ہے...... رحیم ہے...... کریم ہے...... وہ اللہ ہے، اللہ، اللہ......“ ہچکیاں لے کر روتی بے ربط سا بولتی لفظ اللہ پر جیسے کائنات کا ذرہ، ذرہ سماعت بنا سر بسجود ہوا تھا...... وہ بھی رکی...... سجدے میں گری اور ہاتھ پھیلا کر اپنے رب کے حضور پیش ہوگئی۔

”میں غلطی پر تھی...... اپنی غلطی کے احساس کے باوجود میں معافی طلب کیے بنا غلطی پر غلطی کرتی رہی...... میں شرمندہ ہوں میرے اللہ مجھے معاف کردے......“

خاموش لبوں سے نکلتے لفظوں سے بے قراری کو جیسے قرار ملنے لگا تو وہ پُرسکون ہوتی چلی گئی...... پھر اس کے سکون کو اگلے دن آنے والی یمنیٰ کی کال بھی...... بے سکون تو نہ کرسکی۔

”کہاں ہو دریہ...... پورے تین دن ہوگئے تمہیں یونیورسٹی سے غیر حاضر ہوتے ہوئے......؟“

”ہاں بس ویسے ہی......“ اس نے گول مول سا جواب دیا جس پر غور کیے بنا یمنیٰ نے کہا۔

”کل تو آرہی ہوں ناں تم...... یاد ہے ناں کل فیئر ویل پارٹی ہے؟“ اس نے یاددہانی کروانی چاہی......

”مجھے یاد ہے...... مگر میں نہیں آرہی پارٹی میں......“ اس نے رسانیت سے کہا۔ اس کے انکار پر یمنیٰ ماؤتھ پیس میں جیسے چلائی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم...... تم پارٹی میں نہیں آرہیں؟ تم......؟ حالانکہ تم اچھے سے جانتی ہو کل آفان حیدر کا یونیورسٹی میں آخری دن ہے...... کل کے بعد پھر تم اسے نہیں دیکھ سکوگی...... اس کے باوجود تم کہہ رہی ہو جو کہ تم پارٹی میں نہیں آرہیں......؟“ حیرت کی زیادتی سے اس کی آواز پھٹنے کے قریب تھی۔ جسے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنے سابقہ انداز میں کہا۔

”ہاں، مجھے پتا ہے...... اس کے باوجود بھی میں کل نہیں آرہی......“ اسے علم تھا وہ جتنی دیر اس سے بات کرتی یمنیٰ نے اس سے اسی طرح بحث کرتے رہنا تھا...... اور وہ اب بحث کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے اپنی بات کہہ کر اس کی مزید سنے بنا کال ڈسکنکٹ کرکے سیل فون آف کرکے دراز میں ڈال کر جیسے خود کو اس سب سے لاتعلق کردیا۔

پھر گزرتے وقت کے ساتھ اس کی لاتعلقی میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آسکی...... یمنیٰ اس کی بے حسی پر اسے اس کی آفان حیدر سے کی گئی محبت کے طعنے بڑے زور شور سے مارتی...... جسے وہ تحمل سے سن کر مسکراتی پھر پیار سے اس کے غصے سے تمتماتے گال کو تھپتھپاتے ہوئے آگے چل پڑتی۔ پیچھے بک، بک کرتی یمنیٰ کھولتی ہوئی پہلے اسے گھورتی اور پھر لب بھینچ کر تیز قدم اٹھاتی اس کے پیچھے لپک کر اس کے ہمراہ ہولیتی۔

وقت کی پنکھی تیزی سے گھومی اور اس کا یونیورسٹی کا آخری سال اختتام کو پہنچا پھر جیسے ہی اس کی تعلیم مکمل ہوئی اس کے والدین نے اس کی شادی طے کردی...... اور جب یہ خبر یمنیٰ تک پہنچی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے مقابل سراپا سوال بنی تھی۔ اسے اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو ماں، باپ کی مرضی کے آگے سر جھکائے ہوئے تھی۔

”تم شادی کررہی ہو؟“ انداز بلا کا تیکھا تھا۔

”ہاں......“ وہی یمنیٰ کا دل جلا کر راکھ کردینے والی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس نے سر ہلا کر اعتراف کیا تو وہ جیسے چلائی تھی۔

”میں نے پورا ایک سال تمہیں کچھ نہیں کہا دریہ...... اس وقت بھی تم سے کچھ نہیں پوچھا جب تم نے خود کو ”بوجھ سہیلی والی پہیلی......“ بنا کر مجھے امتحان میں ڈالے رکھا تھا۔ میں خود سے اندازے لگا، لگا کر ہلکان ہوتی رہی مگر تم بھوٹ کے نہ دیں...... مگر اب تم مجھے بتادو آخر ایسا کیا ہے؟ کہاں گئی تمہاری وہ افلاطونی محبت...... جس کے لیے تم مرجانے کو تیار تھیں۔ اگر میں خود ان لمحوں کی گواہ نہ ہوتی تو چلو پھر بھی مان لیتی کہ بس وہ بس ایویں سی محبت تھی جو محبوب کے سامنے سے ہٹ جانے پر اور وقت گزرنے پر مرکھپ گئی...... مگر اب جب مجھے معلوم ہے تمہاری محبت مرکھپ جانے والی تھی ہی نہیں تو پھر تم کیسے کسی اور سے شادی کو تیار ہو......؟“ سوالوں کی نہ ختم ہونے والی بوچھاڑ تھی جس کے گھیرے میں لے کر وہ دریہ عظیم کو آج امتحان میں ڈالنے کو تیار بیٹھی تھی۔

دریہ نے چپ رہ کر اس کے سب سوالوں کو سنا...... پھر ایک گہری سانس بھر کر پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کیوں خود کو ہلکان کررہی ہو پیاری...... چھوڑو سب یہ پانی پیو...... اور میری شادی میں آنے کی تیاری کرو......“ اس کے نزدیک جیسے اس کے سوالوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی...... اس کا ردِ عمل دیکھ کر یمنیٰ کی آنکھیں ابل پڑیں۔

”دریہ تم آج بھی میرے کسی سوال کا جواب نہیں دو گی؟“ دکھ کی زیادتی سے بھاری ہوتی آواز میں اس نے کہا پھر جواب کی چاہ میں کچھ دیر اس کے سامنے کھڑی رہی...... مگر جب دریہ کے آپس میں پیوست لبوں کو نہ ہلتا پایا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے ایک طرف کیا اور جیسے کے پہلے اس کے کمرے اور پھر اس کے گھر سے نکلتی چلی گئی...... مگر دریہ کے دل سے وہ کیسے نکلتی جہاں اس کے تصور سے مخاطب ہو کر اس نے کہا تھا۔

”معاف کردو پیاری دوست...... مگر تم ہی بتاؤ...... میں تمہارے سوالوں کے کیا جواب دوں؟ کیونکہ تمہارے سوالوں کے جو جواب میرے پاس ہیں...... وہ تمہیں بتادوں تو تم کبھی ان پر یقین نہیں کروگی...... اور جب تم یقین نہیں کروگی تو بتاؤ میں تمہیں کیونکر یقین دلاسکوں گی...... تم ہی بتاؤ میں کس طرح بتاؤں کہ آفان حیدر کو پانے کے لیے تم نے مجھے جس راستے کی طرف جانے کو کہا تھا...... اس پر چل کر مجھے اس محبت کی چاہ میں مبتلا کردیا گیا ہے۔ جس کے مقابل مجھے اپنی محبت کی طلب باقی نہیں رہی...... میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کو اس کی محبت کے چراغ میں تیل کی جگہ ڈال کر اس کی محبت کے چراغ کو روشن کر چھوڑا ہے...... کروگی تم میرا یقین......؟ ہاں کبھی نہیں...... کبھی نہیں کروگی تم میرا یقین۔“ اس نے...... بے بسی کے شدید احساس تلے دب کر اپنے ہونٹوں کو بری طرح کچلتے ہوئے تھک کر پھر اس کے تصور سے مخاطب ہوتے ہوئے ہم کلامی کی تھی۔

”تمہیں یقین دلانے کو میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ میں اپنا دل چیر کر تمہیں نہیں دکھا سکتی...... تمہیں تو لگے گا کہ میں نے محبت کے نام پر کھلواڑ کیا...... مگر تم یہ بھی جانتی ہو میں نے محبت میں کھیل تو کبھی کھیلا ہی نہیں...... یہ بس ”اس“ کی رضا میں راضی بہ رضا ہوتا ہے......“

یمنیٰ اس کی ایسی دوست تھی جس نے ہمیشہ اس کی ان کہی ہر بات کو اس کے بولنے سے پہلے اس کی ہونٹوں کی جنبش سے سمجھا تھا تو پھر اب نہ جانے وہ کیوں اسے سمجھ نہیں پارہی تھی۔ یمنیٰ کی ناراضی حقیقتاً اسے بے چین کررہی تھی۔ اسی لیے اس نے اسے منانے کے لیے فون کیا...... مگر وہ شاید بہت زیادہ خفا تھی اس لیے یمنیٰ نے اس سے بات کرنے سے صاف انکار کردیا...... یمنیٰ کے مان کو ٹھیس پہنچی تھی...... دریہ کو احساس تھا...... مگر وہ کرتی بھی کیا......؟ اسے منانے کی ایک آخری کوشش میں وہ شادی کارڈ لے کر خود اس کے گھر گئی...... تو وہ اس کی پہنچ سے بہت دور اسلام آباد اپنے ماموں کے گھر جا

بیٹھی تھی جو اس کی مکمل ناراضی کا واضح ثبوت تھا...... دریہ بے انتہا ڈسٹرب ہوگئی...... گہرے پچھتاوے نے اسے بری طرح اپنی لپیٹ میں لے کر یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ کاش وہ اپنے منہ کو بند نہ رکھتی...... جو تھا جیسا تھا اسے بتا دیتی...... پھر چاہے وہ یقین کرتی نہ کرتی...... مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔

زندگی کے نئے سفر پر قدم رکھتی وہ آگے تو بڑھ آئی مگر اب سہیلی کی ناراضی کو سوچ کر وہ ملول سی سر جھکائے اس شخص کی منتظر تھی جس کے نام ہوکر وہ اس وقت یہاں حجلۂ عروسی میں موجود تھی۔

اپنی سوچوں میں گم اسے خبر ہی نہیں ہوسکی اور وہ آکر اس سے ذرا فاصلے پر بیڈ پر عین اس کے سامنے بیٹھ گیا...... وقت کی سانس رک سی گئی۔ کھلی کھڑکی سے جھانکتے چاند نے رک کر حیرت سے انہیں دیکھا...... ہوا نے سرسرا کر سرگوشی کی...... مگر وہ بے خبر اپنے میں گم تھی۔

خیر تو اس وقت ہوئی جب اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کے جھکے سر کو اونچا کیا...... پل دو پل کو غلافی آنکھوں پر سجی پلکوں کی چلمن نے حرکت کی اور آنکھیں ساکت رہ گئیں۔

دربان بے سکوت نے ہاتھ باندھ کر مزید سر جھکا دیا۔

آفان حیدر مجسم حقیقت بنا اس کے سامنے بیٹھا تھا...... دریہ نے بے خودی کے عالم میں ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو چھوا تو آفان حیدر نے اس کے بڑھے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر خوب صورتی سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

اسی پل کھڑکی میں ٹنگے چاند نے بھرپور مسکراہٹ ان کی سمت اچھالی اور مطمئن سا آگے کی طرف سفر کو بڑھ گیا...... تبھی آفان حیدر کی بھاری، دلنشین آواز نے دربان بے سکوت کو اسی طرح سر جھکائے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے دریہ عظیم......“ اپنی ہی بات کو روک کر اس نے زبان کو دانتوں تلے دبا کر بڑی خوب صورتی سے کہا۔

”اوں ہوں...... دریہ آفان...... تمہیں کیا لگتا ہے...... تمہاری وہ مجھ سے چپکے، چپکے کی جانے والی محبت سے میں انجان تھا......؟“ سوال تو اچھا تھا مگر جواب والی دم سادھے تصور میں اس ذات کے سامنے سر بسجود تھی جس نے دیا تھا۔

”تو میری مان...... میں تیری کروں گا......“

اس نے راضی بہ رضا ہوکر اس کی مانی تھی۔ حتیٰ کہ شادی کا کارڈ تک نہ پڑھا تھا۔ مگر ”اپنی“ کی شرط ہٹا دی تھی۔ اب بھلے سے اس نے اپنی شرط ہٹا دی تھی...... وہ...... ذات کیسے اپنے وعدے سے پھرتی......؟ وعدے کو امانت ٹھہراتی ہے...... اس نے اسے بے نیازی سے نوازا تھا...... اس کے جسم کا رواں، رواں اس ذات کے سامنے سربسجود تھا۔

آفان حیدر نے بڑی نرمی سے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ چونک کر بھیگی پلکیں لیے اس کی طرف متوجہ ہوئی...... نم آنکھوں اور کپکپاتے لبوں سے اس نے ایک پل اس کی آنکھوں میں اپنے لیے سچی محبت کو دیکھا۔ دوسرے پل اس کے ہاتھوں پر سر ٹکا کر وہ خوشی کے آنسو لیے پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔

آفان حیدر نے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس نازک سی خوب صورت گڑیا کو بہت چاہ سے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ آفان کی محبت بھری سرگوشیاں سنتے ہوئے وہ خود سے خفا یمنیٰ کو سوچ کر مسکرائی...... اسے یقین تھا وہ اب اس کی ناراضی آسانی سے دور کر لے گی...... کیونکہ اب اس کے پاس اللہ کا دیا انعام آفان حیدر کی شکل میں موجود تھا۔ جو بذاتِ خود یمنیٰ کے سوال کا جواب تھا...... اس کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے اپنی توجہ کے سبھی زاویے آفان حیدر کی طرف موڑ دیے جو اسے اپنی اس محبت کے متعلق آگاہ کر رہا تھا۔ جس نے اسے اس کی محبت سے ہماری محبت کا مسافر بنا کر اس سے ملا دیا تھا۔

چھپے ہیں گلاب محبتوں میں

نبیلہ نازش راؤ



”تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔“ تھک ہار کے اُمّی کی پھر اسی جملے پر اٹک گئی۔

”میں صرف اپنا حق استعمال کر رہی ہوں۔“ وہ پُراعتماد تھی۔

”سوچ لو...... کہیں اس ہٹ دھرمی کے بدلے میں خوشیوں کا سودا نہ کر بیٹھو۔“

”خدا نہ کرے...... خدا نہ کرے جو میری خوشیاں کسی انسان سے وابستہ ہوں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”بہر حال!“ سدرہ تھک گئی تھی۔ ”جو مجھے بتایا، وہ ایک بار پھر سمجھا دیتی ہوں۔ آگے تمہاری مرضی۔ وہ تمہاری بے توجہی سے نالاں تھا۔ اتنے سالوں میں تم نے نہ تو اس کے فون اٹینڈ کیے، نہ اس کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے گئیں۔ حتیٰ کہ گھر میں بھی کوئی منگیترانہ طرزِ عمل اختیار نہ کیا۔ پھر ظاہر ہے وہ شبے میں مبتلا ہوگیا صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ تم اسے پسند کرتی بھی ہو یا نہیں......“ سدرہ نے ذرا سا وقفہ لیا۔

”تو اس نے زنیرہ سے محبت کا ڈھونگ رچانا شروع کردیا۔ مجھے جلانے کے لیے اسے مہرہ بنالیا۔ اس

کے دل کو کھلونا سمجھ لیا؟'' وہ بات کاٹ کر پھنکاری۔

''نہیں ارشین! ایسا نہیں تھا۔'' سدرہ نے ہلکا سا احتجاج کیا۔ ''ان میں صرف بے تکلفی تھی۔ صرف دوستی تھی جس کا زنیرہ نے غلط مطلب لے لیا...... اور کیا یہ زنیرہ کی بے وقوفی نہیں تھی کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارا اور معیز کا رشتہ بچپن سے طے ہے اس کے لیے سوچنے لگی۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں...... قصور تو ہمیشہ لڑکیوں کا ہی ہوتا ہے ناں۔ معیز بیچارہ تو معصوم ہے، تف ہے تم پر اور تمہارے جیسی دنیا جہان کی ساری لڑکیوں پر، لڑکوں کی ہر غلطی پر پردہ ڈال کر اپنی ہی صنف کو زیرِ عتاب لے آنا...... یہی شیوہ ہے تم جیسے لوگوں کا...... اسی لیے تو لڑکے سدھرتے نہیں مزید بگڑتے ہیں۔ بار، بار بے وفائیاں کرتے اور دھوکا دیتے ہیں۔ کوئی روکنے والا جو نہیں...... پتا ہے انہیں، وہ جو کچھ بھی کرلیں بعد میں معافی تو مل جائے گی۔ دو تین ڈائیلاگز ہوں گے۔ چھ سات شعلہ بار نظروں کا تبادلہ ہوگا اور پھر معاملہ سیٹ ہوجائے گا۔'' اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''نہیں سدرہ نہیں، میں اس گھسی پٹی روایت میں شریک نہیں ہوسکتی۔ اب بدلنی چاہیے یہ سوچ۔ میری طرف سے معیز کو پیغام دے دو کہ اگر شادی کرنی ہے تو زنیرہ سے ہی کرلے ورنہ جو مرضی آئے کرتا پھرے، مجھے اس سے کیا۔'' اس نے بات ہی ختم کردی تو سدرہ کچھ نہ بولی۔ بات تو ٹھیک ہی تھی اس کی۔ معیز ان کا کزن تھا اگرچہ ان کے ہاں یہ خالص جاہلانہ رواج نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ارشین کی پیدائش پر بڑی تائی نے اس کا خوب صورت شہزادیوں جیسا چہرہ چوم کر مہر ثبت کردی تھی۔

''بس یہ پری تو میرے معیز کے نام ہوئی۔''

امی مسکرا کر چپ ہو رہیں، انہیں بھی گول مٹول گوتھنا سا معیز اچھا لگتا تھا۔ جو بار، بار ارشین کو دیکھنے کے لیے ان کے پاس آبیٹھتا۔ کبھی ہاتھ پھیلا کر گود میں لینے کی ضد کرتا۔ تو کبھی اسے جھنجنے سے بہلانے کی کوشش کرتا۔ یوں وہ بھی دل سے راضی تھیں۔

بچپن گزرتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ خصوصاً آج کل کے دور میں تو بچے وقت سے پہلے ہی بڑے ہونے لگتے ہیں۔ معیز کے دل میں بھی بہت جلد نئی امنگوں [illegible] شروع کردیا۔ اسے ارشین بہت اچھی لگتی تھی اور [illegible] اظہار وہ کبھی نظروں سے تو کبھی زبان سے کرتا ہی [illegible] لیکن ارشین اس کی توقعات سے خاصی مختلف [illegible] اسے اپنے جذبوں کا ''اتوار بازار'' لگانا ہرگز منظور [illegible] سو معیز کو وارفتگی کے جواب میں بے رخی ملتی [illegible] آنکھوں سے خواب دیکھنے والے معیز کو بار، بار نا [illegible] سے تنگ آکر ان ہی پرانے ہتھکنڈوں پر اترنا پڑا [illegible] آدم کا پرانا ہتھیار ہے۔ اتنی ساری کزنز میں صرف اپنی خالہ زاد زنیرہ ہی نظر آئی تھی۔ جس کی ارشین بالکل نہ بنتی تھی۔ اور وہی معیز کے مطلب کی [illegible]

معیز کے التفات سے زنیرہ صاحبہ تو پھول [illegible] ہوگئیں۔ اس کی مغرور آنکھیں ارشین کا تمسخر اڑا [illegible]

''دیکھو، کیسی شکست دی۔'' اپنے زعم میں [illegible] دیکھ ہی نہ پائی کہ معیز باتیں تو اس سے کرتا، نظریں ار [illegible] پر ہوتیں وہ تو بس آنکھیں موندے جذبوں کی حسین [illegible] میں معیز کا مضبوط ہاتھ تھامے آگے بڑھتی چلی گئی اور آنکھیں تب کھلیں جب ان دونوں کی گریجویشن پر ہونے والی پارٹی میں یہ خبر اڑنے لگی کہ جلد ہی ارشین [illegible] معیز کی باقاعدہ منگنی کا اعلان کردیا جائے گا۔ کیونکہ معیز [illegible] بی ای کرچکا تھا اور جاب کی تلاش میں تھا۔ لوگ یوں [illegible] کررہے تھے جیسے یہ سب کچھ پہلے سے طے تھا۔ ہاں تھا [illegible] بس اِک وہی بے خبر تھی۔

کتنے ہی دن اس نے رو، رو کر گزار دیے لیکن [illegible] کہہ نہ سکی۔ ایک موہوم سی امید تھی۔ شاید یہ بڑوں کا [illegible] ہو شاید معیز بڑی امی اور ماما کے دباؤ میں آگیا ہو۔ [illegible] سب کچھ پھر سے ویسا ہی ہوجائے۔ وہ کس طرح [illegible] کرلیتی کہ اس کا سایہ بننے والا معیز اس کے ساتھ [illegible] ...... ایک کھیل، کھیل رہا تھا۔ زنیرہ اور ارشین کا [illegible] سے مقابلہ چلتا آیا تھا۔ سدرہ اور زنیرہ ایک ہی کلاس [illegible] تھیں۔ سدرہ اور ارشین آپس میں کزنز تھیں۔ اور دادا [illegible] آبائی گھر میں ہی رہتی تھی۔ زنیرہ ان کی خالہ زاد تھی اگرچہ الگ گھر میں رہتی تھی۔ لیکن محلہ اور گلی آگے [illegible] تھی۔ جبکہ معیز کے والد نے بھی الگ گھر بنالیا تھا۔ [illegible] رہنے کی وجہ سے ان میں دوستی بھی بہت تھی۔ لڑائی [illegible] خیر زنیرہ سے بھی نہ تھا مگر نہ جانے کیوں اسے ارشین

[illegible] واسطے کا بیر تھا۔ پڑھنے میں تینوں ایک سی تھیں۔ کبھی [illegible] کے مارکس بہتر ہوتے کبھی کسی کے...... لیکن زنیرہ [illegible] ارشین کی برتری کو تسلیم نہ کرتی۔ پھر ارشین بھی خم [illegible] کر میدان میں اتر آتی اور دونوں چیخ، چیخ کر ایک [illegible] کو کمتر ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتیں۔ حتیٰ کہ [illegible] اور خالہ آکر دونوں کو ایک، ایک تھپڑ رسید کر ڈالتیں۔ [illegible] ڈانٹ ڈپٹ کر الگ کرتیں۔

وقت کے ساتھ، ساتھ اس ٹورنامنٹ کے مقابلے [illegible] ہی گئے۔

انٹر کے بعد دونوں نے سلائی اسکول کی کلاسیں [illegible] کیں تو باقی قوم کو بھی سکون ملا۔ سلائی اور سینے [illegible] نے میں مہارت حاصل کرنے کے بعد دونوں کو گھر [illegible] والوں نے کوکنگ کی ٹریننگ کا مشورہ دیا۔ دونوں نے [illegible] کلاس جوائن کیں تو باقی سب کے تو مزے آگئے۔ [illegible] دن زنیرہ اسٹیم کی ڈش لیے چلی آرہی ہے تو دوسرے [illegible] ارشین اچار گوشت کی دعوت کررہی ہوتی۔ اگر ارشین [illegible] ایپل کیک بنا کر داد وصول کرتی تو اگلے دن شیر [illegible] خورمہ کھلانا زنیرہ کا فرض ٹھہرتا۔ یوں پیسے تو امی اور خالہ کے خرچ ہوتے۔ فائدہ [illegible] پارٹی اٹھاتی۔

یوں لڑتے بھڑتے عمر کی منزل طے کرتی ہوئی [illegible] کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ ایک دن اسے زنیرہ کے ساتھ [illegible] جیتے جاگتے انسان کے لیے بھی مقابلہ کرنا پڑے گا۔ [illegible] اس رشتے سے بے خبر نہ تھی۔ جو معیز اور اس کے گھر [illegible] والے ان دونوں کے درمیان جوڑنا چاہتے تھے۔ شاید [illegible] نے میں انسیت کا جذبہ بھی چھپا ہوا تھا لیکن وہ وقت [illegible] سے پہلے خود کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

جب پہلے پہل معیز نے اسے نظر انداز کرنا شروع [illegible] کیا تو وہ ٹھٹک سی گئی۔ ایک چوٹ سی پڑی دل پہ اور جب [illegible] آہستہ، آہستہ واضح ہونے لگا کہ اس کا جھکاؤ زنیرہ کی [illegible] طرف ہے تو جلن کا جذبہ ابھر آیا، ملکیت کا احساس بھی [illegible] جاگ اٹھا۔

اگر معیز اس لمحے کو حاصل کرلیتا تو شاید اپنے مقصد [illegible] میں کامیاب بھی ہوجاتا۔ لیکن وہ چوک گیا۔ اس نے تیر [illegible] نشانے پر بیٹھتا دیکھ کر کھیل کا دورانیہ طویل سے طویل تر [illegible] کردیا۔ انجام یہ ہوا کہ ارشین چڑ گئی۔ اسے احساس توہین [illegible] ہونے لگا۔

''ایسی کیا بات ہے معیز میں کہ میں ڈوئل لڑنا شروع کردوں، ٹھیک ہے وہ زنیرہ کو پسند کرتا ہے ہر کسی کو اپنی پسند ناپسند پر مکمل اختیار ہونا چاہیے۔'' یہ سوچ کر ارشین نے ان دونوں کی طرف سے دھیان ہٹالیا۔ اب اس کی بلا سے معیز، زنیرہ کی زلفوں کو سراہے یا ہنسی کی شان میں قصیدے پڑھے، کھیل میں اس کا پارٹنر بنے یا میتھ پڑھنے میں اس کی مدد کرے۔ اس کی طرف سے وہ بھاڑ میں جائے۔

معیز نے بازی پلٹتے دیکھی تو فوراً راہِ راست پر آگیا...... مگر اب دیر ہوچکی تھی۔ ارشین نے منگیتر کی نشست تو خیر کیا سنبھالنی تھی منصف کی کرسی پر چڑھ بیٹھی۔ اس کی عدالت میں معیز مجرم تھا اور اس کی سزا یہ تھی کہ وہ اب وہ زنیرہ کو ہی شریکِ زندگی بنائے، اب معیز اس سزا کو قبول کرے نہ کرے وہ پورے معاملے سے دستبردار ہوچکی تھی۔

ارشین نے بی اے کیا تھا۔ جبکہ سدرہ آنرز کررہی تھی۔ چونکہ شروع سے ہی بزرگوں کا ارادہ تھا کہ ارشین کے بی اے کرنے کے بعد بیاہ کی کارروائی ہوگی جبکہ سدرہ تو...... ابھی پڑھ رہی تھی...... اور ارشین کو یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لینے دیا گیا تھا۔ لیکن اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔ اس لیے ارشین کے اصرار پر انہوں نے اسے سدرہ کے ساتھ ہی اکنامکس میں ماسٹرز کی اجازت دے دی تھی۔ سدرہ اب فائنل ائیر میں تھی۔

آج پہلا دن تھا پوری کلاس انتہائی تندہی سے اپنی، اپنی نوٹ بکس پر جھکی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب انتہائی سنجیدگی سے لیکچر دینے میں مصروف تھے کہ اچانک انہوں نے کچھ عجیب انکشاف کیا۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ میری بھی ابھی شادی نہیں ہوئی۔''

ارشین اپنی ڈائری میں اس اہم پوائنٹ کو بھی نوٹ کرنے ہی والی تھی کہ ایک دم سے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر ان سویرا اور نفیس سے سرکو دیکھا جو اب بے حد دردناک ہوچکے تھے۔

''اور جب میں اپنے اردگرد نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے ایک گانا یاد آجاتا ہے۔'' اب وہ کنپٹی پر ہاتھ رکھے کوئی گانا سوچ رہے تھے۔

پیچھے کی سیٹوں سے باقاعدہ ہچکیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ لوگ عجیب تذبذب کا شکار تھے۔ اتنی خوب صورت، سنجیدہ سی شخصیت کو اچانک کیا ہوگیا تھا۔ کوئی اسکرو تو ڈھیلا نہیں ہوگیا۔

”میں پروفیسر داؤد، گریڈ سترہ، تنخواہ خاصی معقول......شادی کے لیے بالکل تیار، طلب گار اور منتظر ہوں۔ آپ کی نظر میں کوئی مناسب رشتہ......(لڑکی کا) اگر ہو تو اس خاکسار کا نام یاد رکھیں۔ لڑکی چاہے غریب ہی ہو، امیر ہونا شرط نہیں......لیکن جہیز میں کیش چیک ضرور لائے۔ کار کوٹھی بے شک نہ ہو مگر کارڈ ضرور لائے گولڈ......اور جناب بہری نہ گونگی ہو بے شک بولتی نہ ہو مگر بری بھلی سننے کی صلاحیت ضرور رکھتی ہو۔ باقی تفصیلات آئندہ......میں چلا ٹاٹا......“

میرون گاؤن میں سرپٹ دوڑتے ہوئے ٹیچر انہوں نے پہلی بار دیکھے تھے۔ ان کے ساتھ کلاس میں سے بہت سی لڑکیاں اور لڑکے بھی دوڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ان میں سدرہ بھی شامل تھی۔ جب ہی دروازے پر ایک اور میرون گاؤن دیکھ کر سارا معاملہ ان کی سمجھ میں آگیا۔ ارشین اتنی بڑی ہو کر بھی فول بن جانے کو بالکل ہضم نہ کرسکی اور کچھ اسٹوڈنٹس کے ساتھ جا کر باقاعدہ اس بے ہودگی کی شکایت لگا آئی تھی۔ بعد میں سدرہ اس پر خوب بگڑی۔

”تمہیں ضرور شکایت لگانی تھی۔ بیچارے داؤد کو ڈانٹ پڑ گئی۔“

”ہونہہ بیچارہ......نام نہ لو تم اس بدتمیز کا......اور تم، تم سے یہ نہ ہوا کہ مجھے بتا دیتیں۔ پورے گھنٹے میں اس کا الٹا سیدھا لیکچر نوٹ کرتی رہی اور جب اصلی لیکچر شروع ہوا تو ہاتھوں میں دم ہی نہیں تھا۔“ وہ سلگ کر بولی۔

”ارے بابا! مجھے کچھ معلوم ہوتا تو بتاتی ناں۔“ سدرہ ایک دم سے معصوم بن گئی۔

”چل بے ایمان، تم اور تمہاری کلاس کی بے ایمان ٹولی نے ہی یہ اطلاع دی تھی کہ کلاس نو بج کر تیس منٹ پر شروع ہوجائے گی۔ کیونکہ سر کو پونے دس بجے کہیں کسی اہم میٹنگ میں جانا ہے۔ پھر آرام سے ہمارا تماشا دیکھنے پیچھے جا بیٹھے۔“

سدرہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ ارشین غصے سے منہ پھلا کر الگ ہو بیٹھی۔

”معاف کردو چندا......مگر یہ تو بس چھوٹا سا مذاق تھا۔ میں بتا دیتی تو تمہاری یہ گول جاپانی پھل جیسی ناک کہاں سے دیکھنے کو ملتی۔ چلو مان جاؤ۔“ بہت منتوں کے بعد سدرہ کی اس شرارت پر جان بخشی ہوئی کہ کل کینٹین کا خرچ وہ تن تنہا اٹھائے گی۔

”یہ داؤد ہماری کلاس کا سب سے شریر لڑکا ہے بہت اچھا۔ میں نے بتایا تھا ناں تمہیں اس کے متعلق۔“ کولڈ ڈرنک کے سپ لیتے لیتے سدرہ مزے سے کہہ رہی تھی۔

اسے یاد آیا۔ سدرہ اکثر کسی داؤد کا ذکر کرتی تھی۔ ”داؤد نے یوں کیا......ووں کیا۔“

”اچھا تمہیں لگتا ہوگا، مجھے تو بونگا سا لگا۔“ اس نے ناک چڑھا کر کہا۔ ایک دم پیچھے سے ایک کڑک دار آواز آئی۔

”یہاں کیا کررہی ہیں، جائیں جا کر کامن روم میں بیٹھیں۔ شرم نہیں آتی سرعام پیتے ہوئے۔“ وہ دونوں اچھل پڑیں۔ بوتل ارشین کے ہاتھ سے گرتے، گرتے بچی۔ جب ہی اس نے سدرہ کی آواز سنی۔

”بہت بدتمیز انسان ہو تم، باز نہیں آؤ گے۔“

ارشین نے مڑ کر دیکھا اور اسے آگ ہی لگ گئی۔

”آپ کو شرم نہیں آتی۔ خوامخواہ دوسروں کی باتوں میں گھستے ہیں۔“ پھر وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے جسے ڈانٹ رہی تھی وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہ تھا، وہ سدرہ سے بات کررہا تھا۔

”سوری بابا، معاف کردو......لیکن تم خود کو بھی تو دیکھو......میں تو اسی طرح ڈراتا آرہا ہوں اور تم ہمیشہ فول بن جاتی ہو۔“ وہ مسکرا، مسکرا کر معافی مانگ رہا تھا۔

ارشین کو زبردست توہین کا احساس ہوا۔

”آپ مجھ سے کچھ فرما رہی تھیں؟“ جاتے جاتے وہ مڑ کر معصومیت سے پوچھنے لگا۔ وہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔

☆☆☆

”چوکا......وہ مارا۔“

”یاہو......“

”توبہ ہے۔“ ارشین جزبز ہونے لگی۔ ”یہ لوگ

...ی پڑھتے بھی ہیں یا ہر وقت شرارتیں ہی کرتے رہتے ہیں۔“

وہ دونوں کلاس میں بیٹھی سر ایوب کے تازہ ترین نوٹس کی کوڈسکس کررہی تھیں۔ اور باہر سے نعروں کی صورت میچ کی تازہ ترین صورت حال پر کمنٹری ہورہی تھی۔ فکر ارشین کو بھی تھی کیونکہ میچ پاکستان اور بھارت کے درمیان تھا لیکن ایسا بھی نہیں کہ ریڈیو لے کر چلی آتی۔ اس نے سوچا کسی سے اسکور پوچھتی رہے گی لیکن برا ہوا اس کی کلاس کے نالائقوں کا۔ کوئی بھی ریڈیو نہ لایا تھا (وہ موبائل کا زمانہ نہ تھا) اور اب سامنے کاریڈور میں دشمن گروپ بیٹھا میچ سن، سن کر اس کا دل جلا رہا تھا۔

”اگر ڈسٹرب ہورہی ہو تو ہم کہیں اور چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔“ سدرہ نے کہا اور چیزیں سمیٹنے لگی۔ ”ان لوگوں کی تو پرانی عادت ہے۔ ایسے ہی ہنگامہ خیز طریقے سے میچ سننے کی چلو۔“

”نہیں......“ ارشین ہچکچا کر بولی۔ ”اصل میں، میں خود بھی اسکور پتا کرنا چاہ رہی تھی۔“

”او ہو تو ایسے کہو ناں، لو ابھی لو......“ سدرہ نے وہیں سے ہانک لگائی۔ ”داؤد!“

”جی جناب......!“ ادھر سے بھی اتنا ہی اونچا جواب ملا۔

”اسکور کیا جارہا ہے؟“

”شاندار، پانچ کو گھائل کرچکا ہوں ابھی تک۔“

”شرم کرو بدتمیز......“ سدرہ کو ہنسی آگئی۔ ”میں میچ کا پوچھ رہی ہوں۔“ اور وہ ریڈیو کسی اور کے ہاتھ میں تھما کر ادھر ہی چلا آیا۔

”میچ بھی ٹھیک ٹھاک جارہا ہے، لیکن تمہیں کیا ہوا ہے جب دیکھو پڑھتی رہتی ہو، اپنی کلاس کو تو بھول گئی ہو۔ ایسی تو نہیں تھیں تم۔“

”اس سے پہلے میری یہ کزن بھی تو یہاں نہ تھی۔“ سدرہ نے ارشین کی طرف اشارہ کیا تو اس نے غور نہ کیا۔

☆☆☆

آج کل خاندان میں خاصی ٹینشن چل رہی تھی۔ ...ں کو پوری بات کا علم ہوگیا تو انہوں نے تائی سے بڑے مناسب الفاظ میں معذرت کرلی۔ اور دبی زبان سے زنیرہ کی سفارش کردی جو اب مزید پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

معیز کو سدرہ کی وساطت سے ارشین کا پیغام مل گیا تھا۔ وہ اس وقت تو چپ رہا لیکن جب تائی نے زنیرہ کے لیے اس کی مرضی پوچھنی چاہی تو وہ بھڑک اٹھا۔

”میں کوئی دوسروں کی مرضی کا پابند نہیں ہوں۔ چاچی نے اپنی بیٹی نہیں دینی نہ دیں۔ مشورہ کیوں دیتی ہیں۔ مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے، نہ خاندان کے اندر نہ خاندان سے باہر۔“ اس نے دوٹوک جواب دے دیا۔ زنیرہ کو سدرہ کی زبانی سب پتا چل چکا تھا۔ وہ اب بہت بدل گئی تھی۔ اب اس کی نظروں میں ارشین کے لیے احترام تھا، خلوص اور محبت تھی۔

ارشین اور زنیرہ کی دوستی کیا ہوئی؛ خاندان بھر کی تمام لڑکیوں نے معیز کے خلاف محاذ قائم کرلیا۔ معیز جہاں جاتا اسے مذاق کا نشانہ بننا پڑتا۔ وہ جو راجا بھوج بنا پھرتا تھا اب گنگو تیلی سے بھی گیا گزرا ہوگیا تھا۔

☆☆☆

سیکنڈ سمیسٹر شروع ہوئے دو ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ ڈیپارٹمنٹ میں ایک فنکشن کا اہتمام کیا گیا۔ ارشین نے اس فنکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس فنکشن کی کامیابی کا تو اسے یقین تھا ہی مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب سدرہ کی کلاس میں سے اس نے داؤد کو بھی شامل دیکھا۔

”ہر وقت تو یہ صاحب کھیلتے رہتے ہیں۔ پڑھتے کہاں ہوں گے ضرور سفارشی ہے۔“

”یہ بہت اچھا اسٹوڈنٹ ہے ارشین! ایگزام کے دنوں میں جی جان سے پڑھائی کرتا ہے۔ کلاس میں بھی بہت ایکٹو رہتا ہے، کبھی دیکھو تم۔“ سدرہ نے بتایا تو اس کے منہ سے نکلا۔

”کلاس میں تو تم دیکھتی ہوگی۔“ سدرہ نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہوگئی۔

”یہ کیا شروع کردیا میں نے......عورتوں کے حق میں بولنے کے بجائے یک ایسی جلی کٹی باتوں پر اتر آئی۔“ وہ خود کو ڈانٹتی رہی مگر حقیقت تو حقیقت تھی۔ وہ سدرہ سے لاشعوری طور پر جلنے لگی تھی۔ ہر وقت دل ہی دل میں اپنا اور اس کا موازنہ کرتی رہتی اور اس وقت تو

بالکل کوئلہ ہو جاتی جب داؤد اس پر کوئی دھیان دیے بغیر سدرہ سے باتوں میں مصروف رہتا۔ بظاہر ان کی باتوں میں کوئی خاص معنوی باتیں تو نہ ہوتیں لیکن وہ خود ہی اپنے تئیں سو معنی نکالتی رہتی۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی کڑھتی رہتی۔

"ہمیشہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دنیا میں ہزاروں لڑکے ہیں کیا ضروری تھا کہ مجھے داؤد ہی پسند آتا۔"

فنکشن کی اختتامی تقریب آرٹس کونسل میں منعقد ہوئی تھی۔ واپسی میں تمام ٹیچرز اور دوسرے مہمان تو ایک پوائنٹ میں سوار ہو گئے اور آرگنائزڈ ٹیم کو...... دوسرے پوائنٹ میں بٹھا دیا گیا۔ ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ کوئی گانے گا رہا تھا کوئی نعرے لگا رہا تھا۔ کان پڑی آواز تک سنائی نہ دے رہی تھی۔ ایسے میں انہوں نے دیکھا۔ فائنل ائیر کے ارشد بھائی ہاتھ ہلا، ہلا کر کچھ تقریر کر رہے ہیں۔

آناً فاناً پوری بس دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ سدرہ کو اس کی کلاس فیلوز کھینچ کر پیچھے لے گئیں اور وہ اپنی کلاس کے ساتھ وہیں رہ گئی۔ سیکنڈ ائیر شروع سال سے ہی تھرڈ ائیر کی چیلی کا لقب حاصل کر چکی تھی چنانچہ وہ بھی تھرڈ ائیر کی طرف کھنچی چلی گئی۔ اور فرسٹ ائیر چونکہ ان دونوں کے ہاتھوں فول بننے کا اعزاز حاصل کر کے فرداً فرداً پندرہ روپے گنوا چکی تھی۔ اس لیے دردِ مشترکہ کے ناتے پریولیس کے ساتھ آ بیٹھی۔ جبکہ فائنل کے اسٹوڈنٹس ریفری کی حیثیت سے درمیان میں براجمان تھے۔ مقابلہ تھا گانے، گانے کا۔ ارشد نے کمپیئرنگ کے فرائض سنبھالے۔

"آرڈر، آرڈر...... تو ساتھیو میری دائیں طرف ہے اے ٹیم (آرٹس اور سیکنڈ ائیر والے جھک، جھک کر آداب کرنے لگے) اور بائیں طرف ہے بی ٹیم۔" شور مچا اور اس کی کلاس کے لڑکوں نے سیلیوٹ جھاڑنا شروع کر دیا۔ "کھیل کا طریقہ کچھ یوں ہے کہ ہم آپ کے جناب میں ایک گانا عرض کریں گے۔ آپ نے اسی طرح اپنی پسند سے کوئی بھی گانا، گانا ہے۔ گانا خود بھی بنایا جا سکتا ہے اور دوسروں کی کاپی بھی کیا جا سکتا ہے تو ہو جائیں شروع؟"

اور بی ٹیم کے دیوتا کوچ کر گئے۔ حالانکہ بس کی چھت سالم تھی لیکن انہیں تارے ہی تارے نظر آ رہے تھے۔ سیدھا سادہ مقابلہ گانوں کا سوچ کر بیٹھے تھے یہاں باقاعدہ گانوں کا مقابلہ گلے پڑ گیا۔ مگر اب تو چیلنج قبول کر لیا تھا سو صبر کرنا پڑا۔

"ہائے، ہائے......" فرسٹ ائیر نے سر دھننا شروع کر دیا۔ "کس جاہل سے آرزو کر ڈالی۔"

"چپ کرو نالائقو۔" ارشد نے سب کو ڈانٹا۔

"چلو اے ٹیم گانا گاؤ۔"

"واہ جی...... ہم کیوں گائیں پہلے بی ٹیم گائے۔"

داؤد اور اس کے ساتھی صاف مکر گئے۔ اصل میں انہیں کوئی گانا یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے خود بنانا تھا اور اس میں دیر تو لگتی ہے، وہ کوئی پیدائشی سنگر تو تھے نہیں۔ ہاں ان کے پاس ارشین کی صورت میں ایک اچھی سنگر موجود تھی۔ لیکن نئے، نئے ہونے کی وجہ سے اس کی کلاس کو اس کے اس ہنر کا علم نہیں تھا۔ البتہ سدرہ جانتی تھی۔

"چلو بھئی اے ٹیم...... اس راؤنڈ میں آپ ہی پہل کرو۔" ارشد ذرا کی ذرا بائیں طرف مڑا اور بائیں طرف ہلچل مچ گئی۔

"سوچو، سوچو۔" سب ایک دوسرے کو ڈانٹ رہے تھے۔ سدرہ نے ارشین کو دیکھا۔

"ارشین؟" اس کا اشارہ پاتے ہی ساری بی ٹیم ارشین کے پیچھے پڑ گئی۔ وہ تو پہلے ہی سوچے بیٹھی تھی، سدرہ کی طرف دیکھ کر کچھ کہنے ہی والی تھی مگر رک گئی، انا آڑے آ گئی۔ سب کی التجاؤں کا پاس کرتے ہوئے اس نے ایک بڑا دردناک سا گانا گایا۔

"واہ، واہ کیا سچائی ہے۔" اس کی کلاس نے دل کھول کر داد دی۔ ان کے حوصلے بلند ہونے لگے۔ اے ٹیم کو یہ امید نہیں تھی کہ یہ نئی نویلی کلاس مقابلے پر جم جائے گی۔ مگر وہ کون سا پیچھے ہٹنے والے تھے۔ اب تک تو انہیں خاصا وقت مل چکا تھا۔ جمال نے جلدی، جلدی لکھا اور داؤد ساتھیوں کو ساتھ لے کر لہک، لہک کر گانا گانے لگا۔

اچھے گانے کا ایسا جواب پا کر ارشین کا دل چاہا فوراً واک آؤٹ کر جائے۔ لیکن بس بہت تیز چل رہی تھی۔ اُدھر غدر مچا ہوا تھا۔ دونوں ٹیمیں اپنے آپ کو برتر ثابت کرنا چاہ رہی تھیں۔ بہ مشکل فائنل ائیر نے سینیارٹی کا رعب استعمال کرتے ہوئے سب کو چپ کرایا۔

"حاضرین...... پہلا راؤنڈ ایک، ایک گول

برابر رہا۔ اب دوسرا راؤنڈ کھیلا جائے گا۔ اور اب پہل اے ٹیم کرے گی۔"

بی ٹیم نے شکر کیا۔ اُدھر تھرڈ ائیر اور سیکنڈ ائیر میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ ویسے ان میں ہم آہنگی موجود تھی۔ داؤد آئیڈیے دینے کا ماہر اور سیکنڈ ائیر کا جمال گانے بنانے کا۔

"ہاں تو جی گانا آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔"

"اوہو، اوہو......" آوازیں آنا شروع ہوئیں۔

ارشد جھینپ گیا۔ داؤد نے جھک کر جمال کے کان میں کچھ کہا۔ جمال نے فٹافٹ گانا تیار کیا۔

"لیجیے جی...... سنبھالیے۔" داؤد نے سدرہ کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سنبھل، سنبھل کر گانا شروع کیا۔

"اُف ظالم کیا گانا گا ڈالا۔" سیکنڈ ائیر ایک ساتھ بے ہوش ہونے کو تھی۔ لیکن پریولیس میں سے خیرسگالی کے طور پر ایک جوتا آیا تو فوراً ہوش آ گیا۔ داؤد سب کو آداب کر رہا تھا۔ سدرہ اب کھل کر مسکرا رہی تھی۔ اور ارشین کا دل جیسے مسل کر رہ گیا۔

"یہ تو گانا ہی غلط ہے۔" ارشین کے ایک کلاس فیلو نے احتجاج کیا۔

"اسے ایسے ہی ہونا چاہیے۔"

"واہ، واہ زبردست......" بی ٹیم نے اٹھ کر داد دی۔

لیکن اے ٹیم کو تو آگ ہی لگ گئی۔ سب بائیکاٹ، بائیکاٹ کے نعرے لگانے لگے۔ جمال نے فوراً پوائنٹ آف آرڈر پر کر تقریر کرنا شروع کر دی۔

"جناب عالی! یہ ہم پر سراسر الزام ہے، اگر میں ابھی بی ٹیم کے گانوں کا پول کھول دوں تو آپ کہیں گے کہ بس بس...... خیر جانے دیں بس یہ سن لیں کہ یہ گانا وزن اور شرافت دونوں سے گرا ہوا ہے، دوسرے یہ کہ یہ ہمارے سونگ کا چربہ ہے، اصل میں یہ سونگ ہے نہیں۔"

اعتراضات معقول تھے فوراً نوٹ کیے گئے۔ اب سب کی نظریں ارشین پر تھیں۔ اے ٹیم باقاعدہ گنتی کر رہی تھی۔

"گیارہ۔" ارشین چپ رہی۔

"بارہ۔"

"ارشین بولو، بولو۔" سب چیخ رہے تھے۔

"تیرہ......"

"ارشین......" سدرہ بھی کہہ اٹھی۔ اس کی کلاس نے آنکھیں دکھانا شروع کر دیں۔

"ہائے سدرہ!"

"چودہ...... سدرہ غدار چپ رہنا۔" الٹی گنتی پھر سے شروع ہو گئی۔

"چھ۔"

"اللہ کا واسطہ ارشین...... کچھ بھی کہہ دو۔ بس آخر میں "محبت ہے وہ" آ جائے......"

"پانچ، چار۔"

ارشین کچھ نرم پڑ گئی۔ ٹھیک ہے ہار ماننی ہے تو اعلیٰ ظرفی کے ساتھ......

"تین......"

"دو......"

"محبت ہے۔"

"محبت ہے محبت ہے......" بی ٹیم نے مل کر نعرہ لگایا۔ اور پھر لڑکوں نے جوش میں آ کر بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔

اس کے لہجے میں اتنا ٹھہراؤ، اتنی اداسی تھی کہ داؤد نے چونک کر دیکھا۔ صرف ایک لمحے کو۔

پھر اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر بی ٹیم کے بھنگڑے پر ہوٹنگ کرنے لگا۔ فائنل ائیر نے ڈنڈے کا آزادانہ استعمال کرتے ہوئے سب کو دوبارہ بٹھایا اور مقابلہ برابر رہنے کا اعلان کر دیا۔

لیکن ارشین تو مقابلہ ہار چکی تھی۔

پھر وہ غیر محسوس طریقے سے سدرہ سے الگ ہو گئی۔ اور چارہ بھی کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر سدرہ کے ساتھ رہی تو بار، بار داؤد سے ٹکراؤ ہوگا اور بار، بار دل ٹوٹے گا کیونکہ اب لاکھ چاہنے پر بھی وہ ان دونوں کو بھاڑ میں جھونک نہیں سکتی تھی۔ اب وہ پہلی سی حقیقت پسند اور انصاف پسند رہی کہاں تھی۔

"شاید اسی کو محبت کہتے ہیں۔" اس نے سوچا۔

"وہ جو معیز سے تھی۔ محض ایک انسیت تھی۔ دیرینہ نسبت کا فطری اثر اسی لیے اسے ختم کرنے میں ذرا تکلیف نہ ہوئی تھی۔ لیکن اب، اب بات الگ تھی۔ کسی رشتے، کسی ناتے کسی امید کسی تعلق کے بغیر ہی داؤد نے

اس کی سوچوں پر قبضہ جما لیا تھا۔ اور بدقسمتی سے اس دفعہ دوسری لڑکی کوئی اور نہیں اس کی سب سے اچھی دوست اور کزن سدرہ تھی۔

اس دوران میں ہی داؤد کے امریکا روانہ ہونے کی خبر عام ہونے لگی۔

''چلو ختم ہوا یہ باب بھی۔'' اس نے گہری سانس لی۔

''بڑی بوریت ہوگئی یار...... ساری رونقیں اسی کے دم سے تھیں۔'' سدرہ بہت اداس تھی۔ (ہاں تم یہ کہہ سکتی ہو) اس نے دل ہی دل میں کہا پھر مزید بولی۔

''کوئی بات نہیں، اس کا کیریئر بن جائے گا۔ صرف دو سال کی تو بات ہے۔'' سدرہ مسکرانے لگی۔

''ہاں واقعی صرف تین سال کی تو بات ہے۔'' وہ اس کے معنی خیز انداز پر چونک سی گئی۔

(تو اس نے تم سے اظہار کر ہی دیا تھا۔ ٹھیک ہے اگر تم نے راز دار نہیں بنایا تو میں خود بھی کچھ نہیں پوچھوں گی) اور اب، اتنے عرصے بعد یہ کیا کہہ رہی تھی سدرہ؟

☆☆☆

''تم مذاق کر رہی ہو۔'' اس نے بے یقینی سے سدرہ کو گھورا۔

''میں صرف سچ کہہ رہی ہوں۔'' سدرہ بڑے اطمینان سے بولی۔

''دیکھو سدرہ مجھے قربانیاں دینے والے ہیرو ٹائپ لوگ بالکل پسند نہیں۔ مجھے سچ، سچ بتا دو۔'' ارشین کے خیال سے سدرہ اس کی پسندیدگی بھانپ چکی تھی۔ ارشین اپنے اصولوں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔

''افوہ...... بھئی کون سی قربانی؟ کہاں کی قربانی؟ بھئی بات ہو رہی تھی داؤد کے واپس آنے اور تمہارے لیے پروپوزل بھیجنے کی اور تم جانے کیا لے بیٹھیں۔'' وہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔

''جو شخص مجھ میں ذرا بھی انٹرسٹڈ نہیں تھا، پروپوزل کیسے بھیج سکتا ہے؟''

''نہیں ارشین! اصل میں تم نے اسے سمجھا ہی نہیں۔ تمہاری طرح وہ بھی اپنی نوعیت کا ایک ہی ہے، تم نے جو شکایت لگا کر اول روز سے دشمنی کا آغاز کیا تھا ناں، اس نے آخر دم تک اسے نبھایا۔ ہاں شاید جانے سے پہلے بتا دیتا۔ لیکن وہ میرے توسط سے تمہارا مزاج آشنا بھی ہو گیا تھا۔ اس لیے اس وقت تک اپنے جذبوں کو ظاہر نہ کیا، جب تک کہ خود کچھ نہ بن گیا۔'' سدرہ تفصیل سے بتا رہی تھی اور وہ حیران تھی...... کیا خواب یوں بھی سچ ہو سکتے ہیں۔

''لیکن پھر وہ...... تمہارے اور داؤد کے درمیان......''

''بس باہمی اتفاق تھا۔'' سدرہ نے ہنس کر بات مکمل کی۔ ''تمہیں تنگ کرنے کے لیے۔''

''سدرہ کی بچی......'' وہ اسے گھونسا جڑ کر بولی۔

''شروع سے آخر تک تم لوگ مجھے ہی فول بناتے رہے۔ اور میں پتا نہیں کیا کیا سمجھتی رہی کتنی احمق کی میں بھی۔'' اس کے چہرے پر خوشیاں رقص کرنے لگیں۔

''مسئلہ یہ ہے کہ ارشین کہ لڑکیاں ہوتی ہی تھوڑی احمق ہیں، سب نہیں اکثر اور اکثر نہیں تو بھی...... کم از کم ہم تینوں......'' سدرہ بظاہر اس کے پاس تھی مگر سوچیں کہیں اور تھیں۔

''ایک حماقت زنیرہ نے بھی کی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ معیز منگنی شدہ ہے اس کی باتوں میں آگئی۔ اور میں جو ارشین کو بے وقوف کہتی تھی اس سے کہیں زیادہ نادان جھلی نکلی...... سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس شخص سے محبت کرتی رہی جو صرف اور صرف ارشین تمہاری باتیں کرتا تھا۔ تمہارے لیے سوچتا تھا۔ میرا تو کبھی تھا ہی نہیں، تم تو بعد میں آئی تھیں مگر بازی لے گئیں۔ مگر ارشین یہ سب میں کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی...... ہاں کسی سے بھی نہیں۔ اس لیے کہ اگر یہ بات کسی طرح تم تک پہنچ جاتی تو تم پھر انصاف کا ترازو سنبھال کر بیٹھ جاتیں۔ جیسے زنیرہ اور معیز کی دفعہ کیا۔ اپنے اور داؤد کے دل کو توڑ اور روند ڈالتیں۔ اور یہ مجھے کسی بھی صورت منظور نہیں تھا کہ تم ایسا کرنے میں ہر حد پار کر جاؤ۔ مجھے تو خیر پھر بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہی کچھ ملنا تھا پر تمہاری خوشیوں کے رنگ بھی اڑ جاتے اور خواب بھی سارے ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتے، تمام عمر تمہارا محبت سے اعتماد اٹھ جاتا اور اعتبار بھی ختم ہو جاتا۔'' اس نے پلکوں کی نوک پر اترتے آنسوؤں کو صاف کیا اور اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں ارشین اور داؤد کی رسم منگنی انجام دی جا رہی تھی۔



ایک دن نادرہ کے ساتھ

شمع تنویر

''پولیو ویکسین پلوا لیں......'' نادرہ نے آواز لگانے کے ساتھ ہی دروازے پر دستک دی۔

''ارے بھئی کتنی بار بتایا ہے کہ یہاں کوئی چھوٹا بچہ نہیں رہتا۔ بس دروازے بجانے کا شوق ہے...... پھر رہی ہیں اِدھر سے اُدھر......'' اندر سے کسی عورت کی کرخت آواز آئی۔

''سوری میڈم، ہماری تو یہاں پہلی بار ڈیوٹی لگی ہے۔'' نادرہ نے تحمل سے کہہ کر اپنی ساتھی رقیہ آپا کے

ہمراہ قدم آگے بڑھا دیے...... ایسی تلخ و ترش آوازیں و جملے ان کا روزمرہ معمول بلکہ ڈیوٹی کا حصہ تھے مگر ہر بار تکلیف تو ہوتی ہی تھی۔

”دماغ دیکھو ان نکمی عورتوں کے...... پورا، پورا دن گھر میں آرام کرتی ہیں اور صرف زبان ہلانے میں انہیں اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ دوسرے کی عزت کا کچھ خیال ہی نہیں۔“ رقیہ آپا اپنے غصے کو دباتے ہوئے نادرہ سے مخاطب ہوئیں۔

”ارے رقیہ آپا...... گھر میں بھی آرام کہاں ملتا ہے، عورت کے نصیب میں تو بس کام ہی کام ہے...... چاہے گھر میں کرے یا گھر سے باہر۔“ نادرہ قصداً مسکرائی۔

”لیکن گھر کی چار دیواری میں اپنے گھر کا کام کرنا اور بات ہے اور ہماری طرح اتنی تیز دھوپ میں مارے، مارے پھرنا اور پھر اپنی ہی صنف سے... گھرکیاں سننا اور بات ہے۔“ وہ افسردگی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ ”مگر کیا کریں، مجبوری ہے، روزی، روٹی جو کمانی ہے۔“

”ارے چھوڑیں رقیہ آپا...... آپ افسردہ بالکل بھی اچھی نہیں لگتیں! ذرا سوچیں تو سہی کتنی عظیم خدمت ہم انجام دے رہے ہیں، کتنے بچے ہماری اس محنت کی بدولت پولیو جیسی مہلک بیماری سے بچ جاتے ہیں۔ اسی لیے تو ہم ہر دروازہ بجاتے ہیں کہ کوئی بچہ رہ نہ جائے، چاہے بدلے میں ہمیں صلواتیں ہی کیوں نہ سننے کو ملیں۔“ نادرہ، رقیہ آپا کو ہمت دلاتے ہوئے بولی۔

”ہاں، یہ تو تم نے ٹھیک کہا ورنہ ہم ہر دروازہ نہ بھی بجائیں بس مخصوص گھر نمٹا کر چلے جائیں۔“ کہنے کے ساتھ ہی رقیہ آپا نے اگلے گھر پر دستک دے کر صدا لگائی ”پولیو ڈراپس“ صبح سے شام تک انہوں نے یہی کام سرانجام دینا تھا۔

☆☆☆

دوپہر ہو چلی تھی اور اب تک محض اڑتیس بچوں کو پولیو ڈراپس پلائے گئے تھے...... جانے کیا وجہ تھی کہ کراچی جیسے شہر میں بھی لوگ پولیو ڈراپس بچوں کو پلوانے سے احتراز برتنے لگے تھے بعض پرائیویٹ اسکول بھی اس ضمن میں پیچھے نہ تھے۔

”سوری، بچے کے گھر والوں کی اجازت نہیں ہے۔“ ان کا عذر ہوتا۔

”بچے کو بخار ہے۔“ گھر والوں کا بہانہ ہوتا۔

”بچہ چھ سال کا ہے۔“ چاہے چار سال کا ہوتا۔

”ہم نے پلوا دیے ہیں، پولیو ڈراپس۔“ گھر والے کہتے حالانکہ بچے کی انگلی پر نشان نہیں ہوتا۔

اب کون بحث کرے اور اپنی عزت خراب کرے...... بعض لوگ تو یوں اپنے بچوں کو چھپاتے جیسے یہ خواتین ویکسینیشن کے لیے نہ آئی ہوں، بچے اغوا کرنے آئی ہوں۔

اس طرح کے رویّوں کا سامنا کرتے ان کی تھکن دُگنی ہو جاتی۔

”ہم کوئی چیز بیچنے نہیں آئے، ہم تو اللہ کے کرم سے صحت بانٹنے آئے ہیں، پولیو ڈراپس نہ پلوانے کی وجہ سے ملک کے کچھ حصوں میں پولیو بیماری کے کیسز سامنے آئے ہیں، اللہ خیر کرے۔“ دستک کے جواب میں اگر کوئی معقول نظر آنے والی خاتون بچے کو پولیو ڈراپس پلوانے سے انکار کرتی تو نادرہ یا رقیہ آپا اسے سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

”جی...... آپ صحیح کہہ رہی ہوں گی مگر ہماری سسرال میں پولیو ڈراپس نہیں پلوائے جاتے۔“ اُف، اُف...... اتنی معقول باتوں کا اتنا نامعقول جواب...... پولیو ڈراپس کا تعلق سسرال یا میکے سے نہیں بچے کی صحت سے ہے یہ بات کیسے سمجھائی جائے۔

”پتا نہیں کیا کچھ غلط فہمیاں لوگ پولیو ڈراپس سے متعلق اپنے ذہنوں میں لے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔“ نادرہ نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔

”یہ تو حکومت کو چاہیے کہ میڈیا وغیرہ کے ذریعے بہت بڑے پیمانے پر پولیو آگہی مہم کا اجرا کرے۔“ رقیہ آپا نے بھی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”واقعی جبھی ہم کامیاب ہو سکیں گے۔“ نادرہ

نے کہتے، کہتے ان کے چہرے پر نظر ڈالی جہاں تھکن کے آثار ہویدا تھے۔

”آپ بہت تھک گئی ہیں آپا...... چلیں آئیں وہاں چبوترے پر دو گھڑی بیٹھ جاتے ہیں۔“

”ہاں بھئی آج تو چل، چل کر پاؤں تھک گئے۔“ کہتے، کہتے وہ چبوترے پر بیٹھ گئیں۔ اور بیٹھتے ہی انہیں اتنا سکون ملا جیسے بدن میں جان پڑ گئی ہو۔

نادرہ نے اپنی پانی کی بوتل ان کی طرف بڑھائی۔

”اصل میں دو تین دن سے پیروں پر سوجن ہے۔“ رقیہ آپا بولیں۔

”ارے وہ کیوں؟“ نادرہ نے فکرمندی سے کہا۔

”بس ڈاکٹر کے پاس جاؤں تو پتا چلے...... یا پھر روز اتنا، اتنا چل کر یہ حال ہوا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”رقیہ آپا واقعی اس عمر میں آپ کو تو آرام کی ضرورت ہے۔“ نادرہ نے سر ہلا کر کہا۔

”ارے بیٹا جوان بچیاں ہیں میری...... باپ ان کا بیمار، بیٹا کوئی ہے نہیں...... میری تو رات کی نیندیں تک حرام ہیں ان کی شادی کی فکروں سے، کیسے گھر بیٹھ جاؤں۔“ وہ فکرمندی سے بولیں۔

”جی یہ تو ہے، مجبوری تو سب کچھ کرواتی ہے...... اب مجھے دیکھ لیں، بیمار بچے کو بخار میں تنہا چھوڑ کر آئی ہوں...... کس دل سے آئی ہوں، یہ میں ہی جانتی ہوں جب کسی چھوٹے بچے کو دیکھ رہی ہوں اپنا منّو یاد آ رہا ہے۔“ نادرہ کی آواز یک دم ہی بھرا گئی۔

”ارے منّو کو بخار تھا...... کچھ دوا، دوا دے کر آئی ہو؟“ رقیہ آپا نے پوچھا۔

”نہیں آپا...... صبح مجھے دیر ہو رہی تھی اور وہ ضد پر اڑا ہوا تھا...... کہہ رہا تھا کہ آج مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں...... بخار میں پھنک رہا تھا میرا بچہ...... ابھی پانچ سال کا ہی تو ہے۔ میں نے دودھ ڈبل روٹی کھلانی چاہی...... وہ بھی نہیں کھائی...... ایک ہی ضد، آپ نہ جائیں...... میرے پاس ہی لیٹ جائیں، اب آپ ہی بتائیں آپا میں بھلا چھٹی کر سکتی تھی۔“ نادرہ نے دل ہلکا کیا۔

غزلیں

بھیگی بھیگی ٹھنڈی شام
کر دوں اس ظالم کے نام

دھیان میں رکھنا تم کو بھی
پڑ سکتا ہے مجھ سے کام

صرف محبت ہے انمول
باقی ہر جذبہ ناکام

دنیا چھوڑ کر آئی ہوں
اب تو میرے ہاتھ کو تھام

تمثیلہ وہ جادو گر
کر لیتا ہے مجھ کو رام

کلام: تمثیلہ لطیف، جوڑھالا

☆☆☆

تناؤ میں جب آ جائیں تو دھاگے ٹوٹ جاتے ہیں
ذرا سی بات پہ دیرینہ رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

تمہیں اس بات پہ حیرت کہ ٹوٹا ہے ہمارا دل
مقابل جبکہ ہوں پتھر تو شیشے ٹوٹ جاتے ہیں

گزرتے وقت سے چیزیں پرانی ہو ہی جاتی ہیں
دلوں میں میل پڑتی ہے تو جذبے ٹوٹ جاتے ہیں

ہزاروں خواہش ترتیب پاتی ہیں خیالوں میں
مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو شیشے ٹوٹ جاتے ہیں

نہ جانے کیوں تمہاری یاد آتی ہے مجھے اس دم
میرے آنگن میں جب پھولوں کے پتے ٹوٹ جاتے ہیں

دکھوں میں تو نکل آتے ہیں اکثر آنکھ سے آنسو
خوشی کے موسموں میں بھی کنارے ٹوٹ جاتے ہیں

کاوش: صبا صغیر آرزو، کراچی

"پھر...... اس کا ناشتا دوا...... تمہاری ساس دیں گی؟" رقیہ آپا بولیں۔

"جی اللہ سلامت رکھے میری ساس کو...... عرفان...... میرے شوہر کے بعد تو جیسے وہ میری سگی ماں بن گئی ہیں، ان کی زندگی میں بھی ہمیشہ مجھے بیٹی سمجھا اور اب تو اور زیادہ پیار اور خیال کرتی ہیں وہی میرے تینوں بچوں کو سنبھالتی ہیں' چھوٹے موٹے کام بھی دیکھ لیتی ہیں فائزہ اور فائق تو خیر سات اور نو سال کے ہیں ذرا سمجھ دار ہیں مگر میرا منو ابھی بہت چھوٹا ہے صبح ناراض ہو گیا تھا مجھ سے، اب جاؤں گی تو مناؤں گی۔"

نادرہ کے چہرے پر ماما کا نور تھا۔

"کچھ لے جانا اس کی پسند کا اس کے لیے۔" رقیہ آپا مسکرا کر بولیں۔

"جی چاکلیٹ اور نوڈلز لے لوں گی ابھی کسی دکان سے...... اب چلیں۔" نادرہ کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی سامنے والے گھر کا دروازہ دستک کے لیے ان کا منتظر تھا۔

☆☆☆

"پی لے میرا چندا...... دادی کی جان...... کتنا پیارا میرا شہزادہ ہے بس یہ آدھا کپ دودھ پی لے۔" عطیہ بیگم لاڈلے پوتے کو راضی کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔

"جب امی آئیں گی تب پیوں گا۔" اس نے منہ بسور کر کہا۔

چاہنے والی دادی نے اسے فکر مندی سے دیکھا...... بخار سے چہرہ سرخ اور نڈھال ہو رہا تھا...... آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ماتھا جل رہا تھا...... کافی دیر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں مگر اس کی کچھ بھی نہ کھانے کی ضد نے پریشان کر رکھا تھا۔

"اچھا بھئی تو پھر میں تمہاری چھوٹی دادی کے ہاں لاہور فائق کو ہی لے جاؤں گی...... وہ تو میرا کہنا مانتا ہے ناں......" وہ دانستہ فائق کی طرف منہ کر کے بولیں تو فائق بھی خوش، خوش ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"اچھا ناں...... لائیں دیں دودھ......" منو ایک دم اچھل کر بیٹھ گیا، اس کی اس پھرتی پر انہوں نے مسکراہٹ چھپا کر کپ اس کی طرف بڑھایا۔ بہ مشکل تمام دودھ پیا دو بسکٹ کھائے تو عطیہ بیگم کے دل کو کچھ سکون ہوا۔ اب بخار کا سیرپ پلانا ایک مرحلہ...... وہی ضد...... امی پلائیں گی تو پیوں گا۔

"پی لو ناں منو۔" فائزہ خود بھی بچی تھی تاہم بہت معتبر بن کر بولی۔

"نہیں...... امی کے پاس جانا ہے۔" اس نے رونا شروع کیا۔ دادی نے ایک بار پھر پوتے کو منانا شروع کیا بخار نے اسے بہت چڑچڑا اور ضدی کیا ہوا تھا۔

☆☆☆

"آج کا دن تو کٹ ہی نہیں رہا۔" نادرہ ایک دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے بولی۔

"کون......" اندر سے نسوانی آواز آئی۔

"پولیو ویکسین۔" نادرہ نے کہا۔

"جی ابھی کھولتی ہوں۔" کہا گیا۔

دروازہ کھلا تو ایک چند ماہ کا بچہ اس عورت کی گود میں تھا جبکہ ایک چار سال کا بچہ شرما کر اپنی ماں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔

پہلے شیر خوار بچے کو پولیو ڈراپس پلائے پھر وہ چار سال کا بچہ سامنے آیا اسے ڈراپس پلاتے وقت نادرہ کو ایک بار پھر منو یاد آیا۔ اس نے بے ساختہ اس بچے کو پیار کیا۔

بس ایک مضافاتی بستی اور رہ گئی تھی پھر گھر ہی جانا تھا۔ "پتا نہیں کیسی طبیعت ہو گی میرے منو کی......" اس نے فکر مندی سے سوچا۔

☆☆☆

"آج تو نادرہ نے حد کر دی...... اتنی دیر...... پتا بھی ہے کہ چھوٹا بچہ بیمار ہے، نہ جی لو، لو پھر رہی ہے...... گھر کی کوئی پروا نہیں، میں بوڑھی جان کیا، کیا دیکھوں، کیا، کیا سنبھالوں۔" عطیہ بیگم بیمار منو کو دیکھ، دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں۔ اس لیے خود ہی خود یہ سب کہتی چلی گئیں اور جب کہہ لیا تو جی بھر کر خود ہی شرمندہ بھی ہو گئیں۔

"بیچاری کیا کرے...... دوپہر کا کھانا تک تو پکا کر جاتی ہے...... بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرتی ہے...... ایک برتن بھی باورچی خانے میں سنا ہوا چھوڑ کر نہیں جاتی کہ مجھے پریشانی نہ ہو...... آتے ہی پھر گھر کے کاموں میں لگ جاتی ہے، گھر بھی دیکھے باہر بھی دیکھے، کمائے نہیں تو ہمیں کہاں سے کھلائے...... میرا عرفان ہوتا تو اس بیچاری کو یوں نہ رُلنا پڑتا۔" مرحوم بیٹے کی یاد کے ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے۔

"دادی کیوں رو رہی ہیں نہ" تینوں بچے قریب آ گئے، فائزہ اور فائق معصومیت سے انہیں دیکھ رہے تھے جبکہ منو گود میں چڑھ کر انہیں پیار کرنے لگا۔

"میرا منو کھچڑی کھا لے گا تو میں نہیں روؤں گی۔" انہوں نے کھچڑی کی پلیٹ منو کے آگے کی جو نادرہ صبح ہی آج اس کے لیے بنا گئی تھی۔

"کھاؤں گا...... مگر امی کب آئیں گی۔" اس نے معصومیت سے پوچھا تو عطیہ بیگم کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا انہوں نے چٹا چٹ کئی بوسے اس کے لے ڈالے مگر نادرہ کے لیے غصہ ایک بار پھر عود کر آیا آج تو ان کی ساسوں والی مخصوص حس بیدار ہو گئی جو سال میں کبھی ایک آدھ بار ہی بھولے بھٹکے بیدار ہو جاتی تھی۔

"آ جائے آج نادرہ...... لوں گی خبر اس کی...... اتنی دیر...... غضب خدا کا شام بھی ڈھل گئی ہے۔" ان کی بڑبڑاہٹ کے دوران ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ گئی مہارانی...... لیتی ہوں خبر اس کی، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں مجال ہے جو احساس ہو۔" کہتے، کہتے انہوں نے دروازہ کھولا مگر وہ جو کہنے کے لیے اتنی باتیں سوچے بیٹھی تھیں نادرہ کو دیکھ کر کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔

وہ آئی ہی اس طرح تھی...... بالکل خاموش، اسٹریچر پر لیٹی ہوئی...... سر سے پاؤں تک سفید چادر میں ڈھکی ہوئی۔ سفید براق چادر پیٹ کے پاس سے سرخ ہو رہی تھی' انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے اس کے چہرے پر سے چادر ہٹائی۔ وہ خاموش تھی مگر چہرے پر درد نظر آ رہا تھا، ممتا کا درد...... بچوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی تھی ناں...... بچے ماں کو اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے' ماں کو پکار رہے تھے مگر وہ خاموش تھی...... نادرہ کا ہینڈ بیگ عطیہ بیگم کے ہاتھ میں دیا گیا جو منو نے بے تابی سے کھولا...... ماں نے صبح ہی کہا تھا تمہاری پسند کی چیز لاؤں گی...... چاکلیٹ اور نوڈلز کے تین پیکٹ ہینڈ بیگ سے برآمد ہوئے تھے۔

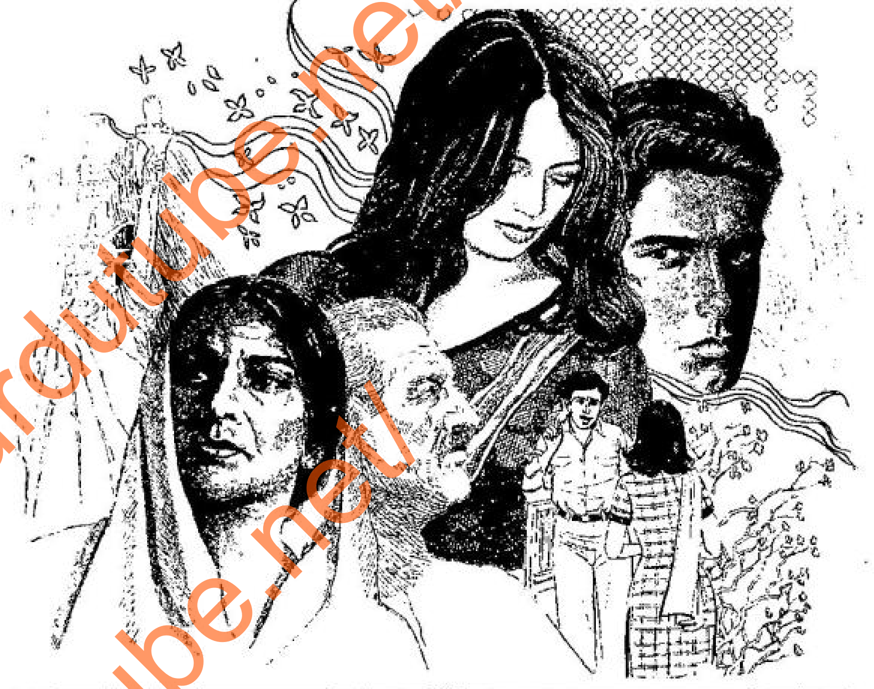
"مگر امی اٹھ کیوں نہیں رہیں۔" منو، دادی سے پوچھ رہا تھا مگر انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ پھٹی، پھٹی نظروں سے اپنی بیٹی جیسی بہو کا ساکت وجود دیکھ رہی تھیں۔ کوئی انہیں کچھ بتا تو رہا تھا ہاں شاید کوئی کہہ رہا تھا کہ صحت کی سوغات بانٹنے والوں کو موت کی سوغات دی گئی تھی۔ بچے، ماں کو پکارتے، پکارتے اب گھبرا کر رونے لگے تھے۔ عطیہ بیگم تینوں معصوم بچوں کو آغوش میں بھینچ کر زمین پر ہی بیٹھ گئی تھیں اور دھاڑیں مار، مار کر رو رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلے روز اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر چھپی تھی۔ "کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میں پولیو ویکسینیشن ٹیم پر فائرنگ سے دو خواتین سمیت تین افراد جاں بحق ہو گئے۔"

لوگوں نے سرسری نگاہ سے اس خبر کو دیکھا اور تفصیل پڑھے بغیر اخبار کی سیاسی شہ سرخیوں کی طرف متوجہ ہو گئے بھلا انہیں اس بات سے کیا سروکار کہ مرنے والی عورت ایک ماں بھی تھی جو اپنے یتیم بچوں کا آسرا تھی...... اور بھلا انہیں کیا علم کہ ایک چھوٹے سے کرایے کے گھر میں ایک پانچ سالہ بچہ بلک، بلک کر روتے ہوئے اپنی دادی سے کہہ رہا تھا۔

"دادی، امی کو بلا دو اب میں ضد نہیں کروں گا۔"



مکمل ناول

جب پھاگن پھول کھلائے

عالیہ حرا

حریرہ اسٹریچر پر تھی، تھکا ہوا زرد چہرہ، ڈھلکا ہوا سر...... آنکھوں کے گرد حلقے، بکھرے، الجھے بال، زرد رنگت، خشک ہونٹ......

”یہ، یہ میری حریرہ تو نہیں......“

زرین اکرام نے منہ پر ہاتھ رکھ لیے۔ آنکھوں سے بھل، بھل آنسو بہہ رہے تھے۔ مدیحہ بھی اپنے آنسوؤں پر کنٹرول نہیں رکھ پائی۔

اسٹریچر دھکیل کر لاتا ابوبکر اونچا ولمبا، خوبرو، اس

کے اعصاب بھی تنے ہوئے تھے، ماتھے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔

''کاش......کاش......''

زرین نے روتے ہوئے اکرام احمد کو دیکھا جو ضبط کی جانے کن منزلوں پر تھے جو ایک ٹک قریب آتی جانِ جگر حریرہ کو دیکھ رہے تھے۔ بیٹیوں سے ڈر نہیں لگتا، بیٹیوں کے نصیب سے ڈر لگتا ہے، بیٹیاں تو فرشتہ، معصوم، مقدس ہوتی ہیں ان کے نصیب بگڑ جائیں تو......تو حریرہ بن جاتی ہیں۔

''میری بیٹی......'' زرین اس پر جھک گئیں۔ وہ ہوش وحواس میں نہیں تھی۔

''یہ ٹرینکولائزر کے زیرِ اثر ہیں، ورنہ اتنا لمبا سفر نہ کر پاتیں۔'' ابوبکر گویا ہوا تھا۔

مدیحہ، حریرہ کو پیار کر رہی تھی اس کے رخسار چوم رہی تھی، اس کی بہن اس کی ماں جائی کتنے ماہ وسال کے بعد اس سے مل رہی تھی۔ اس سے کتنے سال چھوٹی مگر کتنے سال بڑی لگ رہی تھی۔ خوب صورت ملاحت کی جگہ ہڈیوں کا ڈھانچا، جاذبیت تو جانے کہاں جا سوئی تھی حسن جہاں سوز میں مبتلا تھا۔

اکرام احمد نے شکر گزاری سے ابوبکر ریحان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''شکریہ......میرے بچے......شکریہ......''

''شکریہ کیسا خالو جان......آپ میرے ہیں، میرا فرض تھا یہ......'' اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''فرض......'' اندر ہی اندر شرمسار ہو گئے تھے اکرام احمد......انہوں نے کون سا فرض ادا کیا تھا ابوبکر سے متعلق۔ ہمیشہ بوجھ سمجھا تھا اس یتیم بچے کو......گریز ونفرت کی سی راہ اپنائی تھی۔ آج اسی یتیم بچے نے ان کے جگر گوشے کو ملا دیا تھا۔ احساسِ تشکر سے آنکھیں نم ہو گئیں۔

''چلیں خالہ!'' دھیرے سے حریرہ کو چومتی، جگاتی، ہلاتی اپنے ہونے کا احساس دلاتی زرین کو اٹھایا۔

''ہم گھر چل رہے ہیں، اگلے دو گھنٹے میں اسے مکمل ہوش آجائے گا۔ آپ کو پہچانے گی بھی، باتیں بھی کرے گی، بس خود سے کچھ مت پوچھیے گا۔''

محبت سے، پیار سے زرین خالہ کے شانوں پر بازو پھیلا کر انہیں لے کر آگے بڑھا ساتھ، ساتھ سمجھا رہا تھا۔

مدیحہ اسٹریچر کے ساتھ، ساتھ چل رہی تھی۔ اکرام احمد نے ٹرالی تھام لی اور نرس میڈیکل باکس اور دوائیوں کا بیگ تھام کر ساتھ، ساتھ چلنے لگی۔ باہر ایمبولینس تیار کھڑی تھی۔ اب یہ لوگ قائداعظم انٹرنیشنل ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکل رہے تھے۔

☆☆☆

''ابوبکر، کب اٹھے گی وہ......؟'' زرین اکرام وقفے، وقفے سے جاتیں اور محوِ خواب حریرہ کو دیکھ کر آجاتیں۔ ان کی ممتا کو آدھا قرار آیا تھا۔ آدھا سکون اسے ہوش وحواس میں باتیں کرتے دیکھ کر آجاتا۔ بیٹے سے لگا کر تسکین اور طمانیت ملتی۔ ابوبکر انہیں بس دیکھ کر رہ گیا۔

ماں تھیں ناں بات سمجھ نہیں رہی تھیں۔ کیسے بتاتا کہ حریرہ ذہنی طور پر مفلوج ہو گئی ہے، ذہنی اذیت، جسمانی تکلیف اور ظلم کی حد نے اسے بالکل توڑ دیا تھا۔ واجد نے زیادہ مقدار میں نشہ آور انجیکشن دے، دے کر اسے تقریباً مار دیا تھا۔ اب وہ بولتی کچھ تھی اور منہ سے نکلتا کچھ تھا۔ جو ہذیانی قسم کے دورے پڑتے وہ الگ تھے۔

''خالہ......اسے سونے دیں، وہ آپ کے گھر میں ہے آپ کے پاس ہے۔ اٹھے گی تو جی بھر کر مل لیجیے گا۔'' مسکرا کر انہیں دیکھا۔

''یہ ہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کب اٹھے گی؟'' وہ بے چینی سے پھر اس کے کمرے کی جانب جانے لگیں۔

''حریرہ ٹھیک تو ہے ناں......مجھے اس کی حالت ٹھیک نہیں لگتی۔'' مدیحہ کے انداز میں تفکر آمیز بھیگا پن تھا۔

''مدیحہ وہ یہاں آگئی ہے شکر ادا کرو، واجد نے اسے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ زندگی تھی جو مرتے، مرتے بچ گئی ہماری حریرہ......''

''واجد نے ایسا کیوں کیا؟ وہ تو ہمارا خون تھا، بڑی محبت سے اسے رخصت کروا کر لے گیا تھا۔ ایسا کیا ہوا تھا۔ تم تو وہاں تھے ناں......'' ابوبکر بے چین سی مدیحہ کو دیکھ کر رہ گیا۔ حریرہ کی حالت دیکھ کر ہر ذی روح کا تڑپنا ممکن تھا۔

''محبت......!'' گہری سانس لی۔

معلوم نہیں کس کو کس سے محبت تھی۔ اور یہ کیسی محبت ہوتی ہے۔ جو کہیں وجود میں گھاؤ ڈال دیتی ہے کہیں وجود کو خاکستر کر دیتی ہے۔ ہر محاذ پر اس کا کام دوسرا ہے۔ لاحاصل محبت دیوانگی ہوئی ہے......یا......حاصل محبت دیوانگی بن جاتی ہے۔

مدیحہ اندر کی جانب بڑھ گئی......اس کے انداز میں بے چینی تھی۔

ابوبکر ریحان......دیوانِ محبت کھولنے لگا۔ طاقِ نیساں پر رکھے چراغ خود بخود جلنے لگے۔ باسی پھولوں کی مہک عطر سے باہم ملنے لگی، عشق کے زرد پھول وجود کی آکاس بیل سے آلپٹے۔

پلکوں کی باڑ سے پرے دوراوس کی بوندیں سمٹنے لگیں۔ دھیرے سے نگاہ اٹھا کر اطراف میں نگاہ کی۔ وہی بام ودر، وہی منزلیں، وہی دکھ کی انتہا......کوئی اس سے بھی تو پوچھے ناں......تم نے اب تک بڑے درد سہے۔ کوئی اسے بھی تو گلے لگالے۔ کوئی اس کے لیے بھی تو مسیحا بن جائے۔

وہ اٹھ کر باہر نکل آیا۔

بازو پیچھے باندھ کر لان کی مخملی گھاس پر ٹہلنے لگا۔ عشق سے بام ودر روشن تھے۔ رنگ برنگے پھولوں سے لان سج رہا تھا۔ خالو جان نے وہی پرانا اسٹیل کا جھولا نکال کر ہار سنگھار اور املتاس کے درختوں سے ذرا فاصلے پر رکھوا دیا تھا۔ سبز گھاس پر پھول گرے ہوئے تھے۔

جھولے پر بیٹھ کر چند پھول ہتھیلی پر اٹھا کر رکھ لیے......

اس افسانوی سی لڑکی کو ہار سنگھار کا پودا بہت پسند تھا۔ خصوصی طور پر مالی سے منگوا کر لگایا تھا۔ بڑا سا پودا روز پانی دیتی تھی۔ ابوبکر ہنستا تھا۔

''مت ہنسو......کیا اس پر پھول نہیں آئیں گے؟''

وہ چڑ جاتی تھی۔

''میں ہنس نہیں رہا۔ تمہاری جلد بازی کا مذاق اڑا رہا ہوں، اتنی جلدی پھول نہیں آتے۔''

''آئیں گے تو ناں......'' اس کے اندر یقین تھا۔

''بے شک......'' اسے نظروں میں رکھ کر مسکرایا تھا۔ ''پھول ہر درخت کا حسن اور ہر پیڑ کا سنگھار ہیں۔''

''ابوبکر میں نے مالی سے چمپا کا پودا بھی منگوایا ہے۔ افسانوں میں چمپا اور چنبیلی کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ چمپا پر تو جلدی پھول آجاتے ہیں، میں چاہتی ہوں میں سبز مخملی گھاس پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے سفید، زرد، ارغوانی، سرخ پھول چنوں، گجرے بناؤں۔'' وہ اپنی دھن میں بولتی تھی۔

''پھر تو تمہیں مالی سے بڑے، بڑے درخت منگوا کر لگوانے چاہیے تھے۔ آج دبا دیتا کل تم مالن بن جاتیں......'' وہ مسلسل چھیڑ خانی کرتا تھا۔ وہ اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر گھورتی، تراشی ہوئی بھنوؤں کو سکیڑ کر دیکھتی اور مذاق اڑائے جانے پر بطورِ خفگی اٹھ کر اندر چلی جاتی۔

اور، اب......نگاہ ہتھیلی سے اٹھ کر ان درختوں پر رک گئی۔ اس کے لگائے گئے درختوں پر بور بھی لگتا تھا، پودوں میں پھول بھی آکر جھولتے تھے، کتنے دن تک محبت سے آنے والے رستے کو تکا کرتے اور پھر ہوا کے زور سے ٹوٹ کر گر جاتے۔ پھر کتنے دن تک سبز مخملی غالیچے پر زمین بوس رہتے کوئی انہیں اٹھائے مگر انہیں چن کر گجرا بنانے کی خواہش لے کر کوئی بھاگا نہیں آتا تھا۔ یہاں تک کہ مرجھا کر جھلس جاتے۔ پھر مالی آتا جھاڑو لگاتا اور مرجھائے ہوئے پھولوں کو کچرے کی ٹوکری میں ڈال کر لے جاتا۔ جلا دیتا یا کہیں ڈھیر کرا دیتا۔ یہ مالی کی مرضی......

گہری سانس لے کر ابوبکر اٹھا......اور ان درختوں کے سائے میں آگیا، جو آج بھی اپنے لگانے والے کے منتظر تھے۔

''یادیں، بس یادیں باقی تھیں۔ اور......یہ یادیں......''

گہری سانس لے کر باسی پھولوں کی مہک کو اپنے اندر کھینچ لیا۔

اس ہجر ویاس کی ماری کو یاد بھی تھیں یا نہیں......

اس کی یادداشت، اس کا نگار وجود، ذہنی اذیت، وہ ٹارچر سیل سے نکل کر آئی تھی، اب وہ معصوم سی پیاری لڑکی......افسانوی رہتی کہ یا نہیں......ابوبکر پر تفکر طاری تھا۔

اسے یہاں لے تو آیا مگر نتائج کیا ہوتے ہیں اس کا یقین اسے بھی نہیں تھا۔ اپنی زندگی میں ہار ضرور گیا تھا محبت کو......مگر زندگی از سرِ نو سانس بھی تو لیتی ہے ناں......

محبت، محبت سے مشروط ہوتی ہے، ہاں اس کے وجود میں کہیں مشروط محبت ہو......مقامِ دل پر ہاتھ رکھنا جو

جانے کب سے ایک لے ایک ہی تال پر دھڑک رہا تھا...... دھک، دھک...... حریہ...... حریہ...... حریہ...... محبت، محبت، محبت......

☆☆☆

حریہ بہت لمبی نیند میں مبتلا تھی۔ زرین اسے پیار کرتیں، اپنے آنچل سے چہرہ صاف کرتیں، اٹھانے کی کوشش کرتیں، ہاتھ چومتیں مگر کوئی لمس اس کی حسیات کو نہیں چھیڑ رہا تھا۔ بے جان پتھر ہوگئی تھی وہ......

مسلسل رو...... رو کر زرین کی آنکھیں متورم تھیں۔

اکرام احمد اندر آتے، حریہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے، نظروں سے پیار کرتے اور زرین سے نگاہ چرا کر گزر جاتے۔

اس وقت بھی وہ آس و یاس میں مبتلا حریہ کا ہاتھ تھام کر بیٹھی تھیں۔ ابوبکر اندر آ گیا۔

''چلیں آئیں خالہ چائے پیتے ہیں۔'' ایک نگاہِ غلط محوِ خواب...... حریہ پر ڈالی۔ آنکھ کی پتلیوں میں جانے کیسے خواب ہوں گے۔

''مجھے کچھ نہیں کھانا جب تک میری بچی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھے گی نہیں، میرے سینے سے نہیں لگے گی۔''

''خالہ......'' دو زانو ہو کر وہ کارپٹ پر بیٹھا اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ مریضہ ہے...... اور وہ بھی ذہنی مریضہ...... ہم اس کے ساتھ زبردستی کچھ نہیں کر سکتے۔''

''کیا...... یہ ایسے ہی رہے گی......'' روتے ہوئے حریہ کو دیکھا۔

''اللہ نہ کرے خالہ جان......'' انہیں شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور باہر لے آیا۔

''اگر اسے ایسے ہی چھوڑنا تھا تو یہاں لاتے ہی کیوں......'' باہر لاؤنج میں لا کر صوفے پر بٹھایا۔

''اسے وقت لگے گا نارمل ہونے میں۔'' ریشماں کو چائے لانے کا اشارہ کیا۔

''کتنا......؟''

''کہیں...... اتنا تو نہیں ابوبکر کہ میں مر جاؤں۔'' غائب دماغی سے اسے دیکھا۔

''اللہ نہ کرے خالہ جان۔'' اس نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔

''مجھیں معاف کر دینا بیٹا، ہم نے تم پر بہت ظلم کیے ہیں یہ...... یہ شاید اسی کی سزا ملی ہے ہمیں۔'' وہ نڈھال سی تھیں۔

''نہیں خالہ جان، میں بندوں کے فیصلوں سے زیادہ خدا اور تقدیر پر بھروسا کرتا ہوں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں، شکوہ نہیں اگر ظلم ہوتا تو میں یہاں رہتا ہی نہیں۔'' اس نے ان کا شانہ تھپکا......

اتنے میں ریشماں ٹرالی لے آئی تھی۔

''اپنے آپ کو سنبھالیں۔ حریہ آپ کو خوش دیکھنا چاہے گی اور یہ بات یاد رکھیے گا اس کے سامنے کچھ دُہرائیے گا نہیں، کچھ پوچھیے گا نہیں، اس کے ساتھ بالکل نارمل رویہ رکھیے گا۔ اس کی پسند کی چیزیں پکائیے گا۔ اچھی، اچھی باتیں اس کی دوستوں کو بلوائیے گا...... مگر ابھی نہیں......'' کہتے، کہتے وہ ہنسا۔

''پتا چلا آپ نے مجمع اکٹھا کر لیا اس کا علاج جاری ہے اور چلے گا ابھی......''

''کب تک......؟'' سر اٹھا کر معصومیت سے دیکھا۔

ابوبکر کچھ کہتے، کہتے ایک لمحے کو رکا اور ہنس دیا۔

''جب تک وہ نارمل لوگوں کی طرح بی ہیو نہ شروع کر دے۔''

زرین چونکیں۔

''وہ جو نرس ساتھ آئی تھی وہ کہاں گئی؟''

''وہ وہاں امریکا میں رہتی تھی پاکستانی نرس تھی۔ پاکستان آ رہی تھی اور حریہ کے اپارٹمنٹ میں ہی رہتی تھی۔ اس لیے دونوں میں دوستی ہو گئی۔ اب اگر اسے آنا ہوگا تو خود ہی آ جائے گی۔ اسے اور کسی نرس کی ضرورت نہیں ہے آپ ہیں ناں اس کے پاس...... اب اسے سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہوگی۔ دوائیں تو ابھی...... اس کی چلیں گی۔'' ابوبکر بھاپ اڑاتا چائے کا مگ تھامے دھیرے، دھیرے بولتا جا رہا تھا۔

زرین سسکیاں لیتے ہوئے سن رہی تھیں اور پیاری بیٹی کا درد سہہ رہی تھیں۔ اور دروازے میں ایستادہ اکرام احمد سوزِ دل سے سن رہے تھے۔

جو پیارا ہوتا ہے سب سے پیارا...... وہی سب سے زیادہ دکھی کیوں ہوتا ہے۔

''آپ سب لوگوں کی توجہ، پیار، محبت اسے جلدی زندگی کی طرف واپس لے آئے گی۔''

ابوبکر، حریہ کی ذہنی حالت جانتا تھا۔ اس لیے ذہنی طور پر انہیں تیار کر رہا تھا۔ جس کرب انگیز دور سے وہ گزر کر آئی تھی۔ اس کی حقیقت سے صرف وہ ہی واقف تھا۔

☆☆☆

صوفیہ بانو آئی ہوئی تھیں، حریہ کا سنتے ہی اسلم چچا بھی آ گئے۔ لاؤنج میں اب سب گم صم بیٹھے تھے۔ حریہ کی حالتِ زار نے سب کو ہی دکھی کر دیا تھا۔

''اسے کب ہوش آئے گا؟''

''پتا نہیں......'' لہجہ گھبرا رہا تھا زرین کا۔

''پتا نہیں بھائی جان کو کیا شوق تھا ظہیر کے بیٹے سے شادی کرنے کا......'' اسلم چچا غصے میں تھے۔

''بھائی جان کو کہاں پتا ہوگا کہ واجد خود ذہنی مریض ہے یہ حال کر دے گا بچی کا۔''

''میرا دل تو کبھی مانتا ہی نہیں تھا۔'' زرین دلگیر تھیں۔

''ایسی کرتے ہیں ہمیشہ...... اب ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔'' صوفیہ بانو رنجیدہ تھیں۔

''پتا نہیں، ابوبکر نے اسپیشلسٹ سے ٹائم لیا ہے، اسے ذرا مکمل ہوش آ جائے۔''

مدیحہ سب کے لیے ٹرالی میں چائے لے آئی۔ ابھی سب کو دے کر اپنے لیے بنا رہی تھی کہ ایک ہذیانی چیخ نے ہڑبڑا دیا۔ سب چونکے۔

''نہیں، نہیں چھوڑ دو مجھے، چھوڑ دو...... جاؤ۔'' چیخوں کی آواز بلند ہوئی۔

موٹر سائیکل گیٹ کے اندر لاتا ابوبکر چونکا...... دوسرے لمحے بائیک وہیں درخت سے لگاتا اندر سرپٹ بھاگا تھا۔ مدیحہ، پھپھو، خالہ سب اوپر بھاگ رہے تھے۔ چیخیں بلند سے بلند ہو رہی تھیں۔

سب کمرے میں داخل ہوئے، ملگجا سا اندھیرا تھا۔ حریہ نیم جاں سی بستر پر پڑی چیخ رہی تھی۔

''حریہ، حریہ......'' مدیحہ اس پر جھکی...... شانے پر ہاتھ رکھا۔

''جاؤ...... جاؤ مجھے ٹیکا نہیں لگانا۔''

''حریہ، میری بچی......'' زرین اس کی جانب بڑھیں۔

حریہ کی آنکھیں بند تھیں اِک ہذیان اس پر طاری تھا۔ وہ اپنی کلائی دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ ایک جھٹکے سے مدیحہ دور ہٹی۔

صوفیہ اور زرین رونے لگیں۔

ابوبکر سرعت سے بھاگتا ہوا اندر آیا۔

اس وقت سوائے اس کے کوئی حریہ کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔

''حریہ، حریہ۔'' اس کے ہاتھ پکڑ کر اس نے اس کا چہرہ تھپتھپایا۔

''حریہ......'' جگ سے پانی لے کر اس کے چہرے پر چھڑکا۔

وہ اپنا سر پٹخ رہی تھی۔

''حریہ......'' اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ پھر ابوبکر نے پلٹ کر میڈیکل باکس سے سرنج نکالی۔ انجیکشن بھرا اور بایاں بازو پکڑ کر لگا دیا۔

اِک طویل چیخ بلند ہوئی۔ پھر چیخوں میں بتدریج کمی آتی گئی۔ نیم جاں حریہ، مدیحہ کی گود میں گر گئی۔

ابوبکر نے اس پر کمبل ڈالا...... مدیحہ نے اسے سیدھا کیا، اپنے آنچل سے چہرہ صاف کیا۔ زرین دم سادھے، ساکت، منہ پر ہاتھ رکھے اسے دیکھے گئیں۔

''یہ، یہ ان کی بیٹی کی کیا حالت ہو گئی تھی۔''

''واجد...... واجد......'' ان کے لبوں سے... بددعائیں نکلنے لگیں۔

ابوبکر، زرین اور صوفیہ بانو کو تھام کر باہر لے آیا۔

اسلم چچا سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھے تھے۔

''بھائی صاحب نے اپنی بیٹی کی زندگی خود ہی ختم کر دی، کیا تھا بچے دے دیتے، صوفیہ نے کتنا اس کا رشتہ مانگا تھا مگر صدا کے ضدی تھے وہ تو......'' ابوبکر نظر چرا کر باہر نکل گیا۔

حریہ کے لیے آج بھی اس کا دل طلب گار تھا۔ آج بھی خدا کے حضور سجدہ ریز تھا، سچے اور پاک جذبے کے ساتھ...... مگر...... عشق کی راہ کے امتحان زندگی لوٹ

لیتے ہیں۔

نشاط آفرین محبت آمیز لمحے تو اس کی زندگی میں آئے ہی نہیں تھے۔ امنگ کی قندیل، وجود کے بام و در پر روشن ہی نہیں ہوئی۔ اِک گہری سانس لے کر وہ سرخ بجری کی روش پر ٹہلنے لگا۔

☆☆☆

اکرام احمد اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئے تو نگاہ مصلے پر بیٹھی زرین پر پڑی، ہتھیلیاں پھیلی تھیں، ہونٹ دھیرے، دھیرے لرز رہے تھے، آنسو رخساروں پر پھسل، پھسل کر آنچل و دامن بھگو رہے تھے۔

آگے بڑھے اور نڈھال سے بیڈ پر گر سے گئے، دونوں بازو وجود کے دائیں بائیں پہلو میں لٹکائے۔

کیسی خاموش طبع عورت تھی۔ حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ لائی۔ اس کی ذات کو کبھی اہمیت ہی نہیں دی، اپنا مطلب نکالا۔ داؤ چلایا اور بس...... گہری سانس لی۔ ان جیسے خود غرض مرد اگر بیوی کو نصف بہتر ہی سمجھ لیں۔ پسلیوں کے پاس مقامِ دل کے قریب ہی جگہ دے دیتے تو آج ان کی بیٹی یوں نیم جاں پژمردہ سی نہ ہوتی۔ ان کا دل کٹ رہا تھا حریرہ کی حالت دیکھ کر...... جیسے کوئی بوڑھا وجود جو اپنی ساری زندگی اپنی ساری خوشیاں ہار بیٹھا ہو، بس اب رختِ سفر ہو۔

''واجد......'' ان کا دل دہائی دے رہا تھا۔ جسے ساری دنیا پر فوقیت دی اس نے ان کی بیٹی کو کن حالوں میں پہنچا دیا۔

اندھا اعتماد...... بعض اوقات اندھا ہی ہوتا ہے۔ وہ کہیں سے مل جاتا تو اسے دار پر چڑھا دیتے۔ چھوٹے بھائی کی محبت نے چھوٹی پیاری بیٹی کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا۔

اپنے سب بچوں میں انہیں سب سے بڑے منہاج کے بعد حریرہ سے محبت تھی۔ یہ فطری امر تھا...... یا قانونِ قدرت۔ سب سے پہلے بچے سے محبت ہوتی ہے، پہلی اولاد جو ہوتی ہے، ساری محبت لٹا دی جاتی ہے، آخری بچے کے ساتھ بھی یہ ہی حساب کتاب ہوتا ہے کہ وہ آخری ہوتا ہے، جان سے پیارا بن جاتا ہے گھر بھر کا لاڈلا...... جان سے پیارا...... بے چین دل کو دائیں ہاتھ سے مسلا...... آنکھیں بند کیں...... جانِ جگر بستر پر خاموش، چپ، نیم جاں نڈھال تھا۔

اک باطل خیال دل کو چھو گیا، آنکھیں کھولیں۔ تسبیح لے کر زرین سر جھکائے باہر جا رہی تھیں۔ انہیں حریرہ پر دم کرنا تھا۔ اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر تسبیح پڑھنا تھی۔ وہ انہیں روک نہ سکے......

اس عورت کو ناقص العقل کہہ کر اس کا دل توڑ دیا تھا۔ واجد کے ساتھ حریرہ کو رخصت کرنے پر وہ ایسی ہی نیم جاں نڈھال ہو گئی تھیں۔ اولاد کا دکھ انسان کے سارے کس بل نکال دیتا ہے۔

☆☆☆

حریرہ کے بیڈ پر سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں، دریچے کے پردے کھنچے ہوئے تھے، تازہ ہوا نے اس کے چہرے کو چھوا۔ مانوس جیسمین کی خوشبو سانسوں سے لپٹی۔ دھیرے سے آنکھیں کھل گئیں۔

وجود میں درد کا احساس کھینچے ہوئے تکلیف کا احساس شدید تھا۔ دائیں ہتھیلی کی پشت پر چبھن کا احساس تھا، بھاری پپوٹے برسوں کی تھکن لیے تھے۔

پانی کا گلاس لاتی مدیحہ دروازے میں ہی ٹھہر گئی۔ پچھلے سات دن سے بے ہوش، نیم مردہ حریرہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ ایک ٹک اب اپنے قریب بیٹھی اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ جن کی آنکھیں بند تھیں۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں۔ دوسرا ہاتھ حریرہ کے وجود پر تھا۔ خود ان کا وجود شاید خدا کے آگے سر بسجود تھا۔

''ماما......'' حریرہ کے نیم وا ہونٹوں سے نکلا۔

مدیحہ ساکت کھڑی تھی۔

''ما...... ما...... مجھے آپ سے ملنا ہے، مجھے بہت تکلیف ہے، بس آخری دفعہ...... آپ کی گود میں سونا ہے، مجھے آپ...... بہت یا...... د...... آ...... رہی ہیں۔''

لفظ ٹوٹ رہے تھے۔

''ماما...... میں آپ...... کو...... یاد نہیں آتی کیا بس مرنے سے پہلے...... ایک...... بار...... آپ کا...... فون بھی...... نہیں...... ملتا...... اللہ...... بھی...... میری نہیں

سنتا...... کیا...... میں......''

زرین اکرام نے ان بے ربط الفاظ پر آنکھیں کھول دیں۔ حریرہ کی پتلیاں ساکت ان پر ٹھہری ہوئی تھیں...... بے جان سا وجود۔

''کیا میں ...... آپ...... کو دیکھے...... بغیر مر جاؤں گی۔''

''حریرہ......'' زرین کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ بے تابی سے ہاتھ تھام لیا۔

''میرے خوابوں سے باہر آ کر مجھے تھام لیں، مجھے بہت درد ہے، ماما...... میں اسی تکلیف سے...... کہیں ...... مر ہی نہ جاؤں۔''

''حریرہ......'' اس کا بازو پکڑا۔

نڈھال سی پلکیں، زرد رخساروں پر گر گئیں۔ وہ عالمِ خواب میں تھی۔

''حریرہ...... حریرہ...... میری بچی......'' اسے جھنجوڑا۔

''ماما......'' مدیحہ نے پیچھے سے آ کر ماں کو پکڑا۔

''میری جان...... حریرہ...... دیکھ مدیحہ اسے ہوش آ گیا ہے، دیکھ تو......'' وہ بے خود تھیں۔

نیم جاں حریرہ عالمِ خواب سے ابھر رہی تھی۔ زرین اسے چوم رہی تھیں۔

''میری بچی...... آنکھیں کھول...... ماں قربان، میں تیرے پاس ہوں۔'' مدیحہ دم بخود ماں کے پیچھے سے دیکھ رہی تھی۔

بے یقینی سے حریرہ نے آنکھیں کھولیں۔

''حریرہ......'' ماں نے چوم لیا۔

گمان یا حقیقت پلکیں گریں...... اٹھیں...... سورج کی شعاعیں چبھنے لگیں۔ برسوں گزرے...... اسی حقیقت کا عکس اور یقین تلاشنے میں...... یہ یقین تھا...... یا کوئی خواب...... کلائی میں چبھن کا احساس ہوا۔

ماں کے عقب میں ایک اور چہرہ ابھرا تھا۔ حسیات چونکنی ہوئیں۔ دوسرے لمحے سر گھمایا...... آشنا چیزیں، یہ بستر، یہ دریچہ، وہ کتابیں اک خوف، دہشت آنکھوں میں ابھری۔ کمزور دل دھڑ، دھڑ دھڑک رہا تھا۔

''ما...... ما......''

''میری جان......'' ماں کا عکس نیم جاں وجود سے لپٹ گیا۔

''نہیں، نہیں چھوڑ دو مجھے جانا ہے، تم جاؤ، جاؤ......''

وہ چیخ رہی تھی، اپنا وجود چھڑا رہی تھی۔ ہذیانی سی کیفیت تھی۔ موجود حقیقت کو خواب سمجھ رہی تھی۔

اور پھر خود بخود چیخیں مدھم ہوئیں۔ نڈھال پژمردہ وجود ماں کی گود میں گر گیا۔

مدیحہ نے زار، زار روتے، ہوئے پانی کے چند قطرے سوکھے ہونٹوں پر گرائے، گیلا ہاتھ منہ پر پھیرا۔

زرین اکرام چوم رہی تھیں۔

مدیحہ نے دھیرے سے اسے بستر پر لٹایا۔ زرین چونکیں۔ ان کا ہاتھ اس کی انگلیوں میں بھنچا ہوا تھا۔ وہ عالمِ خواب میں تھی۔

یقین و بے یقینی کے درمیان...... مگر حریرہ کا لمس...... ان کا ہاتھ بھینچنا...... انہیں زندگی کا احساس دے رہا تھا۔

اک عرصے بعد...... طویل سفر کے بعد......

انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

☆☆☆

''ہوں......'' ابو بکر نے پُر تفکر سے انداز میں سامنے بیٹھی مدیحہ کو دیکھتے ہوئے کہا جو اسے حریرہ کی کیفیت بتا رہی تھی۔

''یہ خوش آئند بات ہے، اسے خود ہوش آیا ہے مدیحہ...... کل کا دن انشاء اللہ آج کے دن سے مختلف ہوگا۔ جس اذیت، جس دکھ کے سمندر سے وہ گزر کر آئی ہے، اس کا تم لوگوں کو اندازہ نہیں ہے۔ میں نے ڈاکٹر نیلوفر سے ٹائم لیا ہے، ساری کنڈیشن بتائی ہے، وہ ایک ماہر سائیکاٹرسٹ ہیں، آہستہ، آہستہ حریرہ نارمل ہوگی پر اس میں وقت لگے گا۔'' ابو بکر دھیرے، دھیرے مدیحہ کو سمجھا رہا تھا۔

''تم خالہ جان کو سمجھاؤ کہ اس کے سامنے نہ آئیں، اب کے وہ اٹھے تو اس کے پاس کوئی نہ ہو، اپنا کمرا، اپنی چیزیں دیکھے گی تو اسے بہت کچھ سمجھ آئے گا۔ ابھی وہ عالمِ خواب میں ہوتی ہے، خواب سے حقیقت کی دنیا میں آنا اِک صبر آزما کام ہے۔''

''ابوبکر......واجد نے ایسا کیوں کیا؟ اُسے تو حریرہ سے بہت محبت تھی، جیتے جی کیوں مار دیا اسے؟''

ابوبکر اسے دیکھنے لگا۔

''مدیحہ ایک ذہنی مریض ہی دوسروں کو ذہنی اذیت دے سکتا ہے، اس نے ایسا کیوں کیا...... یا وہ ایسا کیوں تھا، یہ الگ کیس ہے...... لیکن اس وقت حریرہ کا کیس سب سے زیادہ اہم ہے، ہمیں اسے زندگی کی طرف لانا ہے، تم خالہ جان، یہ گھر، ہم سب مل کر ایسا کرسکتے ہیں۔'' مدیحہ نے گہری سانس لی۔

''اب تو ہم سب کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہوگا......''

ابوبکر کی پیشانی پر شکنیں بڑھ گئیں۔

☆☆☆

اب کے حریرہ طویل نیند سے جاگی تو اس کے بیڈ روم میں کوئی نہیں تھا، کھلی آنکھیں چھت کو دیکھے گئیں۔

دھیرے، دھیرے نظریں نیچے اتریں، بیڈ، الماری، دیگر چیزیں، کتابیں، ٹی وی ٹرالی، فلور کشن، وہ ایک کرسی...... اس کی حسیات بیدار ہو رہی تھیں۔

''وہ کہاں ہے......؟'' اپنے سہارے سے اٹھی۔

''فلیٹ میں...... یا گھر میں......'' وہ چونکی۔

''ما......ما......واجد......'' کمبل سائڈ پر پھینکا...... یہ خواب نہیں تھا، کلائی میں چبھن کا احساس ہوا۔ دایاں بازو درد کر رہا تھا۔ دریچے کی جانب بڑھی...... بے اختیار دکھے ہوئے بازو اٹھا کر پردے کھینچ دیے۔

وہ امریکا کی طویل قامت عمارت کے کسی فلیٹ کا کمرا نہیں تھا۔ وہ تو گھر تھا...... بے ساختہ آگے بڑھی مگر لڑکھڑا گئی۔ اس نے قریبی کرسی پکڑی۔ وہ شدید کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ شیشے کی یخ دیوار اس کے چہرے سے ٹکرائی۔

نیچے کوئی سڑک نہیں تھی۔ جہاں سے گاڑیاں چیونٹیوں جیسی نظر آتیں۔ شیشے کی سطح سے چہرہ چپکا دیا۔ دل ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

یہ تو اس کی بھولی بسری یاد تھی۔ اس کا گھر تھا۔ پھول، پودے، درخت اور اس کا جھولا...... بے یقینی...... خواب...... دل ڈوبا...... بے ساختہ اپنی کلائی کو دانتوں سے کاٹ ڈالا...... آہ حقیقت ...... حقیقت......

یہ خواب نہیں تھا' یہ واجد کے فلیٹ کا کمرا نہیں تھا۔ اس پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔

''ماما...... پاپا......'' آنسو نیم جاں آنکھوں میں ابھرے۔ پھر بے ساختہ گھومی اور لڑکھڑا کر گری...... یہ اسی کا کمرا تھا۔ قالین کو اپنے ہاتھوں سے چھوا۔

ہاتھ بڑھا کر ٹرالی کا پایا چھوا...... کھسک کر آگے بڑھی۔ ہر چیز کو چھو لینا چاہتی تھی، چوم لینا چاہتی تھی۔

اس کی حیات نارمل ہو رہی تھیں پھر ایک زور کا چکر آیا اور اس کا سر ڈھلک گیا تھا۔

بازو کا درد بڑھ گیا۔ کلائی پر دانتوں کے نشان کی جگہ خون کے قطرے ابھر آئے۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

اور اسے دیکھنے کی خاطر اندر آئے اکرام احمد دروازے میں ہی ٹھٹک گئے۔ کیسی مردہ سی پڑی تھی وہ۔

''حریرہ...... حریرہ......'' بے ساختہ آگے بڑھے، سیدھا کیا اس کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا۔ اٹھا کر بستر پر لٹایا، کمبل ڈالا، اس کے دوپٹے سے چہرہ صاف کیا۔ زرد، کمزور اور نڈھال۔

''میری بچی مجھے معاف کر دے۔'' پیشانی چوم لی۔ ''میں اس ظالم کو چھوڑوں گا نہیں......'' دھیرے، دھیرے بال سہلانے لگے۔ ہتھیلی ہاتھ میں تھام لی۔

''پاپا......'' مدیحہ اندر آ گئی۔ ''آپ کا فون ہے۔'' قریب آئی۔

انہوں نے اپنی آنکھیں صاف کر کے سیل فون لے لیا۔

مدیحہ نے باپ کا شانہ دبا کر بہن کو دیکھا۔

اس کے چہرے پر بے چینی سی تھی...... دھیرے سے سر ہلا رہی تھی۔ بند آنکھوں سے جانے اذیت کے کس جہاں سے گزرتی سر پٹخ رہی تھی۔ اکرام احمد فون سننے باہر چلے گئے۔

مدیحہ دم بخود کھڑی تھی۔ حریرہ کو ہوش آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلنے کو بے چین سی تھیں' وہ اپنا سر پٹخ رہی تھی۔

اسے ہٹ جانا چاہیے سامنے سے...... دو قدم، تین قدم، پیچھے ہٹنے لگی۔ سانس ساکن سی تھی۔

حریرہ کی آنکھیں کھل گئیں...... اِک ٹک پیچھے ہٹتی مدیحہ پر ٹھہر گئیں۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔

شناسا چہرہ، شناسا لمس...... خواب...... حقیقت......

مدیحہ ایک قدم اور پیچھے ہٹی دروازے سے ٹکرائی...... حریرہ نے سر گھمایا، دوسرے لمحے مدیحہ باہر نکل گئی۔

حریرہ نے پھر اس جانب دیکھا اور ساکت رہی وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کا خواب تھا۔ اس کا ذہن بے چین ہو گیا۔

اِک طلب سی تھی جس نے وجود میں سرائیت کر کے بے چینی کو اچھال دیا۔ آنکھوں میں خوف و دہشت کا احساس موجزن ہوا...... بازو پر تکلیف کا احساس بڑھا...... دھیرے سے اٹھ بیٹھی۔

طلب، وجود میں بڑھنے لگی، رگ و پے میں سرائیت ہوتا ہوا نشہ رسد، رسد پکارنے لگا......

اس کا ذہن مفلوج ہونے لگا۔ پہچان کے سائے بھی تھے، نشے کی طلب بھی تھی۔ مانوس کمرا بھی تھا۔ خواب ٹوٹنے کا اندیشہ بھی...... مضمحل و نڈھال بھی تھی...... اور ہوش میں بھی رہنا تھا۔

اس نے زور، زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ چیخ، چیخ کر رونے لگی۔

''چھوڑ دو مجھے، جانے دو بس ایک بار، ایک بار......'' مدیحہ کمرے کے باہر ساکت کھڑی تھی۔

مدھم سی آواز پر لاؤنج میں بیٹھے ابوبکر نے چونک کر اوپر دیکھا اور مدیحہ کو یوں کھڑا دیکھ کر سرعت سے اوپر آیا۔

حریرہ کی آواز نمایاں ہونے لگی۔

''کیا ہوا......؟''

''اسے ہوش آ رہا ہے۔''

ابوبکر سرعت سے اندر داخل ہوا۔

''ابوبکر...... ابوبکر......'' شناسا چہرہ۔

''دیکھو، دیکھو...... یہ میرا کمرا ہے ناں...... یہ میری چیزیں ہیں ناں...... مجھے یہاں کون لایا...... مجھے، مجھے بہت درد ہو رہا ہے، مجھے انجکشن...... بس ایک دفعہ اور لگا دو......'' ابوبکر کو دیکھ کر حریرہ کنارے تک آ گئی۔ دو زانو بیٹھی، ہاتھ جوڑتی وہ ابوبکر کو دلگیر کر گئی۔

''پلیز لگا دو...... واجد کہاں ہے، اس سے کہہ دو، لگا دو ناں...... پھر وہ...... مجھے ہوش میں دیکھ کر مار دے گا، جلدی کرو ناں......'' وہ ابوبکر کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگی۔

''پلیز...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''میری بات سنو......'' ابوبکر اس کے سامنے بیٹھا۔

''اب تم واجد کے پاس نہیں ہو...... اس سے بہت دور ہو، تم اپنے پاپا کے گھر میں ہو۔''

اک ٹک وہ اسے دیکھے گئی۔ بے چینی حد سے سوا ہونے لگی۔

''حریرہ......'' دھیرے سے اسے جھنجوڑا۔ ''ہوش

میں آؤ، تم پاکستان میں ہو، امریکا میں نہیں......اپنی ماما، پاپا کے پاس ہو۔"

"پلیز ابوبکر......" وہ اس کے شانے سے لگ گئی۔

اس کے انداز میں خوف تھا۔

"لگا دو ناں، مجھے درد ہو رہا ہے۔" ابوبکر کی آنکھیں بھرنے لگیں۔

محبت مضمحل ہو تو دل کب قرار میں رہتا ہے۔ اور یہ دل تو کب سے بے قرار، رنجور اور نارسائی کے دریا میں ڈوبا ہوا تھا۔

"تم ماما، پاپا سے نہیں ملوگی؟"

"میں سب سے ملوں گی، مجھے اِک انجیکشن لگا دو...... مجھے تیار ہونا ہے، مجھے کپڑے بھی بدلنے ہیں، میلے ہو رہے ہیں ناں......" اس کی آواز سرگوشی میں نکل رہی تھی۔

مدیحہ نے سر دیوار سے لگا دیا۔ بھل، بھل آنسو بہہ رہے تھے۔

"کیسی زندہ دل لڑکی جذبوں سے بھرا وجود مار دیا تم نے واجد......خدا کرے تم بھی یوں ہی بھٹکو......... بے قرار رہو......" دل سے بددعا نکلی۔

اس سے پہلے وہ مشتعل ہوتی چیختی چلاتی، ابوبکر نے اسے پُرسکون کرنے کے لیے انجیکشن لگا دیا۔

وہ ہوش سے بے ہوشی کی جانب سفر کرنے لگی۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ معصوم مسکراہٹ نے ہونٹوں کا گھیراؤ کر لیا۔

ابوبکر کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

دھیرے، دھیرے اس کا ہاتھ تھپکتے وہ دلگیر تھا۔ اس کی رگوں میں واجد نے زہر اتار دیا تھا جو اسے ہوش میں نہیں آنے دے رہا تھا۔ ہوش آتا تو نشے کی طلب کچھ اور سوچنے نہیں دیتی......سر پٹخنے لگتی تھی۔ اس وقت اسے پُرسکون ادویات کے زیرِ اثر رکھا جا رہا تھا تاکہ آہستہ، آہستہ نشے کی طلب ختم ہو۔

مدیحہ اندر آ گئی۔

"ابوبکر......" وہ رو رہی تھی۔

"ایسے کب تک......" حریرہ کے پیروں کے پاس وہ کرہی گئی۔

"ماما، پاپا کتنا انتظار کریں گے اس سے ملنے کا۔"

ابوبکر نے آنکھیں مسلیں۔

"سامنے تو ہے جی بھر کر دیکھو......" بہ مشکل مسکرایا۔

"اس کے وجود میں جو نشہ ہے، وہ اسے بے چین، بے کل رکھتا ہے۔" مدیحہ دھیرے، دھیرے اس کے پیر سہلانے لگی۔

"یہ جیتے جی کیوں مر گئی ابوبکر......"

اس نے اِک نگاہ اسے دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"بعض فیصلے زندگی کی سانسیں کھینچ لیتے ہیں مدیحہ، ایک بھی غلط فیصلہ روح میں سرایت کر جائے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔"

"واجد تو اس سے بہت محبت کرتا تھا؟" مدیحہ کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

"وہ ایک ذہنی مریض تھا اور ذہنی مریض خود پرست، خود پسند ہوتے ہیں، دوسروں کو سوائے تناؤ کے اور کچھ نہیں دیتے۔"

"ذہنی مریض......؟" مدیحہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

ابوبکر پلٹ کر جانے لگا۔

"تمہارے چچا اور چچی کی طلاق نے واجد پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ بے شک واجد اپنے باپ کے ساتھ رہا مگر وہاں کے ماحول وآزادی، خودمختاری اور عورت کے انداز نے اسے عورت سے متنفر کر دیا۔ اس کے لیے عورت محض کھیل تھی، من پسند عورت کا حصول آسان...... ہر خوب صورت عورت کھلونا تھی۔ دولت نے اسے اور طرار بنا ڈالا، اسے عورت کی عزت نفس، حرمت اور حیا کا احساس تھا نہ پاس......اس لیے اس نے حریرہ کو اِک کھلونا سمجھ لیا تھا۔" ابوبکر نے لحہ بھر رک کر آواز کے زیر و بم کو قابو میں کیا۔ مدیحہ دم بخود سن رہی تھی۔

حریرہ کھلونا نہیں تھی، نہ بننا چاہتی تھی۔ واجد اسے کھلونا بنانا چاہتا تھا۔ اس ٹکراؤ نے حریرہ کو توڑ دیا۔ زور زبردستی سے واجد اسے نشہ دینے لگا، نشے کا عادی بنا ڈالا......حریرہ ہوش وخرد سے بیگانہ رہنے لگی۔

انہی دنوں اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ غلط دوا

نے ری ایکشن کر دیا۔ واجد اسے کسی دوست کے ذریعے اسپتال میں چھوڑ کر بھاگ گیا حالانکہ وہاں تو سب تحقیق کرتے ہیں مگر واجد کی قسمت اچھی تھی پکڑا نہیں گیا۔ یہ الگ داستان تھی کہ ابوبکر کو کیسے خبر ہوئی اور کس طرح ضروری قانونی کارروائیاں مکمل کر کے اسے وہ پاکستان لانے میں کامیاب ہو گیا۔

ابوبکر نے مدیحہ کو داستان سنا کر ایک گہری سانس لے کر حریرہ پر نگاہ ڈالی۔

"ابھی اسے احساس نہیں ہے کہ یہ کس جہنم سے نجات حاصل کر کے آئی ہے۔ اب بھی یہ عالم خواب میں تم لوگوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اسے ہوش میں آنے پر اپنے ہونے کا احساس دلاؤ، یہ خواب سمجھتی رہے گی، تم لوگ اسے حقیقت کی طرف لے آؤ۔"

ابوبکر مجروح لہجے میں تفصیل بتا رہا تھا۔ زندگی کے اوراق صرف حریرہ کے ہی پریشان کن نہیں تھے۔ سبھی گھر والے متاثر تھے۔

اکرام احمد دروازے سے ہی پلٹ گئے تھے۔ سب سن کر انہیں بے انتہا دکھ ہو رہا تھا۔ ان کا وجود ریزہ، ریزہ ہو رہا تھا۔ زرین ماں تھی انہیں احساس تھا۔ ان کی چھٹی حس خبردار کر رہی تھی کہ غلط ہو رہا ہے، بھائی کی محبت میں اکرام احمد کو احساس ہی نہیں ہوا کہ واقعی ایک غلط فیصلہ ان کی بیٹی کی زندگی تباہ کرنے والا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر رضا عباسی نے اس کا مکمل چیک کیا تھا اور پھر اس کیس کو اپنی ماہر نفسیات بیگم ڈاکٹر نیلوفر کو ریج دیا۔ ابھی اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ نشے کی علت سے نکالنے کے لیے اسے ادویات دی جا رہی تھیں۔ ہوش میں آتی تو چیختی چلاتی، اپنے وجود کو کاٹتی، نوچتی۔ اسے پُرسکون رکھنے کے لیے واپس انجیکشن دے دیا جاتا۔

زرین اکرام کے سجدے طویل ہوتے گئے، اس کے پاس بیٹھی تسبیح کے دانے گرائے جاتیں اور پھونکیں مارے جاتیں۔

وہ ایسا ہی اِک نرم گرم سا دن تھا۔ وہ رنجوری دلگیر تسبیح پڑھ کر پھونک رہی تھیں کہ حریرہ نے آنکھیں کھول دیں۔

اعتراف

☆اپنے رب کے حضور سچے دل سے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا کرو کہ وہ انہیں تمہاری قوتوں میں بدل دے گا۔ توبہ شرط ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

☆دعا ایک دستک ہے اور مسلسل دستک سے دروازے کھل جایا کرتے ہیں۔

از: فرح طاہر، ملتان

"ماں قربان جائے۔" زرین نے پیشانی چوم لی۔

اس وقت وہ قدرے پُرسکون تھی گویا طویل نیند سے جاگی تھی۔

"ماما......" اس کا سر تکیے پر تھا۔ اپنے بیڈ پر تھی، سامنے ماما تھیں، اس کا اپنا کمرا تھا۔

"حریرہ کیسی طبیعت ہے بیٹا؟"

"ما......ما......" اس کی آنکھوں میں یقین کے بادل اترنے لگے۔

زرین اس کا ہاتھ تھام کر چومنے لگیں۔ آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔

"ما......ما......" یقین۔ پُریقین ہوا......دھیرے سے اٹھ بیٹھی۔ نڈھال، پژمردہ، زرد......

"ما......ما......" پھر ان کے سینے سے آ لگی۔

"میری بچی، میری جان......" وہ اسے چومنے لگیں۔

"یہ خواب تو نہیں ہے ناں، میں آپ کو دیکھ رہی ہوں، ماما......"

"یہ خواب نہیں...... حقیقت ہے میری جان، تم ہمارے پاس ہو اپنے گھر میں، جہنم سے باہر......"

"ما......ما......" اس نے سر اٹھایا اور ایک دفعہ پھر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں خوف، واہمے، خدشے تھے۔

"وا......جد......واجد......"

"تف ہے اس پر۔" انہوں نے اسے سمیٹ لیا۔

اور وہ ایک معصوم، میلے میں کھوئی ہوئی ڈری سہمی بچی کے مانند ان کے سینے میں چھپ گئی۔

زرین اکرام بھل بھل رو نے لگیں۔

☆☆☆

اِک طویل نیند سے تو وہ جاگ گئی تھی۔ مگر گئے وقتوں کا ڈر خوف، سراسیمگی آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی۔ دہشت کے سائے آنکھوں میں لرزتے رہتے تھے۔ بس سب کو دیکھے جاتی...... لفظوں سے کھیلنے والی لڑکی...... لفظ بولنا بھول گئی تھی۔ وجود کے رگ و پے میں ایک خلجان سا بپا رہتا۔ وہ سونا چاہتی تھی طویل نیند مگر کوئی آنہ جائے...... کوئی اٹھا نہ لے جائے۔

”مجھے زندہ نہیں رہنا ابو بکر...... زندگی اب مجھے ذلت لگتی ہے باعث دکھ ہوں میں ماما، پاپا سب کے لیے...... مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہی میری زندگی تھی وہی میری آخرت......“ آج ابو بکر اسے ڈاکٹر نیلوفر کے پاس لے جا رہا تھا۔

”کیوں...... کیوں...... ابو بکر مجھے اِدھر.... لے آئے ہو تم......“ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتی وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔

”بس مجھے ایک ڈوز دے دو، مجھے سلا دو...... مجھے سونا ہے۔“

ابو بکر کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

دھیرے سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

دل چاہا اسے خود میں چھپا کر اس پر پھولوں کی برسات کر دے، کیسے اسے بتائے زندگی ایک بھرپور زندگی اس کی اب بھی منتظر ہے۔

نظریں چرا کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ مدیحہ اندر آ گئی تھی۔ ٹرینکولائزر اس کی شریانوں میں گردش کرتا دماغ تک پہنچ رہا تھا۔ آنکھیں موندے، وہ پُرسکون نیند میں اتر رہی تھی۔ مدیحہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

اس کی معصوم بہن کے لیے زندگی کتنی درد آمیز تھی۔

☆☆☆

آنکھوں میں سوچوں کے پیچ و خم لیے دریچے سے لگی باہر دیکھ رہی تھی۔ ہلکی، ہلکی دھوپ اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ گلاب، چنبیلی، موتیا، سبز گھاس اس پر پھدکتی چڑیاں، ذرا فاصلے پر گھاس پر ٹھونگیں مارتی ہدہد......

ذرا سا آگے ہوئی اور شیشے سے جا لگی...... اما...... کے زرد پتے نظر آ رہے تھے۔

”میرا جھولا......“ خشک گھاس پر بادام کے سرخ، سبز خشک پتے بکھرے تھے۔

چن، چن کلیاں میں گجرا بناؤں گی۔“ یادِ ماضی کا ورق الٹ گیا۔

گجرے پھول...... پتیاں...... اپنی کلائی مسلی نیچے لان میں جانے کی خواہش مچلی، پلٹی اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

برابر کا کمرا بند تھا...... محرابی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ ننگے پاؤں نیچے اترنے لگی۔

کچن سے باہر نکلتی زرین اکرام اُدھر ہی رک گئیں۔ گھر میں اکیلی تھیں، مدیحہ جا چکی تھی۔ اکرام آفس میں تھے۔ ابو بکر اپنی انیکسی میں یا پھر آفس میں......

”اگر اسے کچھ ہوا...... دورے کی کیفیت ہوئی تو......“ لمحے بھر کو خوف جاگا۔ اب وہ بیرونی دروازہ کھول کر باہر جا رہی تھی۔ ٹائیلوں کی ٹھنڈک نے پیروں کو چھوا۔ چند سیڑھیاں اتر کر سبز مخملی گھاس پیروں تلے آ گئی۔ اندر تک اِک ٹھنڈی لہر اتر گئی۔

بادام کا درخت، املتاس کے پتے، بوگن ویلیا کی بیل جو برآمدے کے ستون سے لپٹی اوپر جا رہی تھی۔

ہار سنگھار کا درخت اور...... وہ...... وہ اس کا ہلکورے لیتا جھولا......

اُدھر ہی ٹھٹک کر کھڑی چہار سو دیکھتی رہی، ہر چیز ویسے ہی تھی، صرف وہ تھی جو اسی جگہ پر نہیں تھی۔ سیٹے بازو ولپیٹ کر آم کے درخت سے جا کر ٹک گئی۔ پورا لان اس کے سامنے تھا۔ مشرقی دیوار کے ساتھ لگے آسٹریلین طوطوں کے پنجرے خالی تھے۔ اس کے وجود کی طرح... اس کا وجود کتنا خالی، اکیلا، ویران اور بنجر تھا۔ آگے بڑھ کر پنجرے کی جالی پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

زرین بھی باہر آ گئیں۔

بے رونق، الجھے، ملگجے بال، پشت پر بکھرے تھے، جو کبھی گھٹاؤں کی طرح ہوا کرتے تھے۔ ان کی بیٹی...... بھرپور محبت کرنے والی، اس کی ہنسی، اس کا ترنم، نم آنکھوں کو

...چل سے رگڑا......

گلاب کے پودوں کے پاس سے گزری تو دامن کانٹوں سے الجھنے لگا تھا؟ جھٹکا وہ اور الجھ گیا۔ الجھ کر کھینچا، دامن پھٹا اور کچھ کانٹے ساتھ آ گئے، جھک کر بے دردی سے کانٹوں کو نکالا...... پوروں پر خون کے قطرے ابھرنے لگے۔

”خون......“ رگ و پے میں خوف ابھرنے لگا...... گھبرا کر ارد گرد نگاہ کی...... زرین قریب آ گئیں۔

”کیا ہوا بیٹا......؟“

”ماما......“ اپنی ہتھیلی آگے کی، انہوں نے آنچل سے ہتھیلی صاف کر کے کانٹا نکال دیا۔

آنکھیں بار، بار دھندلا رہی تھیں۔

”تم اپنے جھولے پر نہیں بیٹھیں؟“

”میرا جھولا......“ سر گھما کر ہلکورے لیتے جھولے کو دیکھنے لگی۔ جس پر اس وقت چند چڑیاں، اوپر ایک کوا اور ساتھ ایک ہدہد بیٹھے تھے۔

”آؤ......“ اس کا ہاتھ تھام کر وہ جھولے تک لے گئیں۔ پرندے اُڑ گئے۔ اسے بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئیں۔ ان کے درمیان خاموشی تھی، حریرہ سامنے اطراف میں دیکھ رہی تھی۔ اور زرین اسے......

ہرے بھرے سرسبز و شاداب باغ میں ان کی زندگی کا کملایا ہوا پھول آنکھ بھر بھر آئی۔

”تمہارے پاپا نے کسی پھول کو مرجھانے نہیں دیا۔ یہ پودا ویسے ہی ہے۔“ حریرہ سر گھما کر انہیں دیکھنے لگی۔

زرین جانتی تھیں وہ جھوٹ بول رہی ہیں، یہ ساری محنت تو ابو بکر کی تھی۔ اکرام کو تو باغبانی سے لگاؤ ہی نہیں تھا۔ ان کا صرف ایک ہی شوق تھا پیسہ کمانا، پیسہ جمع کرنا اور بچوں کا اچھا مستقبل...... دونوں بیٹے برائٹ فیوچر کے ساتھ آسٹریلیا اور جرمنی میں تھے، چھوٹی بیٹی ثنا گریجویٹ کرنے کے بعد اپنے شوہر ڈاکٹر فواد کے ساتھ امریکا میں ہی تھی۔ مدیحہ بینک آفیسر تھی اس کا شوہر بھی افسر تھا۔ ایک حریرہ...... جانے کس سوچ میں گم...... دونوں ہاتھ گود میں رکھے سبز گھاس پر گرے پتوں کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو حریرہ......؟“ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”پاؤں اوپر کر لو تھک گئی ہو گی۔“

سارے میں تتلی کے مانند گھومتی حریرہ کیسی ساکت بیٹھی تھی ان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر اسے لٹایا اور اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ بند پلکیں دھیرے، دھیرے لرز رہی تھیں۔

”بولو، بیٹا...... اپنا دکھ...... اپنی تکلیف...... اپنا غم مجھے بتاؤ، میں تمہاری ماں ہوں، تمہیں سمیٹ لوں گی، یوں گھٹ، گھٹ کر خود کو ختم مت کرو...... اب تم آزاد ہو...... پُرسکون ہو...... میرے پاس ہو۔“ زرین کی انگلیاں حریرہ کے بالوں میں سرائیت کر رہی تھیں۔ گرم، گرم آنسو حریرہ کی پلکوں سے ٹوٹ، ٹوٹ کر بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

”تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے، زیادتی ہوئی ہے، ہم اس سے ہر ظلم کا حساب لیں گے پھر خدا تو سب سے بڑا منصف ہے ناں......“

آنسو ٹوٹ، ٹوٹ کر ان کی آغوش میں گر رہے تھے۔

”ما...... ما......“ دونوں ہاتھوں میں زرین کا ہاتھ بھینچ لیا۔

اپنا آنچل اس پر ڈال کر چھوٹے سے بچے کی طرح اسے سمیٹ لیا۔ بڑا سا جھولا دھیرے، دھیرے ہلکورے لے رہا تھا۔

☆☆☆

”کیسی ہو......؟“ ابو بکر کمرے میں آیا۔ آنکھوں میں چمکدار سی روشنی لے کر حریرہ کو دیکھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اپنی ہتھیلیوں کو مسلا۔

”تمہیں ڈاکٹر نیلوفر سے ملنا ہے۔“ سامنے بیٹھے ابو بکر کو سر اٹھا کر دیکھا، آنکھوں میں ہر اس نے بھی سر اٹھایا۔

”تمہارا تعاون تمہیں جلد صحت یاب کر دے گا۔“

”میں ٹھیک ہوں بس کچھ بے چینی سی رہتی ہے، دل چاہتا ہے کہ ہر وقت سوئی رہوں۔“

”یہ صحت مندی کی نشانی تو نہیں ہے ناں...... خالہ بتا رہی تھیں کہ تم رات کو نیند میں بولتی ہو...... چیخیں مارتی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں، مجھے انجیکشن لگا دو......“ بازو

آ گے کیا۔

"یہ...... صحت مندی تو نہیں ناں......" اس نے بازو تھام لیا۔

"تمہیں نئے سرے سے زندگی شروع کرنی ہے، حریرہ، ایک بھرپور زندگی جیسی تم چاہتی تھیں۔"

حریرہ غائب دماغی سے اسے دیکھنے لگی۔

"جو ہو چکا اسے بھول جاؤ۔"

بھول جاؤں؟" بھرپور خوف نے ہر اس کی جگہ لے لی۔

"اس لیے تو کہہ رہی ہوں کہ سب بھول جاتی ہوں، جب تم انجکشن لگا دیتے ہو...... کچھ یاد ہی نہیں رہتا، تنہائی، نہ اداسی، اذیت نہ ذلت......"

"حریرہ......" اس کے ہاتھ کو اپنی ہتھیلیوں میں چھپالیا۔

"وہ ماضی تھا، تلخ اور اذیت بھرا...... اب پھر سے تم اپنوں کے پاس ہو، ماما، پاپا کے ساتھ۔"

"وہ آئے گا اور مجھے لے جائے گا، گھسیٹتا ہوا، بستر پر پھینکے گا۔ مارے گا اور پھر...... اور...... پھر۔" ابوبکر کی آنکھیں دھند سے بھرنے لگیں۔

"مجھے سلا دو، مجھے اور ذلیل نہیں ہونا، پلیز...... پلیز......" خوف بھرا پاگل پن حریرہ کے لہجے کی سرگوشی میں بدل گیا۔

"نہیں......" وہ سختی سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب کوئی انجکشن نہیں ملے گا، تمہیں خود زندگی کی طرف آنا ہے۔ ڈاکٹر نیلوفر سے تعاون کر کے۔"

"پلیز ابوبکر......"

اسے جاتا دیکھ کر اس کے ہوش اڑنے لگے۔

"میں تعاون کروں گی مگر اس وقت......" ابوبکر رخ موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"نہیں...... بس کل چلیں گے اُن کے کلینک......"

وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکلنے لگا۔

وہ چیخنے لگی تھی ابوبکر چلا گیا تو اس کا سکون بھی چل جائے گا ایک اور اذیت بھری رات کیسے گزارے گی۔

☆☆☆

"سارے خوف، سارے اندیشے دل سے نکال [illegible] حریرہ...... یوں چپ، چپ مت رہا کرو...... اب کوئی [illegible] تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا...... امی کو دیکھو...... تمہارے [illegible] کتنی پریشان ہیں۔" آج چھٹی کا دن تھا مدیحہ آئی ہوئی تھی اس کا ہاتھ تھامے دھیرے، دھیرے اسے سمجھا رہی تھی۔

"تمہیں ڈاکٹر نیلوفر سے ملنا چاہیے۔ ایک بہتر زندگی تمہاری منتظر ہے، اس خوف سے تمہیں چھٹکارا پانا ہے۔"

"مجھے زندگی نے کچھ نہیں دیا مدیحہ...... مجھے [illegible] بہتر زندگی نہیں گزارنی...... مجھے میرے حال [illegible] چھوڑ دو......" اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔

"پاپا بھی تمہیں دیکھ کر بہت تکلیف میں ہیں۔"

"ان سے کہو مجھے مت دیکھا کریں۔" [illegible] کے گرد بازو لپیٹ کر اس نے سر جھکا۔

اتنے میں اکرام احمد اندر کمرے میں آ گئے تھے۔

"حریرہ......" اس کے پاس بیٹھے...... اور [illegible] بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا...... اس کے آنسو تھم گئے۔ زرین نڈھال سی کرسی پر گر گئیں۔

حریرہ کسی صورت ڈاکٹر نیلوفر سے ملنے کے لیے [illegible] نہیں تھی۔

کل بھی ابوبکر کوشش کر، کر کے تھک گیا تھا۔ [illegible] مدیحہ کوشش کر رہی تھی۔ اس کی ضد نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ [illegible] اس کا مستقل علاج نہیں تھا۔ جانے اذیت کی کس [illegible] تھی وہ......

اکرام احمد کے ہاتھ اسے تھپک رہے تھے۔ [illegible] بے چینی، ایک بے قراری روح میں سرائیت کر رہی تھی۔

☆☆☆

"ایک تو ہم پر ظلم ہو، دوسروں کی غلطیوں کی [illegible] دبے کر ہم خود پر مزید ظلم کریں، یہ تو انسانیت کی توہین [illegible] ناں حریرہ...... تمہیں جینا ہے، تمہیں زندگی از سر نو شروع [illegible] کرنی ہے، اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے [illegible] پیاروں کے لیے۔ زندگی کتنی خوب صورت ہے تمہیں [illegible] کا احساس ہونا چاہیے۔ اور پھر یہ زندگی ہمیں بار، بار [illegible] نہیں ملے گی۔" وہ سر جھکائے سنتی رہی، آج کسی [illegible] طرح ابوبکر، مدیحہ اور ماما اسے ڈاکٹر نیلوفر کے پاس [illegible]

[illegible] میں کامیاب ہو گئے تھے۔

"یہ سب تم سے پیار کرتے ہیں تمہاری صحت [illegible] چاہتے ہیں اور تم......؟" ڈاکٹر نیلوفر دھیرے، دھیرے بول رہی تھیں، سمجھا رہی تھیں۔

"تم انہیں مزید ہرٹ کر رہی ہو...... کیوں......؟"

اور آج اس کا تیسرا وزٹ تھا ڈاکٹر نیلوفر کی طرف پہلے دن [illegible] ڈالا جو طوفانی انداز تھا ابوبکر کا اگلے دن خود ہی آرام سے وہ آ گئی تھی۔ تاہم لب بھینچ گئے تھے۔

ڈاکٹر نیلوفر...... ماہر نفسیات تھیں اور ابوبکر کی خاص جاننے والی تھیں۔ اس کیس کو انہوں نے ہر حال میں مکمل کرنا تھا۔ اس چھوٹی سی لڑکی کا دکھ، انہیں بہت اپنا سا لگا تھا۔ جو اپنے دکھوں کی زنبیل کو نہ کھولنے کا تہیہ کیے [illegible] بیٹھی تھی۔ اِک اور روگ لگانے کے لیے۔

"کہو، کچھ بولو...... اپنے دل کی بھڑاس نکالو...... کہہ ڈالو...... ہم سب تمہارا دکھ سننے کے لیے ہیں۔"

"مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا...... میں جینا نہیں چاہتی، جینے میں کیا رکھا ہے اب......" دھیرے سے سر اٹھایا۔

"سرور تو نشے میں ہے اور ابوبکر مجھے اب اس سرور تک جانے ہی نہیں دیتا۔"

"جانتی ہو نشہ موت ہے۔"

"اور...... موت سے مجھے پیار ہے ڈاکٹر تمنا مر جائے تو موت کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔"

"صرف ایک شخص کی سزا تم خود کو نہیں دے سکتیں۔"

"وہ ایک شخص......" سر اٹھایا...... اس کا چہرہ [illegible] دھواں تھا۔

"وہ اک شخص تو عذاب مسلسل تھا میرے لیے، قہر تھا میرے لیے اس نے ایسا زہر میرے رگ و پے میں بھر دیا ہے کہ اب کسی چیز کی خواہش بچی ہے نہ لگن......"

"وہ ایسا کیوں تھا؟" انہوں نے کریدنے کا انداز اختیار کیا۔

"وہ کہتا تھا مجھ سے محبت کرو...... میں کیسے اس [illegible] کرے، ذلیل شخص سے محبت کرتی...... وہ زبردستی کرتا [illegible] ابوبکر کے طعنے مارتا...... میں اس کی باتیں جو اس سے [illegible] کرتی تھی، ابوبکر کو مجھ سے محبت ہوتی تو وہ مجھے جانے [illegible] کیوں دیتا...... وہ ظالم شخص اسی بات کو سمجھتا ہی نہیں تھا۔"

اس کے وجود سے لپٹی دکھ کی کاسنی بیل کی گرہ ڈھیلی ہوئی۔

وہ بیٹھے، بیٹھے تھک گئی تھی۔ بے چینی سی ہونے لگی۔ رگوں میں نشے کی طلب رسد مانگنے لگی۔

ڈاکٹر نیلوفر نے اسے اٹھایا اور آرام دہ کرسی پر لٹا کر پاؤں سیدھے کیے۔ ہاتھوں کو سمیٹا، اور اپنی کرسی اس کے قریب لے آئیں۔ بالآخر انہوں نے حریرہ کو بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"وہ ایک شکی، وہمی شخص تھا۔" حریرہ کی نگاہ چھت پر چلتے پنکھے پر جم گئی تھی۔

"وہ عورت کو محبت نہیں ضرورت سمجھتا تھا۔ پیاس مانتا تھا، پیاس بجھ گئی تو بس جام پھینک دو...... خالی بوتل، خالی تن بے ضرورت ہوتے ہیں ناں، وہ کہتا تھا میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے بہت بڑا دھوکا...... تمہیں تو شادی کی ضرورت ہی نہیں تھی پھر تم نے شادی کر کے مجھے دھوکا کیوں دیا۔"

"وہ تم سے محبت نہیں کرتا تھا؟"

"محبت......" حریرہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

"محبت کیا ہوتی ہے یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم...... مگر اس نے میرے بابا سے لڑ جھگڑ کر مجھے مانگا تھا۔ چچا جان نے دامن پھیلایا تھا۔ میرے بیٹے نے پہلی دفعہ کسی سے محبت کی ہے میرے رشتے کی لاج رکھ لو۔ بہت محبت تھی ان کے لہجے میں...... وہ تو محبت کے لیے محبت بھرا اصرار کر رہے تھے جب میں حاصل ہو گئی تو محبت، ذلت کیوں بن گئی۔"

اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ "یہ شک بھری محبت کیوں بن گئی۔" ڈاکٹر نیلوفر نے اسے دیکھا جو ضبط کی جانے کن منزلوں پر تھی۔

آنکھیں موندے بے دم لیٹی تھی۔ انہوں نے تسلی دیتے لمس سے اس کا ہاتھ تھام کر تھپتھپایا۔

دکھ اس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر لرز رہے تھے۔ چھوٹی سی عمر اور اتنا کرب...... ان کی آنکھ بھی بھر آ گئی۔

"مجھے ہنسنا بولنا اچھا لگتا تھا۔ سب ہی میرے دوست تھے پر محبت تو صرف ایک سے ہی ہوتی ہے ناں......" لمحہ بھر کو رک کر سانس لی۔

"محبت کے لیے میرے احساسات بہت انمول، بہت خاص تھے، میں محبت صرف اپنے شوہر سے کرنا چاہتی تھی مگر......اس نے......" آنسو بند آنکھوں کی دہلیز سے نکلنے لگے......لہجہ بھرّا گیا۔

ڈاکٹر نیلو نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا......اس کے اندر اور بولنے کی خواہش تھی۔ مگر اس سے اب بولا نہیں جا رہا تھا۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

☆☆☆

"کیا صورت حال ہے؟" ابوبکر، ڈاکٹر نیلوفر کے سامنے چیئر پر بیٹھا تھا ان سے اس کی پروگریس پوچھ رہا تھا۔

"وہ بہت سخت ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی ٹارچر ہوئی ہے، زندگی کو سنبھالنے میں اسے ابھی وقت لگے گا، تھوڑی سی کوشش ہوئی ہے، انشاء اللہ پُر امید رہیے۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔"

"ہوں، بے شک میں پُر امید ہوں مایوس نہیں۔" اس نے پر امید نظروں سے اسے انہیں دیکھا۔

"ابوبکر ایک بات بتاؤ......" وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھیں۔ "کیا حریرہ کی شادی کے وقت تم ان لوگوں کو نظر نہیں آئے تھے؟"

ابوبکر نے گہری سانس لی۔

"میں اگر انہیں نظر آتا تو حریرہ کی روح اتنی زخمی نہ ہوتی۔"

ڈاکٹر نیلوفر اس کے لہجے پر غور کرتی اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"بعض لوگوں کی قریب کی نگاہ بہت کمزور ہوتی ہے ڈاکٹر صاحبہ۔" اتنا کہہ کر وہ رکا نہیں تھا۔

☆☆☆

"حریرہ تم کرب کے ایک وسیع جنگل سے نکل آئی ہو اب تمہیں خود سنبھلنا ہے، اپنے اندر قوتِ ارادی پیدا کرنی ہے یوں زندگی کو بے دم کر کے تم کس کو سزا دے رہی ہو خود کو، اپنے والدین کو، اپنے پیاروں کو؟"

گم صم، خاموش بیٹھی حریرہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نیلوفر کہہ رہی تھیں آج اس کی سیکنڈ لاسٹ نشست تھی۔ مگر پروگریس بہت سلو تھی۔

"اس ڈپریشن سے خود کو نکالو حریرہ......زندگی سے فرار ممکن نہیں۔ یہ آزمائش دراصل ہمارے امتحان ہوتے ہیں، کون کتنا کامیاب ہوتا ہے، اس کا فیصلہ اللہ کرتا ہے۔"

ساکت بیٹھی وہ میز کے شیشے کی سطح کو کھرچتی رہی۔

"شادی ہو جاتی ہے تو لڑکی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے، میں نے یہاں واپس آ کر برا کیا ہے......ابوبکر کو مجھے یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔"

"والدین کے گھر سے زیادہ بڑی کوئی پناہ گاہ نہیں ہوتی۔ ہر دکھ میں والدین ہی اولاد کو سمیٹتے ہیں، دکھ اور خوشی تو قسمت سے ملتے ہیں، یہ کسی کے اختیار میں تھوڑی ہوتے ہیں۔"

"واجد......" بے اختیار اس نے سر اٹھایا۔ "وہ مجھے سگریٹ سے داغتا تھا۔ مجھے بیلٹ سے مارتا تھا، میرا گلا دبا دیتا تھا۔ سانس بند ہونے لگتی تو چھوڑ دیتا۔ مجھے سخت سردی میں کھڑا رکھتا تھا باہر بالکونی میں۔ مجھے وہ کھانے پر مجبور کرتا جسے کوئی نہ کھا سکے۔ میں اس کی بات نہیں مانتی تو مجھے رسیوں سے کرسی پر جکڑ کر نکل جاتا اور گھنٹوں نہیں آتا۔ ڈاکٹر یہ کس جرم کی سزا تھی کس قصور کی خطا ہے یہ کیسی محبت تھی۔ کیا یہ میری قسمت میں ہی لکھا تھا۔" بے چین ہو کر حریرہ بولتی چلی گئی۔ اندر کے نکلتے غبار نے کسی کی آنکھوں میں دھند بھر دی تھی۔

"بھول جانا بہتر ہوتا ہے، دکھ کو جتنا دُہرائیں گے اتنا ہی ہرے رہیں گے۔"

اس کا چہرہ تلخ ہونے لگا۔

"ہاں، بھول جانا، برداشت کرنا، عورت کا نصیب اور مرد......سب کچھ غلط کر کے بھی گھومتا پھرے ہونہہ......"

"حریرہ بہت ہو چکا، اب خود کو سنبھالو......زندگی کی طرف لاؤ خود کو مضبوط کرو......اور اپنے اندر اتنی طاقت پیدا کرو کہ اس مرد کو سزا دے سکو...... جو تمہاری زندگی تباہ کرنے کا ذمّے دار ہے۔" نیلوفر نے ایک اور رستہ سجھایا۔

"میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟"

"کم سے کم اتنا......کہ خود کو اس ڈپریشن سے نکالو......ورنہ نفسیاتی مریض بن جاؤ گی اور زندگی بہت خوب صورت ہے، اور یہ زندگی اللہ کی امانت ہے۔ بہت خوب صورت لوگ تمہارے منتظر ہیں ان کی خاطر تمہیں زندگی کی طرف لوٹنا ہے۔" ساکت نظروں سے وہ شیشے کی سطح کریدتی رہی اور ڈاکٹر نیلوفر بولتی رہیں۔

☆☆☆

"حقیقت سے آنکھیں چرا لینا، فراموش کر دینا، عالم [illegible] میں رہنا، حالات سے فرار اختیار کرنا کسی بھی ذی [illegible] کے لیے ممکن نہیں ہے حریرہ...... انسان کو اللہ نے [illegible] بخشا ہے، ذہن عطا کیا ہے، اب تم بیمار نہیں ہو صحت [illegible] کی جانب قدم بڑھا رہی ہو ڈپریشن کا توڑ جب تک [illegible] نہیں ہے جب تک تم خود نہ چاہو۔" ڈاکٹر نیلوفر [illegible] رے، دھیرے رسان سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

"دلچسپی......دلچسپی لو......آنکھیں کھول کر ارد گرد [illegible] و حریرہ...... باتیں کرو اپنی ماں سے، اپنی بہن سے، [illegible] ارے اندر اب کوئی دکھ نہیں ہے۔ کہہ دیا سب کچھ تم [illegible] تمہارا کتھارسس ہو گیا ہے۔ اب اس حصار کو توڑ دو [illegible] کچھ نہیں کر سکتیں۔ ایک تم ہی تو ہو جو سب کچھ کر سکتی [illegible] دیکھو اپنے پیرنٹس کو خوش کر سکتی ہو، نئی پرواز کر سکتی [illegible] ظلم کی حد پہنچتی ہے تو ان لوگوں کو دیکھو جو ساری عمر دکھ [illegible] چکی میں پستے ہیں اور زبان پھر بھی شکر ادا کرتی ہے۔" [illegible] اسے سمجھا رہی تھیں۔

"تم ذہنی، جسمانی، روحانی کسی طور پر بھی معذور [illegible] ہو حریرہ......اک صحت مند لڑکی ہو، ماضی کا آئینہ [illegible] اب تمہیں ثابت بھی کرنا ہے۔" "تم خواہ مخواہ ایک [illegible] ان کے ظلم و جبر کا شکار رہیں۔" "پڑھی لکھی سمجھدار ہو کر [illegible]۔ ڈاکٹر نیلوفر خاموش ہو گئیں۔

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

"صرف موت ہے جو ہمیں حالات سے فرار [illegible] کرنے میں مدد دیتی ہے۔ لیکن کیا تم حرام موت [illegible] قبول کرو گی؟"

حریرہ ان کی جانب دیکھنے لگی۔

"یقیناً نہیں ناں......تو پھر ایک بار پھر اپنے بھرپور [illegible] ہونے کا ثبوت دو۔"

"مگر کیسے......؟ مجھے کچھ بھولتا نہیں ہے، ایسا لگتا [illegible] جیسے ابھی کہیں سے وہ شخص آ جائے گا، مجھے دبوچ لے [illegible] اور میری کوئی پناہ گاہ بھی نہیں ہو گی؛ مجھے بچانا ہوا۔

سالگرہ مبارک

پُرخلوص دعاؤں
محبتوں کے سمندر
چاہتوں کی بارش
اور
خوشیوں کے لازوال
خزانوں کے ساتھ
اے پاکیزہ آپ کو
سالگرہ بہت، بہت
مبارک ہو

نگینہ ضیا بخش، کراچی

مزدور

"مما! آج نہ تو آپ اسکول گئیں نہ ہی پاپا آفس گئے؟" شبیر کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ آج یوم مزدور کی چھٹی ہے۔

"کیا پاپا مزدور ہیں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا انجینئر بھی مزدور ہوتا ہے۔" میں ہنسی......

"اور آپ بھی؟"

"ہاں بیٹا! ٹیچر بھی مزدور ہوتا ہے، ہر محنت کرنے والا مزدور ہوتا ہے۔"

"مگر مما! ہماری ماسی بھی تو محنت کرتی ہے اس کی تو آج چھٹی نہیں۔"

مجھے سو وولٹ کا جھٹکا لگا۔

فوراً ماسی کو آواز دی۔ "حمیدہ برتن چھوڑ دو، آج تمہاری چھٹی ہے۔"

"کیوں باجی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

تو میرے بجائے شبیر نے جواب دیا۔

"کیونکہ آپ بھی مزدور ہیں۔"

از: آنسہ احسان، ڈی آئی خان

روندتا ہوا لے جائے گا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا...... یہ تمہارا خوف، تمہارا واہمہ ہے، تمہیں طلاق ہوچکی ہے۔ اب وہ ایسا کچھ نہیں کرسکتا...... تم اپنے اندر ہمت اور جرأت پیدا کرو، سنا ہے تم تو بڑی باہمت اور بہادر تھیں۔“

”ہاں کبھی تھی......“ حریرہ نے سر جھکالیا۔

”یہ تھی کا لفظ اپنی زندگی کی لغت سے نکال ...... اور ”ہو“ پر یقین رکھو۔“

”لیکن اب شاید میں زندگی میں کچھ نہ کرسکوں۔“

چند لمحوں تک انہوں نے حریرہ کو دیکھا۔

”یہ بتاؤ تم اپنی لائف میں کیا بننا چاہتی تھیں؟“

حریرہ نے سر اٹھایا۔

”میں لیکچرر بننا چاہتی تھی، کسی بہت اچھے آفس میں کسی بڑی پوسٹ پر بیٹھتی...... یا بزنس کرتی......“ وہ دھیرے سے ہنسی۔

”تمہارے پاپا کیا کرتے ہیں؟“

”بزنس کرتے ہیں۔“

”تم ان کا آفس جوائن کرسکتی ہو، اپنی تعلیم بھی بڑھا سکتی ہے۔ اپنی پسند کی جاب کرسکتی ہو۔“ انہوں نے مشورہ دیا۔

”مجھے گھر جانا ہے۔“ دھیرے سے کہتی......“ کیا ابوبکر نہیں آیا؟“

”چلو آؤ باہر چلتے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر باہر لے آئیں۔

”ڈاکٹر مجھے کب تک یہاں آنا ہوگا؟“

”جب تک تم خود نہ کہہ دو کہ میں اب اِدھر نہیں آؤں گی۔“

”آپ بہت اچھی ہیں۔“ دھیرے سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”جب تک زندگی کو مثبت انداز میں نہیں لوگی میری باتوں کی سچائی کو ثابت نہیں کروگی میں کیسے سمجھ لوں کہ میں اچھی ہوں۔“ ان کے انداز میں شرارت تھی۔

”شاید یہ ممکن نہیں ہے۔“ حریرہ نے نظریں چرالیں۔

”دنیا میں ہر چیز ممکن ہے اگر ہم چاہیں تو۔“

”اگر ہم نہ چاہیں تو......؟“ اس نے معصومیت سے سر اٹھایا۔

”پھر تم کیسے ثابت کروگی کہ میں اچھی ہوں۔“

حریرہ لاجواب ہوکر گیٹ کی جانب دیکھنے لگی گیٹ کھول کر اب اندر آرہا تھا۔ لمحہ بھر کو نگاہ مرتکز کر کے ہٹالی......

”السلام علیکم......“ پُرجوش سا انداز تھا۔

”وعلیکم السلام...... کیسے ہو تم؟“

”بالکل ٹھیک ٹھاک......“ حریرہ پر نگاہ کی جو پھولوں کی جانب متوجہ تھی۔

ڈاکٹر نیلوفر آگے بڑھ کر ابوبکر تک آگئیں وہیں کھڑی تھی۔

”کیسا ہے اب آپ کا مریض......؟“

”وہ صحت مند ہے، مریض کہاں رہی ہیں اسے توجہ اور مصروفیت کی ضرورت ہے۔ یہ حالات فرار چاہتی ہے، انشاء اللہ یہ کیفیت بھی ختم ہوجانے کی“

”انشاء اللہ......“ اس نے بھی زیرِ لب کہا۔

☆☆☆

نہا کر وہ باہر نکلی تھی۔ بھیگے اُلجھے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ تولیا بیڈ پر رکھ کر وہ وہیں چیئر پر بیٹھ گئی۔ ماما عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ انہیں محویت سے دیکھنے لگی اسے کتنا عرصہ ہوگیا نماز پڑھے یک دم چونکی...... بہت عرصہ...... شاید اِک عمر...... وہ واجد کی زندگی میں تھی تو وہ اسے پڑھنے ہی نہیں دیتا تھا۔ اپنے ماں، باپ یا کسی اور کے ہاں بھی نہیں جانے دیتا تھا۔

”کیا وہ نماز بھول گئی تھی؟“ اپنے اندر ہی وہ بولی تبھی ماما نے سلام پھیر کر اس کی جانب دیکھا اور مسکرائیں۔

”اِدھر آؤ۔“ ماما نے اشارے سے بلایا۔

دھیرے سے اٹھ کر وہ ان کی جانب بڑھی۔ انہوں نے اس پر پھونک ماری...... اور تسبیح پڑھنے لگیں۔ وہ اُداس بیٹھی رہی۔ پھر دعا مانگ کر منہ پر ہاتھ پھیرے۔

”آؤ میں تمہارے بال سلجھادوں......“ وہ اٹھنے لگیں

”نہیں......“ ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مجھے نماز پڑھنی ہے۔“

”ضرور، بیٹا آؤ...... پڑھو......“ وہ ایک جانب کھسکیں...... وہ اُدھر ہی بیٹھی رہی سر جھکا کر ہتھیلیاں مسل رہی تھی۔

”کیا ہوا......؟“

”ماما...... مجھے نماز نہیں آتی، میں، میں......“ اس نے شرمندگی سے سر اٹھایا۔ آنسو، آنکھوں میں جھلملا رہے تھے۔ ”میں نماز بھول چکی ہوں۔“

دھیرے سے زرین نے بیٹی کا ہاتھ تھام لیا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا...... انسان کبھی بھول جاتا ہے لیکن جب یاد کرتا ہے تو اسے سب کچھ یاد آجاتا ہے۔ چلو آؤ، میں تمہیں یاد کراؤں......“ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑی ہوگئیں۔ اسے بیڈ پر بٹھایا۔ اور برش لے کر اس کے بال سلجھانے لگیں۔

پہلے وضو کروایا اور دھیرے، دھیرے اسے نماز دُہرانے لگیں۔ دونوں کو اس کام میں مزہ آنے لگا۔ زرین کو حرف، حرف پڑھانے میں اور حریرہ کو حرف، حرف دُہرانے میں۔

دھیرے، دھیرے وہ ماما کے ساتھ نماز پڑھنے لگی تھی۔ ساتھ، ساتھ وہ قرآن پاک بھی دُہرانے لگی۔ یہ ایک مثبت عمل تھا۔ تاہم وہ زیادہ بولتی نہیں تھی۔ کوئی فرمائش، کوئی خواہش ماضی کی کوئی بات، بالکل غیروں کی طرح بیٹھی رہتی، اس کے اندر سے ہلچل ہی ختم ہوگئی تھی۔ نیم بے ہوشی سے تو یہ کہیں بہتر تھا۔

ڈاکٹر نیلوفر خوش تھیں۔ حریرہ زندگی کی جانب لوٹ رہی تھی۔ ابوبکر آفس سے آنے کے بعد ضرور آتا۔ چائے پیچھے لاؤنج میں ہی پی جاتی۔ اکثر اکرام صاحب بھی آجاتے...... وہ سب کی سنتی رہتی۔

☆☆☆

اس روز لان میں بنے جھولے پر بیٹھی تھی۔ ہار سنگھار کا درخت لان کی منڈیروں پر پنکھ پسارے کوّے اور کبوتر، جامن کے درخت پر میناؤں اور چڑیوں کا شور...... بادام کے سرخ...... زرد، پیلے، سبز پتے ہوا کے جھونکوں سے اِدھر اُدھر پھیلے تھے۔ جھولا دھیرے، دھیرے ہچکولے لے رہا تھا۔ زبان دھیرے، دھیرے سے پڑھ رہی تھی

سبحان ربی الاعلیٰ...... وہ اٹھ کر گلاب، چنبیلی، موتیا کے پھولوں کی طرف چلی گئی۔ یہ سب پھول پودے، اسے بے حد پسند تھے۔ سبزے سے پیار اور باغبانی سے عشق تھا۔

انیکسی کے ٹیرس پر کھڑے ابوبکر نے سرشار سے انداز میں کافی کا مگ ہونٹوں سے لگالیا۔

اپنے لان میں اِدھر اُدھر گھومتی حریرہ کو کافی دیر سے وہ دیکھ رہا تھا۔ زمین سے پھول اٹھا کر اس نے آنچل میں بھر لیے تھے۔ پھر گیٹ کے قریب لگے املتاس کے اور یوکلپٹس کے قدآور درختوں کی جانب بڑھ گئی۔ اردگرد سوکھے پتوں کا ڈھیر لگا تھا۔

”کل مالی کو بلوا کر لان کی صفائی کروائے گی۔“

اس نے سوچا پھر چوکیدار سے مالی کا پوچھا۔

”سامنے کوٹھی میں آیا ہوا ہے۔“

”بلا کر لاؤ......“ گیٹ کھول کر وہ باہر جھانکنے لگی، چوکیدار سامنے کی جانب بڑھ گیا۔

اس سے وہ ابوبکر کو پہلے والی حریرہ لگی۔ تبھی بلیک شیشوں والی گاڑی دھیرے سے ان کے گھر کے آگے رکی...... ابوبکر چونکا...... حریرہ، چوکیدار کی جانب متوجہ تھی۔

گاڑی دھیرے، دھیرے آگے بڑھ گئی۔

چوکیدار...... مالی کو لے کر آگیا...... ابوبکر خوب صورت سے احساسات لے کر پیچھے مڑا کچن میں جاکر مگ دھوکر رکھا اور پھر واپس پلٹ کر باہر نکلا اور انیکسی کا دروازہ کھول کر ان کے پورشن کی جانب آگیا۔ چہرے پر خوب صورت سی مسکراہٹ تھی۔

”خوش آمدید...... میری زہرہ جبیں......“ اس کے قریب رکا...... حریرہ چونک کر اسے دیکھنے لگی اور پھر رخ پھیرلیا۔

”کبھی ہنس بھی لیا کرو......“ سر پر ٹہوکا دیا۔

”اس سے کیا ہوگا؟“ تیکھی نگاہ ڈالی۔

”اس سے ہمیں احساس ہوگا کہ ہماری محنت ضائع نہیں گئی۔“

”بی بی مالی چلا گیا ہے کل آئے گا۔“ چوکیدار پلٹ آیا۔

”ٹھیک ہے کل آئے تو اسے بلوالینا، لان کی صفائی کروانی ہے۔ پودوں کی کانٹ چھانٹ اور کچھ نئے

پودے بھی منگوانے ہیں۔" کہتے ہوئے وہ پلٹ آئی۔ ابوبکر، دھیرے، دھیرے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"لان کی حالت بدل جائے گی۔"

"بری تو اب بھی نہیں ہے۔" اب وہ جھولے پر بیٹھ گئی تھی۔

"تم کیسا محسوس کرتی ہو اب......"

"میری فکر مت کیا کرو۔" چند پھول ہتھیلی پر رکھ لیے۔

"تمہاری فکر نے ہی تو فکرمند رکھا ہوا ہے۔" سینے پر ہاتھ باندھ لیے۔

"کوئی اور کام نہیں ہے تم کو؟"

"ہے......" دلچسپی سے دیکھا۔

"تو جاؤ پھر......" قطعی لہجہ تھا۔

"حریرہ......" دھیرے سے کہتا جھولے پر بیٹھ گیا۔ "میرا ہر راستہ تم سے شروع ہوتا ہے اور تم تک ہی جاتا ہے، آج میں تمہیں پروپوز کرتا ہوں، میری زندگی میں آجاؤ، میری پناہ بہت مضبوط ہے، تمہارے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔ تمہارے سوا میرے دل میں کوئی نہیں۔" چند پھول اور اٹھا کر ابوبکر نے اپنی ہتھیلی پر رکھ لیے حریرہ ساکت بیٹھی ہتھیلی پر دھرے پھولوں کو دیکھتی رہی۔

"جتنی تکلیف تم اٹھا چکی ہو، اس سے زیادہ اذیت میں نے سہی ہے۔"

"ابوبکر...... میرا پیچھا چھوڑ دو، میری زندگی، میرا وجود خالی ہے، تمہیں دینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے، مجھے زندگی سے پیار نہیں رہا۔ بار، بار میرے رستے میں مت آؤ۔"

"میں نے کہا ناں، میں نے تم سے تم تک کا سفر طے کرنا ہے۔ میں سکھا سکتا ہوں تمہیں زندگی سے پیار کرنا۔"

"میں بابا سے تمہاری شکایت کردوں گی۔"

"شاید اس بار خالو اور خالہ کی مرضی ہو۔" ایک پھول اس کی جانب اچھال دیا۔

"مگر میری مرضی نہیں ہوسکتی۔" اس کا لہجہ قطعی تھا۔

"میں مرضی اور فیصلے دونوں بدلنا جانتا ہوں اور چاہتا ہوں۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم اس بارے میں سوچ لو۔"

حریرہ اسے گھورنے لگی۔ ابوبکر چہرہ گھما کر گنگنانے لگا۔ فیصلہ اور اٹل فیصلہ اس کے چہرے پر رقم تھا۔ حریرہ کو غصہ آنے لگا۔ سارے پھول اٹھا کر اس کے چہرے پر دے مارے۔

"ارے، رے......" کھلکھلا کر ہنستے ہوئے ابوبکر نے خود کو بچایا۔

"شکریہ، شکریہ...... اے میری زہرہ جبیں"

پاؤں پٹخ کر وہ اٹھی اور اندر کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتیں زرین نے گہری سانس لے کر پردہ چھوڑ دیا۔

"کاش، کاش آپ نے اتنی جلد بازی نہیں کی ہوتی، ابوبکر کو حقیر نہ سمجھا ہوتا تو آپ کی بیٹی کے ساتھ یہ سانحہ نہ ہوتا۔" دلگیر سے انداز میں سوچتی وہ بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"اب تو ہمارا منہ ہی نہیں پڑے گا کہ ابوبکر...... کہیں کتنی ترقی کی ہے اس نے...... کتنا کامیاب انسان ہے وہ اس کے اندر ظرف ہے۔ دوسروں کی عزت کا احساس ہے، واجد میں کیا دیکھا تھا آپ نے...... آپ کے بھائی کی اولاد اور آپ کا خون تھا ناں اور میری غریب بہن کا بیٹا تھا جیسے کرتے آپ...... آپ نے مجھے کب عزت دی تھی۔ عورت کی آپ کی نظر میں تو قدر ہی کیا ہے۔" پوروں سے آنکھیں صاف کرتی وہ بہت زیادہ رنج ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

"ماضی میں جو ہوا بھول جاؤ حریرہ...... میں تمہارے ساتھ ہے حال میں زندہ رہو...... تم زندگی کی جانب لوٹ آؤ گی۔" کوئی دھیرے، دھیرے سرگوشی کرنے لگا۔

"گھاؤ کب بھرتے ہیں بھلا......" اس کا شکوہ بھی بجا تھا

"تمہیں خود کو طاقتور بنانا ہے، واجد سے بدلہ لینا ہے۔" ڈاکٹر نیلوفر کا ناصحانہ انداز اسے تقویت دے رہا تھا۔

"سب ٹھیک ہی کہتے ہیں، اب مجھے نئے سرے سے زندگی شروع کرنی ہے، مضبوط، نڈر اور دوسروں کی مدد کرنے والی۔" دل کی کھڑکیاں کھول کر ایک نئی روشنی اندر داخل کیا وہ خود کو بہتر اور مضبوط محسوس کرنے لگی تھی

☆☆☆

اکرام احمد، زرین اور مدیحہ نے اس کے نئے انداز کو اس کی تبدیلی کو محسوس کیا۔ وہ ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگی تھی۔ اس روز تو دونوں کو بہت خوشی ہوئی۔ جب پاپا نے ریشماں سے چائے کے لیے کہا تو حریرہ خود بنا کر لے آئی۔

"پاپا میں آپ کے لیے بنا کر لائی ہوں۔"

"اچھا......" وہ سیدھے ہو کر بیٹھے۔ "بے حد شکریہ میرا بیٹا۔" کپ تھام لیا۔

"کیسی بنی ہے پاپا......؟"

"اے ون...... ریشماں سے بھی اچھی۔"

وہ ہنس دی۔

زرین کا ڈھیروں خون بڑھ گیا۔

تبھی چائے میں حصہ لینے ابوبکر بھی آگیا۔

"کہاں ہوتے ہو آج کل برخوردار......"

"آفس کی مصروفیت...... پھر ایک این جی او اور جوائن کرلی ہے۔"

"کس قسم کی ہے؟"

"مستحقین کی مدد کی جاتی ہے۔ ان کے بچوں کو تعلیم میں مدد دی جاتی ہے۔ آپ بھی آئیے گا ناں کسی دن......"

"ہاں ضرور...... میں بھی تمہارا ساتھ دینا چاہوں گا۔"

اور انہوں نے جھٹ ایک بڑی رقم کا چیک لکھ دیا تھا۔

"حریرہ بیٹی ابوبکر کے لیے چائے لاؤ وہ بھی اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی۔"

"جی......" وہ کھڑی ہوگئی۔

"خالو چائے تو اچھی بنی ہے ناں......؟" وہ شرارت سے ہنسا۔

"آف کورس...... تم سے بھی زیادہ......"

"میں بھی ذرا ٹھیک ٹھاک پیتا ہوں۔" شرارت سے باز نہیں آیا۔ "ساتھ میں کچھ میٹھا بھی لے آنا۔"

"سب ڈبے خالی ہیں، اپنے گھر جا کر پی لیں۔"

وہ پھر سے بیٹھ گئی۔

"دیکھ لیں خالہ......"

"جاؤ بیٹا، لے آؤ، ایسے نہیں کہتے یہ بیٹا ہے ہمارا کتنا خیال رکھتا ہے۔ تمہارے اپنے بھائی تو باہر جا کر باہر کے ہی ہوگئے ہیں سوائے پیسہ کمانے اور پیسہ بھیجنے کے انہیں اور کسی بات کا احساس نہیں ہے، بہت ہوا تو قسمت سے کبھی فون کھڑکا لیتے ہیں۔" محبت سے ابوبکر کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"اب جاؤ، لے کر آجاؤ چائے......" ڈپٹنے کے سے انداز میں کہا۔

لحاظ و مروت کے مارے اٹھ گئی۔ وگرنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ گئے وقتوں کی حریرہ بنے اور لٹھ دے مارے۔

"ایسا مت سوچا کریں خالہ...... میرا کون ہے آپ لوگوں کے سوا...... آپ لوگ مجھے اپنا سمجھتے ہیں تو میں بھی سمجھتا ہوں ناں...... روزِ محشر مجھے بھی تو امی، ابو کو جواب دینا ہوگا کہ اتنی محنت کرنے والے خالہ، خالو کی عزت و تکریم میں فرق تو نہیں کیا۔" ادب سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ اور دونوں اسے دیکھ کر رہ گئے۔ کتنا غلط سمجھا تھا ابوبکر کو اور کتنا خسارہ اٹھایا تھا...... لیکن اب بھی ازالہ ممکن ہے...... اکرام احمد نے بے حد زود رنج ہو کر سوچا...... اور حسرت سے باتیں کرتے ابوبکر کو دیکھا۔

"بعض اوقات ہم زندگی میں کتنے غلط فیصلے کرلیتے ہیں اور ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا۔"

☆☆☆

"میں تمہاری این جی او جوائن کرلوں؟"

وہ لان سے گزرنے لگا تو حریرہ راستے میں آگئی۔ پلٹ کر اسے دیکھا۔

"کیوں......؟"

"تاکہ میں مصروف ہوجاؤں۔"

"میری این جی او جوائن کرکے مصروف ہونا ہے تو میرے ساتھ ہی مصروف ہوجاؤ۔" شرارت سے ہاتھ اونچا کرکے ٹہنی ہلائی اور عشقِ پیچاں کے کتنے پھول اس کے اردگرد گرنے لگے۔

"میں سنجیدہ ہوں۔"

"میں بھی غیر سنجیدہ نہیں ہوں۔"

"میں کچھ اور بھی مصروفیت چاہتی ہوں۔"

"مثلاً......؟"

"مثلاً...... یہ کہ میں لا کرنا چاہتی ہوں، دکھی

انسانیت کی خدمت......"

"اوہو......" ذومعنی انداز میں ہنسا۔ "ٹھیک ہے، مگر ایک شرط پر۔"

"کیا......؟" نگاہ اٹھائی۔

"میں بھی بہت دکھی ہوں، خدمت کا بیڑا میری جانب بڑھ کر اٹھاتا۔"

"ابوبکر......" اسے غصہ آنے لگا۔ "ایسی بات مت کرو جو میرے اختیار میں نہیں۔"

"میں تو بے اختیار ہوں ناں......" ایک بار پھر ٹہنی کو ہلایا۔

کچھ پھول بالوں میں اٹکے...... چند شانے پر ٹھہر گئے۔

"میری این جی او ہی نہیں میرا ساتھ بھی تمہیں مضبوط بنا دے گا۔ ایک بار میری بن کر تو دیکھو......" وہ کھل کر کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں کچھ اور کر لیتی ہوں۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے لا کے ایڈمیشن میں ابھی دیر ہے میرے دوست نے بھی لینا ہے۔ میرا دوست افضال بتا رہا تھا کہ جب ایڈمیشن ہوں گے تو بتا دوں گا۔ کل تم آفس چلنا، تمہیں اس کام کی تنخواہ ملے گی۔"

"نہیں...... فی الحال میں بے لوث ہو کر یہ کام کرنا چاہتی ہوں۔"

ابوبکر کے پینترا بدلنے پر وہ خود ہی رک گئی۔

"میں بزنس بھی سیکھنا چاہتی ہوں۔"

"یہ تم خالو سے سیکھ لینا۔ اور سنو تم ڈاکٹر نیلوفر کی جانب کتنے دن ہو گئے نہیں گئیں۔ ضروری ہے کہ میرے ساتھ جاؤ...... یا میں ہی لے کر جاؤں۔" وہ پھر ہنسا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے نگاہ چرائی۔

"دیکھو، خود کو میرا عادی نہیں بناؤ جبکہ تم میری زندگی میں آنا بھی نہیں چاہتی ہو، کل کو میں کوئی خوب صورت شہزادی لے آیا تو بھی تمہیں تکلیف ہوگی۔ تو سنو پلیز ہیلپ یور سیلف......" بڑے شاہانہ انداز میں کالر اکڑاتے ہوئے فلسفہ جھاڑا۔ فلسفہ اس کے سر سے گزر گیا۔ ہاں آنکھوں میں دھند کیوں بھرنے لگی تھی۔ وہ سمجھ نہ سکی۔ دھیرے سے پلٹ کر وہ اندر چلی گئی۔ اور ابوبکر بہ آواز بلند گنگنانے لگا۔

"اے میری زہرہ جبیں
تجھے معلوم نہیں
تو ابھی تک ہے حسیں اور میں جواں......"

☆☆☆

گزرتے دنوں نے اسے مصروف کر دیا تھا۔ اس مصروفیت میں گاہے بہ گاہے ابوبکر اپنا احساس دلانا نہیں بھولتا تھا۔ اپنے ہونے کا احساس...... اور حریرہ پہلو بچا کر گزر جاتی۔

ہفتے میں دو دن بابا کے آفس بھی جاتی تھی۔ وہ اب الحمدللہ بہت ٹھیک تھی۔ اکرام احمد بھی خوش تھے۔ ان کی لاڈلی بیٹی کو نئی زندگی مل گئی تھی۔ وہ ابوبکر کے احسان مند تھے اور اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتے تھے۔ بے حد خود غرضانہ سوچ تھی مگر مجبور تھے، بیٹی کے باپ تھے، اسے ایک بار پھر ساری عمر گھر بٹھا کر نہیں رکھنا تھا۔ اپنی زیادتیوں کا ازالہ بھی کرنا تھا اور وہ اسی صورت میں ممکن تھا۔

یہ صورت تو ابوبکر بھی چاہتا تھا۔ اس کے اطوار، انداز سے ظاہر تھا۔ بس وقت کا انتظار تھا۔

زرین تو اندر تک مسرور رہتی تھیں۔ حریرہ ہنستی بھی تھی، ان سے باتیں بھی کرتی تھی۔ وہ دن بہت خوب صورت ہوتا جب وہ کچھ فرمائش بھی کر ڈالتی۔

مدیحہ بھی اکثر اس کے ساتھ ٹائم گزارتی۔ کبھی اسے بلوا لیتی، آریان میں اس کا دل لگ جاتا تھا۔ ننھا منا آریان اس کی ساری تھکن سمیٹ لیتا تھا۔

لان کی حالت بدلنے لگی تھی۔ نئے پھول پودے لہلہانے لگے۔ وہ اپنے جھولے پر بیٹھی ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اندر تک خوشی محسوس ہوتی۔ وہ ایک نارمل زندگی کی جانب لوٹ آئی تھی۔ لا کے ایڈمیشن میں چند دن تھے کہ...... کہ زندگی ایک بار پھر سسکنے لگی۔

☆☆☆

"کیا......؟"

ابوبکر سناٹے میں آ گیا۔ زرین بے ہوش پڑی تھیں۔ اکرام احمد حواس باختہ ڈاکٹر کو فون کر رہے تھے،

مدیحہ بھاگی چلی آئی تھی۔ ریشماں، زرین کی ہتھیلیاں مسل رہی تھی اور ابوبکر اِدھر اُدھر باہر بھاگ رہا تھا۔

ابھی، ابھی گھر آیا تو چوکیدار نے بتایا کہ حریرہ بی بی اغوا ہو گئی ہیں۔ اور گھر کے گیٹ کے آگے سے کالی گاڑی میں۔

"تم کہاں تھے؟"

"میں تو جی گیٹ کھولنے آیا تھا۔ ذرا سی دیر ہو گئی تھی۔ بی بی کی گاڑی گیٹ پر کھڑی تھی جیسے وہ اندر آنے کے لیے کھڑی کرتی تھیں۔ ہارن بجایا تو میں باہر ہی آ رہا تھا کہ زوردار چیخ سنائی دی۔ گیٹ کھولا تو بی بی نہیں تھیں اور آخری موڑ سے گاڑی مڑ رہی تھی۔"

"یااللہ......" اندھیرے میں کہاں تیر چلائے۔

بائیک لے کر نکلا...... اِدھر اُدھر گیا آفس آیا۔ کوئی دوستی دشمنی نہیں۔ پھر بائیک روک کر کھڑا ہوا۔

"وہ کہیں نہیں جا سکتی، یہ ضرور واجد ہے، واجد پاکستان آیا ہے اور اس پر پھر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔"

ابوبکر...... حریرہ کے دکھ کے احساس سے پاگل ہونے لگا۔

"اب تمہیں نہیں بخشوں گا۔" مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"اگر حریرہ کو کچھ ہوا۔ بڑی دعاؤں اور منتوں سے زندگی کی جانب لایا ہوں واجد اب تم اپنی زندگی کی خیر مناؤ۔"

☆☆☆

"کیا......" اکرام احمد کے تو ہوش اُڑ گئے۔

"جی خالو، ہماری کسی سے دشمنی نہیں ہے، این جی او ابھی قائم ہوئی ہے، کوئی لڑائی جھگڑا نہیں، واجد نے ہی یہ قدم اٹھایا ہے۔"

"اس کو تو اب میں زندہ نہیں چھوڑوں گا بھلے میرا کون سی بھی ہو مگر اس سے انتقام لوں گا۔" وہ ڈی، ایس پی انوار علی کا نمبر ملانے لگے۔ اب اسے بھاگنے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔

"اسے وہاں جل کر یا لیچ گا پہلے کنفرم کرنے تو چلیں۔"

"چلو......" گاڑی کی چابیاں اٹھا لیں...... مدیحہ کو ماں کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے وہ دونوں نکل گئے۔

"واجد میں تجھ سے اپنی بیٹی کے ایک، ایک دکھ کا حساب لوں گا۔" ان کی کنپٹی میں ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔

گاڑی انہوں نے بھائی کے گھر کے آگے روکی۔

پھولوں جیسی لگتی ہے

وہ پھولوں جیسی لگتی ہے
وہ چاند کی طرح چمکتی ہے
وہ ہر پل ہنستی رہتی ہے
وہ خوشیاں ہر پل دیتی ہے
وہ پھولوں جیسی مہکتی ہے
وہ سورج کی کرنوں جیسی ہے
وہ دھوپ میں چھاؤں جیسی
وہ غم میں خوشیوں جیسی ہے
وہ سندر اور انمول بھی ہے
وہ محبت ہی محبت ہے
دنیا میں بہت عظیم ہے وہ
اور وہ ہے میری پیاری ماں
ہاں! وہ ہے میری پیاری ماں
جو پھولوں جیسی لگتی ہے

کاوش: صبا صغیر آرزو، کراچی

پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، چوکیدار بھی غائب تھا۔ بیل بجاتے رہے مگر جواب ندارد...... دونوں کا ماتھا ٹھنکا۔

"اگر واجد یہاں نہیں آیا تو پھر حریرہ کو کس نے اغوا کیا ہے۔"

"نہیں خالو...... وہی ہے...... اور کوئی نہیں...... یہ ضرور یہاں آئے گا، بے ہوش کر کے وہ حریرہ کو کہیں بھی نہیں لے جا سکتا۔" ابوبکر بضد تھا۔

"کس سے اس کے بارے میں پوچھیں۔" وہ پیشانی مسلنے لگے۔

اتنے میں ڈی ایس پی کا فون آ گیا تھا۔ ابوبکر اپنے ذرائع استعمال کرنے لگا۔ اکرام احمد اپنے ذرائع۔ رات سے صبح ہو گئی۔ ایک دن گزر گیا۔ واجد کی کوٹھی پر پہرہ لگا دیا تھا۔ دن چار بجے ابوبکر کا فون بجا۔

"سر، کوٹھی کا گیٹ کھول کر ایک گاڑی ابھی، ابھی اندر گئی ہے۔"

"اوکے تم نظر رکھو باہر جائے تو پیچھا کرتا...... میں پہنچ رہا ہوں۔"

"جی......" فون بند ہوگیا۔

عجلت بھرے انداز میں وہ دل سے حریرہ کی خیریت کی دعا مانگتا نکلا۔ کوٹھی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ فون بجا......

"سر میں گاڑی کا پیچھا کر رہا ہوں، گاڑی میں کچھ سامان ہے گیٹ اندر سے بند ہوا ہے۔"

"تم کہاں ہو اس وقت؟"

"سر میں......" رشید اسے راستہ بتانے لگا۔

ابو بکر، ڈی ایس پی کو فون کر کے محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا کہ اسے رشید کی بائیک نظر آگئی۔ اپنی گاڑی آہستہ کر کے اس سے پوچھا۔

آگے والی گاڑی ایک روڈ پر مڑ کر ایک بنگلے کے آگے کھڑی ہوگئی۔ ہارن بجا کر گیٹ کھلا اور گاڑی اندر داخل ہوگئی۔ گیٹ بند ہوگیا۔ ابو بکر کو پتنگے لگے ہوئے تھے، یقین ہوگیا کہ واجد ہی تھا۔ ان کے گھر اور کون داخل ہوسکتا ہے۔

تبھی ڈی ایس پی انوار احمد موبائل کے ساتھ آگئے۔ بنگلے کو آگے پیچھے سے گھیر لیا۔ وہ سپیشل فورس کو بھی ساتھ لائے تھے۔ باہر سے کود کر اندر سے گیٹ کھول دیا گیا۔ دونوں گاڑیاں اندر داخل ہوگئیں۔ پولیس اِدھر اُدھر اشارے پر پھیل گئی۔

ابو بکر اندر داخل ہونے لگا کہ اندر سے واجد تیز، تیز بولتا باہر نکلا۔

"بس میں نکل رہا ہوں، سالی بے ہوش ہے ابھی تک ڈاکٹر کو دکھاتا ہوں۔" چند منٹ رک کر اس کی بات سنی......

"ایسا کر بے منٹ کر اور بے ہوش کو لے جا...... ہوش میں آگئی تو فساد کرے گی۔" پھر چند منٹ رکا......

"ہاں میں نے انجیکشن لگا دیا ہے سالی بہت اچھل رہی تھی۔ سر اور منہ سے خون بھی نکل رہا تھا۔ اس کا باپ بھی دم نہیں مار سکتا...... یار...... انہیں مجھ پر ذرا شک بھی نہیں ہے کہ میں پاکستان آسکتا ہوں۔ کوٹھی خالی پڑی ہے ایک ہفتے کے لیے میں نے یہ کوٹھی لے لی تھی۔" وہ اِدھر ہی رک گیا تھا۔

ڈی ایس پی نے آگے بڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ دونوں سائڈ میں تھے۔ بولتے ہوئے واجد احتیاط نہیں کر رہا تھا۔

ابو بکر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کا خدشہ درست تھا۔ اس بار وہ اسے نہیں چھوڑے گا۔

"تو کیوں ڈر رہا ہے؟ میں ائر پورٹ پہنچ رہا ہوں اسے لے کر اپنی بیوی کی حیثیت سے۔ نکاح نامہ ہے میرے پاس......" دوسری جانب کی بات سن کر وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

"وہ جب تک طلاق نامہ لے کر پہنچیں گے ہمارا جہاز ہواؤں میں بلند ہو چکا ہوگا۔ میں واپسی کے ٹکٹ...... ساتھ لے کر آیا تھا۔ میں تو اُدھر ہی کام ختم کر دیتا اگر اس کا کزن نہ آجاتا۔" پھر رکا۔

"نہیں یار دام کھرے...... بالکل کرارے نوٹ لوں گا۔" ابو بکر کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ کیسا ننگ خاندان تھا۔ اپنے خاندان کی عزت بیچ رہا تھا۔ تف تھا اس پر...... ساری عمر اب جیل کی چکی کاٹے گا۔

"چل ٹھیک ہے میں ائر پورٹ پہنچ جاؤں گا۔ ٹکٹ کنفرم کروالیا ہے رات نو بجے کی فلائٹ ہے۔"

ابو بکر کی آنکھوں میں لہو سمٹ آیا۔ فون بند ہوگیا۔ سارا پروگرام پتا چل گیا تھا۔ ڈی ایس پی کے پیچھے ابو بکر بھی آگے بڑھا۔ واجد جو سرور میں باہر نکل رہا تھا، ٹھٹک گیا۔

اس کے گمان میں نہیں تھا کہ یوں قفس اس کے پاؤں کی زنجیر بنے گا...... ڈی ایس پی نے آدمیوں کی مدد سے اسے حراست میں لیا۔ ابو بکر اندر بھاگا...... کمرا، کمرا دیکھتا وہ بدحواس ہو رہا تھا۔ اوپر کے آخری کمرے میں اسے بیڈ پر حریرہ مل گئی وہ بے ہوش تھی، سر سے خون رس رہا تھا۔ منہ کے قریب خون جم گیا تھا۔ سانس آہستہ، آہستہ چل رہی تھی۔

"حریرہ، حریرہ۔" اسے جھنجوڑا۔

وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ منہ پر پانی کا چھڑکا، چہرہ صاف کیا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔

نازک سے وجود کو بانہوں میں بھر کر وہ باہر بھاگا۔

"میرا خیال ہے اسے زیادہ ڈوز دی گئی ہے۔ اس

کی سانس نارمل نہیں ہے۔" گھبراتے ہوئے اس نے ڈی ایس پی کو بتایا۔ انہوں نے گاڑی کا بیک ڈور کھول دیا۔ ساتھ ہی اشارے سے ایک لیڈی کانسٹیبل کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ابو بکر اور حریرہ کو دیکھ کر...... واجد انگریزی میں گالیاں دے رہا تھا۔ ابو بکر گاڑی باہر نکال لے گیا۔ پولیس کی گاڑی واجد کو تھانے کی جانب لے جا رہی تھی۔

☆☆☆

"زرین، زرین آنکھیں کھولو...... حریرہ مل گئی ہے۔ اسے واجد نے اغوا کیا تھا۔" اکرام احمد، زرین کے منہ پر پانی ڈال رہے تھے، بڑی نقاہت سے انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

"حریرہ...... حریرہ...... میری بیٹی...... میری بی بیٹی۔"

"ہماری بیٹی ٹھیک ہے تم حوصلہ کرو، میں اسے لے کر آتا ہوں۔" انہیں مدیحہ کے حوالے کر کے تیزی سے باہر نکل گئے۔

"کیا......" نڈھال سے اکرام احمد اسپتال میں پہنچ کر بینچ پر گر سے گئے۔

"اسے بہت اذیت دی گئی ہے۔ مارا گیا ہے، بھاری مقدار میں نشہ دیا گیا ہے تاکہ وہ بے ہوش رہے، اسے واجد نے کسی اوباش کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ سودا پورا کرنے وہ اِدھر آیا تھا۔ حریرہ کو اغوا کر کے واپس لے جانا چاہتا تھا۔" ابو بکر نے مشتعل سے انداز میں اکرام احمد کو بتایا۔

"تف...... تف ہے ننگ انسانیت تجھ پر...... تجھے میں چار چوٹ کی مار لگواؤں گا...... رذیل انسان...... میری بیٹی...... حریرہ کیسی ہے؟"

"آئی سی یو میں ہے...... ڈاکٹر دیکھ رہے ہیں۔"

ابو بکر کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ حریرہ...... حریرہ...... کس مشکل سے زندگی کی جانب لایا تھا۔ اس کا ہنستا چہرہ...... چمکتی آنکھیں...... ایک بار پھر...... ایک بار پھر......

"اے میرے اللہ......" وہ کراہا...... "بس اب اور نہیں...... اس کے دکھوں کی صبح کر دے...... اس کی زندگی سے شامِ غم نکال دے...... اسے اس تکلیف سے نکال دے۔" اونچا لمبا، مضبوط ابو بکر ریلنگ پر سر جھکا کر رو دیا۔

وہ مستقل بے ہوش تھی اور...... ڈاکٹر...... پُرامید نہیں تھے۔

بے دم سی حریرہ ابو بکر کی جان نکال رہی تھی۔

"اٹھو...... آنکھیں کھولو...... اب میں تمہیں کسی تکلیف میں نہیں پڑنے دوں گا۔ خود سے بڑھ کر تمہارا خیال رکھوں گا۔ کبھی اکیلا، تنہا نہیں چھوڑوں...... آنکھیں کھول دو...... مجھے زندگی دے دو۔" ذرا سی جھری سے دیکھتا ابو بکر اندر ہی اندر سسک رہا تھا۔

ڈاکٹر نیلوفر نے سنا تو ساکت رہ گئیں۔

"بس دعا کریں۔"

اس نازک سی چھوٹی سی پیاری لڑکی کے لیے تو ہمیشہ ہی دعا گو رہتی تھیں۔ دو دن بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ابو بکر، اکرام احمد، اور روتی ہوئی زرین سجدۂ شکر ادا کرنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں نقاہت...... اور چہرے پر زردی تھی۔ ٹکر ٹکر چھت کو دیکھ رہی تھی۔ پھر آنکھیں موند لیں۔

"حریرہ...... بیٹا آنکھیں کھولو...... میں تمہارا پاپا......" اکرام احمد نے اس کی پیشانی چوم لی۔

خوف و ہراس اس کے اندر ٹھہر گیا تھا۔ اس کی مٹھیاں سختی سے بند تھیں۔

"یہ کسی شدید خوف کے حصار میں ہیں۔" ڈاکٹر انہیں بتا رہے تھے۔ "خوف و دہشت، انہیں آنکھیں کھولنے نہیں دے رہے...... جب یہ بے ہوش ہوئیں تو کیا ہوا تھا؟"

ڈاکٹر پوچھ رہے تھے۔ اکرام احمد نے ڈاکٹرز کا پینل بلوا لیا تھا۔ انہیں بیٹی کی زندگی عزیز تھی۔ ابو بکر انہیں کیس ہسٹری بتانے لگا۔

"اوہ ویری سیڈ......" تاسف بھرا انداز تھا۔

ابو بکر اس کے بیڈ کنارے کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ دہشت کے جانے کون سے لمحے میں تھی کہ یک دم ہی بازو کھینچا۔ مٹھی بند ہتھیلیاں، منہ کی جانب کھینچیں، سر اِدھر اُدھر پٹخنے لگی۔ بازو میں لگی سرنج نے بازو لہولہان کر دیا۔

"نرس، سسٹر......" آگے بڑھتے ہوئے ابو بکر چیخا۔

باہر جاتی ہوئی نرس پلٹ آئی۔

”پلیز دیکھیں اسے۔“ اس نے بازو تھام لیے۔
حریہ اپنا سر پٹخ رہی تھی۔
”نہیں، نہیں، چھوڑ دو، مجھے جانے دو، مجھے زندہ رہنا ہے، مجھے زندہ رہنا ہے۔ اپنے لیے، ماما کے لیے جاؤ چلے جاؤ، چھوڑ دو، چھوڑ دو......“ اس کی آواز دم توڑتی ہوئی پھر بلند ہوئی۔ پھر آہستہ، آہستہ مدھم ہوتی گئی۔
دوسری سسٹر نے ڈاکٹر کو بلوالیا۔
”یہ خوش آئند بات ہے، یہ بولی ہیں، انشاء اللہ انہیں جلد ہی ہوش آجائے گا انہیں بھرپور توجہ کی ضرورت ہے‘ جو انہیں جگائے، بتائے، خوف کے حصار سے باہر نکالے...... ورنہ یہ آنکھیں نہیں کھولیں گی۔“ ڈاکٹر اسے چیک کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
”توجہ......“ اندر ہی اندر ابوبکر کے آنسو گرنے لگے۔
اس کی تو پوری زندگی اس پر نثار تھی۔
کوئی بھی آتا...... بے دم سی پڑی رہتی...... اشکبار سی زرین دم کیے جاتیں۔ دعائیں مانگے جاتیں...... مدیحہ پیار کرتی، سہلاتی، اٹھاتی، اکرام احمد نے واجد کو جیل کروادی تھی۔ بیٹی کو حبسِ بے جا میں رکھنے کے جرم میں...... ظلم و زیادتی، مارکٹائی، زبردستی، نشہ دینے کے جرم میں کتنی ہی دفعات لگادی تھیں‘ وہ مرغِ بسمل کے مانند تڑپ رہا تھا۔
سارے حساب کس بل کے ساتھ نکال لیے تھے۔
حریہ ان کی پیاری بیٹی تھی۔ پیارے بھائی کو اس لیے نہیں دی تھی کہ اس پر زندگی تنگ کردے۔ اسے زندہ درگور کردے۔ بار، بار نہیں، اس بار قطعی واجد کو معاف نہیں کرنا تھا۔
بیوی کی نظر میں برے بنے حالانکہ اس نے کتنا منع کیا تھا، اس رشتے سے انہیں ابوبکر پسند تھا۔ پسند تو انہیں بھی تھا۔ مگر سوال بھائی کا تھا کیسے سات سمندر سے آئے بھائی کو خالی ہاتھ لوٹا دیتے۔
اندر ہی اندر ابوبکر سے شرمندہ ہوتے تھے...... مگر اب نہیں اب بھائی کو بھی دیکھ لیں گے اور واجد کو بھی۔ یہ احساس ہی سوہانِ روح تھا۔ وہ ننگ انسانیت ان کی بیٹی کو بیچنا چاہتا تھا اگر ایسا کر گزرتا تو ان کے پاس کیا رہ جاتا۔

کہاں ڈھونڈتے ہاتھ ملتے...... صد شکر ابوبکر کا جس نے ایک بار پھر حریہ کو بچالیا۔ وہ تو شروع سے حریہ کا مستحق تھا۔ اور وہ شروع سے ہی اس کے ساتھ ناانصافی کرتے آئے تھے۔
اب...... نہیں...... اب انہیں اگر بیٹی کے لیے جھکنا بھی پڑتا تو جھک جاتے...... ابوبکر کو منالیتے، ابوبکر سے زیادہ ان کی بیٹی کی کوئی حفاظت کرسکتا تھا نہ تحفظ دے سکتا تھا۔

ہے مجھے خدا کا جو آسرا
نہیں میں نے کوئی گلہ کیا
میں بتاؤں کہ مجھے کیا ملے
مجھے صبر کا ہی صلہ ملے

ابوبکر ایک ٹک حریہ کو دیکھ رہا تھا۔

میں وہ کس طرح سے کروں بیاں
جو کیے گئے ہیں ستم یہاں
سنے کون میری یہ داستاں
کوئی ہم نشیں ہے نہ رازداں

”آنکھیں کھولو حریہ......“ دھیرے سے اس کے بال سہلائے۔
”میں ہوں تمہارے پاس، اب تمہیں کوئی خوف نہیں ہے، اب کوئی تم تک نہیں پہنچ سکتا کھولو آنکھیں۔“
اور حریہ نے آنکھیں کھول دیں‘ ابوبکر قریب آگیا۔
ایک دم خالی آنکھوں سے وہ ابوبکر کو دیکھ رہی تھی۔
”کیسی ہو......؟“ ابوبکر نے خراشوں بھرا بازو تھام لیا۔
”میں مرتی کیوں نہیں ہوں۔“ آنسو ٹوٹنے لگے۔
”کس عذاب کی سزا ہے...... تم، تم تو کہتے تھے کہ وہ اب نہیں آئے گا۔ پھر...... پھر......“ اس کی سانس پھولنے لگی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں، نقاہت بے انتہا تھی۔ ”بولو۔“
ابوبکر نے بیڈ کا سرہانہ اونچا کیا...... اس کے پیچھے تکیے لگا کر اس کو پانی پلایا...... وہ بے دم ہورہی تھی۔
”حوصلہ رکھو...... ہوش کرو۔ وہ اب جیل میں ہے، اب کبھی نہیں نکل سکتا۔“
”جھوٹ، جھوٹ بولتے ہو تم...... وہ پھر آجائے گا، لے جائے گا یونہی گھسیٹتا ہوا...... نوچتا ہوا...... مارتا ہوا۔“
وہ بلک، بلک رو رہی تھی۔ گھٹی، گھٹی چیخوں سے نیم

جاں ہورہی تھی۔
ڈاکٹر نیلوفر دیکھنے آئیں تو انہیں دیکھتے ہی اس کی آنکھیں بھر آنے لگیں۔
”آپ نے تو کہا تھا کہ ماضی کو بھول جاؤ، ظالم کو ظلم کی سزا ملے گی تو پھر...... سے...... میں ہی کیوں؟“
آنسو رخساروں پر پھسلنے لگے۔
”ایک اور بار...... پھر سے وہی اذیت...... وہی دکھ...... وہی تکلیف......“ انہوں نے حریہ کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

☆☆☆

اب دھیرے، دھیرے وہ بہتر ہورہی تھی۔ مگر چپ، خاموش، گم صم سی ہر چیز کی خواہش دم توڑ گئی تھی۔ زرین اسے دیکھ کر روئے جاتیں، یہ کیسا دکھ تھا جو پلٹ، پلٹ کر آرہا تھا۔
”دیکھ لیا اپنی من مانی، اپنی ضد کا انجام، مر رہی ہے میری بچی......“ اس روز وہ اکرام احمد کے آگے بپھر اٹھیں۔ آج تک حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی تھیں۔
”حریہ کا دکھ مجھے بھی ہے، میں سزا دلوا رہا ہوں واجد کو۔“ دھیرے سے انہوں نے بیوی کو ساتھ لگا لیا۔
”کیا فائدہ...... میری بیٹی تو......“ وہ دلگیر تھیں۔
آنسوؤں نے ان کی آنکھوں کو بھی بھگو دیا۔
”مجھے معاف کردو زرین، میں نے بہت ظلم کیا۔ اس پر اور تم پر بھی۔“
”کیا فائدہ...... کیا فائدہ...... ایسی معافی کا جو اولاد کو بے موت مار دے‘ اس کی زندگی سے خوشیوں کا رس کشید کرلے۔ کس مشکل سے وہ زندگی کی جانب لوٹی تھی۔“
”انشاء اللہ، انشاء اللہ...... ایک بار پھر وہ زندگی کی جانب لوٹے گی۔ پہلے جیسی ہوگی تم دیکھنا۔“ یقین دلایا۔
اور وہ...... سر ہلاتے ہوئے آنچل سے چہرہ صاف کرنے لگیں۔

☆☆☆

وہ گھر آچکی تھی۔ ابوبکر کمرے میں داخل ہوا۔ حریہ اپنے بیڈ کے کونے میں گھٹنے گراؤن سے ٹیک لگائے کھلے دریچے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کئی پل رک کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر کھنکھار کر اپنے ہونے کا احساس دلایا۔
”یہ کیا تم ایک کمرے میں سمٹ کر بیٹھ گئی ہو، باہر نکلا کرو...... خالہ جان کے ساتھ باتیں کیا کرو......“
ایک نگاہ اس پر ڈال کر وہ دوبارہ سے باہر دیکھنے لگی۔
”ارے......“ کشن اٹھا کر اس پر پھینکا۔ ”تم سے کہہ رہا ہوں۔“
”فائدہ...... میں کیوں باہر نکلوں...... کیوں کچھ سوچوں...... تاکہ پھر وہ آجائے... پھر سے وحشی بن جائے پھر سے مجھے، مجھے......“
”حریہ...... اب ایسا نہیں ہوگا۔“
”ایسا ہی ہوگا...... ہمیشہ ہی ایسا ہوگا وہ کہتا ہے کہ میں نے تمہیں طلاق نہیں دی، تم کہتے ہو دے دی۔ وہ کہتا ہے کہ زبردستی طلاق نہیں ہوتی۔ تم اب بھی میری بیوی ہو۔“ وحشت بھرے انداز میں وہ بول رہی تھی۔
”ہمارے پاس ثبوت ہے۔“
”وہ کسی ثبوت کو نہیں مانتا۔“ سر جھٹکا۔ ”بس تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو...... جینا مرنا میرا مسئلہ ہے۔“
”نہیں، یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ میرا مسئلہ ہے۔“
”بھلا کیوں؟“ پھاڑ کھانے والا انداز تھا۔
”واجد جیل میں بند ہے۔“ اطلاع دی۔ ”خالو نے اس پر کئی مقدمات ڈال دیے ہیں۔“
”اس کے پاس بہت پیسہ ہے آجائے گا باہر۔“ وہ خوفزدہ تھی۔
”ہم...... اتنے کمزور نہیں ہیں۔“
”مگر...... میں تو ہوں ناں، مجھے نہیں کچھ جاننا...... کچھ نہیں سننا...... جاؤ تم......“
”جارہا ہوں این جی او میں تمہاری سیٹ تمہاری منتظر ہے۔“
”کسی اور کو دے دو۔“
”تمہاری وکالت......“
”پلیز جاؤ یہاں سے۔“ وہ چیخی۔
”جارہا ہوں، خود کو کمزور ثابت مت کرو...... تم بہت مضبوط ہو، تمہیں اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔“
حریہ نے بچوں کی طرح کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

ابوبکر ہنستا ہوا کشن اس پر اچھال کر باہر نکل گیا۔

واجد کے باپ ظہیر کا فون آیا تھا۔ ”واجد کو چھوڑ دیں میں اسے بلوالیتا ہوں۔“ اکرام احمد کو پتنگے لگ گئے۔

”آ گیا خیال بات کرنے کا...... کون ہوں میں۔“

”اس سے غلطی ہوئی ہے اکرام بھائی معاف کردیں۔“

”غلطی نہیں، غلطی پر غلطی ہوئی ہے دیدہ دلیری دیکھو سودا طے کررہا تھا میری بیٹی کا، میرے خاندان کا کیسی تربیت کی ہے اس کی؟ یہ انسانیت ہے کوئی، تف ہے تم پر اور تمہاری اولاد پر۔“ اکرام احمد جو منہ میں آیا بولتے چلے گئے۔ آخر میں فون ہی بند کردیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر نیلوفر کو حریہ بہت عزیز ہوگئی تھی اس کی طبیعت پوچھنے آئیں تو ایک بار پھر اسے کلینک آنے کے لیے کہا۔

”مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے کہیں آنا جانا نہیں ہے، یہ میری جنت ہے، یہ میری تنہائی مجھے یہاں جینے دیں۔“

”ایسے کب تک رہوگی تم...... اکیلا آدمی بے موت مرجاتا ہے۔“

”باہر بھی تو موت ہی ہے۔“ شاکی اور دکھی انداز میں کہا۔

”اس کمرے سے تو باہر نکلو۔“

”شاید اب کبھی نہ نکل سکوں۔“

”اپنی وجہ سے تم کتنے لوگوں کو دکھ دو گی۔“

”میں......“ اس کا لہجہ بھرا گیا۔ ”اور...... میں کیا کروں...... قوتِ برداشت ختم ہوگئی میری۔ میرے اختیار میں بس یہی ہے۔“ آنسو رخساروں پر پھسلنے لگے۔

”تم اتنی کمزور نہیں ہو حریہ...... بہت بہادر ہو ڈھال بنو سب کی، اپنی ماما کو دیکھو، پاپا کے لیے۔“

حریہ چپ چاپ سنتی رہی...... زخم سہلاتی رہی، زندگی پر سے اعتبار بالکل ختم ہوگیا تھا۔

اب کے حد سے زیادہ ریزہ، ریزہ ہوئی تھی۔ کیسے جڑتی، کیسے جڑے گی، باہر نکلنا، آفس کے کام...... پاپا کے ساتھ جانا...... سب ختم تھا، بس ایک چپ تھی جو ہر سو حصار میں لیے رہتی۔

زرین زبردستی اس کے ساتھ بولتیں اور اس کی حالت دیکھ کر چھپ، چھپ کر روتی رہتیں۔ کیسی بدنصیب بیٹی تھی ان کی...... ایک ابوبکر تھا جو زبردستی اس کے ساتھ بات کرتا، لان میں لے جاتا۔ ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا بلواتا...... حریہ کے چہرے پر ناگواری کے بل رہتے۔

”تھوڑا عرصہ اور برداشت کرلو...... پھر تو میں چلا جاؤں گا۔“

”کہاں......؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”جہاں میری مرضی......“

”کیوں جارہے ہو ابوبکر......؟“ ذرا سا وہ قریب آئی۔ اس کے انداز میں بے ساختگی تھی۔

”اس لیے کہ تمہیں میری ضرورت نہیں رہی۔ تم میری دوست ہو میں تمہیں ہر حال میں خوش مطمئن اور مکمل دیکھنا چاہتا ہوں مگر تم اب ایسا نہیں چاہتی ہو......“ گریز کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے وہ اپنا کام کرتا رہا۔

حریہ چپ ہوگئی۔

”مگر...... میں دوا تو لے رہی ہوں ناں......“ معصومیت سے کہا۔

”ہاں، مگر زندگی کی جانب نہیں لوٹ رہیں، وہی تنہائی، خاموشی اور آدم بیزاری......“

”میرا دل نہیں چاہتا، ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ وہ آئے گا مجھے لے جائے گا۔“

”مجھ سے خالو اور خالہ کا تفکر نہیں دیکھا جاتا۔“

”اس نے ایک بار پھر میرے ساتھ ایسا کیوں کیا جب سب حق ختم ہوگئے تھے تو پھر کیوں اس نے مجھے زخم خوردہ کیا۔“

”واجد ایک نفسیاتی مریض ہے، اس کی نظر میں عورت حقیر ہے، ماں، بہن، بیٹی کے رشتے نہیں ملے اسے، بچپن سے بورڈنگ میں رہا ہے، ان رشتوں کی اس کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں۔ ہماری غلطی تھی کہ اسے کھلا چھوڑ آئے مگر اب نہیں، وہ ایک وحشی درندہ بن چکا ہے، جسے مذہبی عقائد و ضوابط کا بھی نہیں پتا...... اب یا تو اس کا علاج ہوگا یا پھر وہ سزا کاٹے گا۔“ ابوبکر نے سر جھکائے بیٹھی حریہ کو دیکھا...... جو ہاتھ کی لکیروں میں الجھی ہوئی تھی۔

”جو کچھ ہوچکا، ہم اسے بدل نہیں سکتے آئندہ کے لیے تو یہ احتیاط لازم ہے اب تمہاری زندگی میں واجد نام کے کسی شخص کا دخل نہیں ہوگا، وہ خود تم سے آکر معافی مانگے گا۔“ ابوبکر نرم آواز میں ناصحانہ انداز میں بولتا جارہا تھا۔

”جانا تو مجھے پہلے بھی تھا۔ مگر اپنے ایک دوست کی وجہ سے رک گیا۔ اب پھر جارہا ہوں، مجھے شادی بھی کرنی ہے، اپنا گھر بھی بسانا ہے، کوئی اچھی سی لڑکی دیکھنا میرے لیے۔“ دھیرے سے کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔ اور حریہ خالی الذہن بیٹھی رہ گئی۔ اردگرد عجیب سا سناٹا پھیل گیا۔

”ابوبکر چلا جائے گا تو...... میں کیا کروں گی۔“ ایک خوف تھا جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کشن اٹھا کر اس نے گود میں رکھا اور سمٹ کر اسے آس بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ یہ احساس ہی سوہانِ روح تھا کہ وہ چلا جائے گا۔

صبح تک وہ بخار میں بری طرح تپ رہی تھی۔ زرین اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں۔

”ما...... ما......“ بڑے کرب سے پکارا۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ بال سنوارتے ہوئے اس پر جھکیں۔

”ماما...... ابوبکر کو روک لیں، اس سے کہیں، کہیں مت جائے۔ میں ٹھیک ہوجاؤں گی، ہر کام کروں گی۔“ بچوں کی طرح اس نے کہا۔ ان کی گود میں منہ چھپالیا۔

”ماما، وہ پھر آگیا تو...... تو کیا ہوگا...... مجھے کون بچائے گا۔“

”تمہیں خود حریہ اکرام احمد بچائے گی، دوسروں پر اکتفا مت کرو......“ ابوبکر اندر آگیا تھا۔ حریہ چونک گئی۔

”تم کہاں جارہے ہو ابوبکر......؟“ زرین نے پریشانی سے دیکھا۔

”ایک کورس کے سلسلے میں جارہا ہوں دیکھیں کتنا عرصہ لگتا ہے۔ اور خالہ میں ہمیشہ تو اِدھر نہیں رہ سکتا ناں...... میرا فلیٹ بن گیا ہے۔“

”ابوبکر بیٹا......“ وہ روہانسی ہونے لگیں۔

”آتا جاتا رہوں گا۔“

”بخار کیسے ہوگیا۔ ریشماں بتا رہی تھی ابھی......“ ہاتھ بڑھا کر اس کا ماتھا چھوا۔

”خالہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جایئے گا یا ڈاکٹر زینب کو اِدھر ہی بلوالیں، میں جارہا ہوں۔“ دھیرے سے کہا اور پلٹ گیا۔

اسے جاتا دیکھ کر ایک دم سے اٹھی۔ وہ مڑے بغیر نکل گیا۔ بے دم سی ہوکر وہ تکیے پر گرگئی۔

دل و وجود ذہن، کمرا ہر چیز خالی ہونے لگی۔ آنسو بہہ نکلے۔ زرین بھی اچانک اس کے جانے کا سن کر سن سی بیٹھی رہ گئیں۔

یہ گھر، سب لوگ اس کے عادی ہوگئے تھے، بہت خیال رکھتا تھا ہر فرد کا...... ہر دکھ کا، ہر تکلیف، پریشانی کا علاج تھا اس کے پاس...... سب کے دل کی بات جان لیتا تھا۔

”وہ چلا جائے گا ماما، وہ چلا جائے گا۔“

وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

”مت جاؤ ابوبکر بیٹا...... اگر جانا ہی ہے تو واپس آجانا۔“ ڈائننگ ٹیبل پر اس سے کہا۔

”جانا تو ہے ناں خالہ...... میرا فلیٹ خالی ہے، مجھے شادی بھی کرنی ہے، آپ سے مجھے گلہ ہے۔ آپ نے مجھے ماں کی محبت تو دی چاہت بھی دی، خیال، دھیان سب کیا تھا۔ ممتا بھی دی، بس میری شادی کا ہی نہیں سوچا، اب یہ فیصلہ مجھے خود کرنا ہے خالہ...... اس لیے میرا یہاں سے جانا ضروری ہے۔“ کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے اسے دیکھا۔

زرین اکرام اسے دیکھے گئیں بالکل ٹھیک گلہ، شکوہ کررہا تھا وہ۔

”تم میری مجبوری جانتے ہو بیٹا...... اور میں تمہاری مرضی...... تمہارے خالو کی مرضی نہیں تھی، انہوں نے من مانی کرکے اس کی زندگی تباہ کردی...... میں تم سے شرمندہ ہوں۔ پھر بھی تم نے ہمارا بھی بہت خیال رکھا۔ ہمت ہی نہیں ہوئی کہ تم سے کہتی شادی کرلو......“ دھیرے سے نگاہ جھکا کر انہوں نے کہا۔

’’خالہ، میں قسمت پر شاکر رہتا ہوں مگر مجھے گھر بھی تو بسانا ہے ناں...... کب تک اکیلا رہوں گا۔‘‘
’’کوئی لڑکی دیکھی ہے، ہم تمہاری شادی کریں گے، حق ہے تمہارا یہ......‘‘
’’جی لڑکی دیکھی ہے جلد آپ کو بتادوں گا......‘‘ پانی کا گلاس اٹھایا۔
’’میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری دلہن لاؤں گی۔‘‘
وہ بے انتہا خوش ہوئیں۔
ابوبکر مسکرا کر انہیں دیکھنے لگا۔

☆☆☆

وہ چلا جائے گا اس کی زندگی...... ویران، بنجر ہوجائے گی۔ یہ احساس ہی اسے مار رہا تھا۔ وہ بہت عادی ہوگئی تھی۔ بچپن سے اس کا ساتھ تھا ہر موقع، دکھ، تکلیف میں اس نے ساتھ دیا تھا۔ بے لوث ہوکر آج تک نبھا رہا تھا۔ اس کے ہر غم کا علاج ابوبکر ہی تھا۔
وہ چلا جائے گا وہی اس کا دوست و رہنما اس کا مونس و غمخوار تھا۔ وہ جلے پیر کی بلی کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ بار، بار پانی پی رہی تھی۔ پیاس تھی کہ بجھ ہی نہیں رہی تھی۔
لان میں نکل آئی۔ ہر سو اندھیرا تھا، سرما کا چاند جانے کہاں جا چھپا تھا۔ سردی کی لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
ننگے پاؤں گھاس پر پھرتی رہی، قرار نہ ملا...... اپنے غمخوار کو کیسے روکے، اس کی تمام شرطیں مان لے، ہاں، مان لے گی، سوکھے پتوں کو ہاتھ میں لے کر مسلا۔
’’وہ وکیل بھی بنے گی، دوبارہ سے پاپا کا آفس بھی جوائن کرے گی۔ این جی او بھی جائے گی اور وہ سب کام کرے گی۔‘‘ اس نے اپنے آپ کو خود حوصلہ دیا۔
’’وہ ابوبکر کو روک لے گی۔‘‘ سر اٹھا کر انیکسی کے اوپر والے پورشن کو دیکھا جہاں اندھیرا، سناٹا اور گہری خاموشی تھی۔
’’صبح، صبح بات کرے گی، ابھی نہیں گیا ہوگا۔‘‘
عجیب بے چینی تھی جس نے جسم و جاں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔
نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، دھیرے سے پاؤں سمیٹ کر جھولے پر آ کر بیٹھ گئی۔ ٹھنڈی لہر وجود میں اتر نے لگی۔

کبھی اجڑی شاموں کو دیکھنا
کبھی سونی صبحوں میں گھومنا
کبھی بھیگی آنکھوں سے جاگنا
کبھی بیتے لمحوں کو سوچنا
مگر ایک پل ہے امید کا
ہے مجھے خدا کا جو آسرا
نہیں میں نے کوئی گلہ کیا
میں بتاؤں کہ مجھے کیا ملے
مجھے صبر کا ہی صلہ ملے
کسی آرزو کا صلہ ملے
جو میرا ہے وہ مجھ سے آملے
کہ......
میری ذات ذرہ بے نشاں......

دھیمے سُروں میں نظم کے بول کہیں دور سے کان میں پڑے، سننے والے کے ساتھ وہ بھی سننے گئی۔ پھر جانے کب سوگئی۔
صبح...... اسے یوں جھولے پر سویا دیکھ کر زرین کانپ گئیں۔
’’حریرہ، بیٹا یہاں......‘‘
’’ماما...... وہ ابوبکر کا انتظار کررہی تھی، وہ چلا نہ جائے اسے روکنا تھا ناں۔‘‘ معصومیت سے انہیں دیکھا۔
’’ہم نے اس کا دل توڑا ہے رک بھی جائے گا تو کیا فائدہ...... جانا تو اس نے ہے ہی ناں......‘‘ پیار سے بال سنوارے۔
’’وہ دو ہفتوں کے لیے اسلام آباد گیا ہے، آجائے گا پھر جرمنی جائے گا ایک سال کے لیے۔‘‘
’’وہ چلا بھی گیا...... بتایا بھی نہیں۔‘‘ وہ ہکا بکا رہ گئی۔
’’بتایا تو تھا کل......‘‘
’’م...... مگر آج کا تو نہیں بتایا تھا۔‘‘ انہوں نے اس بے قراری پر نگاہ چرالی۔
’’چلو اندر چلو، ابھی بخار کی کمزوری گئی نہیں ہے تم پھر یہاں آ کر پڑ گئی ہو۔ طبیعت خراب ہوگئی تو۔‘‘

دھیرے سے اٹھا کر وہ اسے اندر لے آئیں۔
اور وہ مڑ، مڑ کر انیکسی کی جانب دیکھتی رہی۔

☆☆☆

اکرام احمد نے چونک کر سنجیدہ بیٹھی زرین کو دیکھا۔ وہ بات مکمل کرچکی تھیں۔ ابوبکر کا پروگرام...... شادی کا ارادہ بتادیا تھا، وہ تو کیا سوچ رہے تھے، ابوبکر کے آگے جھکیں گے، خود کہیں گے ان کی بیٹی کا ساتھ قبول کرلو۔ اس کے بہت احسان مند ہیں وہ مگر...... ان کے کندھے جھک گئے۔
’’وہ ٹھیک کررہا ہے، اسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔‘‘
ان کا دل بھی دکھ کے بوجھ سے بوجھل ہونے لگا۔
بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا کفارہ ممکن ہی نہیں ہوتا۔
اِک گہری سانس لے کر چائے کا کپ اٹھالیا تھا۔

☆☆☆

کتنی بار انیکسی کی سیڑھیاں چڑھتی، کتنی بار اترتی، کافی دیر تک اُدھری ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی۔ اس کے پاس سم سم کا ورد نہیں تھا کہ تالا کھل جاتا، اندر جا کر...... ابوبکر سے مل لیتی، اس سے بات کرتی اور اسے روک لیتی۔
آنکھوں میں انتظار ساکت ہوگیا۔ پاؤں انیکسی کی جانب بھاگ، بھاگ کر تھک گئے، ہر آہٹ پر اس کا گمان اِک جوت سی جگا دیتا۔ مگر مانوس جاپ قدموں کی آہٹ نہیں ابھری۔ کسی نے ابوبکر کی طرح حریرہ کہہ کر نہیں بلایا تھا۔ وہ سراپا انتظار تھی۔ دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ در و بام سوتے تھے۔ شام و سحر ویران تھے۔ کمرے کی تنہائی، اکیلا پن ڈراتا تھا۔ اس کا خیال آنکھ بھر لاتا تھا۔ اور زرین اکرام اپنی آنکھوں کی دھند صاف کیے جاتیں۔
ایک شام...... جب وہ جھولے پر بیٹھی تھی اس کے گرد بادام کے پتوں کا بسیرا تھا۔ ایک اداس چڑیا جھولے کی راڈ پر بیٹھی اس کے ساتھ ہلکورے لے رہی تھی۔
سرما کی اداسی، اکیلا پن ہر سو پھیلا تھا...... کہ وہ دشمنِ جاں بلکہ اس کا مسیحا...... اس کی آنکھوں کی جوت جلنے بجھنے لگی۔
’’تم، تم آگئے......‘‘ بھاگی اور جھولے کے قریب

کیسے مشکور!

میں نے اپنی محنت کی کمائی اپنی بیوی کو کپڑے، میک اپ کے لیے پاؤڈر، رنگ و روغن، پلستر اور کیچڑ وغیرہ مہیا کرنے میں خرچ کردی تاکہ وہ نوجوان نظر آئے۔ عورت اس وقت بوڑھی ہوتی ہے جب وہ بوڑھی نظر آئے، مرد اس وقت بوڑھا ہوتا ہے جب وہ خود کو بوڑھا محسوس کرے یا یوں کہہ لیجیے عورت اس وقت بوڑھی نظر آتی ہے جب وہ دلکشی کھو بیٹھے اور مرد اس وقت بوڑھا ہوتا ہے جب وہ بے ضرر بن جائے۔ ہر شہر اور گاؤں میں مرد ہی سب سے زیادہ بوڑھا ہوتا ہے کیونکہ کوئی بھی عورت بڑھاپے کی حقیقت کو ماننے کو تیار نہیں ہوتی۔ آپ کسی بوڑھی عورت سے اس کی عمر پوچھیں تو وہ کہے گی۔ تقریباً 35 سال...... پھر آپ اس سے اس کے سب سے بڑے بچے کی عمر پوچھیں تو وہ کہے گی 45 سال‘ ایک عورت دوسری عورت کے لیے شیطان ہوتی ہے۔ خواتین اکثر میری بیوی کو کہتی ہیں۔ آپ یقیناً حکیم صاحب کی چوتھی بیوی ہوں گی...... اگرچہ وہ میری پہلی اور آخری بیوی ہے۔ مرد کو اپنی زندگی میں بیوی کو خوش رکھنے کے لیے اتنی زیادہ سیاسی، سماجی اور معاشی قلابازیاں کھانا پڑتی ہیں کہ ایک ہی بیوی خاوند کو فصلوں میں گاڑا ہوا ڈراؤنا نقلی آدمی (بڈاوا) بنانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ایام جنگ میں ایک شخص کی دو بیویوں میں سے ایک نے شوہر سے کہا۔
’’آپ کو اس بات پر کوئی اعتراض تو نہ ہوگا اگر ہم میں سے ایک ملک وقوم کی خدمت کے لیے فوج میں شمولیت اختیار کرلے؟‘‘ شوہر نے جواب دیا۔
’’اگر آپ دونوں وقتی طور پر میدان جنگ میں چلی جائیں تو میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا۔‘‘

تحریر: حکیم محمد ارشاد، کتاب زندگی
مرسلہ: افتخار شوق، میاں چنوں

اسے کھینچ لائی۔

"سچ بالکل مزہ نہیں تھا زندگی میں...... میں تمہاری اتنی عادی ہوگئی ہوں، ہر کام ادھورا تھا، میں ہر کام کروں گی۔ ڈاکٹر نیلوفر کے پاس جانا ہے لے چلو...... لا کے فارم فل کروادو، تمہارے آفس جاؤں گی' میرا سیٹ اپ، میری روٹین چینج ہو جائے گی پلیز...... اب مت جانا......" بچوں کی طرح بازو پکڑ کر اس نے کہا۔ دونوں جھولے پر بیٹھ گئے۔ ابوبکر مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے اپنی پوری زندگی میں تمہیں بہت مس کیا ہے حریرہ......" چاہ سے اسے دیکھا۔

"تم مت جاؤ...... میں تمہاری تمام توقعات پر پورا اتروں گی۔"

"سچ......" ابوبکر کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

"ہاں، بالکل سچ، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی، تمہاری عادی ہوگئی ہوں۔"

"میں بھی......" نخ ہاتھوں کو تھام لیا۔

"اسلام آباد کی سڑکیں، پارک، پکنک پوائنٹ سب بیکار تھے تمہارے بنا...... ہر چیز ادھوری تھی۔" اس نے بھی اقرار کیا۔

"کیا تم نے بھی میری کمی محسوس کی۔"

"ہاں......" خلوصِ دل سے اس نے کہا حریرہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بس یہ تنہائی، یہ اکیلا پن، یہ اداسیاں اب نہیں سہہ سکتا میں ابھی خالہ سے بات کرتا ہوں تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔" وہ قریب ہوا۔

"لیکن میرا ہاتھ تو تمہارے ہاتھ میں ہی ہے۔" معصومیت سے سر اٹھایا۔

"ہش پگلی، ایسے نہیں نکاح کے بعد...... تمہاری شادی کردیں میرے ساتھ...... میری، محبت، میری چاہت، میرے حوالے کردیں۔ یہ سب اس لیے تھا، میں کیسے اپنے منہ سے کہتا، خالہ کو احساس نہیں تھا بچہ بڑا ہوگیا ہے، اسے ایک زوجہ کی گھر میں چہل پہل کی ضرورت ہے۔" ابوبکر شوخ ہو رہا تھا۔

جس انداز سے حریرہ نے اس کی آمد پر اس کی پزیرائی کی تھی۔ ابوبکر کا انگ، انگ مسرت سے کھل اٹھا تھا۔ سوکھے پتوں کی جگہ ہر سو عشقِ پیچاں کے پھول، پتے بکھرے نظر آرہے تھے۔ حریرہ ساکت نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہارا ہوں، ہمیشہ سے تمہارا۔" یہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

ابوبکر کے اردگرد یہاں وہاں ہر سو موسمِ بہار کی خوشیاں گر رہی تھیں۔

حریرہ کی گرم جوشی ماند پڑی ہاتھ گود میں گر رہے دوسرے لمحے وہ اٹھی، بھاگی دوپٹے سے الجھی، ڈگمگائی اور بھاگتی چلی گئی۔

"ارے ایسے شرما کر چھپ مت جانا' میں آرہا ہوں، خالہ سے بات کرنے۔" پیچھے سے وہ چیخا۔

مگر اس نے سنا کب تھا۔ وہ سن کب رہی تھی۔ شادی کی خبر ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھی۔

اسی رات اس نے خالہ، خالو سے بات کی، وہ حریرہ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ دونوں دم بخود اسے دیکھتے رہے، ابوبکر نے سر جھکا لیا۔

"مگر تمہاری پسند کی ہوئی لڑکی؟" زرین نے بے اختیار کہا۔

"وہ یہیں ہے مگر آپ کو لڑکا نظر نہیں آرہا تھا۔ کیا آپ نے اپنی لڑکی نہیں بیاہنی تھی۔" شرارت سے خالہ سے سرگوشی کی۔ خالو سے لحاظ تھا۔

زرین نے اس محبت پر اسے گلے لگا لیا۔

"مجھے معاف کردینا بیٹا، میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ ہم راستہ بھٹک کر کئی مرحلوں سے گزر کر آج پھر اسی مقام پر کھڑے ہیں شرمندہ، سر جھکائے۔" اکرام احمد نے سر جھکا کر کہا۔

"ایسا مت کہیں خالو...... میں نے کبھی آپ لوگوں کے بارے میں غلط نہیں سوچا، ہر کام مشیتِ ایزدی کا مرہونِ منت ہے پھر کس طرح ہم لوگ خودسری کرسکتے ہیں، اس کے ہونے سے انکار ہی نہیں ہے۔ خودسری کا انجام بھی معلوم ہے۔" محبت سے خالو کا ہاتھ تھام لیا۔

اکرام احمد نے اسے گلے لگا لیا۔

"واجد کو چھ سال کی قید جرمانے کے ساتھ ہوئی ہے، بہت ہاتھ پاؤں مار رہا ہے مگر اب نہیں...... مجرم کو ضرور سزا ملے گی......"

"بالکل......" دونوں نے سر ہلایا۔

وہ جو بالکل مایوس، نامراد، تہی داماں سمجھ رہے تھے ایک بار پھر بامراد ہوگئے تھے۔ اس یتیم و یسیر نے انہیں مالا مال کردیا تھا۔ خوشی کا احساس کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔

"بیگم صاحبہ...... بیگم صاحبہ...... صاحب جی......" ریشماں کی چیخ زوردار تھی۔ تینوں چونکے۔

"جلدی آیئے، جلدی دیکھیں حریرہ بی بی کو کیا ہوگیا ہے۔"

تینوں اٹھ کر سرپٹ بھاگے، آگے پہنچنے والوں میں ابوبکر تھا۔ اور حریرہ کو دیکھتے ہی ساکت ہوگیا۔ اس کے منہ سے جھاگ اور پانی نکل رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوش سی تھی، ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے، پاؤں بیڈ سے نیچے تھے، دوپٹا کارپٹ پر......

اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی تھی۔

"میں تو کھانے کے لیے بلانے آئی تھی اور یہ......" ریشماں چیخ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" اکرام احمد بدحواس باختہ آئے تھے۔

"اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی ہے۔" اسے بانہوں میں اٹھا کر ابوبکر باہر بھاگا۔

"ہائے......" زرین نے سینہ پکڑ لیا۔

اکرام دم بخود رہ گئے...... اور پھر پیچھے بھاگے۔

☆☆☆

ماتھے پر شکنیں لیے ابوبکر گرل سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اکرام احمد کاریڈور میں بے قرار و بے چین ٹہل رہے تھے۔

"حریرہ نے زہر کھالیا...... کیوں...... میں اسے اتنا ناپسند تھا۔ میرے پرپوزل کے جواب میں یہ ردِعمل...... اتنا سخت کیوں؟ کہہ دیتی۔" دل میں درد کی لہر اٹھی۔

آئی سی یو میں ڈاکٹر اس کا معدہ واش کر رہے تھے اسے بچانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

"تمہاری خوشی سے زیادہ تو کچھ اہم نہیں ہے۔ تم سے دستبردار ہو جاؤں گا۔" آنکھیں جل رہی تھیں، دل ڈوب رہا تھا۔ بظاہر ساکت کھڑا لان میں بیٹھے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ اپنے پیاروں کے ساتھ تھے، کچھ صحت کے لیے دعا مانگ رہے تھے کچھ اسپتال سے رخصت ہو رہے تھے۔

آٹھ گھنٹے بعد ڈاکٹر نے کچھ بہتری کی امید دلائی تھی۔ اکرام احمد سجدۂ شکر بجا لائے۔ ابوبکر گھر فون کرنے لگا اس کا دل خالی تھا۔ وہ جو اک خوشی تھی محبت کو پانے کا خمار تھا۔ وہ چاند کہیں ڈوب گیا تھا۔ ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ روشنی کی امید تھی نہ چاند نکلنے کی آس...... حریرہ کے اس اقدام نے سارے جذبوں کو.... بے موت مار دیا تھا۔

صبح اسے ہوش آگیا تھا۔ چہرہ مزید زرد ہوگیا۔ صبح سے اکرام احمد اور زرین اس کے پاس تھے۔ ابوبکر ہمت ہی نہیں کرسکا اندر جانے کی اِدھر اُدھر ڈاکٹرز کے ساتھ مصروف رہا...... باہر نکل گیا پھر گھر چلا گیا۔

جب آپ کو علم ہو جائے کہ کوئی آپ کو اتنا ناپسند کرتا ہے کہ زندگی ہی ختم کرنے کے درپے ہو...... تو زندگی سے نکل جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ کسی کو زندگی سے نکالنا، خود اس کی زندگی کی موت تھی۔

مگر دوسرے کو موت سے ہمکنار کرنے سے بہتر تھا کہ انسان خود مر جائے اس کی زندگی سے نکل کر وہ خود بھی تو مر جائے گا۔

کسی کے حاصل ہونے کی آس امید ختم ہو جائے تو پھر زندگی کا حاصل کیا ہوا انتظار...... رائگاں ہی گیا۔

وہ آخری بار ملنے کے لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دکھ سے جانے کون، کون سے رنگ تھے نگاہ اٹھا کر دیکھتی تو ساکت ہو جاتی۔

ابوبکر کے دل میں محبت کی بے بسی.... خواہش کو حریرہ کے اقدام نے توڑ دیا تھا۔

"تم مجھے کہہ دیتیں تم کو میرا ساتھ قبول نہیں حریرہ...... باخدا میں تمہاری زندگی سے نکل جاتا۔ خود کو اتنی اذیت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ صحرا نوردی اپنی قسمت میں لکھ لیتا۔"

اس کا بیڈ تھام کر وہ تھوڑا سا جھکا۔

’’میں تمہیں پانے کے لیے کبھی تمہارے قریب نہیں رہا۔ بے لوث جذبہ تھا جو جانے کب محبت میں بدل گیا۔ میں نے تمہیں لوٹ آنے کی بددعا بھی نہیں دی تھی۔ تم جب واجد کے پاس دکھی تھیں تو بے لوث ہی تمہاری مدد کی تھی۔ ہر بار، ہر بار...... تمہیں پانے کی طلب تو اب پیدا ہوئی۔ باخدا اگر مجھے معلوم ہوتا تو کبھی نہیں میں تمہیں اتنا دکھی کرتا۔‘‘

ابوبکر کی آواز دکھی اور آنسوؤں میں ڈوبی تھی، گمبھیر لہجہ بھیگا ہوا تھا...... دھیرے سے حریرہ نے نگاہ اٹھائی۔ رکے ہوئے آنسو رخساروں پر ڈھلک گئے۔

’’تمہاری خوشی خود سے بڑھ کر عزیز ہے۔ میں غلطی پر تھا تمہیں غلط سمجھتا رہا کہ تم...... کہ تم بھی میرے .... ساتھ...... آئی ایم سوری...... حریرہ......‘‘

ابوبکر خاموش ہوگیا۔ دل کا کرب چہرے پر تھا۔

’’کل میں چلا جاؤں گا کبھی نہ آنے کے لیے۔‘‘

حریرہ کے بے آواز آنسو نکلتے رہے۔

’’اب کیوں رو رہی ہو تمہاری مرضی ہی تو ہے۔‘‘

’’ابوبکر......‘‘ دھیرے سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

’’حریرہ تمہارے قابل نہیں ہے، ایسے بے لوث محبت کرنے والے شخص کے ساتھ کسی پیاری سی لڑکی کو ہونا چاہیے۔‘‘ وہ سسکی۔

’’میں تمہارے قابل نہیں ہوں، میں نے تو دوست بن کر تمہارا استقبال کیا تھا، تمہاری کمی محسوس کی تھی۔ لمحہ، لمحہ اذیت سہی تھی تم میری زندگی میں کتنے داخل ہو، تم تو میری زندگی گزارتے ہو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔‘‘

ایک دوست، دوسرے دوست کو بتا رہی تھی۔

’’مگر تم محبت کے حصول کا ذکر کر رہے تھے، میرے جیسی بدنصیب لڑکی کے نصیب میں کون سی محبت ہوسکتی ہے۔ جس کی زندگی ہی کانٹوں کی سیج ہو...... میں زخم خوردہ ہوں، میں تمہارے قابل کہاں تھی۔ میں تو دوستی کے بندھن سنبھال رہی تھی۔ اور یہ تم شادی کے بندھن باندھ رہے تھے، میں اس لیے تم سے فرار حاصل کرتی تھی۔ میں کم نصیب اتنے اچھے انسان کا نصیب نہیں بن سکتی۔‘‘ اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ ابوبکر کی پوری آنکھیں کھل گئیں۔

’’اس دکھ نے مجھے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کردیا...... دوست کو کھونا نہیں چاہتی۔ محبت تمہاری بن نہیں سکتی، موت ہی بہتر ہے میرے لیے۔‘‘

بہت دیر بعد ابوبکر کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔

’’تم مجھے ناپسند نہیں کرتی ہو؟‘‘ لہجے میں یقین تھا۔

’’اپنے دوست کو کوئی ناپسند کرسکتا ہے بھلا......‘‘

’’بس...... اتنی سی بات تھی...... وہ اس پر پورا جھک گیا۔

’’وعدہ رہا، تم مجھے دوست سمجھنا، بن کر رہنا میں سارے قواعد و ضوابط پورے کروں گا دوستی کے بس...... کبھی، کبھی مجھے میری زوجہ سے ملنے دینا۔‘‘ وہ ہنس کر شوخ ہوا۔

مخمور کن پرفیوم خوشبو دار سرگوشی اور ہاتھوں کا لمس...... حریرہ نے آنکھوں پر سے بازو اٹھایا۔

’’جان جاں تو جو کہے گاؤں میں گیت نئے
اور پھر چاہیے کیا...... سامنے تو جو رہے‘‘

حریرہ کے آنسوؤں کی رفتار تیز ہوگئی، اب وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔

’’نہیں ابوبکر، میں تمہارے قابل نہیں۔‘‘

’’آج ابھی اس کمرے میں نکاح ہوگا ہر حال میں، میں تمہاری غلط فہمیاں دور کردوں گا......‘‘ ہاتھ تھام لیا، آنسو سمیٹے۔

’’نہیں، نہیں، خدا کے لیے نہیں۔‘‘ روتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔ ابوبکر نے ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔ بال سنوارے، آنسو سمیٹے پیشانی چوم لی۔

’’میں تو تمہارے قابل ہوں ناں...... ہم دونوں کیوں بھٹکیں، ہم دونوں کو اللہ نے الگ، الگ راستوں سے گزار کر ایک بنایا ہے۔ پھر کیوں ناشکری کریں۔ ہم دونوں کو خدا نے ایک اور موقع دیا ہے۔ تو پھر کیوں زندگی بے وقوفی کی نذر کریں ہم ’ہماری منزل ایک ہے۔‘‘

’’مگر میں...... میں......‘‘ گھبرا کر سر اٹھایا۔

’’تم...... میں...... میں یعنی بکری نہیں ہو جانِ ابوبکر...... ہوا اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہے، تم دوستی کی محبت نبھانا، میں محبت کی محبت نبھاؤں گا۔ دونوں کا ٹریک الگ ہوگا مگر

منزل ایک...... ایک پاگل لڑکی کے پاگل پنے کی نذر میں اپنا جیون نہیں کرسکتا...... یہ زیست جو ایک بار ملی ہے...... اس راستے سے مجھے بار، بار نہیں گزرنا...... آج ابھی... لمحے، جو چاہو سمیٹ کر گزر جاؤں گا۔‘‘

’’نہیں...... ابوبکر......‘‘

’’اب اپنی نہ کو ہاں میں بدل دو، ورنہ مشرقی لڑکی کی نہ میں بھی ہاں ہوتی ہے۔‘‘ وہ بے حد شوخ ہو رہا تھا۔

’’میں کل سے جل رہا ہوں اپنی آگ میں مگر اب نہیں...... مجھے کہیں نہیں جانا ہر سفر اب تم سے تم تک طے ہوگا۔ اور اس کی منزل میرا فلیٹ ہے۔ خالو، خالہ راضی ہیں، تمہاری صحت کا بھی انتظار نہیں کرنا۔‘‘

دھیرے سے اسے اٹھا کر بٹھایا۔ پانی پلایا، سامنے بیٹھ کر اس کے بالوں کو سمیٹا۔

’’سن...... سنو......‘‘ کچھ کہنا چاہا۔

’’ہاں، صرف میری سنو...... عروسی جوڑا، سرخ ہوگا، میرون نہیں، مجھے ساڑی پسند ہے، پارلر سے ٹائم میں لوں گا، فلیٹ سجانے کا آرڈر دینا ہے اور......‘‘ وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر پھل، پھل رو دی گئی۔

محبت کی پیاسی تھی۔ ابوبکر نے محبت کا سمندر اس کے نام کردیا تھا۔ جیتی زندہ، رومینٹک لڑکی کو واجد نے مار دیا تھا۔ ابوبکر نے محبت کے دیے جلا دیے، محبت کے سارے ساگر اس پر برسا دیے۔ ابوبکر نے اس کے بولنے پر بند باندھ دیے۔ ’’اب اس پیارے سے شخص کو اور دکھ نہیں دے گی۔ روتے، روتے سر اٹھایا۔

’’بس آج جی بھر کر رولو......‘‘ ابوبکر محبت سے گھور رہا تھا۔

’’مجھے تمہارا نام حریرہ...... اپنے نام کے ساتھ جڑا بہت اچھا لگا ہے۔ حریرہ ابوبکر......‘‘ دھیمے سے سرگوشی کی۔ بھیگی آنکھوں سے وہ ایک بار پھر ہنس دی۔

ابوبکر نے ہاتھ بڑھا کر بالوں کی لٹ پیچھے کی۔

’’حد ہوتی ہے بھئی، سال کے بارہ ماہ تو تم اسپتال میں رہتی ہو اور تم کاریڈور میں...... خدا کا خوف کرو شادی کے بعد بھی یہ کام کرنا ہیں۔ خیال کرو کچھ، اسپتال کا کمرا ہی تم لوگوں نے بک کروالیا ہے۔ ابوبکر تمہارا فلیٹ مکمل نہیں ہوا یا کرائے پر دے دیا ہے؟ لڑکی کو راضی کرو، نہیں تو لے اڑو...... سارے کس بل نکل جائیں گے ... خبردار جو تم نے صحرانوردی کی بات کی، ہجرت کریں تمہارے دشمن...... لڑکیاں بہت، حریرہ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔‘‘

ڈاکٹر نیلوفر بولتی ہوئی بے دھڑک اندر آگئیں۔ اندر کے منظر نے ٹون ہی بدل دی۔

’’واہ...... مجھے ڈرا کر تم یہاں زندگی سیٹ کیے بیٹھے ہو میرا خون جل گیا کتنا۔ میرے میاں مجھے دھمکا رہے ہیں خبردار جو پرائی آگ میں کودیں۔ مرد بنو ابوبکر، لے اڑو لڑکی......‘‘

حریرہ کی شرمگیں مسکراہٹ اور ابوبکر کی ہنسی بہت کچھ بتا رہی تھی۔

’’میں بات کرتی ہوں تمہارے خالہ، خالو سے میرے بھائی کی قدر کریں۔ بہت ہوچکا، میرے پاس بھی ٹائم نہیں ہے، پرسوں کلائنٹ آرہی ہے میرے پاس مصروفیت سی مصروفیت ہے، کل جمعہ ہے نکاح پرسوں، ولیمہ...... اتوار کو میری طرف دعوت ہے۔‘‘

سارا پروگرام ڈن کر کے یہ جا، وہ جا......

’’دلہن، دولھا راضی تو کیا کرے گا قاضی...... بعد میں ساری شاپنگ کرتے رہنا، موقع سے فائدہ اٹھاؤ، ایسا نہ ہو پھر رنگ میں بھنگ پڑ جائے۔‘‘ جاتے، جاتے چٹکلے چھوڑ دیے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا...اور مسکرا دیے۔ محبت کے ستارے ان کے گرد روشن ہونے لگے، تنہائی، اکیلا پن اور اداسیاں سب کمرے سے نکل بھاگے۔

ابوبکر نے ہاتھ بڑھایا کچھ جھجک کر حریرہ نے ہاتھ تھام لیا۔

’’میرا یقین ہے ناں......؟‘‘ دھیرے سے جھکا۔

’’خود سے بھی بڑھ کر......‘‘ محبت سے کہا گیا۔

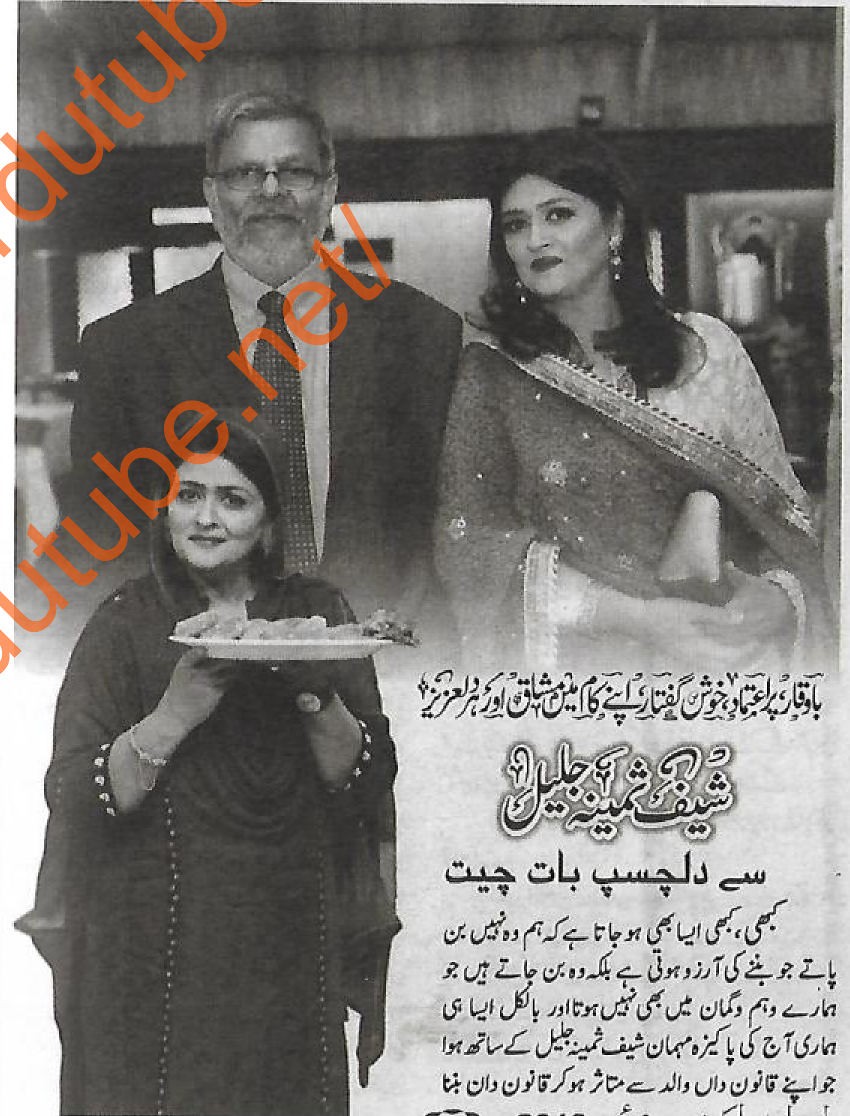
’’اچھا!‘‘ حیرت بھرے استعجاب سے دیکھا۔ اور اس کے شرمیلے انداز پر ہنس دیا۔

قوسِ قزح کے رنگ چہار سو پھیل گئے تھے۔



پاکیزہ کے مہمان

شائستہ زریں



باوقار، پراعتماد، خوش گفتار، اپنے کام میں مشاق اور ہر دلعزیز

شیف ثمینہ جلیل

سے دلچسپ بات چیت

کبھی، کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ ہم وہ نہیں بن پاتے جو بننے کی آرزو ہوتی ہے بلکہ وہ بن جاتے ہیں جو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا اور بالکل ایسا ہی ہماری آج کی پاکیزہ مہمان شیف ثمینہ جلیل کے ساتھ ہوا جو اپنے قانون داں والد سے متاثر ہو کر قانون دان بننا

چاہتی تھیں لیکن شادی کے بندھن میں بندھنے اور پھر اس سے منسلک ذمے داریوں میں گھر کر قانون دان بننے کا خواب تعبیر نہ پا سکا۔ گھریلو امور بالخصوص کھانا پکانے کی مہارت ثمینہ کو اپنی والدہ سے وراثت میں ملی جس کے طفیل خوش ذائقہ کھانے پکا پکا کر ثمینہ اپنے گھر والوں اور احباب سے بہت داد سمیٹ رہی تھیں۔ یقیناً لذیذ پکوان پکا کر اور اپنے گھر کو سلیقے سے چلانے کی بنا پر شیف ثمینہ کو اپنی ماں کی دعائیں ایسی لگیں کہ داد کا سلسلہ دراز ہوتے، ہوتے اہلِ خانہ، خاندان اور دوست احباب سے بڑھ کر ملکی سطح تک پھیل گیا۔ اور اب تو ماشاء اللہ بین الاقوامی سطح تک ثمینہ کے بنائے پکوانوں کو پسند کرنے والے موجود ہیں۔ ان کامیابیوں پر ثمینہ فخر اور خوشی تو محسوس کرتی ہیں لیکن تکبر سے پاک اللہ کی شکر گزاری کے ساتھ...... اور یہی ثمینہ کی شخصیت کا عمدہ اور اعلیٰ رخ ہے۔

آئیں قارئین، ثمینہ جلیل سے اس بارے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کا شمار کیسی بچیوں میں ہوتا تھا؟

ثمینہ جلیل ❖...... شرمیلی سی بچی ہوا کرتی تھی۔ شرارتیں تو بالکل بھی نہیں کیا کرتی تھی۔

پاکیزہ ✧...... بچپن میں آپ کا پسندیدہ کھیل کون سا تھا؟

ثمینہ جلیل ❖...... وہی جو اکثر لڑکیوں کا ہوتا ہے...... یعنی گڑیاں کھیلنا جو میں بہت شوق سے کھیلا کرتی تھی۔

پاکیزہ ✧...... شادی سے پہلے ہی کھانا پکانا آگیا تھا یا سیکھنے کے مراحل میں تھیں؟

ثمینہ جلیل ❖...... امی کو پکاتے دیکھ کر بہت کچھ سیکھ لیا تھا اور پھر جب باقاعدگی سے پکایا تو میرے پکائے ہوئے خوش ذائقہ کھانوں کی تعریفیں بھی بہت زیادہ ہوتی تھیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کا یہ ہنر گھر سے ٹی وی اسکرین تک کیسے پہنچا؟

ثمینہ جلیل ❖...... نادیہ خان شو میں اعلان کیا گیا کہ کوئی ریسیپی بتانے والا چاہیے تو میں نے بھی اپلائی کر دیا اور منتخب ہونے کے بعد وہاں کام کرنا شروع کر دیا۔

پاکیزہ ✧...... کیسا لگتا تھا یوں اسکرین پر سکھاتے ہوئے؟

ثمینہ جلیل ❖...... بہت اچھا۔ یہ بڑا خوشگوار احساس اور تجربہ تھا کہ میں اپنا ہنر اوروں میں منتقل کر رہی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... پھر یہ سلسلہ آگے کیسے بڑھا؟

ثمینہ جلیل ❖...... یہ کام جاری رکھنے کے لیے میں نے مکمل تربیت حاصل کی اور اس طرح سے آج تک کام کر رہی ہوں۔ پیچھے مڑ کر بالکل بھی نہیں دیکھا۔

پاکیزہ ✧...... اس وقت آپ کے بچے عمر کے اس دور میں تھے جب انہیں آپ کی توجہ کی زیادہ ضرورت تھی... کیا حکمت عملی اختیار کی کہ بچے اور گھر بھی متاثر نہ ہو اور شوق کی تکمیل بھی ہوتی رہے؟

ثمینہ جلیل ❖...... بے شک اس وقت میرے بچے چھوٹے تھے لیکن اسے میری خوش قسمتی کہیے مجھے یہ سہولت تھی کہ بچوں کو اسکول بھیج کر چینل پر جاتی تھی۔ اپنا کام کر کے واپس آتی تو گھر اور بچوں کو دیکھنے کے لیے تقریباً پورا دن ہی مل جاتا تھا۔ اس طرح نہ تو میرا گھر خراب ہوا نہ ہی چیزیں اور بچے متاثر ہوئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک تو مجھے وقت بہت اچھا مل گیا تھا گھر پر دینے کے لیے دیگر یہ کہ میں نے اپنے کام اور گھر دونوں میں توازن برقرار رکھنے کے لیے سخت محنت کی اور الحمدللہ اس کے بہترین نتائج بھی میرے حصے میں آئے۔

پاکیزہ ✧...... کھانا پکانے کی ابتدائی تربیت آپ نے کس سے حاصل کی؟

ثمینہ جلیل ❖...... ابتدائی تربیت تو میں نے اپنی والدہ سے ہی حاصل کی جو خاندان بھر میں کھانا پکانے کی بہت ماہر سمجھی جاتی تھیں۔ الحمدللہ ان کے ہاتھ کے کھانے نہ صرف بے حد لذیذ اور خوش شکل ہوتے تھے بلکہ ان کے پیش کرنے کا انداز آنکھوں اور دل کو بہت بھاتا تھا۔

پاکیزہ ✧...... ایک ماہر پکوان اور شیف میں بنیادی فرق کیا ہے؟

ثمینہ جلیل ❖...... کوئی بھی کھانا مسلسل بناتے رہیں

تو مستقل کوشش سے ہاتھ میں صفائی اور مہارت دونوں ہی آجاتی ہیں۔ مزید اچھا بنانے کی کوشش اور تجربے سے ماہر پکوان کہلاتے ہیں۔ جبکہ شیف بننے کے لیے باقاعدہ تربیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ کٹنگ، چوپنگ، مسالوں کی اچھائیاں بُرائیاں سب میں مہارت حاصل کر کے شیف کہلاتے ہیں۔

پاکیزہ✧......کھانا پکانے میں آپ کا خاص امتیاز کیا ہے؟

ثمینہ جلیل ❖......کوکنگ کرتے وقت میری خواہش ہوتی ہے کہ اشیا بہت اچھی ہوں اور وزن کا تناسب بہت صحیح ہونا چاہیے۔ میرینیشن اور گلاوٹ کو پورا وقت دیتی ہوں۔

پاکیزہ✧......کسی بھی کوکنگ چینل پر کام کرنے کے لیے آپ کی اولین ترجیح کیا ہوتی ہے؟

ثمینہ جلیل ❖......کسی بھی چینل پر کوکنگ کرنے کے لیے میں ہمیشہ یہی چاہتی ہوں کہ مجھے ٹائم اچھا ملے تاکہ میں اپنی چیزیں اچھی طرح واضح کرسکوں کیونکہ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ صرف چیز کو پکا کر دکھاؤں بلکہ میں ایک ایک اسٹیپ کو طریقے سے بتانا چاہتی ہوں تاکہ ناظرین جب کوئی چیز بنائیں تو اچھی طرح follow کر کے بنائیں گے تو اچھی بنے گی۔

پاکیزہ✧......کیا اپنے کوکنگ شو میں پکائے جانے والے کھانے کی افادیت بتاتی ہیں؟

ثمینہ جلیل ❖......بالکل! میری پوری کوشش ہوتی ہے جو کچھ بنا رہی ہوں صرف بنا کر ہی نہ دکھاؤں بلکہ اس کی افادیت کے بارے میں بھی بتاؤں کہ کھانا تو سب ہی پکالیتے ہیں لیکن میں یہ بھی بتاتی ہوں کہ ان چیزوں کو بہتر طریقے سے کیسے بنایا جاسکتا ہے اور کس طرح یہ مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔

پاکیزہ✧......اپنے سابقہ شو ''کم خرچ بالانشیں'' کے ذریعے خواتین کی رہنمائی میں کس حد تک کامیاب رہیں؟

ثمینہ جلیل ❖......یقیناً! ''کم خرچ بالانشیں'' میرا بہترین پروگرام تھا۔ جس میں کچھ ایسی چیزیں سکھائی گئی تھیں جو لوگ باہر جا کے کھاتے ہیں لیکن مہنگی ہونے کے سبب باہر جا کر کھانا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں یا کم، کم کھاتے ہیں تو ان چیزوں کو گھر میں بنانا سکھایا تاکہ بچت کے ساتھ گھر بیٹھے یہ چیزیں کھائی جاسکیں اور یہ بہت ہٹ پروگرام تھا۔

پاکیزہ✧......کھانا پکانے کے معاملے میں بالکل اناڑی لڑکیوں کو تربیت دیتے ہوئے کس بات کا خیال رکھنا چاہیے؟

ثمینہ جلیل ❖......سب سے پہلے بنیادی چیزیں سکھانی چاہئیں اس کے ساتھ، ساتھ لڑکیوں کو یہ بھی سمجھاتی ہوں کہ کھانا کوئی سا بھی پکائیں، محبت پیار اور دل سے پکائیں اس سے ایک تو اس میں کوئی دشواری نہیں ہوگی دیگر یہ کہ جب آپ لگن سے پکائیں گی تو اس میں خود بخود ذائقہ آجائے گا۔ (واہ کیا خوب ٹپ دی)

پاکیزہ✧......براہ راست روٹی اور پراٹھے پکانے سکھانے چاہئیں یا پہلے ان کو آٹا گوندھنا آنا چاہیے؟

ثمینہ جلیل ❖......یہ صحیح ہے کہ روٹی بنانے سے پہلے آٹا اچھا گوندھنا آنا چاہیے کہ آٹا اچھا گوندھنا آجائے تو اس سے اچھا پراٹھا بنالیں گی۔ بہت ضروری ہے کہ پہلے بنیادی باتیں سیکھیں لیکن میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ مجھے زیادہ اچھا آٹا گوندھنا نہیں آتا (بالکل میری طرح۔ زریں) لیکن میں اسی آٹے سے اچھی روٹی بنالیتی ہوں۔

پاکیزہ✧......کھانا پکانے میں لذت محض مسالوں کے تناسب سے آتی ہے یا اور کوئی باریکی بھی ہے؟

ثمینہ جلیل ❖......بالکل، کھانا پکاتے ہوئے بنیادی مسالے نمک، مرچ، ہلدی کا تناسب صحیح ہوگا تو چیزیں اچھی بنیں گی اس کے ساتھ ہی دیگر مسالوں کا تناسب بھی بہت اچھا ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ، ساتھ وقت کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر سارے مسالے ایک ساتھ ڈال دیے جائیں گے تو کھانا تو پک جائے گا لیکن وہ لذت نہ آسکے گی جو تناسب اور وقت کا خیال کرنے سے آئے گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جہاں جس مسالے کی ضرورت ہے اسی کے مطابق ڈال کر اپنے کھانے کو خوش ذائقہ بنائیں۔

پاکیزہ✧......پروفیشنلی کھانا پکانے کے دوران کبھی



ندا یاسر کے پروگرام میں شیف ثمینہ جلیل نے بنائیں مزیدار ڈشز

کوئی بدحواسی ہوئی؟

ثمینہ جلیل ❖......اس فیلڈ میں آئے چودہ پندرہ برس ہوگئے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس عرصے میں کسی بھی چینل پر کام کرتے ہوئے کھانا پکانے کے دوران مجھ سے کوئی بدحواسی ہوئی ہو۔ چونکہ چینل پر کھانا پکانے کے دوران میں اپنی تمام تر توجہ اپنے کام پر رکھتی ہوں اس لیے کوئی چیز نہیں بھولتی۔ لیکن گھر میں چونکہ دھیان بیک وقت کئی سمتوں میں سفر کررہا ہوتا ہے اس لیے عموماً ایسی چیزیں ہوجاتی ہیں کہ بہرحال انسان خطا کا پتلا ہے۔

پاکیزہ✧......کیا آپ سمجھتی ہیں کہ کھانا پکانا ایک منافع بخش کاروبار کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے؟

ثمینہ جلیل ❖......بلاشبہ۔ یہ ایک بہترین منافع بخش کاروبار بن گیا ہے۔ اب تو ہوم ڈیلیوری بھی کافی زیادہ ہونے لگی ہے۔

پاکیزہ✧......گھر بیٹھے روزگار کمانے کی خواہشمند خواتین کی رہنمائی کیسے کریں گی؟

ثمینہ جلیل ❖......ایک بات ضرور کہوں گی یہاں پاکیزہ کے توسط سے کہ خواتین اپنا ہنر پہچانیں۔ اپنی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کریں کہ آپ کس کام کو بہتر طریقے سے کرکے اپنا ذریعۂ آمدنی بنا کر اپنے وقت کو بامقصد بناسکتی ہیں۔ اور اس کے لیے بہت زیادہ ذہین ہونا ضروری نہیں بس آپ اپنے پیشن (شوق، ہنر، صلاحیت) کو اپنا پروفیشن بنالیں۔ کیونکہ جو کام دلچسپی اور لگن سے کیا جاتا ہے آپ کے لیے آسان ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی آپ کی وجہ سے مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ضروری نہیں کہ آپ باقاعدہ شیف بنیں۔ آپ اپنی کھانا پکانے کی مہارت سے گھر بیٹھے بھی اپنی آمدنی میں اضافہ کرسکتی ہیں

پاکیزہ✧......کیا پیشہ ورانہ اور تربیت یافتہ شیفس کی بہتات سے روایتی باورچیوں کا کاروبار متاثر ہوا ہے؟

ثمینہ جلیل ❖......بے شک ماہر باورچیوں کے کاروبار پر اثر پڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی نامور شیف کا نام لیا جاتا ہے تو لوگ اس پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ باورچیوں کی اپنی اہمیت ہے۔ وہ اپنے کام کو بہت بہتر طریقے سے کررہے ہیں۔ ان کا بھی سالہا سال کا تجربہ ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ بہترین خدمات۔☆☆

سرانجام دے رہے ہیں۔

پاکیزہ ✧......کھانا پکانے کے ہنر میں مرد زیادہ طاق ہوتے ہیں یا خواتین؟ سبب؟

ثمینہ جلیل ❖...... شائستہ، ہمارے یہاں یہ تصور کرلیا گیا ہے کہ مرد جو بھی کام کریں گے وہ زیادہ بہتر طریقے سے کریں گے۔ بے شک مرد اچھا کام کرتے ہیں۔ مگر خواتین بھی کسی طور مردوں سے کم نہیں وہ جہاز اڑانے سے لے کر گھر کے تمام کام کرتی ہیں بہرحال جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حقیقت ہے کہ مردان کاموں میں زیادہ ماہر ہیں اور خاتون شیف ہونے کے ناتے بھی میں یہی کہوں گی لیکن ساتھ میں یہ بھی کہوں گی کہ خواتین شیف بھی بہت اچھا کام کررہی ہیں۔

پاکیزہ ✧......کبھی سوچا تھا کہ ایک گھریلو خاتون سے شیف بن کر پاکستان کی نامور خواتین میں شمار ہوں گی؟

ثمینہ جلیل ❖......ہرگز نہیں۔ سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں کبھی اس مقام تک بھی پہنچ جاؤں گی۔ یہ سب اللہ کے کرم میرے والدین کی دعاؤں، گھر والوں، سسرال والوں اور میرے شوہر کے تعاون کا نتیجہ ہے......اور مجھے بے حد فخر اور خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں ایک گھریلو خاتون تھی جو آج اپنی خداداد صلاحیت، محنت، کام سے لگن کی بنا پر اس قابل بن گئی۔ بے شک اپنے گھر میں بڑی، بڑی پارٹیز ارینج کرتی تھی۔ اس وقت بھی لوگ بہت سراہتے تھے اور آج جبکہ ماہر پکوان سے شیف بن چکی ہوں تو الحمدللہ آج بھی ستائش کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

پاکیزہ ✧......کچھ عرصہ ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والی میزبان خواتین کے رنگ ڈھنگ میں واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ لیکن عرصۂ دراز سے اسکرین پر دکھائی دینے کے باوجود آپ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کی وجہ آپ کی مستقل مزاجی ہے یا اور کوئی سبب؟

ثمینہ جلیل ❖......میرا جو فطری انداز ہے میں اسی طرح رہنا چاہتی ہوں۔ اسے تبدیل نہیں کرنا چاہتی۔ سادگی مجھے بے حد پسند ہے اگر اس میں پُرکاری بھی ہوجائے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ ہاں آج تک مجھے کسی نے ٹوکا نہیں کہ اتنا سادہ کیوں رہتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......آج آپ جس مقام پر ہیں اس تک پہنچنے میں آپ کے گھر والوں کا کتنا حصہ ہے؟

ثمینہ جلیل ❖......بہت زیادہ اور جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ امی جانی سے پہلے بہت کچھ سکھا گئی تھیں۔ شادی کے وقت میں کھانا پکانا جانتی ضرور تھی لیکن ماہر نہیں تھی۔ نارمل سے ہٹ کر کھانے پکانے مجھے ہمیشہ بہت اچھے لگتے تھے۔ شادی کے بعد میں نے کھانا پکانے میں بہت مہارت حاصل کرلی۔ چینل پر آنے کے لیے سسر نے بہت حوصلہ افزائی کی، شوہر کا ساتھ تو تھا ہی۔ میرے بچوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر میرے پکائے کھانوں کی تعریف کرتے ہیں تو جہاں کمی محسوس ہو اس پر تنقید بھی کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......ماں بننے کے اولین پل میں آپ کے کیا احساسات تھے؟

ثمینہ جلیل ❖......بہت ہی خوب صورت احساس جو بیان کروں تو شاید حق ادا نہ کرسکوں کہ یہ وہ رشتہ ہے جو اس میں بندھتا ہے وہی محسوس کرسکتا ہے۔

پاکیزہ ✧......آپ نے اپنی اولاد کی تربیت میں اپنی امی کے کون سے اصول کو مدِ نظر رکھا؟

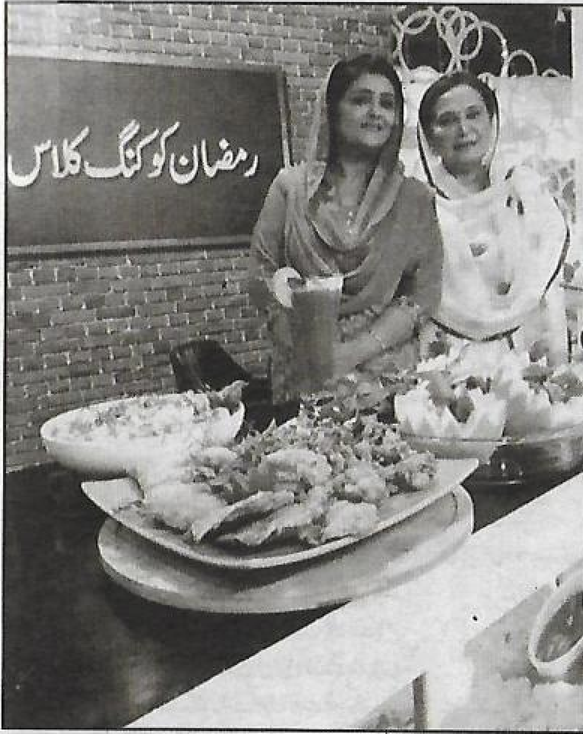
ثمینہ جلیل ❖......اپنی ماں کے اصول "اولاد کو کھلاؤ سونے کا نوالہ دیکھو شیر کی نگاہ سے" پر سختی سے عمل کیا۔

پاکیزہ ✧......کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کی امی اور آپ کے مقابلے میں آج کی ماں کو اولاد کی تربیت میں زیادہ مشکلات اور چیلنجز کا سامنا ہے؟ اگر ہے تو کیسے؟

ثمینہ جلیل ❖......بے شک آج کل ماؤں کو چیلنجز کا زیادہ سامنا ہے کیونکہ مقابلہ کافی سخت ہے میڈیا نے بچوں کو بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ جس کی بنا پر آج کی ماؤں کو ان کی تربیت میں بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ تاکہ بچوں کو زیادہ بہتر بنا سکیں۔

پاکیزہ ✧......اولاد کی تربیت میں ماں کی اولین ذمے داری کون سی ہے؟ آپ نے اپنی یہ ذمے داری کیسے نباہی؟

ثمینہ جلیل ❖......بچوں کی تعلیم پر توجہ دینا اور



بہت خوب' شیف ناہید انصاری کے ساتھ شیف ثمینہ جلیل (کیا کچھ بنا ڈالا)

الحمدللہ میں اس میں کامیاب رہی۔ میرا ایک بیٹا ڈاکٹر ہے۔ ایک بیٹا بزنس کرتا ہے۔ میڈیا سے اس کا تعلق ہے۔ ماشاءاللہ بیٹی نے فائن آرٹس میں ماسٹرز کیا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ہی تربیت کی بھی اہمیت ہے خاص طور پر بچوں سے متعلق رشتوں کی سمجھ دینا بہت ضروری ہے جو میں نے دی اور وہ اس کا احترام بھی کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......اولاد کی تربیت میں بیٹے اور بیٹی میں کوئی تفریق کی؟

ثمینہ جلیل ❖......دونوں کی تربیت میں بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ بیٹی کی تربیت میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ اسے دوسرے گھر جا کر کیسے گھر بسانا اور تمام گھر والوں کو اپنانا ہوتا ہے کہ سسرال میں بیٹی کا رویہ اس کی ماں کی تربیت کا گواہ ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧......اکلوتی بیٹی کی تربیت میں آپ کا لاڈ پیار تو حائل نہیں ہوا؟

ثمینہ جلیل ❖......ہرگز نہیں۔ وہ مجھے بے حد عزیز ہے لیکن اس کی تربیت میں، میں نے بے جا لاڈ پیار کو بھٹکنے بھی نہیں دیا۔ لاڈ کی جگہ لاڈ اور سختی کی جگہ سختی برتی۔ اس میں اسی کی بہتری تھی میری ہمیشہ سے یہی خواہش رہی کہ میری بیٹی تمام کاموں میں ماہر ہو۔ الحمدللہ اس کو بہت سارے کام آتے ہیں۔ ماشاءاللہ سے وہ اپنے گھر کو بہت عمدگی سے چلا رہی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں اور وہ ان کی تربیت بھی بہت اچھے طریقے سے کر رہی ہے۔ ہاں جہاں میری رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتی ہے وہاں مجھ سے پوچھ کر کام کرتی ہے۔ ہر ماں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی بیٹی کو اپنے انداز میں ڈھالے اور میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہی۔ یوں بھی مجھے لگتا ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ، ساتھ بیٹیاں خودبخود اپنی ماں کی طرح ہوتی جاتی ہیں۔

پاکیزہ ✧......بیٹیوں کی گھریلو تربیت میں محض کھانا پکانا ہی کافی ہے یا پھر ان کو انتظامی امور اور گھریلو بجٹ بنانے کی تربیت بھی دینی چاہیے؟

ثمینہ جلیل ❖......لڑکیوں کو کھانا پکانا تو خیر آنا ہی چاہیے کہ یہ چینی کہاوت "شوہر کے دل کا راستہ معدے سے ہوکر گزرتا ہے" بالکل درست ہے اور آپ کی سوچ بھی بجا کہ کوکنگ کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کو دیگر گھریلو امور میں بھی طاق ہونا چاہیے۔ کیونکہ اسی کے بل بوتے پر وہ کامیابی سے گھر چلا سکتی ہیں۔ جب خود کام آتا ہوگا تو نوکروں سے بھی

کام کرواسکتی ہیں۔اس لیے تعلیم ختم ہوتے ہی لڑکیوں کو گھر کے تمام کام جن میں گھریلو انتظامی امور، گھر کا بجٹ، رشتے داریوں کو نباہنا وغیرہ بخوبی آنے چاہئیں۔

پاکیزہ ✧......آپ خود شادی سے پہلے ان امور میں کتنی ماہر تھیں؟

ثمینہ جلیل ❖...... بالکل بھی طاق نہیں تھی۔سارے کاموں کا شوق ضرور تھا لیکن کیونکہ میں اس وقت اپنی تعلیم مکمل کر رہی تھی اس لیے اس جانب عملاً توجہ نہیں دی۔اور تعلیم مکمل ہوتے ہی شادی بھی ہوگئی تھی لیکن چونکہ امی کو یہ سب کام کرتے دیکھتی تھی تو چیزیں تو سب ذہن میں تھیں اس لیے بعد میں یہ تمام چیزیں سیکھیں اور گھر داری میں کامیاب رہی۔

پاکیزہ ✧......شوہر صاحب گھر کے کاموں میں آپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں یا آپ کا کام بڑھاتے ہیں؟

ثمینہ جلیل ❖......جب ہمارے بچے چھوٹے تھے تو وہ میرے کاموں میں میرا بہت ساتھ دیتے تھے۔ایک بچے کو تو ہمیشہ خود ہی سنبھالتے تھے۔بچوں کے سارے کام کرتے تھے۔بچے بڑے ہوگئے ان کی اپنی ذمّے داریاں بڑھتی گئیں تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔اب تھوڑا بہت غصہ کرنے لگے ہیں جو مجھے بالکل برا نہیں لگتا۔ہاں ہاتھ بٹانے کے ساتھ ساتھ گھر پھیلانے میں بھی ماشاء اللہ بہت ماہر ہیں۔

پاکیزہ ✧......گھر میں کس کے فیصلے کو حتمی سمجھا جاتا ہے؟

ثمینہ جلیل ❖...... حتمی فیصلہ تو باہمی افہام و تفہیم سے ہی ہوتا ہے۔جہاں میرے فیصلے کی ضرورت ہوتی ہے میں کرلیتی ہوں۔جو فیصلہ میرے شوہر کو کرنا ہوتا ہے وہ کر لیتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......آپ کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے یا لچک کی گنجائش ہوتی ہے؟

ثمینہ جلیل ❖......ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں اٹل فیصلہ کروں میرے فیصلے میں لچک ہوتی ہے۔

پاکیزہ ✧......شوہر کی رضا کے بغیر کوئی بھی عورت اس مقام تک نہیں پہنچتی۔کبھی ان کو گلہ تو نہیں ہوا کہ آپ کے پاس ان کے لیے اب وقت ہی نہیں؟

ثمینہ جلیل ❖......آج تک میرے شوہر نے مجھ سے وقت نہ دینے کی کبھی شکایت نہیں کی اور نہ ہی اعتراض کیا۔ہاں خود مجھے اس کا احساس ہوتا ہے اور جب میں ان سے کہتی ہوں تو وہ کہتے ہیں۔''جب تمہیں کام کرنا ہے تو پوری توجہ سے کرو''۔الحمدللہ ہمارے تعلقات بہت اچھے ہیں۔

پاکیزہ ✧......گھر کی زیبائش اور آرائش میں آپ کا کتنا حصہ ہے؟

ثمینہ جلیل ❖......گھر کی زیبائش کا سارا کام میں خود کرتی ہوں کہ مجھے گھر سجانے کا بہت شوق ہے۔ہاں اس میں میرے شوہر میرا بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......کیا اکثر خواتین کی طرح خریداری آپ کی بھی کمزوری ہے؟

ثمینہ جلیل ❖......بالکل جناب،خریداری کا تو مجھے بہت شوق ہے۔گھر کی جتنی چیزیں ہیں کراکری اور آرائش کی چیزیں وہ سب بہت شوق سے خریدتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......اپنی کمائی کے بعد میاں سے فرمائشوں کا تناسب کچھ کم ہوا؟

ثمینہ جلیل ❖......میاں سے فرمائش کا اپنا لطف ہے۔اب بھی ان سے فرمائش کرتی ہوں اور وہ اسے بہت اچھے سے پورا کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......خود کمانے والی عورت زیادہ کفایت شعار ہوتی ہے یا گھر کے مردوں کی کمائی خرچ کرنے والی عورت؟ آپ کو دونوں طرح کا تجربہ ہے کیا کہیں گی؟

ثمینہ جلیل ❖......میرے شوہر کو ایسا لگتا ہے کہ جب سے میں نے کمانا شروع کیا ہے تھوڑی سی کنجوس ہوگئی ہوں پیسے کو سنبھال،سنبھال کر رکھتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......ازدواجی زندگی میں کبھی ایسا پل یا دور آیا جب آپ کو کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا؟ تب آپ نے کیا حکمت عملی اختیار کی؟

ثمینہ جلیل ❖......ایک نہیں کئی مرتبہ میرے ساتھ ایسا ہوا۔ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میرے چھوٹے بیٹے کو ڈینگی ہوگیا۔وہ اسپتال میں داخل تھا۔رمضان کا مہینہ تھا اور میں چھٹی بھی نہیں کرسکتی تھی۔اسپتال سے شو پر جاتی تھی شو کے فوراً بعد اسپتال جاتی۔وہ وقت میرے لیے بہت کٹھن



تھا۔جو میں نے بہت مشکل سے گزارہ تھا۔بہر حال دورانِ ملازمت آزمائش کی ایسی گھڑیاں آتی رہتی ہیں۔یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ۔اس نے میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔الحمدللہ!

پاکیزہ ✧......کہا جاتا ہے کہ عورت ایک پہیلی ہے آپ کیا کہتی ہیں؟

ثمینہ جلیل ❖......بالکل اتفاق نہیں کروں گی آپ کی اس بات سے۔عورت کھلی کتاب کے مانند ہے جب ہی تو خود سے وابستہ ہر رشتے خاص طور پر ماں،بہن،بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے بھرپور محبت،ساتھ اور اعتماد دیتے اپنے عملی رویّوں سے اس تعلق کا اظہار کرتی اور نباہتی نظر آتی ہے۔ایسے میں عورت کو پہیلی کہنا ناانصافی ہے۔

پاکیزہ ✧......اگر ایک شعبۂ وزارتِ نسواں کا ہو اور آپ کو وزارت مل جائے تو خواتین کی فلاح کے لیے آپ کے ترجیحی اقدامات کیا ہوں گے؟

ثمینہ جلیل ❖......میں یہ پیشکش قبول کرنے سے قطعاً انکار کردوں گی۔کیونکہ میں ایسی کوئی ذمّے داری اپنے سر لینا نہیں چاہتی۔میں چاہتی ہوں کہ آزاد رہوں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کسی بھی معاملے میں کسی خاتون نے مجھ سے مشورہ لیا تو ان کو مایوسی نہیں ہوئی لیکن وزارتِ نسواں بہت بڑی ذمّے داری ہے۔اس کے لیے بہت وقت اور دماغ لگانا پڑتا ہے جو میرے لیے ممکن نہیں۔

پاکیزہ ✧......پسندیدہ رشتہ، رنگ، موسم، وقت، فنکار،شیف،ڈش،تہوار،کھیل کون سے ہیں؟

ثمینہ جلیل ❖......ماں بیٹی کا کہ اس سے زیادہ خوب صورت اور بہترین رشتہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا،سیاہ رنگ پسند ہے،سردیوں کا موسم زیادہ اچھا لگتا ہے،صبح کا وقت بہت خوب صورت لگتا ہے، معین اختر صاحب اور بشریٰ انصاری جن کے ساتھ میں نے ایک کوکنگ شو میں کام کیا تھا محض فنکار کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ بحیثیت انسان بھی بشریٰ مجھے بہت پسند ہیں۔عید کا میں خاص اہتمام کرتی ہوں عید پر مہندی لگانا،اپنے آپ کو سنوارنا،گھر سجانا،بہترین پکوان پکانا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔جس چینل پر میں کام کر رہی ہوں وہاں سب ہی شیف بہت اچھے ہیں لیکن سب سے زیادہ میں شیف محبوب کی تعریف کرنا چاہوں گی کہ وہ مجھے بہت زیادہ پسند ہیں۔کھانا میں سادہ اور کم مرچ مسالے والا کھانا پسند کرتی ہوں لیکن نہاری مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔کھیلوں سے دلچسپی نہیں لیکن کرکٹ کا کھیل آخری لمحات میں دیکھنا پسند کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... رمضان کے لیے خواتین ایسا کیا طریقہ وضع کریں کہ ان کو عبادت کا وقت بھی مل جائے اور وہ وقت پر افطاری بھی تیار کرسکیں؟

ثمینہ جلیل ❖...... ماہ رمضان سے پہلے ہی منصوبہ بندی کرلیں کہ سارا رمضان ان کو کیا کرنا ہے بہتر یہی ہے کہ تمام باتیں ڈائری میں نوٹ کرلیں کہ سحری و افطاری میں کب کیا چیزیں بنانی ہیں۔رول،سموسے اور کباب بنا کر اور چنے ابال کر فریز کرلیں۔اس طرح بہت سے کام ہو جائیں گے اور عبادت کا وقت بھی مل جائے گا جو رمضان کا خاص عمل ہے۔

پاکیزہ✧......آپ کی پسندیدہ سحری و افطاری کون سی ہے؟

ثمینہ جلیل ❖......سحری میں میری کوشش ہوتی ہے کہ دلیا کھاؤں کیونکہ دلیا کھانے سے سارا دن بہت اچھا گزرتا ہے۔افطاری میں بہت سادہ پسند کرتی ہوں کہ سادہ افطار کھانے سے طبیعت میں بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا اور عبادت بھی سکون سے ہوجاتی ہے۔

پاکیزہ✧......اب تک ملنے والے اعزازات کے بارے میں بتایئے؟

ثمینہ جلیل ❖......جہاں تک اعزازات ملنے کی بات ہے۔مجھے کئی جگہوں سے کافی اعزازات ملے،شیلڈز ملیں......ستائشی اور حوصلہ افزائی کے لیٹرز ملے،بہت ساری چیزیں ملیں لیکن میرے لیے سب سے بڑا اعزاز میرے دیکھنے والے ہیں جو مجھے دیکھتے ہیں،پسند کرتے ہیں،نہ صرف میری تعریف اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ جہاں میری غلطی ہوتی ہے اس کی نشاندہی بھی کرتے ہیں تو میرے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہوگا بھلا!

پاکیزہ✧......ہمارا ماہنامہ پاکیزہ کیسا رسالہ ہے؟

ثمینہ جلیل ❖......بہت عمدہ۔ایک زمانے میں،میں بہت شوق سے پاکیزہ پڑھا کرتی تھی لیکن کچھ عرصے سے وقت کی کمی کی وجہ سے نہیں پڑھ پاتی لیکن اب بھی جہاں بھی پاکیزہ دیکھتی ہوں تو ورق گردانی ضرور کرتی ہوں۔

پاکیزہ✧......ہماری پاکیزہ بہنوں کے لیے کوئی پیغام؟

ثمینہ جلیل ❖......تمام بہنوں سے یہی گزارش ہے کہ جو کام آپ کرنا چاہیں کرسکتی ہیں۔کوئی کام ناممکن نہیں۔آپ کا خلوص،پیار اور محنت شامل ہونی چاہیے اور سب سے بڑی بات اگر گھر والوں کا تعاون حاصل ہے تو خواتین کبھی کسی بھی موقع پر مردوں سے پیچھے نہیں ہٹیں گی۔

پاکیزہ✧......سحری و افطاری کی ایک،ایک ترکیب اگر عنایت کردیں تو؟

ثمینہ جلیل ❖......ہاں ضرور......

دہی پاپڑی چاٹ

اشیا❁پاپڑی،دو کپ۔ابلے آلو،دو کپ۔چاٹ مسالا،ایک کھانے کا چمچ۔دہی،دو کپ۔نمک،حسب ضرورت۔چینی،ایک کھانے کا چمچ۔کھٹی چٹنی،چار کھانے کے چمچ۔میٹھی چٹنی،چار کھانے کے چمچ۔باریک سیو،آدھا کپ۔باریک کٹا ہرا دھنیا،ہری مرچ۔پیاز،حسب ضرورت۔ٹماٹر باریک کٹا،ایک۔

ترکیب❁ابلے آلو کیوب کٹ کرلیں پھر اسی میں چاٹ مسالا کھٹی چٹنی ملالیں اب ڈش میں ابلے آلو رکھیں پھر اس پر باریک کٹا ہوا ہرا دھنیا،ہری مرچ،ٹماٹر ڈالیں پھر اس پر پاپڑی کو چورا کرکے ڈالیں۔دہی میں نمک،چینی ڈال کر خوب پھینٹ لیں پھر پاپڑی پر پھیلا دیں پھر سے باریک کٹا ہوا دھنیا،ہری مرچ،ٹماٹر پیاز ڈال دیں آخر میں باریک سیو،چاٹ مسالا اور میٹھی چٹنی سے گارنش کریں۔

کالی مرچ قیمہ(سحری کے لیے)

اشیا❁چکن کا قیمہ،آدھا کلو۔دہی تین سے چار کپ۔باریک کٹی پیاز،ایک بڑی۔انڈے،دو عدد۔ادرک،لہسن کا پیسٹ،ایک چمچ۔زیرہ پاؤڈر ایک چمچ۔نمک،حسب ذائقہ۔ہرا دھنیا گارنش کے لیے۔کٹی کالی مرچ،ڈیڑھ چمچ۔تیل چار چمچ،مکھن دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب❁تیل اور مکھن،گرم کرلیں پیاز فرائی کریں پھر اس میں قیمہ،ادرک،لہسن کا پیسٹ،نمک ڈال کر بھون لیں۔ساتھ ہی دہی بھی شامل کریں اور قیمہ گل جائے تو اس میں کالی مرچ،زیرہ پاؤڈر اور انڈے پھینٹ کر اچھی طرح مکس کریں۔اب دم پر رکھیں،ہرا دھنیا ڈال کر پراٹھے کے ساتھ پیش کریں۔

Peach cobbler slice

اشیا❁آڑو،چار سے پانچ۔چینی،چھ کھانے کے چمچ۔دہی،ایک کپ۔دودھ ایک کپ۔جائفل پسی،ایک چٹکی۔ونیلا کوکیز،چار سے پانچ۔برف

تمام چیزوں کو بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کرلیں اور افطار یا سحر دونوں میں نوش فرمائیں۔

☆☆☆

سنگ،سنگ چلیں پاکیزہ کے

قاری بہنیں

وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں ہے......کبھی معلوم ہوتا ہے یہ پہیا رک گیا ہے اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تیز بہت تیز گھومتا چلا جارہا ہے۔مزے کی بات یہ ہے کہ اس کا گھومنا سب کو اپنے،اپنے حساب سے کم یا زیادہ لگا کرتا ہے۔انسانی زندگی کے پانچ دور بچپن،نوعمری،جوانی،ادھیڑ عمری اور بڑھاپا ویسے عام طور پر تو لوگ چار دور ہی شمار کرتے ہیں خیر جانے دیجیے۔ہمیں تو اپنے پاکیزہ ساتھیوں سے ان کا بچپن،نوعمری،جوانی اور ادھیڑ عمری کے تجربات،واقعات،مشاہدات سننے ہیں تو پھر آپ بھی تیار ہوجائیں۔خصوصیت سے وہ تمام بہنیں جو اوّل دنوں سے ماہنامہ پاکیزہ کے ساتھ ہیں اس سلسلے میں ضرور حصہ لیں اور نئے قارئین بھی اپنی رائے سے آگاہ کریں۔اگر پرانا ترین رسالہ ابھی تک موجود ہے تو اس کے سرورق کی واضح تصویر بھی بھیج سکتی ہیں۔اس کے لیے یہ سوالات مرتب کیے ہیں۔

1۔ماہنامہ پاکیزہ سے تعارف کی مختصر کہانی اپنے الفاظ میں......؟

2۔اس پورے عرصے میں پانچ ایسی نمایاں باتیں جو پاکیزہ سے ناتا جوڑے رہیں۔مثلاً کہانیاں،سلسلے،مصنفات یا کچھ اور......؟

3۔ماہنامہ پاکیزہ کس طرح آپ کا دوست،رہنما اور ناصح ثابت ہوا؟

☆فریدہ افتخار...... اسلام آباد

1-سن 2000 یا 2001 میں شمیم فضل خالق کی مہمان بن کر ان کے ہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔وہیں انہوں نے پاکیزہ میرے ہاتھ میں تھمایا۔پہلی بار اس رسالے سے آشنائی یا شناسائی ان کا افسانہ محبتوں کا قرض پڑھ کر ہوئی......بس اس کے بعد سے پاکیزہ ہمارا دوست بن گیا۔باقاعدگی سے پڑھنے لگے۔خاص طور پر بہنوں کی محفل،انجم انصار کے چٹکلے انجم انصار کی شخصیت نے وہ سحر پھونکا کہ بن دیکھے ان کی مداح بن گئی۔ان کا کمال یہ تھا کہ فون پر آواز سن کر پہچان جاتیں۔رسالہ ہاتھ میں آتے ہی بہنوں کی محفل میں کود پڑتے اور اس طرح تمام مصنفات قاری بہنوں تبصرہ نگاروں سے غائبانہ تعارف رہا۔



جواب 2۔محترمہ عذرا رسول صاحبہ نے اپنی خوب صورت شخصیت سے سب کو مسحور کیا ہوا ہے بن دیکھے ان کی فین ہوں۔ان کے سر پر معراج رسول صاحب کا سایہ سلامت رہے۔(آمین)

اس وقت یہ رسالہ بام عروج پر ہے۔(ماشاءاللہ)......سارے سلسلے لاجواب ہیں،رسالے کا آغاز اداریے میں جن خوب صورت الفاظ و انداز سے کیا جاتا ہے اس کے اندر جہاں معنی چھپا ہوتا ہے۔بس ایک تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔جب ساری محفلیں،پارٹی کراچی والے لوٹ لے جاتے ہیں یعنی ہم ترستے رہ گئے وہ مسکرا کر چل دیے۔انجم انصار نے اسلام آباد کے لیے وعدہ تو کیا تھا مگر......کبھی تو اسلام آباد کو بھی رونق بخشیں۔یہاں کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہاں ہم رہتے ہیں،رفاقت جاوید صاحبہ کے علاوہ شمیم فضل خالق،عطیہ ہدایت اللہ کو لانا ہمارا ذمہ ہے۔ہم دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوں گے۔

جواب 3:پاکیزہ ایک دوست ہے رہنما اور ناصح

بھی کہ اس کی روشنی نئی نسل کی بچیوں کو راہِ راست پر رہنے کی راہ دکھاتی ہے۔ دوسروں کے دکھ درد کو جاننے ...... بانٹنے میں مدد اور اپنی زندگی کے مدو جزر کو رضائے الٰہی جان کر صبر، شکر کی نصیحت ...... بھلا کر بھلا ہوگا ...... اپنے لیے تو سب جیتے ہیں دوسروں کے لیے جیا جائے تو کیا بات ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّو بیاں

دعا ہے کہ اس رسالے کے کرتا دھرتا کو صحت کاملہ عذرا رسول صاحبہ کو خوشیاں اور دوسرے وابستہ لوگوں کو صحت، زندگی و تندرستی سے نوازے میرے اللہ پاک، دعاؤں میں ایک دوسرے کو یاد رکھیں۔

☆آسیہ عامر......کراچی

جواب 1۔ بچپن کی سہیلی سے مانگ کر کبھی کبھار پڑھا کرتی تھی لیکن باقاعدہ شادی کے بعد پڑھنا شروع کیا۔

جواب 2۔ کچھ کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں جیسے نایاب جیلانی کا ترک وفا...... پاکیزہ کی سبھی مصنفات بہت اچھا لکھتی ہیں۔ انجم آنٹی کا جلترنگ پسند ہے۔ پاکیزہ پڑھ کر ایسا لگتا اُن سے مل رہی ہوں۔

جواب 3۔ اگر کبھی میں پریشان ہوتی ہوں تو پاکیزہ پڑھنے لگ جاتی ہوں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کہانی کی رائٹر نے ایسی باتیں لکھی ہوتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے کہ مجھے سکون مل جاتا ہے۔ پاکیزہ میری نیند ہے مجھے پاکیزہ پڑھے بغیر نیند نہیں آتی اگر کبھی بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں تو پاکیزہ ہاتھ میں پکڑ کر سو جاتی ہوں۔

☆حمیرا وحید......واہ کینٹ

جواب: مجھے بچپن ہی سے کہانیاں پڑھنے اور سننے اور لکھنے کا شوق رہا ہے۔ میں جب بھی بازار شاپنگ کے لیے جاتی ہوں تو بک اسٹال پر سجے ہوئے خوب صورت رسائل پر ہمیشہ میری نظر رہتی تھی۔ آج سے تقریباً پانچ برس پہلے میں عید کی خریداری کے لیے بازار گئی تو جہاں سے میں نے عید کارڈز اور چوڑیاں وغیرہ خریدیں وہاں پر ایک اسٹال پر خوب صورت چہروں والی ماڈلز کی تصویروں سے رسائل کے سرورق سجے ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ خوب صورت پاکیزہ کا سرورق دیکھا۔ میں رسالہ خرید کر گھر لے آئی۔ جوں، جوں میں نے رسالے کا مطالعہ کیا مجھے اس قدر پسند آیا کہ اس کے بعد جب تک میں پاکیزہ کا نیا شمارہ نہ پڑھ لوں مجھے چین نہیں آتا۔

جواب 2۔ ویسے تو پاکیزہ کے تمام سلسلے ہی بہت خوب صورت ہیں لیکن جو چیزیں اس سے ناتا جوڑنے کا باعث رہیں ان میں سب سے نمایاں درج ذیل پانچ چیزیں ہیں۔

1۔ روحانی مشورے جن سے زندگی کے بہت سے مسائل سنتِ رسول کی مدد سے حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ 2۔ خوب صورت کہانیاں جن کو پڑھ کر معاشرے کے اتار چڑھاؤ کا پتا چلتا ہے۔ 3۔ خوب صورت اشعار اور منتخب غزلیں، شاعری کے دلدادوں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ 4۔ بہنوں کی محفل جس میں شامل ہو کر گھر کا ماحول محسوس ہوتا ہے۔ 5۔ انٹرویو جنہیں پڑھ کر مختلف شخصیات کے بارے میں جاننے کا موقع ملتا ہے اور ان کی زندگی کے تجربات سے بہت رہنمائی ملتی ہے۔

جواب 3۔ پاکیزہ ہمارا بہترین دوست ہے ہماری تنہائی کا بہترین ساتھی ہے جو ہمیں بالکل بور نہیں ہونے دیتا۔ اس میں نہایت سبق آموز سلسلے ہیں جن سے ہمیں رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ خوش ذائقہ کھانے کی ترکیبیں ہوتی ہیں، جن کو اپنے کچن میں استعمال کر کے لذیذ کھانے تیار کرنے میں مدد ملتی ہے۔ بہت سی چیزیں اس میں ایسی شامل ہوتی ہیں جو ہمارے لیے سبق آموز ہیں، اس طرح پاکیزہ ہمارا دوست، رہنما اور ناصح ہے۔

☆فرخندہ جعفری......گجرات

جواب 1۔ میں پاکیزہ رسالہ تقریباً 20 سال سے پڑھ رہی ہوں مگر آج تک کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ ہر وقت پاکیزہ رسالے میں کیوں لگی رہتی ہیں، کبھی تکیے کے نیچے کبھی کرسی پر بیٹھ کر کبھی کھانا پکاتے وقت، ہر وقت آپ کے ہاتھ میں یہ رسالہ کیوں ہوتا ہے؟ مگر آج نزہت اصغر صاحبہ نے اس کے تعارف کی وجہ پوچھی ہے تو بتائے دیتی ہوں اور پوچھنے کا شکریہ بھی ادا کرتی ہوں، جب ہر قسم کے رسالے اور ناول پڑھنے کی شوقین تھی جو رسالہ نظر آیا پڑھنے بیٹھ گئی۔ اسکول کے دور میں بچوں کا اخبار ہو یا کوئی کہانی ہو ضرور پڑھتی تھی۔ ایک دن میں اپنی امی جان کے ساتھ بازار گئی، رسالوں کی سیل لگی ہوئی تھی مختلف رسالے دیکھے،



اچانک میری نظر ایک ٹائٹل پر آ کر رک گئی تھی لکھا تھا ماہنامہ پاکیزہ گھر کے ہر فرد کے لیے...... بیس روپے میں رسالہ خریدا اور گھر آتے ہی سب سے پہلے پڑھنا شروع کیا۔ کہانیاں بہت اچھی اور روز مرہ کے عین مطابق، کھانے کی ترکیبیں، زندگی گزارنے کے ڈھنگ...... ویسے وہ آج کے پاکیزہ رسالے سے بہت مختلف ہوا کرتا تھا اس وقت کی رائٹرز بھی کوئی نیگیٹو پوائنٹ نہیں لکھتی تھیں۔ اگرچہ یہ رسالہ آج بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ آج تک میری الماری پاکیزہ رسالے سے بھری ہوئی ہے اب پاکیزہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس میں جتنا اچھا مواد ڈالا جائے گا یہ اتنی ہی ترقی کرے گا اور پڑھنے والوں کے ذہن چھو لے گا۔

جواب 2۔ اس رسالے میں صرف پانچ ایسی نمایاں باتیں تو نہیں ہیں جس کی وجہ سے اتنی مدت سے یہ رسالہ پڑھا جارہا ہے، اس میں تو سو فیصد باتیں ایسی ہیں جس کی وجہ سے پاکیزہ سے ناتا جڑا ہوا ہے۔ کہانیاں حقیقت کے قریب تر ہوتی ہیں، ہر کوئی سمجھتا ہے کہ یہ میری ہی کہانی ہے جس سے آدھے دکھ دور ہو جاتے ہیں اور زمانے کے ساتھ چلنے کا ڈھنگ آجاتا ہے۔ سلسلے وار کہانی بھی وقت کے ساتھ، ساتھ آہستہ، آہستہ چلتی رہتی ہیں۔ ہماری پیاری، قابل ادب مصنفات اگر اپنی جان مار کر اتنی محنت اور لگن سے کہانیاں پاکیزہ میں نہیں ڈالیں گی تو رسالہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ یہ سب اچھی رائٹرز کا کمال ہے۔

جواب 3۔ ماہنامہ پاکیزہ میرا بہت اچھا دوست رہنما اور ناصح اس لیے ثابت ہوا کہ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ صبر کرنا سیکھا، اچھا بولنا سیکھا، زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھا...... جب دل پریشان ہوا تو اس نے مرہم کا کام کیا، بیکار وقت گزارنے کے بجائے اللہ اور اس کے نور کو پڑھا۔ شمع ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ اچھی اور معیاری کہانیاں پڑھیں۔ اپنی خوب صورت رائٹرز کی پیاری، پیاری تصاویر دیکھیں، دل خوش ہو گیا۔ اتنا کچھ ایک دوست نہیں دے سکتا۔ جتنا ماہنامہ پاکیزہ دیتا ہے اور ہر ماہ ایک اچھے دوست کے طرح اس کا انتظار رہتا ہے۔

☆ایڈوو کیٹ سعدیہ ہما شیخ...... سرگودھا

جواب 1۔ بہت چھوٹی تھی اسکول میں جب چھپ، چھپ کر پاکیزہ سے تعارف کیا اس وقت پاکیزہ بڑا اکلرڈ ہوتا تھا اور قارئین کے انٹرویو کا رنگین سلسلہ تھا جس نے بہت اٹریکٹ کیا بس پھر کیا اپنے تعارف کے ساتھ تصویر بھیج دی اور فوراً لگ گئی۔ اب دل چاہے سب کو دکھاؤں مگر کیسے دکھاتی چوری چھپے کی ملاقاتیں عیاں ہو جاتیں پھر ماما کو بتایا تو انہوں نے بہت تعریف کی اور ڈانٹ نہیں پڑی کیونکہ اسٹڈیز میں مابدولت ٹاپ وتاپ تھے۔ شمارے میں اپنی تصویروں کی تعریفیں سن کر ہم تو لگے ہواؤں میں اڑنے اور خود کو پاکیزہ کے ٹائٹل پہ دیکھنے لگے اور انجم آنٹی کو فون کھڑکا دیا انہوں نے کہا تم واقعی بہت خوب صورت ہو مگر میٹرک تو کر لو ابھی بہت چھوٹی ہو بس پھر ہم اور پاکیزہ لازم و ملزوم ہوں گے۔

جواب 2۔ پانچ نمایاں باتیں۔

1۔ پاکیزہ کی ایڈیٹر 2۔ بہنوں کی محفل 3۔ ایوارڈز کا سلسلہ 4۔ اور کہانیوں کی جدت نے پاکیزہ سے ناتا مضبوط کیا ہر لحاظ سے ایک معیاری رسالہ اور

بہنوں کی محفل میں انجم انصار آنٹی کا لگاوٹ بھرا انداز ہر ایک کو اہمیت دینا بہت جدا ہے باقی رسالوں سے، اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔



جواب3۔ پاکیزہ میرا دوست ایسے کہ میری تنہائی کا ساتھی بنا، ناصح اس طرح کہ اس میں موجود اصلاحی اور معاشرتی کہانیوں نے زمانے کا چلن دکھایا مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک بہن کے خط کے جواب میں انجم آنٹی نے کہا کہ اپنی تصویر اور تحریر کسی کو نہ دیں کسی بہن کو کوئی بلیک میل کر رہا تھا اُن کی تصویر سے یوں ان کے حوالے سے میں نے وہ بات ایسے ذہن میں ڈالی کہ اپنے منگیتر کو بھی تصویر نہ دی آج بھی میرے شوہر طعنے مارتے ہیں کہ تم نے مجھ پر اعتبار نہ کیا اور میں دلار سے کہتی ہوں اب جی بھر کر دیکھوناں جی......!

☆رابعہ یاسمین ......کوئٹہ

1۔ ہمارے والدِ مرحوم بے حد ادبی ذوق کے مالک تھے۔ ہر قسم کی کتابیں ان کے پاس تھیں۔ ہمیں بھی بچپن ہی سے پڑھنے کا شوق ہوا۔ پانچویں جماعت سے ہم نسیم حجازی کے ناول پڑھنے لگے...... ہمارے محلے میں ایک خاتون رہتی تھیں جو ناول لکھتی تھیں اور ریڈیو پر غزلیں گاتی تھیں۔ وہ بھی ہمیں ہر قسم کے رسالے دیتی تھیں...... پاکیزہ ہمیں بے حد پسند آیا اس دن سے لے کر آج تک ہم نے کوئی شمارہ مس نہیں کیا...... اب تو میری بھتیجی عالیہ بھی بہت شوق سے پڑھتی ہے۔

2۔ اس پورے عرصے میں ہمیں تمام سلسلے بے حد اچھے لگے۔ خاص کر دین کی باتیں، سلسلے وار ناول، مصنفات کے انٹرویو بہنوں کی محفل اور جلترنگ جو بہت زیادہ پسند تھا۔ ناہید سلطانہ اختر اور نگہت سیما میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔

3۔ پاکیزہ ہمارا بہترین دوست رہا ہے، پاکیزہ پڑھنا اور اس میں لکھنا میرا واحد شوق ہے۔ کوئی بھی ٹینشن ہو، پاکیزہ پڑھو چند لمحوں میں نجات مل جاتی ہے۔ اس کی کہانیاں دلچسپ اور سبق آموز ہوتی ہیں۔

☆غزالہ عمران بھٹی ...... مریدکے

جواب1: میں میٹرک میں تھی جب اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ مجھے ڈائجسٹ لگوادیں۔ جب اخبار والا پاکیزہ دے کے گیا تو میں نے اپنے بھائی سے کہا پاکیزہ کیوں، وہ کہنے لگے میں نے اپنے دوست سے پوچھا میری بہن کو پڑھنے کا بہت شوق ہے، کون سا ڈائجسٹ بہتر ہے، اس نے کہا میری بیوی پاکیزہ پڑھتی ہے۔ اخبار والے سے بھی پوچھا تو اس نے یہی کہا بچیوں کے پڑھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی پرچا نہیں...... اور اب میرا بیٹا میٹرک میں ہے۔

جواب2۔1۔ بہنوں کی محفل، اس جیسی پاکیزہ محفل اور باتیں پیار و محبت اور کہیں نہیں۔ 2۔ اس کے افسانے جو مختصر مگر سبق آموز ہوتے ہیں۔ 3۔ ادارے کے ارکان جنہوں نے اپنے اسٹاف کو عزت دی اور وہ ہمیں دے رہے ہیں، ہم آپس میں ایسے تعلق میں بندھے ہیں جیسے گھر کے افراد...... آپ سنتے ہیں، ہم آپ سے بے جھجک کہتے ہیں۔ 4۔ اسلام کے بارے میں بھرپور معلومات اور روحانی مشورے۔ 5۔ میری تنہائی بانٹی ہے، میری خوشیاں مکمل کی ہیں، مجھے جینے کے ہنر سے آشنا کروایا ہے، بہت سی کمیاں تھیں مجھ میں جن سے میں ناواقف تھی۔ میری رائٹر نے مجھے بتایا ہے کہ ہم خود کو کیسے بہتر کر سکتے ہیں، ہر کہانی سے ضرور کچھ نہ کچھ سیکھتی ہوں۔

جواب:3۔ پاکیزہ کے کہنے پر خود کو بدلا کیونکہ اس نے تو دوستی کا حق ادا کیا اداریہ ہو، افسانہ ہو کہانی ہو، پاکیزہ ڈائری ہو، عذرا آپی کا ہم کلام ہونا ہو، اسی اعتماد کے ساتھ میں آپ کے سامنے ہوں۔

☆☆☆



مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطرِ اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

اپنے باذوق قارئین کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے آج نامور مزاح نگار ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی کتاب مزاحیات سے دو انتہائی دلچسپ اقتباسات آپ کی خوش ذوقی کی نذر......

گھوڑے بگھوڑے

لیجیے صاحب اب پاکستان میں گھوڑے بگھوڑے ہونے لگے۔ وفاقی حکومت کی طرف سے جاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں گدھوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ 1990.91 میں 34 لاکھ گدھے تھے جبکہ ہماری گدھا پروری کے باعث یہ تعداد 1993.94 میں 39 لاکھ ہوگئی ہے۔ جہاں تک گھڑ شاری کا تعلق ہے 1991.92 میں گھوڑے پچاس لاکھ تھے۔ 1993.94ء میں یہ تعداد چالیس لاکھ رہ گئی ہے۔ ہم گھوڑوں کی تعداد میں کمی کے بارے میں کوئی حتمی رائے اس لیے نہیں دے سکتے کہ ہمیں اسمبلی گئے مدت ہوئی۔ گدھوں کی تعداد میں اضافے پر بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ایک عرصے سے ہمارا سرکاری دفتروں سے رابطہ نہیں۔

گدھوں کے بارے میں ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا وہ ہمارے بارے میں جانتے ہیں، تمام گدھے بنیادی طور پر گدھے ہوتے ہیں، گدھا ہمیشہ لیٹ کر سوتا ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ میرا دوست "ف" کہتا ہے "میں گدھے کی طرح کام کرتا ہوں پھر بھی مجھے ابھی تک ترقی نہیں ملی۔" حالانکہ اسے اسی لیے ابھی تک ترقی نہیں ملی کہ وہ گدھے کی طرح کام کرتا ہے۔ گدھے دو قسم کے ہوتے ہیں دو ٹانگوں والے اور چار ٹانگوں والے، اگرچہ واضح نہیں کیا گیا کہ کون سے گدھے زیادہ ہوتے ہیں۔ گدھوں کی اہم خوبیاں یہ ہیں کہ سگریٹ نہیں پیتے، جھوٹ نہیں بولتے اور شاعری بھی نہیں کرتے۔ امریکا میں تو ملک کا سب سے اہم کام یعنی صدر کا انتخاب گدھے پر لگی مہریں گن کر کیا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں گدھا صرف دوسروں کو گالی دینے کے کام آتا ہے۔ شادی پر بھی ہم گھوڑوں پر بیٹھتے ہیں، گدھے پر اس لیے نہیں بیٹھتے کہ لڑکی والوں کو دولھا پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔ گھوڑے پر بیٹھ کر بھی احتیاطاً دولھے کو سہرا باندھ دیا جاتا ہے۔ ان فلیمنگ کہتا ہے کہ گھوڑا وہ شے ہے جو دونوں سروں سے خطرناک اور درمیان سے بے آرام ہوتا ہے۔ گھوڑے ہر زبان میں ہنہنا سکتے ہیں لیکن چارلس دی ایمپیئر نے کہا ہے میں خدا سے اسپینی، عورتوں سے اطالوی، مردوں سے فرانسیسی اور گھوڑوں سے جرمن زبان میں گفتگو کرتا ہوں۔ یہ بات انہوں نے ایک صحافی سے جرمن زبان میں گفتگو کرتے ہوئے کہی۔

گھوڑوں کی دانش کا تو سب کو پتا ہے۔ ریس میں بیس گھوڑے دوڑتے ہیں تو لاکھوں انسان انہیں دیکھنے نکل پڑتے ہیں جبکہ بیس بندے دوڑیں تو ایک بھی گھوڑا انہیں دیکھنے نہیں آتا۔ تاریخ میں ایک گھوڑے کا ذکر ہے جو سینٹ کا ممبر رہا یہ اطالوی آمر اور شہنشاہ کالیگولا کا گھوڑا تھا جسے انہوں نے اطالوی سینٹ کا ممبر بنا دیا تھا۔ کسی نے کہا گھوڑے کو ایسا عہدہ نہیں دینا چاہیے وہ کسی کے ساتھ

انصاف کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو جواب ملا یہ سچ ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ گھوڑا کسی کے ساتھ نا انصافی کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔

ہم تو گھوڑے کے ذکر کے بغیر اپنے بزرگوں کی تعریف بھی نہیں کرسکتے۔ ”شکوہ“ میں علامہ اقبال لکھتے ہیں۔

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

موسیقی پر بھی گھوڑوں کا بڑا احسان ہے شادی بیاہ پر ”گھوڑیاں“ گانے کی رسم اب بھی ہے، ان حالات میں اگر گھوڑے اسی طرح ہر سال کم ہوتے رہے اور گدھے بڑھتے رہے تو ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم جس طرف دیکھیں گے ہمیں نرے گدھے ہی نظر آئیں گے، ہم شیشہ تک نہ دیکھ سکیں گے۔ اس لیے اخبارات کو چاہیے کہ آج سے گھوڑوں کے خلاف لکھنا بند کردیں اور اسمبلی میں گھوڑوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھیں ورنہ ایک دن ان گھوڑوں کی جگہ بھی گدھے لے لیں گے۔

غور منٹ

صاحب! ہمارے ایک دوست اقبال صاحب ہیں اب تو ان کے بال بس اتنے رہ گئے ہیں کہ لوگ انہیں اکبال صاحب کہہ کر بلانے لگے ہیں۔ ان سے کسی نے پوچھا۔ ”بال گر رہے ہوں تو کیا کرنا چاہیے؟“ تو انہوں نے کہا۔ ”نیچے سے ہٹ جانا چاہیے۔“ ایسے ہی ہمارا تعلیمی معیار جس رفتار سے گر رہا ہے سیانی بات تو یہی تھی کہ اس کے نیچے سے ہٹ جاتے مگر اعلیٰ وزیر بھی ہٹ کے بچے ہیں۔ پہلے ہمارا تعلیمی معیار اتنا بلند تھا کہ لوگوں کا اس تک ہاتھ نہ پہنچ سکتا تھا لیکن ایک حکومت نے تعلیمی معیار اور بلند کرنے کے لیے فیصلہ کیا ہے کہ بچوں کو پرائمری تک امتحان لیے بغیر پاس کیا جائے گا۔

جیسے ٹیچری اچھا پروفیشن ہے۔ بس اس میں یہ مسئلہ ہے کہ کبھی، کبھی کلاس لینا پڑتی ہے ایسے ہی کلاس روم اچھی جگہ ہے۔ بس وہاں پڑھایا نہ جائے۔ اگر پڑھایا جائے تو امتحان نہ ہو، چلو امتحان بھی ہوں مگر نتیجہ نہ نکلے...... نتیجے سے تو ہماری ہر حکومت اتنا ڈرتی ہے کہ...... طبیعات (یہاں طبیعات طبیعت کی جمع ہے) کے اصول کے مطابق دنیا میں ہمیشہ ذہانت کی کل مقدار ایک سی رہتی ہے اس لیے زیادہ بچے ہونا عقل کا گھاٹا ہے۔ ایک سائنسی رپورٹ کے مطابق تو اب دنیا میں جڑواں بچے پیدا ہونے کی شرح بڑھ گئی ہے۔ جس سے لگتا ہے دنیا ایسی ہوگئی ہے کہ بچے یہاں اکیلے آنے سے گھبرانے لگے ہیں۔ بچے جب پیدا ہوتے ہیں تو بڑے معصوم ہوتے ہیں لیکن بعد میں تعلیم یافتہ ہوجاتے ہیں، تعلیم حاصل نہ کرنے والے کو جاہل اور تعلیم حاصل کرنے والے کو بیروزگار کہتے ہیں۔ ویسے جاہل وہ ہی نہیں ہوتا جو پڑھنے کے قابل نہ ہو وہ بھی ہوتا ہے جسے پتا نہ ہو کہ کیا پڑھنے کے قابل نہیں؟ سارا دن پڑھتا رہتا ہے اسے محنتی نہیں بور کہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں بندے کو تعلیم حاصل کرنا چاہیے چاہے اس کے لیے اسکول ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ ہمارے ایک سیاستدان کہتے ہیں میں امتحانات کی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کرسکا جب بھی میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا تو امتحان آجاتے۔ اگر مجھے تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل جاتا تو آج میں سیاستدان نہ ہوتا، پڑھا لکھا ہوتا۔ جب امتحان کی ڈیٹ آتی تو ڈیٹ بھول جاتا کیونکہ میں امتحان ”ڈیٹ“ سے زیادہ ضروری سمجھتا۔

دنیا میں وہ فقرہ جو سب سے زیادہ بولا گیا وہ ہے۔ ”گورنمنٹ آپ کے مسائل پر غور کررہی ہے۔“ یوں گورنمنٹ دراصل غورمنٹ ہوتی ہے لیکن غورمنٹ نے غور کیا اور ایک ہی فیصلے سے شرح خواندگی میں اتنا اضافہ کردیا کہ اب ہماری کتابیں پڑھ کر بھی شرح ناخواندگی میں اضافہ ممکن نہیں۔ ایسے ہی مسز تھیچر نے برطانیہ میں بیروزگاری کم کی تھی۔ وہاں پہلے سولہ سال کا لڑکا اگر کہیں جو کہیں ملازم نہ ہوتا بیروزگار کہلاتا، مسز تھیچر نے اعلان کیا کہ 16 سال سے 18 سال کی عمر کے لڑکوں کو بیروزگار نہیں مانا جائے گا۔ یوں ایک ہی دن میں برطانیہ میں 30 فیصد بیروزگار کم ہوگئے۔ البرٹ آئن سٹائن ایڈورڈ کہتا ہے ذہانت وہ چیز ہے جس کے باعث بندہ تعلیم کے بغیر گزارہ کرسکتا ہے اور تعلیم وہ چیز ہے جس کے باعث بندہ اپنی ذہانت استعمال کیے بغیر گزارہ کرسکتا ہے۔ آج کل اسکولوں میں جتنی محنت اور سفارش سے بچوں کو کلاس میں داخلہ ملتا ہے اس سے کم محنت اور سفارش سے انہیں اس کلاس کا ٹیچر رکھوایا جاسکتا ہے۔ اب بچے ٹائم اسکیل پروموشن کے تحت اگلی جماعت میں چلے جایا کریں گے اب اس سے بچوں کی صلاحیتوں کا پتا نہ چل سکے گا جیسے بچپن میں ہمارے اسکول ٹیچر نے ہمارے امتحان کا رزلٹ دیکھ کر ہمارے والد صاحب کو بتادیا تھا کہ آپ کا بیٹا سیاستدان نہیں بن سکے گا یہ تو ایک سال میں ایک جماعت نہیں بدل سکا۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ

تمام حمد وستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب خدا رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانۂ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ ہمارے وطن پاکستان میں امن و آشتی کی فضا اور خوش حالی رہے اور تمام اہلِ وطن اس کی ترقی و نیک نامی کے لیے کوشاں رہیں۔ (الٰہی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو! سلام خلوص و محبت قبول کریں...... اس مرتبہ جس طرح پاکیزہ کے سالگرہ نمبر کو سراہا گیا اور نزہت اصغر کی کوششوں کی جس طرح تعریف ہوئی اور سالگرہ نمبر کے حوالے سے تمام سلسلوں کی آپ سب نے بے حد پزیرائی کی وہ بہت قابلِ قدر ہے۔ ہماری پیاری بہنیں جو باتیں فون پر کافی، کافی دیر کرتی ہیں تو چاہتی ہیں اس سب کا ذکر میں یہاں بھی کروں جو کہ ممکن نہیں...... ہاں یہ ضرور ہے کہ جو تجاویز اور مشورے رسالے کی بہتری کے لیے آپ دیتی ہیں تو ان کے بارے میں آپ کو ڈائریکٹ جواب بھی دے دیتی ہوں کہ کیا ممکن ہوسکتا ہے اور کیا نہیں اور اس کے ساتھ ان پوائنٹس کو پھر ہم نوٹ کرکے بھی رکھ لیتے ہیں تاکہ وقتاً فوقتاً ان پر عمل کرتے رہیں۔

پیاری بہنو! تمام تجاویز قابل عمل نہیں ہوتیں، کچھ رسالے کی اپنی ضرورت ہوتی ہے، کچھ پرنٹ میڈیا کی حدود ہوتی ہیں...... اور قارئین کی پسند ناپسند کو بھی اولین اہمیت دینی ہوتی ہے۔ بہر حال آپ کی تجاویز، آرا اور مشورے سر آنکھوں پر...... موقع کی ضرورت، مناسبت اور اہمیت کے حساب سے ہم ان پر عمل درآمد کرتے رہیں گے۔ انشاء اللہ

کوئٹہ شہر اور گرد و نواح سے تعلق رکھنے والی ہماری ہونہار بہنیں جیسے رابعہ یاسمین، تسنیم گل، بلقیس جعفر، جمیلہ لوہی و دیگر بہنوں کے خطوط، مراسلات و دیگر نگارشات ملتی رہتی ہیں، آپ سب ہمارے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہیں بلکہ زیادہ قابلِ قدر ہیں کہ اتنے دور دراز علاقوں سے رابطے میں رہتی ہیں جیسے وادیٔ کاغان سے عین الحیات ترمذی بھی، کبھی رابطہ کرلیتی ہیں۔ یہ پاکیزہ کی خوش نصیبی نہیں تو اور کیا ہے...... میری نند ماہ مبین ان تمام بہنوں کا شکریہ ادا کررہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اللہ ان سب بہنوں کو جزائے خیر دے جو دعاؤں میں انہیں یاد رکھے ہوئے ہیں مگر طبیعت ابھی پوری طرح سنبھل نہیں پارہی، معراج صاحب کی طبیعت کا بھی یہ ہے کہ کوئی دن بہتر اور کوئی دن برا گزر رہا ہے۔ بس یہی اللہ کی مصلحت ہے۔ اللہ سب بیماروں کو شفایاب کرے۔ اچھا بہنو! اچھی خاصی باتیں ہوگئیں۔ اب اجازت...... انشاء اللہ پھر گفتگو ہوگی۔

اللہ نگہبان......!

دعا گو عذرا رسول......!

☆☆☆

آپ سب کو پاکیزہ کی سالگرہ ایک دفعہ پھر بہت، بہت مبارک ہو۔ ان تمام قاری بہنوں و دیگر افراد کا شکریہ کہ جنہوں نے سالگرہ کے سلسلے میں تہنیتی پیغامات بھیجے اور دعاؤں میں یاد رکھا۔ جی بہنو! اس دفعہ ہم اپنی مزید مصنفات کا ذکر کریں گے۔ آپ ناراض تو نہیں ہیں ناں کہ جن کے نام لکھنے سے رہ گئے تھے...... انسان ہیں بھول چوک تو ہو ہی جاتی ہے...... اس لیے ہم نے پیشگی

معذرت کرلی تھی۔

(ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا کہ لوٹ آؤ پردیسیو) جی تو بہت سی بھولی بسری مصنفات نے ہماری صدا کو پزیرائی بخشی اور خیر خیریت دریافت کی۔ اب اور کئی قلمکاروں کے نام یاد آرہے ہیں جیسے شمیم رزاق، طاہرہ حسن، رفعت عباس، روشن آرا، فریدہ جمیل، ثروت مزمل، عفت سلطانہ، آمنہ نسیم، آسیہ سلیم قریشی، آسیہ مرزا، ماہا ملک، یاسمین نشاط اختر، انیقہ انا، عفت سحر پاشا، نوربانو محجوب، ثمرہ بخاری، فرح بخاری وغیرہ، وغیرہ...... خیال رہے یہاں ان مصنفات کے نام نہیں لکھے ہیں جو الحمدللہ وقتاً فوقتاً کہانیاں دے رہی ہیں۔ اور جناب ہماری سینئر قاری بہنیں و تبصرہ نگاران نے بھی ہمیں جھنجوڑا ہے کہ ہم بھی تو آپ کے ساتھ ہیں۔ ہاں، ہاں کیوں نہیں ضرور ☆ جیسے چکوال صابہ موہڑہ سے نرگس نسیم نے بچوں کی طرح ہونٹ لٹکا کر پیارا سا منہ بنایا باجی میرا نام...... "فکر نہ کریں آپ سب کے ناموں سے ہی تو محفل کی رونق ہے۔ ☆ صائمہ سجاد بخش اور تسنیم قریشی، بہت پیارے شہر کوہاٹ سے تبصرہ کرتی ہیں، نگارشات بھی بھیجتی رہتی ہیں۔ ☆ ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ خیر اب تو کسی دوسرے شہر شادی ہوکر گئی ہیں، کیسی ہو ناظمہ تمہارے مراسلات رکھے ہیں ہمارے پاس...... ☆ ممتاز خانم، کراچی سے کبھی کبھی ایس ایم ایس کی سہولت کا فائدہ اٹھالیتی ہیں۔ ☆ کوثر خالد، جڑانوالہ، ماشاء اللہ بہت ادبی صلاحیت ہے خوب ادبی مراسلات، شاعری اور نعتیہ کلام بھیجتی ہیں۔ بے حد مخلص اور کھری خاتون ہیں، محلے در محلے کے کام آتی ہیں۔ (اللہ کرے زورِ خدمت اور زیادہ) ☆ عروج فاطمہ، ملتان۔ بڑی، بڑی لکھائی میں خوب مراسلات بھیجتی ہیں۔ آج کل کہاں غائب ہو ☆ صبا نور، لیہ اب کے بعد اب بی اے کے امتحانوں میں مصروف ہیں، انجم باجی کی بہت شکرگزار رہتی ہیں کہ انہوں نے پڑھائی کے بارے میں ان کی بہت ہمت بڑھائی۔ ☆ سمیرا حمید فاروق، کراچی بیٹیوں کی شادی کے بعد سے کچھ زیادہ مصروف ہوگئی ہیں، نانی بھی تو بن گئی ہیں اس لیے ذمے داریاں سوا ہوگئیں۔ آج کل تو زیادہ تر دبئی میں ہی ہوتی ہیں (آپ جہاں رہیں خوش رہیں) اور ان تمام بہنوں کا ایک مرتبہ پھر بڑے خلوص سے شکریہ ادا کرتی ہوں جو ہماری مستقل تبصرہ نگار ہیں اور جنہوں نے پاکیزہ کے سالگرہ نمبر 1 کو بہت سراہا اور ہماری بے حد حوصلہ افزائی کی۔ یہی تو ہمارے ماہنامے کی خاصیت ہے کہ صرف کہانیاں پڑھ کر رسالہ ایک طرف ڈال نہیں دیا جاتا بلکہ دل وجان سے لگا کر رکھا جاتا ہے کہ اس میں سب سہیلیاں، ہم جولیاں سر جوڑ کر بیٹھتی ہیں اور بہت اہم، اہم امور ڈسکس کیے جاتے ہیں، حل بتائے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹے جاتے ہیں خوشیوں میں خوش ہوا جاتا ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ آپ جیسے ہمارے پیارے پاکیزہ قارئین دنیا کے جس، جس گوشے میں بھی ہیں محبت وسلامتی کے ساتھ اپنے، اپنے فرائض بخیر وخوبی انجام دیتے رہیں۔ آمین......

سہواً پچھلے ماہ ہمارے مشاق مصور مظہر انصاری اور ظفر صاحب کا ذکر تو نہ ہوسکا تھا۔ خوب صورت اور دیکھے اسکیچز انہی کی مہارت ہیں اور ادارے کے بے حد دیرینہ اور پرخلوص ساتھی افسر خان جو پاکیزہ کے سیٹ اور مسطر وغیرہ مرتب کرتے ہیں ان کی خدمات بھی قابلِ ستائش ہیں اور مستعدی سے نگہداری کے فرائض انجام دیتے ہوئے کل داد ہر اجنبی پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ اللہ ادارے کے ان وفادار ساتھیوں کو صحت وسلامتی سے رکھے۔ آمین......

ماہ شعبان کا آغاز ہوچکا ہے اور ماہ رمضان کی آمد ہے، لہٰذا اپنے گھریلو امور کو بہ احسن طریقے سے ادا کرتے ہوئے عبادات کا اہتمام بھی ضرور کریں اور اپنی خوشیوں میں حاجت مندوں، ضرورت مندوں اور سفید پوشوں کا بھرم بھی ضرور رکھتی جائیں۔

پیاری بہنو! اپنے پیغام سلام، رائے مشورے اور شکایات کے لیے بھی مندرجہ ذیل نمبر حاضر ہیں۔

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:122.107 ہیں۔

اور حسب روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی یاد رکھیں۔ اللہ رب العزت عالمِ اسلام کی تمام پریشانیوں کو رفع کرے اور تمام مسلمانانِ عالم کو کامیابی نصیب ہو۔ (الٰہی آمین)

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ہماری مایہ ناز مصنفہ رفعت سراج کا پاکیزہ میں قسط وار شائع ہونے والا ناول امانت کا دوسرا ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آگیا ہے۔ اسے خزینۂ علم وادب لاہور کے نذیر صاحب پبلشر نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ پہلا ایڈیشن دو جلدوں پر مشتمل تھا جبکہ

ایک ہی والیوم میں ہے، کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ نمبر نوٹ فرمالیں۔.. 04237314169.03334327178

رفعت سراج کی ہی دوسری کتاب دام دل بھی خزینۂ علم وادب کے پلیٹ فارم سے شائع ہوگئی ہے۔ (مبارک ہو) جبکہ ایک اور خبر رفعت سراج کے حوالے سے یہ ہے کہ پچھلے دنوں ان کے شوہر نامدار منیر صاحب نامعلوم اچکوں کے ہاتھوں اپنے والٹ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب وہ اپنے آئی ڈی کارڈ و دیگر کی ایف آئی آر کٹوانے اور اس کے حصول کے لیے سرگرداں ہیں۔ (خدا ہدایت کرے ان گمراہوں کی جو اچھی خاصی پریشانی میں ڈال دیتے ہیں)

☆ مستقل تبصرہ نگار نسیم ماپارا اور ان کے شوہر صاحب نے ماہ رجب کے عمرے کی سعادت حاصل کی۔ (ماشاء اللہ اور مبارک باد)

☆ مصنفہ عنیقہ محمد بیگ جواب کراچی کی باسی ہوچکی ہیں آج کل اسکرپٹ رائٹنگ میں مصروف ہیں اور اپنے شہر سیالکوٹ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ (افسانے بھی ضرور لکھیں عنیقہ)

☆ مستقل تبصرہ نگار رابعہ یاسمین، کوئٹہ کی دو بھانجیوں، غزالہ شاہین اور صبا اجالا کو بلوچستان سروس کمیشن کی جانب سے لیکچرار کی پوسٹ پر اپائنٹ کیا گیا ہے۔ (بہت، بہت مبارک ہو...... بچیوں کی کامیابیوں پر بلاشبہ بہت خوشی ہوئی ہے)

☆ تمام قاری بہنوں کو ان کے بچوں اور چھوٹے بہن بھائیوں کے مختلف کلاسوں کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے پر دلی مبارک باد......

☆ پچھلے دنوں ریڈیو پروڈیوسر، مصنفہ اور شاعرہ سیما رضا ردا نے ریڈیو پاکستان، کراچی اسٹیشن کے پروگرام سکھی گھر کے لیے ایک مذاکرہ ریکارڈ کروایا جس میں میزبانی کے فرائض ماہر نفسیات تنویر عشرت نے انجام دیے جبکہ شرکاء میں حریم ادب کی عالیہ منصور، مصنفہ اور شاعرہ، ہما بیگ، سوشل میڈیا ایکٹوسٹ اور کالم نگار شنا غوری اور ہم (نزہت اصغر) نے شرکت کی۔ مذاکرے کا موضوع خواتین اور ٹیکنالوجی تھا جس پر تمام شرکا نے سیر حاصل گفتگو کی اور ٹیکنالوجی کے مثبت اور منفی اثرات پر بھی بات ہوئی۔

☆ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی مصنفہ وشاعرہ ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ نے شعبۂ ادب میں گرانقدر خدمات کے صلے میں رائٹرز ویلفیئر فاؤنڈیشن اور ہیومن رائٹس پاکستان کی جانب سے ایوارڈ حاصل کیا جبکہ ادبی دنیا اردو شاعری کے بینر تلے شعر وادب کے میدان میں پہلی پوزیشن سے بھی نوازا گیا ہے۔ (بہت مبارک ہو)

☆ مستقل قاری نرگس نسیم، صابہ موہڑہ کے نوسالہ بیٹے نے پانچویں کلاس کے بورڈ کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی جبکہ کچھ عرصے پہلے ان کا بچہ ایک ٹریفک حادثے میں زخمی بھی ہوگیا تھا۔ (بچے کی کامیابی مبارک ہو، اللہ اسے صحت دے، آمین)

☆ مصنفہ رخ چوہدری کے بہنوئی کرنل محمد امین کو تمغۂ امتیاز ملٹری سے نوازا گیا ہے۔ (بے حد مبارک ہو) رخ چوہدری کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کی پیاری بھانجی ربیعہ کی شادی خرم سلمہ کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں انجام پائی۔ (مبارک باد)

☆ پیاری حورالعین نے جو باصلاحیت مصنفہ وایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ کی دختر نیک اختر ہیں اس مرتبہ پھر اپنی ذہانت کے بل بوتے پر میتھس جیسے مشکل مضمون میں ٹاپ کیا ہے۔ اور بیسٹ اسٹوڈنٹ کا ایوارڈ حاصل کیا ہے۔ (ماشاء اللہ)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پیاری پاکیزہ بہن امینہ عندلیب، سلانوالی کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا۔

☆ مستقل قاری شاہدہ، ملتان کے بچوں کی صحت اکثر خراب رہتی ہے، انہوں نے خصوصی دعا کی درخواست کی ہے۔

☆ مصنفہ پروین عذرا تشنہ، کراچی کی طبیعت ان دنوں ناساز ہے۔

☆ پچھلے دنوں ہماری پیاری رائٹر رفعت سراج شدید بخار میں مبتلا رہیں، اب الحمدللہ قدرے بہتر ہیں۔

☆ مصنفہ حیا بخاری، ڈی آئی خان نمونیا بخار بگڑ جانے کی وجہ سے کئی روز اسپتال میں گزار کر اب خیر سے گھر آگئی ہیں۔ (الحمدللہ... حیا اپنا بہت خیال رکھیں)

☆ قلم کار شبینہ گل، راولپنڈی کی صحت تاحال مکمل بحال نہیں ہوئی۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد سے وہ صحت کے کئی مسائل کا شکار ہیں۔

☆ حمیرا وحید، واہ کینٹ کی بیٹی کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

☆ پاکیزہ کی ایک مستقل قاری اور تبصرہ نگار بہن، شک اور وہم کی... بیماری میں مبتلا ہیں جس سے وہ خود بھی بہت پریشان ہیں۔ کسی کے پاس کوئی علاج، دعا، ٹوٹکا ہو تو ضرور بتائیں۔

☆ مصنفہ عائشہ خان، لاہور کی صحت ابھی مکمل بحال نہیں ہوئی۔
☆ پیاری ذکیہ ایوب کے لیے بہنیں ضرور صحت یابی کی دعا کریں۔
☆ شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری کی طبیعت ان دنوں پھر خراب ہے۔
☆ محترمہ عذرا رسول کی دوست اور پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی شائستہ اعجاز اپنی آنکھوں کے آپریشن کے بعد سے آرام کر رہی ہیں اور شائستہ کی والدہ کی صحت یابی کے لیے ضرور دعا کریں۔
☆ مستقل قاری اور مصنفہ اسما صدیقہ کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔
☆ مستقل قاری اور مصنفہ ریما نور رضوان کے آنگن میں خوشخبری آنے والی ہے، ان کی خیریت کے لیے ضرور دعا کریں۔
☆ پاکیزہ کی سینئر ساتھی ڈاکٹر ممتاز ضیا کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔
پروردگارِ عالم تمام بیماروں کو صحتِ عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے، آمین......

انتقالِ پُرملال

☆ عذرا رسول کی پیاری ممانی جان، رباب خاتون طویل علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔
☆ مستقل تبصرہ نگار شازیہ سرفراز، کراچی کے والد کی اس ماہ برسی ہے۔
☆ ہماری بہت پیاری جواں سال رائٹر شازیہ چوہدری اسی ماہ ہم سے جدا ہوئی تھیں۔ ان کی مغفرت کے لیے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔
☆ پاکیزہ قاری ثنا مرتضٰی، کراچی کی جواں سال بہن کی برسی اسی ماہ ہے۔
☆ پاکیزہ کی پرستار جویریہ رضوی، کراچی کے والد نثار عباس کی اس ماہ چوتھی برسی ہے۔
☆ مستقل قاری، ام حمزہ، گوجرانوالہ کے پیارے بیٹے علی حمزہ کی اس ماہ برسی ہے۔
ایک مرتبہ سورۂ حمد اور تین بار مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر تمام مرحومین کو بخش دیں۔

☆☆☆

☆ اب آتے ہیں آپ بہنوں کے کھٹے میٹھے خطوط کی جانب......

✍ ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ ”پاکیزہ کا سالگرہ نمبر ملا......عذرا اور ان کے ادارے کے تمام اراکین کو سالگرہ مبارک ہو اللہ کرے ایسی ہزاروں سالگرہیں تم لوگ کرو...... (آمین) میرا اور پاکیزہ کا ساتھ پہلے شمارے سے ہے، پرچہ حسبِ معمول خوب صورت تحریروں سے سجا ہوا تھا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں تم ہمیشہ ہی بہت کچھ کہتی ہو، بہت خوب...... ذکیہ کا ایمان افروز مضمون اللہ اور اس کا نور بہترین، اللہ انہیں بہت اچھا صلہ دے گا...... اللہ انہیں سلامت رکھے اور اسی طرح وہ لوگوں کی رہنمائی کرتی رہیں۔ رفعت سراج کا ناول بہت دلچسپ جا رہا ہے مگر زارا کے ساتھ جو کیا ہے اس کا صدمہ کم نہیں ہو رہا...... قانتہ رابعہ، حیا بخاری کی تحریریں گوارا...... ایک سہارے کی آس اچھی تحریر تھی۔ امرت دلچسپ ہوتا جا رہا ہے مگر کردار بہت زیادہ ہیں، ذہن پر زور ڈالنا پڑتا ہے۔ رفاقت جاوید کی اور شمیم فضل خالق کی تحریر گوارا ہے۔ دیگر کہانیاں بھی اچھی ہیں، سحر ساجد کا ہم دو کوئی خاص نہ لگا۔ اختر شجاعت کو اللہ جزائے خیر دے، رضوانہ پرنس کی آمد بزم میں بہت اچھی لگی، ہمیں آج بھی یاد ہے پڑھا تھا کہ کس طرح پرنس باتیں کرتے، کرتے رضوانہ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اللہ مغفرت کرے، ہم رضوانہ کے ساتھ ان کے پرنس اور بھائی سلیم کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ سنگ، سنگ چلیں پاکیزہ کے...... میں تسنیم منیر نے بہت خوب لکھا، آپ نے مجھے بھی یاد رکھا بہت شکریہ۔ بہنوں کی محفل میں عذرا آپا کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں معراج صاحب اور ان کی بہن کے لیے دعائیں ہیں جس طرح وہ ان کی دلجوئی کرتی ہیں وہ قابلِ ستائش ہے۔ جو بہنیں اب نہیں رہیں آپ لوگ انہیں بھی یاد کرتے ہیں یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ چاندنی تو میری بہت اچھی دوست تھی بھولتی نہیں، طیبہ بہن، بیٹی کی شادی کی تیاریوں کی مبارک باد میں نے غلط نہیں لکھا تھا تمہارے افسانے اور ڈرامے کی مطابقت اتفاقیہ ہوگی۔ آپ کی تحریر انجم سلیکٹ کریں یا نزہت کوئی فرق نہیں...... عقیلہ پیاری بحث کرنا میری عادت نہیں نہ ہی مجھے پسند ہے جو شعر آپ نے لکھا ہے میں بھی پڑھتی ہوں۔ آپ کی والدہ مجھے اپنی بیٹی مانتی تھیں اس لیے آپ مجھے عزیز ہیں، نزہت تمہارے لیے ڈھیروں پیار...... ارے بھئی 29 اپریل کو ہماری بھی سالگرہ ہوتی ہے۔“ (مبارک باد ڈاکٹر صاحبہ، آئندہ پیشگی مبارک باد دیں گے انشاء اللہ...... کھرے تبصرے کا شکریہ، اللہ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے)

✍ طیبہ عنصر مغل، راولپنڈی سے۔ ”شعبان کا چاند مبارک ہو، آپ کا بہت شکریہ کہ میرے متعلق خبر لگائی اور مبارک باد دی۔ پاکیزہ کی یہی بات تو دل کو بھاتی ہے۔ اپنے قارئین کا بہت خیال رکھتا ہے (آپ لوگ تو اہم ہیں ناں بھئی) سالگرہ نمبر کے حوالے سے پرچہ بہت خوب تھا۔ بہت اچھا سب پڑھنے کو ملا مگر نظریں اپنی تحریر کو ہی ڈھونڈتی رہی تھیں۔ (ہاں بھئی اب چھپن چھپائی کا کھیل تو چلتا ہے ناں ویسے کئی بہنوں نے بھی تمہیں یاد کیا ہے) ہاں نزہت ڈیئر ایک فرمائش ہے اگر فیشن کے صفحات دوبارہ شروع کر دیے جائیں تو بہت اچھا ہے، ہر ماہ نہیں تو سال، چھ ماہ میں دے دیں۔“ (ارے فیشن اتنی جلدی بدلتے ہیں تم کہو گی اب پرانا ہو گیا ہے خیر تمہاری فرمائش پر غور کریں گے۔ چھوٹے سے تبصرے کا بہت شکریہ)

✍ رضوانہ پرنس، کراچی سے۔ ”پیاری نزہت اصغر میں دل کی گہرائیوں سے تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں، تم نے اپنے خوب صورت سوالات سے میرا انٹرویو کیا جو لوگوں نے بے حد پسند کیا۔ میرے پاس بہت فون آئے اور جنہوں نے ذاتی طور پر تعریف کی ان کا بھی بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں۔ عذرا تمہارا شکریہ کہ تم نے پاکیزہ میں ہمیشہ مجھے بڑی اہمیت دی۔ دوستی تو ہماری بے مثال ہے ہی اور پاکیزہ میں جو جگہ دیتی ہو اس کا بھی بہت شکریہ...... بہنو! میرا نیا سوپ لوگ کیا کہیں گے عنقریب ہم چینل سے شروع ہونے والا ہے۔ میری سب دوستیں ضرور دیکھیں اور اپنی رائے سے بھی آگاہ کریں، عذرا اور نزہت تم دونوں کا ایک مرتبہ پھر شکریہ کہ میرا انٹرویو اتنی اچھی طرح لگایا۔“ (مبارک ہو اور شکریہ)

✍ فرزانہ جاوید، راولپنڈی سے۔ ”آپی ویسے تو پورا پاکیزہ ہی ہمیں بہت پسند ہے لیکن اس مرتبہ شادی کے مسائل پر جو کہانیاں آتی ہیں سب ایک سے ایک اور مختلف...... ہما علی کی بہت خوب صورت تحریر کہ واقعی آج کل یہی ہو رہا ہے اگرچہ میچ میکرز ہیں تو وہ بھی خالص کاروباری انداز، پاکیزہ میں واقعی وہی تحریریں آتی ہیں جو آج کل معاشرے میں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں مگر اللہ توکل کا اچھا سبق دیا ہے۔“ (تبصرے کا بہت شکریہ)

✍ منور، شادن لُنڈ، ڈی جی خان سے۔ ”باجی سب سے پہلے میں بہنوں کی محفل پڑھتی ہوں۔ عذرا رسول کی باتیں پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مجھے بہت پسند ہیں، میں اب نانی ہوں، سارا دن گھر کے کام کر کے جب ریسٹ کرنے لیٹتی ہوں تو پاکیزہ ہاتھ میں ہوتا ہے۔“ (بہت خوب)

✉ فرح ... آپ کی کہانیوں میں دم ہے، انشاء اللہ جلد لگیں گی۔ پاکیزہ کو سراہنے کا شکریہ...... جی ہماری تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ نئے باہنر لوگوں کو آگے لایا جائے۔

✉ تمثیلہ زاہد، کراچی۔ آپ کی کہانی قابلِ اشاعت ہے مگر آپ سینئر مصنفات کی تحریروں کا مطالعہ بھی ضرور کرتی رہیں۔

✉ بشریٰ ماہا، بدین۔ بہن انتظار ہی میں تو لذت ہے سب کو باری دینا ہوتی ہے، ایک سے بڑھ کر ایک تحریر نظر سے گزر رہی ہے انشاء اللہ آپ کی باری بھی جلد ہی آئے گی۔

✍ فوزیہ، اسلام آباد سے۔ ”اس دفعہ ماہنامہ پاکیزہ ہر ماہ سے بڑھ کر خوب صورت لگا۔ بامقصد کہانیوں اور اصلاحی مضامین کا مجموعہ کیوں نہ پسند آئے۔ ہر کہانی میں ایک سبق ہے چاہے وہ قسط وار ناول ہوں یا افسانے...... ناہید سلطانہ اختر تو خیر خوب ہی لکھتی ہیں لیکن اس دفعہ رائٹر ہما علی نے مختصر پیرائے میں بہت خوب صورت بات کہی بلکہ یہ آج کے لوگوں کے لیے پیغام ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بیٹیاں دی ہیں تو وہ نصیب بھی دے گا بس ہمیں اسی پر بھروسا کر کے دعا کرتے رہنا ہے۔ چھوٹے سے افسانے میں کئی باتیں...... سماجی برائیوں کی نشاندہی وغیرہ آج کل کی پریشانیوں میں صرف اللہ رب العزت کی ذات پر بھروسے کا سبق...... یہ رائٹرز کی خوبی ہے اور آپ کے ادارے کے انتخاب کی بات بھی ہے، ہما علی نے نئی رائٹر ہونے کے باوجود بہت سبق آموز افسانہ لکھا۔ واقعی انسان بہت جلد باز ہے۔“ (بہت پیارے تجزیاتی تبصرے کا شکریہ...... ہما بے شک نئی رائٹر ہیں مگر تحریر میں پختگی ہے)

✍ مسکان حسن، ملتان سے۔ ”میں بچوں اور خواتین کے کئی میگزین پڑھتی ہوں، میں پاکیزہ میں بھی لکھنا چاہتی ہوں۔ پاکیزہ ڈائجسٹ کو بہت پسند کرتی ہوں، اس میں تحریر بھیجنا چاہتی ہوں۔“ (جی ضرور بھیجیں اپنے ماہنامہ پاکیزہ میں)

✍ یثرب گل عفان، جبرانجنی سے۔ ”سب سے پہلے تو شکریہ کہ پہلا پیغام نہ صرف شائع کیا بلکہ آئندہ لکھنے کی بھی ترغیب دی ورنہ ہم گھریلو عورتیں کہاں اتنی اہم ہوتی ہیں۔ (ارے بالکل اہم ہوتی ہیں) آپ کا جواب دینا بہت اچھا لگا، اپنائیت سی محسوس ہوئی۔ (آپ لوگ اپنے ہی تو ہیں) اپریل کا پاکیزہ سالگرہ نمبر کے لحاظ سے اس قدر مکمل تھا کہ اس حوالے سے سروے، خطوط اور بہنوں کی محفل تین بار پڑھ چکی ہوں۔ قسط وار ناول بہت زبردست جا رہے ہیں، شیریں اور رفعت آپا دونوں داد کی مستحق ہیں، ویسے میرے

خیال میں ایک سلسلے وار عالیہ بخاری آپی سے لکھوائیں تو پاکیزہ اور نکھر جائے۔ (جی ضرور) محبت لفظ ہے لیکن، یہ قسط بھی بے مثال تھی لیکن کچھ مختصر لگی، کہانی کھلنے لگی ہے، مجھے لگتا ہے ضیا اور باریال میں بھی کوئی رشتہ ہے۔ باقی دونوں ناولٹ بھی زبردست تھے، ناہید سلطانہ نے کمال لکھا۔ واقعی راضی بہ رضا لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ افسانے بھی بہت اعلیٰ تھے۔ خاص کر قانتہ جی اور فرحین اظفر نے کمال کر دیا۔ ذکیہ بلگرامی کے تو احسان مند ہیں، اختر شجاعت بھی بہت اچھا کام کر رہی ہیں، تبصرے بہت اعلیٰ تھے ہمیشہ کی طرح...... آخر میں اپنے پیارے پاکیزہ کو سالگرہ مبارک اور ترقی کی لاکھوں دعائیں۔" (بہت شکریہ، اتنی دور سے یاد کرنے کا)

رابعہ یاسمین، کوئٹہ سے۔ "پاکیزہ کی تمام بہنیں مجھے بے حد اچھی لگتی ہیں اور میں سب کے لیے دعا کرتی ہوں۔ ٹائٹل ہر بار کی طرح دلکش تھا، دین کی باتوں اور شمع ہدایت سے مستفید ہو کر ہمیشہ کی طرح بہنوں کی محفل میں داخل ہوئے۔ شکریہ نرگس! تمہارے تبصرے واقعی بہت اچھے ہوتے ہیں، افسانے سارے لاجواب تھے، خاص کر عقیلہ اور طیبہ کے افسانے...... میری طرف سے انہیں مبارک باد دیجیے۔ دونوں ناول زبردست جا رہے ہیں، ہر بار کہانیاں ایک نیا موڑ لیتی ہیں، عظمٰی اور رخ چوہدری کو تو کمال حاصل ہے تقریب کا احوال لکھنے میں...... ایسا لگتا ہے کہ ہم بھی وہاں موجود تھے۔ پاکیزہ کی سالگرہ آپ سب کو مبارک ہو۔" (تمہیں بھی مبارک، اس دفعہ تو تم خوش ہو گئی ہو ناں......)

قرۃ العین، بھکر سے۔ "بہت ہی خوب صورت سرورق کے ساتھ پاکیزہ ہاتھ میں آیا تو لسٹ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ اس بار افسانوں میں سارے ستارے جگمگا رہے تھے۔ اللہ کا نور سے لے کر مشوروں تک ایک، ایک ورق چھ دن میں پڑھ لیا۔ کاش کہ پاکیزہ ایک ماہ میں دو بار آتا۔ مگر یا حسرت (ہمارا بھی یہی دل چاہتا ہے مگر......) رفعت آپا کا ناول بہت اچھے موڑ پر ہے، پرنس میرا فیورٹ کیریکٹر ہے، حیا بخاری کا ناول بھی کافی تیز ہے، پڑھتے وقت دل دھک، دھک کرتا رہتا ہے کہ جانے کیا ہو جائے۔ (یہی تو رائٹر کی خوبی ہوتی ہے) افسانے ہمیشہ کی طرح اے ون تھے، طیبہ عنصر اور نصرت یوسف سے ناول، ناولٹ لکھوائیں...... بنت سحر کی گاؤں کی عکاسی مجھے بہت پسند ہے، موضوع پرانا تھا لیکن گاؤں کے کردار بہت پیارے اور ناہید آپا کا راضی بہ رضا بھی اچھا تھا۔ پاکیزہ کو سالگرہ بہت، مبارک ہو۔ اللہ کرے پاکیزہ ہمیشہ یونہی چمکتا رہے...... آمین۔" (بہت پیارے تبصرے اور دعاؤں کا شکریہ اور جزاک اللہ)

فاطمہ، انعم، سدرہ، حنا، خیبر پختونخواہ سے۔ "اس دفعہ کا پاکیزہ جلدی مل گیا۔ پیپرز سے پہلے سوچ نہیں سکتے کیا خوشی ہوئی۔ سرورق واقعی سالگرہ نمبر کی شوخی لیے ہوئے تھا۔ دیکھ کے دل باغ، باغ ہو گیا۔ سب سے پہلے پڑھا اللہ اور اس کا نور...... ذکیہ آپا جس طرح بچیوں کا کردار سنوار رہی ہیں شاید انہیں خود بھی اندازہ نہ ہو...... اللہ سے دور چلی جانے والی ہم لڑکیاں اس تحریر سے دوبارہ اپنا رشتہ استوار کرنے میں کامیاب ہو پائیں، دعا کیجیے گا۔ اللہ پاک اجر عظیم دے آپ کو آپا۔ (یہی تو مقصد ہے کہ اصلاح معاشرہ ہو) سب سے پہلے افسانے پڑھے...... ثمینہ عظمت، پڑھی لکھی کے ساتھ پہلے نمبر پر رہیں، ویل ڈن جی۔ باقی میں قانتہ رابعہ، ہما علی اور رفاقت جاوید کے افسانے اچھے تھے...... اس کے بعد حیا بخاری کے ناولٹ محبت لفظ ہے لیکن کی طرف دوڑ لگائی...... اور افففف...... لاسٹ سین نے سانس روک سی دی...... لالہ پاگل ہے جو ضیا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ پلیز کسی طرح بھی لالہ اس کے ساتھ نہ جائے۔ ضیا میرا فیورٹ کیریکٹر ہے مگر نہ جانے کیوں لگتا ہے وہ ضرور کچھ غلط کرے گا۔ کیونکہ میری سمجھ میں کہانی کی تھیم ہی بدلہ، انتقام اور مکافات عمل ہے اور لالہ ہر وقت ماں کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو دوسرے اس کے ساتھ کرتے ہیں تو گناہ گار تو وہ بھی ہوئی تو ایسا کچھ تو ضرور ہی ہوگا۔ پلیز، پلیز لالہ کے ساتھ کچھ غلط نہ ہو۔ اور ایک درخواست یہ بھی کہ پلیز پیجز بڑھا دیں اس ناول کے...... (اس دفعہ آپ کی فرمائش پوری ہو گئی) رفعت آپا کا یہ کہاں بچیں کہ دل ہے۔ اس ناول کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، پورے کالج کا فیورٹ ہے یہ ناول، اور کہانی اس قدر تیز ہے کہ ایک اپی نے بھی بور نہیں کیا۔ امرت اس بار کی اپی زبردست رہی ورنہ کافی سلو ہو گیا تھا۔ ناولٹ دونوں اچھے تھے، بنت سحر سے بس ایک گلہ ہے کہ ہر دفعہ ان کی ہیروئن محبت سے منکر ہو کر بعد میں عشق کر بیٹھتی ہے، پلیز نیو آئیڈیاز پہ بھی لکھیں۔ ان کے قلم میں جادو ہے اسے کسی اور موضوع پر بھی آزمائیں...... (چلیں بنت سحر، ان کے مشورے پر بھی عمل کر لیں) اور ہاں پاکیزہ میں چند دن پہلے ہم نے سرمہ بنایا مضمون چھپا تھا چھوٹا سا...... ہمارے تو دل پر نقش ہو گیا۔ اس کی لکھنے والی کو بھی داد پیش کرتے ہیں (جی ضرور فریدہ افتخار نے لکھا تھا) شاعری میں شہلا، لاہور اور کرن، کراچی کا انتخاب بہت پسند آیا۔ تبصرے بہت عمدہ ہوتے ہیں، ان کے صفحات بڑھا دیں اور پاکیزہ واحد ڈائجسٹ ہے جہاں سب سے زیادہ خطوط نہ صرف شائع ہوتے ہیں بلکہ جواب بھی مفصل دیا جاتا ہے۔ اور خط پڑھنا

بچ میں بہت اچھا لگتا ہے۔ تبصرہ طویل ہو گیا کیونکہ ہم چار دوستوں نے مل کر لکھا ہے آپ کاٹ چھانٹ کر گزارہ کر لیجیے گا۔ ہی ہی ہی......" (یہ تو ہے، دلچسپ تبصرے کا شکریہ)

ام حمزہ، گوجرانوالہ سے۔ "مجھے پاکیزہ بہت پسند ہے، اس میں شامل افسانے، ناولٹ، ناول سب بہترین ہوتے ہیں۔ یہ کہاں بچیں کہ دل اور امرت زبردست بھئی، بہت عمدگی سے دونوں ناول ہمارے دلوں میں گھر کر چکے ہیں۔ بنت سحر اور ناہید نے بہت عمدہ لکھا...... سحر ساجد کا مکمل ناول دیکھتے ہی پڑھا لیکن مایوسی ہوئی۔ سحر نے اپنے انداز سے بالکل ہٹ کر لکھا جیسے ان سے زبردستی لکھوایا گیا ہو۔ امید ہے جلد اچھے ٹاپک کے ساتھ آئیں گی۔ (سحر ساجد نے یہ ناول کئی ماہ پہلے دیا تھا وہ ہر دفعہ ورائٹی لاتی ہیں) ثمینہ عظمت بھی دل میں گھر کر گئیں۔ قانتہ کے افسانے کی سمجھ نہیں آئی۔ (ارے اتنا خوب صورت پیغام تھا) ہما علی کا اللہ مالک یقین پختہ کر گیا۔ رفاقت جاوید نے بھی اچھا لکھا واقعی ہم لوگ بس اس دنیا کا لالچ رکھتے ہیں جو ختم ہونے والی ہے۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ افسانوں میں اس بار طیبہ جی کو مس کیا بہت اعلیٰ لکھتی ہیں۔ (جی وہ جلد آئیں گی) حیا کا ناولٹ بھی بہت اچھا ہے۔ مگر لالہ کا سلوک ماں سے ٹھیک نہیں اقرا کی جگہ کہیں اسے ہی سبق نہ مل جائے۔ خیر کہانی میں سسپنس ہے آگے کھلے گی تو پتا چلے گا، مجھے یہ ناولٹ اس لیے بھی زیادہ پسند ہے کیونکہ اس میں میرے مرحوم بیٹے علی حمزہ کا نام شامل ہے۔ پاکیزہ کا معیار پچھلے چند ماہ میں بہت بلند ہوا ہے۔ اللہ پاک اسے اور ترقی دے اور ہر سال یونہی پیار سے ہم اس کی سالگرہ مناتے رہیں۔" (انشاء اللہ، تبصرے کا شکریہ، بیٹے کا سن کر افسوس ہوا۔)

فائزہ فاروق سحر، لاہور سے۔ "سب کو بہت، بہت سالگرہ مبارک...... جتنے سال کا پاکیزہ ہے اتنے ہی سالوں کا میرا اس کا ساتھ ہے پہلے امی پڑھتی تھیں انہوں نے بچپن میں عادت ڈال دی اس کے پڑھنے کی۔ رسالے تو بہت پڑھے مگر اتنے ماہ و سال سے۔ یہ ریکور آتا ہے۔ (بہت خوشی ہوئی جان کر) اگلے ماہ سے روزے شروع ہیں، اللہ سب بہنوں کو بہت سارے نیک اعمال کرنے کی توفیق دے۔ (آمین) خاص کر پرانے برتن، کپڑے غریبوں میں بانٹ دیجیے...... اور اپنا صدقہ خیرات، زکوٰۃ سب نکال دیں۔ اللہ سب کو خوش رکھے اور ڈھیروں برکتوں والے لمحے عطا کرے۔ آمین۔ سب چھوٹے بڑوں کو عید کی خوشیاں عطا کرے، اور پیار و محبت سے رہنے کی توفیق دے۔ ہمارے ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ڈھیروں خوشیاں عطا کرے۔ اللہ پاک ہر برائی سے ہر آفت سے سب کو محفوظ رکھے، آمین۔ دونوں سلسلے وار کہانیوں کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ اب تو اینڈ کا بھی بے صبری سے انتظار ہے۔ پاکیزہ ڈائری سب سے اچھی تھی اور سب کی تحریر خوب تھی۔ شعر و شاعری بھی خوب رہی۔" (مختصر سے تبصرے کا شکریہ، بے شک اس بابرکت ماہ میں ہمیں خصوصاً اپنے اردگرد ضرورت مندوں کی ضرور مدد کرنی چاہیے)

سلمٰی غزل، کراچی سے۔ "پاکیزہ کی سالگرہ نے رسالے میں چار چاند لگا دیے اور مصنفین نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس مرتبہ تمام افسانے غضب کے دلچسپ، مقصدی اور سبق آموز تھے ہر افسانہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ اور یہ بھی اتفاق ہے کہ دو تین افسانوں کا موضوع ایک ہی رہا۔ یعنی لڑکیوں کی شادی جو پاکستان میں ایک گمبھیر اور سنجیدہ مسئلہ ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میں بھی فی سبیل اللہ یہ کام کر رہی ہوں...... سمجھا کریں گناہوں کا بوجھ کچھ تو کم ہو (ارے واقعی صدق دل سے یہ کیا جائے تو بہت نیک کام ہے) مگر یقین کیجیے لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر پھر لڑکیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور لڑکے نکھے، جب امائیں فون پر پوچھتی ہیں تو بڑی شرمندگی محسوس ہوتی ہے اور دل کرتا ہے لڑکوں کو کہیں سے پکڑ کر لے آؤں اب آتے ہیں افسانوں کی طرف۔ (ہاں یہ تو ہے) ثمینہ عظمت علی کی پڑھی لکھی حقیقت کی آئینہ دار قانتہ رابعہ نے بھی لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ ہمیشہ کی طرف اچھا لکھا ہما علی کا اللہ مالک اچھا تھا۔ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کی تو بات ہی کیا راضی بہ رضا۔ غیر ضروری طوالت کے باوجود لاجواب۔ میراث میں بھی شرعی مسئلے کو اجاگر کیا۔ لیکن سحر ساجد نے ہم دو موضوع تو بہت اچھا لیا مگر کچھ زیادہ ہی ہو لیا۔ افسانے کی غیر ضروری طوالت نے مزہ نہیں دیا۔ (یہ مکمل ناول تھا) پیغام اچھا تھا کہ لڑکے لڑکی کبھی دوست نہیں ہو سکتے مگر بات وہی کہ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے۔ بالکل غیر فطری اور غیر شرعی بہر حال معذرت خواہ ہوں مجھے مقصدی افسانہ ہوتے ہوئے بھی زیادہ مزہ نہیں آیا۔" (چلیں اپنی، اپنی پسند ہے)

شمع فلک، رحیم یار خان سے۔ "تین سال بیت گئے اپنے پاکیزہ سے بچھڑے ہوئے کیونکہ اڑھائی سال پہلے باہر جانا پڑا۔ باجی انجم کے وقتوں میں، میں تبصرہ لکھتی رہتی تھی۔ اب آپ کا نام پڑھ کر خوشی ہوئی۔ کامیابی آپ کے قدم چومے۔

انشاء اللہ ملاقات رہے گی۔ یہ دو افسانے پاکیزہ کی نذر کر رہی ہوں...... اگر آپ کو پسند آجائیں تو پلیز ضرور شائع کیجیے گا، شکریہ......'' (شمع تمہاری دوبارہ آمد اچھی لگی...... افسانے پڑھنے کے بعد بتائیں گے۔ تم تبصرہ بھی لکھو)

☚ تسنیم قریشی، کوہاٹ سے۔ ''سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا حسبِ حال اور حسبِ موقع آپ نے بہت اچھا لکھا۔ اور معلومات میں اضافہ بھی ہوا یہ بات تو ہمیں معلوم ہی نہیں تھی کہ پانی کا بھی عالمی دن منایا جاتا ہے۔ صاف پانی کا تو ہر جگہ بحران ہے۔ ماروی اچھی تحریر تھی ایسی ہی پُراعتماد مضبوط اور بہادر لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ آخری لمحے اچھی کاوش تھی۔ ام ایمان کی تحریر کرنی کا پھل بھی پسند آئی اگر ہر شخص اپنی ذمے داریاں پوری کرتا آج ہم بہت کامیاب ہوتے۔ یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ مائیں اپنے سر سے بوجھ اتار کر بچوں کو ٹیوشن کے لیے بھیج دیتی ہے اور اکثر ٹیوشن والے بچوں کو اِدھر اُدھر دوڑاتے رہتے ہیں۔ شمع ہدایت، اللہ اور اس کا نور ہمیشہ کی طرح ایمان افروز تحریر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کو صحت و زندگی عطا فرمائے۔ غزالہ رشید سے ملاقات اچھی لگی۔ اسی طرح رائٹرز اور کسی اور شعبے میں نمایاں خدمات انجام دینے والی خواتین سے ملاقات زیادہ کروایا کریں۔ بہنوں کی محفل ہمیشہ کی طرح سجی ہوئی تھی مگر ہم شامل نہیں تھے۔ پاکیزہ ڈائری اور مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح اچھے لگے۔'' (پیاری تسنیم آپ کا خط ہمیں اکیس مارچ کے بعد ملا تھا جبکہ آپ نے چھ تاریخ ڈالی ہے لہٰذا اس دفعہ شامل کر رہے ہیں۔ بہت شکریہ تبصرے کا)

☚ شازیہ ہاشم میوانی، کھڈیاں خاص، قصور سے۔ ''مارچ کے شمارے میں مجھے کچھ کہنا ہے، مدیرہ کے خوب صورت الفاظ میں لکھا گیا حقوقِ نسواں پر موتیوں کا ہار بے حد پسند آیا۔ اللہ سے دعا کرتے ہوئے کہ اے اللہ! بنت اسلام کی حفاظت فرما پھر دین کی باتوں سے فیضیاب ہوتے ہوئے اللہ اور اس کا نور سے قلب و جاں کو نورانیت بخشتے ہوئے سب سے پہلے پڑھا۔ محبت لفظ ہے لیکن...... زبردست حیا بخاری بہت زبردست طریقے سے تسلسل اور روانی سے سلسلے کو لے کر چل رہی ہیں لیکن لالہ کی ذہنیت کو سلام کرنا پڑا جس نے اقرا کو اپنی بہن سمجھتے ہوئے اس کے لیے خود کو ڈھال بنایا۔ اور زمزمہ کے بارے میں جان کر بے حد افسوس ہوا مسرت اس بات پر ہوئی کہ اس نے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ پھر امرت پڑھا سب سے پیارا کردار امرت کا اور اس کے چاچو کا ہے۔ کیونکہ اس کا چاچو اس پر جان چھڑکتا ہے اور زین کی بے حسی اور بدکرداری پر بے حد افسوس۔ کہاں امرت جیسی پاکیزہ لڑکی اور کہاں زین...... گھوڑی چڑھیا، پڑھ کر ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا کہ وہ تو اپنی پلاننگ میں لگے ہوئے تھے ان کے باپ نے اور ہی کچھ کارنامہ سرانجام دے دیا۔ دل اک ادھورا چاند...... اور ایک فقرے نے آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا۔ عشق سچا ہو تو منزل ضرور مل جاتی ہے۔ افسر سلطانہ کی ت سے تکون معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتی ہوئی تحریر نے دل و جاں کو لرزا کر رکھ دیا اور آنکھیں جل پڑیں۔ یہ کیسے ماؤں کے بیٹے ہیں جو گلابوں کو مسل کر رکھ دیتے ہیں اور کلیوں کو کھلنے سے پہلے مرجھا دیتے ہیں۔ آخری لمحے افسانہ بھی اچھا تھا۔ کرنی کا پھل زبردست، ام ایمان ایک، ٹیچر یا پرنسپل کو اس کے اصل فرائض سے آگاہی دلاتی تحریر اچھی لگی۔'' (شکریہ)

☚ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ''پاکیزہ کا سالگرہ نمبر ملا بے حد خوشی ہوئی۔ ذکیہ جی کا اللہ اور اس کا نور پڑھ کر دلی سکون ملا۔ سالگرہ نمبر میں تمام بہنوں کے نام کے ساتھ اپنا نام پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ عذرا جی میں پھر پچھلے ماہ سے سخت بیمار ہوں بس اچھا نہیں لگتا بیمار کہنا مگر تمام بہنیں دعائیں دیتی ہیں تو لکھ رہی ہوں مجھے بھی تمام ہڈیوں میں بے حد درد ہوتا ہے اور روحانی علاج بھی کر رہی ہوں۔ شمیم فضل خالق کا دوستی ایسا ناتا، سحر ساجد کا مکمل ناول ہم دو، رفاقت جاوید کا میری جنت لاجواب اپنی پیاری دوست فصیحہ آصف خان کی نعت مقبول کیا بات ہے پڑھ کر مزہ آ گیا۔ بے حد سرور ملا خوش رہو فصیحہ جی سدرہ کلثوم تمہارا فون نمبر مجھ سے گم ہو گیا۔ اپنا فون نمبر دو، تم میری پیاری بہن ہو...... پروین بھابی دعائیں دینے کا شکریہ پرنس افضل بھائی کو بے حد سلام اپنی غزل دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پاکیزہ کو چھیالیسویں سالگرہ مبارک ہو۔'' (آپ کو بھی مبارک ہو، اللہ آپ کو صحت والی زندگی دے، آمین)

☚ عذرا آفتاب، کراچی سے۔ ''پیاری نزہت آپ سب لوگ کیسے ہیں۔ آپ عذرا رسول کی معیت میں ماشاء اللہ بہت اچھا کام کر رہی ہیں مگر مجھے اپنی رائٹرز اور ڈراما نگاروں سے بھی شکوہ ہے کہ وہ کب تک عورتوں کی مظلومیت اور بیچارگی کے قصے سنائیں گے اگر ایسے قصے ہیں تو ان کو پوزیٹو ٹچ دیں...... نوجوان ذہنوں کو ایجوکیٹ کریں انہیں شعور دیں رشتوں کے حسب مراتب احترام اور عزت سکھائیں آخر کب تک ایک بیٹا اپنی ماں کو پٹتے دیکھ کر بیوی سے بھی وہی سلوک کرے گا یا پھر بیوی کے کہنے میں آکر بہن سے بدسلوکی کرے گا...... خدارا اپنے معاشرے کو سنوارنے کی کوشش کریں۔ یہ میری آپ سب سے ہی درخواست ہے۔ رشتے بہت خوب صورت اور قیمتی ہوتے ہیں انہیں سنوارنے اور سنبھالنے کے طریقے بتایئے۔'' (عذرا آپ کی حساس طبیعت نے ہی یقیناً یہ لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ ہماری رائٹرز تو ہر ممکن کوشش کرتی ہیں کہ اپنی کہانیوں کے ذریعے درست اور غلط کی تمیز سکھائی جائے اور مثبت طرزِ زندگی کی طرف راغب کیا جائے، نشاندہی کا شکریہ......)

☚ خالدہ محمود، لاہور سے۔ ''میں عرصہ تیس سال سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں، اس میں شامل تمام سلسلے پسند ہیں خصوصاً روحانی مشورے بہت اچھے ہوتے ہیں، پچھلی دفعہ ذیابیطس کا اچھا علاج بتایا۔ ان باتوں کے لیے جزاک اللہ......'' (بہت شکریہ)

☒ خدیجہ شہوار، ملتان۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ...... آپ کی کہانیاں موصول ہو گئی ہیں، پڑھنے کے بعد قابلِ اشاعت کا فیصلہ ہوگا۔ آپ تبصرہ بھی ضرور بھیجیں۔

☚ ایمل آرزو، اوکاڑہ سے۔ ''باجی کہانی چھاپنے کا شکریہ...... یہاں رسالہ دیر سے ملتا ہے۔'' (آپ سالانہ لگوالیں، شکریے کی کیا بات ہے یہ ماہنامہ آپ ہی کا ہے)

☒ تسمیہ الطاف، ایبٹ آباد۔ آپ کی کہانیاں ضرور شائع ہوں گی، تھوڑا انتظار کرلیں۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

☒ انعم بتول، لاہور۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ...... آپ کی کہانی قابلِ اشاعت ہے۔

☒ لبنیٰ قدیر، لاہور۔ تسلی رکھیں لبنیٰ اور پاکیزہ کا مطالعہ جاری رکھیں، آپ کی کہانی تھوڑی طویل ہے، انشاء اللہ جلد لگے گی۔

☒ فرحت انصاری، ملتان۔ بہن اپنی باری کا انتظار کریں۔ اب ایک کہانی تو چھپ گئی ہے دوسری کا نمبر بھی جلد آجائے گا...... رسالے کو پسند کرنے کا شکریہ...... تبصرہ بھی لکھیں۔

☒ نسرین اختر نینا، اسلام آباد۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ...... آپ کی کہانیاں منتخب ہیں، انشاء اللہ جلد جگہ پائیں گی۔

☚ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ''خوب صورت سرورق لیے خوب صورت سا پاکیزہ ہاتھوں میں آیا دل شاد ہوا۔ پاکیزہ کے ساتھ جڑی یہ زنجیر وفا روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ (جی ہاں) یوں لگتا ہے ایک ہی خاندان کے لوگ ایک ہی آنگن میں مل بیٹھ کر اپنا دکھ سکھ بانٹ رہے ہیں۔ ماشاء اللہ سلسلے سارے ہی لاجواب ہیں بس گوشۂ ظرافت اور پسندیدہ اشعار والا کالم نہ جانے کیوں پسند نہیں آرہا...... شعروں کا معیار دیکھ کر لگتا نہیں کہ پاکیزہ کا کالم ہے، معذرت کے ساتھ (اور بہتری کی کوشش کریں گے۔ انشاء اللہ) ارے واہ شمع تفسیر کا تحفہ تو فریم کرانے لائق ہے بس کوزے میں دریا بند کرنے کے مترادف ہے، یہ خاص الخاص سالگرہ سب کو مبارک ہو۔ یہاں بچیں کہ دل ہے، سلسلے وار کہانی خوب ہے مگر خدارا...... ہیرو کو ماورائی مخلوق نہ بنائیں۔ وہ اسی زمین کا باسی ہے۔ چلتے پھرتے انسانی طبقات کا فرق تو ہے مگر کھاتے سب گندم ہی ہیں، کوئی برگر، پیزا کی شکل میں تو کوئی چپاتی، روٹی سالن کی شکل میں بھوک سب کو لگتی ہے۔ اسے بس انسان ہی رہنے دیں زمین پر چلنے پھرنے والا۔ (آئیڈیل سچویشنز بھی تو ہوتی ہیں ناں) شمیم فضل خالق، کیا لاجواب آئیڈیا ہے کہ دوست جا، جا کر رشتہ کرانے کی بات کرتے ہیں۔ انجام اچھا تھا۔ ایکٹنگ کرنے کا کہ کہاں تو ہیرو مرنے والے تھے کہاں خوشخبری کا ٹیکا لگتے ہی بھلے چنگے ہو کر جی اٹھے...... کہانی کا خیال اچھا ہے۔ (یہی تو آپ محبت ہے) بہنوں کی پاکیزہ محفل اسلام آباد میں سجانے کی نوید سنا کر دل شاد کر دیا۔ ایک دو ماہ کے لیے بچوں کے پاس بیرون ملک روانگی ہے، انشاء اللہ ماہ ستمبر میں مل بیٹھنے کا پروگرام بنائیں یا پھر سردیوں میں (اللہ نے چاہا تو) ویسے کراچی والے تو اسلام آباد کی سردیوں میں کانپ، کانپ جاتے ہیں (اب ایسا بھی نہیں) میزبان ہم جیسے ہوں گے تو مجال ہے سردی قریب بھی پھٹکے ہماری خوشی اور گرم جوشی ہی محفل گرمانے کو کافی ہوگی۔ جب بھی پروگرام بنے غریب خانہ حاضر ہے، دیدہ و دل فرش راہ پائیں گی (بہت نوازش) ایک ضروری بات یاد آگئی، ویمن ڈے مناتے وقت ہمیں بی بی فاطمہؓ ڈے، حضرت خدیجہؓ ڈے، بی بی زینبؓ ڈے منانے کا خیال کیوں نہیں آتا۔ یہ عظیم ہستیاں وہ ہستیاں ہیں جن کی گودوں کے پلے فرزندوں نے تاریخ رقم کی ہے، آج ساری دنیا میں مدرڈے کا تو یاد کیا جاتا ہے مگر ہم اپنی سنہری شاندار تاریخ سے کیوں چشم پوشی کرتے ہیں، آج کی مائیں کیا سکھا رہی ہیں اپنے بچوں کو...... (بالکل درست کہہ رہی ہیں) میری ایک رائے ہے کہ گوشۂ ظرافت کے کالم کے بجائے اگر ایک صفحہ مسلم امہ کی ان برگزیدہ امہات المومنین کے بارے میں تذکرہ ہو تو کیا کہنے...... ہماری پاکیزہ قاری بہنیں، بیٹیاں اس سے مستفید ہوں گی۔'' (جی گوشۂ ظرافت بہت سے قارئین کی فرمائش ہے رہی بات ان برگزیدہ ہستیوں کی تو یقیناً ان کے لیے صفحات حاضر ہیں، اختر شجاعت جس طرح خلوصِ نیت سے تحقیقی مضامین لکھ رہی ہیں وہی ان ہستیوں پر بھی ضرور لکھیں گی انشاء اللہ)

٭ مسکان شہزاد احمد، لاڑکانہ سے۔ ”پاکیزہ بہنوں کی محفل میں شرکت کی وجہ اپریل کے پاکیزہ میں شامل آپا شمیم خالق کا افسانہ دوستی ایسا ناتا ہے، سعد اور شہاب کی مخلص اور سچی دوستی جو ہر خواہش ہر احساس سے بلند تھی آنکھوں میں آنسو لے آئی...... ایسے ٹاپک پر مزید کہانیاں بھی ہونی چاہئیں تا کہ آج کے بچوں کو اندازہ ہو سکے کہ رشتوں کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ ہر خواہش ہر چاہت سے زیادہ...... قسط وار ناول دونوں مجھے بہت پسند ہیں، حیا بخاری کا ناولٹ بھی بہت جاندار ہے۔ سارا مہینہ انتظار کرتی ہوں اس کا مگر پیجز بہت کم...... ابھی کرداروں کا ہاتھ تھامتی ہی ہوں کہ باقی آئندہ ماہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ سحر ساجد کا ناول بس ٹھیک تھا۔ باقی افسانے سب اس ماہ بھی اعلیٰ تھے۔ بنت سحر نے بھی ہمیشہ والی کہانی کردار تبدیل کر کے دوبارہ لکھ دی۔ (محبت کی کہانی تو ایک ہی ہوتی ہے کردار مختلف ہوتے ہیں) ناہید سلطانہ اختر کا راضی بہ رضا بے حد عمدہ، بنت، افتاعلی اور اٹھان زبردست...... فرحین اظفر بھی بہت اچھا سلسلہ لائی ہیں، ایک، ایک کہانی دل جیت رہی ہے اس حروف تہجی سلسلے کی۔ باقی سارا پاکیزہ آج کل جگمگانے لگا ہے۔ نیا، نیا سا لگتا ہے معیاری اور بہترین۔ اپنے پاکیزہ کو ترقی کے کامیاب سال مکمل کرنے پر ساری ٹیم کو مبارک باد اور دعا......“ (بہت شکریہ تبصرے اور دعاؤں کا)

٭ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے آج بات ہو جائے بنت سحر کے ناول دریار کی اس عشق و محبت کی کہانی کو اسٹوری آف دی منتھ کہوں تو غلط نہیں ہوگا۔ پڑھی لکھی، ثمینہ عظمت علی کی حقیقت سے بہت قریب اسٹوری بھی بہت پسند آئی اور جناب ناہید سلطانہ اختر کے ناول راضی بہ رضا نے تو دل موہ لیا۔ اسی طرح ایک سہارے کی آس ناہید فاطمہ حسنین کے افسانے کا تو جواب ہی نہیں، بیٹوں کو فوقیت دینے والوں کے لیے آئینہ ہے یہ کہانی اور دامن میں جس کے ایک بھی تار رفو نہیں۔ بنت زہرا ثانی کے اس افسانے نے بالکل متاثر نہیں کیا۔ جبکہ دوستی ایسا ناتا، شمیم فضل خالق نے بھی مایوس کیا۔ کیونکہ یہ بالکل عام سی بے تاثر کہانی لگی سوری البتہ پہ کہاں بچیں کہ دل ہے، دلچسپ ہوتا جا رہا ہے اور ہاں امرت بھی اچھا لگ رہا ہے مگر پڑھنے کے بعد پیاڈول ضرور کھانی پڑتی ہے کیونکہ کرداروں کو یاد رکھنا اور سمجھ کر پڑھنا بڑا مشکل کام ہے۔ (اوہو اب تک کتنے پتے ختم کر لیے) بہر حال چلتے ہیں سحر ساجد کے ناول ہم دو کو صرف دو صفحہ پڑھ کر ہی دل اوب گیا۔ البتہ رفاقت جاوید کے افسانے میری جنت لاجواب کو بہت اچھا کہہ سکتے ہیں۔ پاکیزہ ڈائری بھی عمدہ ہوتی ہے۔ رضوانہ پرنس کا انٹرویو مزہ دے گیا۔ اور بہنوں کی محفل کا تو جواب ہی نہیں، مزے، مزے کے خط اور آپ کے ننھے منے جوابات دلکش لگتے ہیں، نزہت پاکیزہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت ترقی دے، آمین۔“ (بہت شکریہ کہ آپ کے تبصرے کا...... آپ بہنوں کے تنقیدی و تعریفی تبصرے اسے مزید بہتر بناتے ہیں)

٭ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ”پاکیزہ کا سالگرہ نمبر ہا کر نے 9 تاریخ کو لا کر دیا۔ اتنا دلکش اور خوب صورت ٹائٹل نظروں سے کم، کم گزرا ہے۔ ماڈل کے سر پر دوپٹا دلکشی میں چار چاند لگا رہا تھا۔ دونوں ناول سرپٹ جا رہے ہیں، کہانیوں میں پڑھی لکھی، وہی ہے رکھتا سماعتیں بھی، زوردار تحریریں رہیں، ناہید سلطانہ اختر کا راضی بہ رضا آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا۔ یہ رمز اگر ہم سمجھ جائیں تو آدھی سے زیادہ مشکلات کا خاتمہ ہو جائے۔ ایک سہارے کی آس میں ناہید فاطمہ حسنین نے بڑی تلخ سچائی پر قلم اٹھایا۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے بیٹیوں کے مقابلے میں بیٹوں کو ترجیح دینا اور اپنا سہارا سمجھنا حالانکہ سہارا صرف خدا تعالیٰ کا ہی ہوتا ہے۔ بنت سحر نے دریار لکھ کر محبت کا صحیح مفہوم اجاگر کیا۔ رضوانہ پرنس سے ملاقات سرشار کر گئی۔ سنگ، سنگ چلیں، نیا سلسلہ بھی بے حد شاندار ہے۔ بہنوں کی محفل میں آپ نے مجھے خوشیوں کی بہت بڑی سوغات دے دی۔ یہ اعزاز صرف پاکیزہ کو حاصل ہے کہ وہ اپنے تمام قارئین، مصنفین، شاعرات سب کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور یہی اس کی کامیابی کا راز ہے، اسی کی بدولت ہم سب ایک حسین و جمیل مالا میں پروئے ہوئے ہیں۔“ (جی یہ تو درست کہا، ارم آپ مراسلات صفحے کے ایک طرف لکھ کر بھیجا کریں۔ آپ ای میل بھی کر سکتی ہیں)

٭ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”اس بار پاکیزہ سالگرہ نمبر اریج خان کے سرورق سے سجا میرے ہاتھوں میں ہے، اریج خان واقعی خوب صورت لگ رہی تھی۔ آپ اداریے میں فرما رہی تھیں کہ پاکیزہ چھیالیس سال کا ہو چکا ہے اور انشاء اللہ ہم قارئین آپ کے ساتھ چار سال بعد اس کی گولڈن جوبلی بھی منائیں گے۔ بشرط زندگی۔ (انشاء اللہ ضرور) دین کی باتیں، اللہ اور اس کا نور پڑھ کر روح کو سرشار کیا، سالگرہ ہے آج تمہاری میں شمع تفسیر نے مجھ ناچیز کو بھی یاد رکھا ان کا شکریہ...... بہنوں کی محفل میں آپی عذرا رسول نے ہم رائٹرز کو بھی پاکیزہ کی مبارک باد دی، جی آپی ہم نے پاکیزہ کی چھیالیسویں سالگرہ کی

مبارک باد قبول کی اس کی اصل حقدار تو آپ اور نزہت اصغر اور انجم انصار آپی ہیں، نزہت آپی! آپ نے ذرا عمر رفتہ کو آواز ( ) میں جو بہنیں مصروف ہو گئی ہیں انہیں آواز دی اور جو بہنیں دنیا میں نہیں رہیں انہیں بھی یاد کیا...... جو بہنیں اب تک پاکیزہ سے جڑی ہوئی ہیں ان کا بھی ذکر کیا ان میں آپ نے مجھ ناچیز کو بھی یاد کیا آپ کا بہت، بہت شکریہ...... اس موقع پر آپ نے انجم آپی کو یاد کیا ہمیں بہت اچھا لگا۔ (وہ تو ہمارے ساتھ، ساتھ ہی ہیں) ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عذرا آپی کی ممانی جان کو اور معراج بھیا کی بڑی ہمشیرہ اور آپی فریدہ جاوید فری اور امینہ عندلیب کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ اور آپی انجم انصار کے والدین کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔“ (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

٭ عقیلہ حق، کراچی سے۔ ”گو کہ میں کبھی ایک ریگولر تبصرہ نگار نہیں رہی لیکن آپ کی اور خاص کر عذرا رسول صاحبہ و جملہ اسٹاف کی محبت اور رسالے کی روز بروز نئی جدت مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ آپ کا اداریہ بہت خوب صورت تھا لفظ، لفظ موتی تھے۔ اللہ پاک قیصرہ حیات صاحبہ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آنحضرتؐ کے اسمائے گرامی قابلِ قدر ہیں۔ پڑھی لکھی ایک خوب صورت تحریر اور ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کا کیا کہنا ان کی تحریر پر تبصرہ تو سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ (جی ہاں) قانتہ رابعہ نے بھی بہت مختصر اور خوب صورت تحریر پڑھنے کو دی۔ دراصل رسالے کی ہر تحریر کیونکہ میرٹ پر شائع ہوتی ہے اس لیے زبردست ہوتی ہے، ناہید سلطانہ، رفاقت جاوید اور دیگر تمام مصنفین کی تحریریں بہت اچھی رہیں۔ ان تمام قارئین کا شکریہ جن کو میری تحریر پسند آئی۔ آپ سب کی کھٹی میٹھی رائے ایک مصنف کے لیے ٹانک کا درجہ رکھتی ہے میری ایک قاری بہن کی شکایت تھی کہ میری تحریر، میری ہی اپنی ایک تحریر ”مہر“ کا چربہ تھی۔ اپنی ہی تحریر کا چربہ کچھ سمجھ نہیں آیا، میری پیاری بہن آپ نے افسانے کی ایک معمولی غلطی تو پکڑ لی کہ ایک جگہ میں نے خالد کی ماں کو بیوہ لکھا اور دوسری جگہ ماں باپ لکھ دیا۔ انسان ہوں غلطی ہو جاتی ہے لیکن آپ میری تحریر ”مہر“ اور ”اے زندگی جواب دے“ کے مرکزی خیال کو نہ سمجھ سکیں دونوں کے مرکزی خیال میں زمین آسمان کا فرق ہے میری بہن، دوبارہ ضرور پڑھیے گا لیکن محبت کے ساتھ۔ تنقید کرنے کے لیے نہیں...... (ہزاروں قارئین کی آرا الگ، الگ ہوتی ہیں...... ہم سب کی رائے کا احترام کرتے ہیں) شائستہ زریں کا سروے ہمیشہ کی طرح بہت اچھا رہا۔ اب آتے ہیں ہم سب کی پیاری ہنستی مسکراتی رضوانہ پرنس کے انٹرویو کی طرف...... ان کا انٹرویو بہت زبردست رہا، رضوانہ میں بہت ساری اچھی باتیں ہیں لیکن ایک عادت جو مجھے بہت پسند ہے کہ وہ کبھی نہ تو کسی کے معاملے میں بولتی ہیں، ان کا فلسفہ ہے ہر شخص کی اپنی زندگی ہوتی ہے اور نہ ہی غیبت کرتی ہیں اور یہ دونوں عادتیں بہت پیاری ہیں۔ رضوانہ اللہ پاک آپ کو خوش رکھے، آپ کی زندگی ہمیشہ مسکراتی رہے، آمین۔ ڈیئر نزہت لکھنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن میں جانتی ہوں صفحات محدود ہیں اور ہمیں دوسروں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ (جی ہاں بالکل) خیال رکھنے سے خیال آیا بہت سالوں سے پاکیزہ نے میری سالگرہ یاد کرنی چھوڑ دی ہے۔ ماہ جون میں میری سالگرہ ہوتی ہے جناب...... میں اور عذرا رسول آگے پیچھے آئے تھے عالم بالا سے۔ تمام مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور جاندار رہے۔ اللہ پاک آپ سب کی محنت کو قبول کرے۔“ (بہت شکریہ، ارے سالگرہ یاد رکھنے سے کبھی، کبھی ڈپریشن بھی ہو جاتا ہے؟ خیر چلیں اب کے یاد رکھیں گے)

٭ صبا آصف، گلشن حدید، کراچی سے۔ ”نزہت آپ سے فون پر بات کرتے ہوئے ڈیڑھ سال تو ہو ہی گیا ہے۔ پہلی مرتبہ بات ہونے پر میں حیران ہو گئی کہ اتنے مصروف لوگ اتنے اخلاق سے بات کر سکتے ہیں۔ آپ کے اخلاق سے بات کرنے اور خوب صورت لب و لہجے نے میرے دل میں خوشی سی بھر دی وہ دن اور آج کا دن جب بھی فون پر بات کرتی ہوں ایسا لگتا ہے کسی بہت اپنے سے بات کر رہی ہوں، آپ کو دوسروں کا دل رکھنا آتا ہے۔ (الحمد للہ) سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مدیرہ بن کر بھی آپ میں غرور نہیں آیا۔ مدیرہ تو پہلے بھی تھیں لیکن اب تو انجم باجی کی جگہ ہیں ترقی ہوئی اس کے ساتھ، ساتھ اخلاق میں بھی اتنی میٹھی زبان، کیا چائے میں چینی زیادہ لیتی ہیں، مذاق (میں تو بغیر چینی کا قہوہ پیتی ہوں) کاش کہ میں بھی آپ سے کچھ سیکھ جاؤں۔ (ارے آپ تو میٹھی کہانی ہیں ڈیئر) افسانے، ناولٹ، مکمل ناول سب ہی بہت اچھے۔ وہی ہے رکھتا سماعتیں بھی قانتہ رابعہ، ہما علی کا افسانہ اللہ مبارک، اللہ تعالیٰ پر توکل کا درس دیتے ہوئے۔ ویلڈن قانتہ رابعہ اور ہما علی...... اور سب بھی بہت اچھے تھے آج جلدی ہے اس لیے سب پر تبصرہ نہیں بھیج رہی۔“ (پیاری صبا آپ کے کہنے کے مطابق پورا خط لگا دیا ہے، میری تعریف اور سراہنے کا بہت شکریہ...... آپ کے جذبات قابلِ قدر ہیں، کوئی اپنا وقت نکال کر فون کرتا ہے تو بد اخلاقی تو گناہ کے زمرے

میں آجاتی ہے، اللہ ہم سب کو اپنا عاجز و خاکسار بندہ بنائے رکھے، آمین)

✉ شازیہ سرفراز، کراچی۔ بہن آپ سب کے خطوط، میسج، مراسلات ہم تک پہنچتے ہیں۔ کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ کچھ کمی بیشی ہو تو ہم مواد کو درست بھی کر دیتے ہیں۔ بس آپ لوگ اپنی مخلصانہ رائے، مشورے، تنقید، تجاویز سے ضرور نوازیں مگر پاکیزہ کا باقاعدگی سے مطالعہ کر کے۔ اللہ آپ کو خوش آباد رکھے۔ اب بھی آپ سروے میں شامل ہو سکتی ہیں۔ اللہ آپ کے بچوں کو بھی ہر امتحان میں کامیاب کرے، آمین۔

✍ ماہ رخ، سوات سے۔ ''باجی میں پاکیزہ میں شامل ہر ناول بہت شوق سے پڑھتی ہوں، حیا بخاری کا ناولٹ، محبت لفظ ہے لیکن بہت عمدہ جا رہا ہے، اس دفعہ کی قسط نے تو ہمارے دل چھو لیے، ہر قسط ایک زبردست موڑ پر ختم ہو رہی ہے، اگر یہ کہوں کہ حیا جو لکھتی ہیں وہ کسی بھی اداس دل کی فریاد ہوتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی تحریر حقیقی لمحوں کی سرگوشی ہے، اللہ پاک تمام لکھنے والوں کو کامیابی سے ہمکنار کرے...... پورا پاکیزہ ہی بہت اعلیٰ ہے، آپ سب کو سالگرہ نمبر کی بہاریں مبارک ہوں۔'' (بہت شکریہ ماہ رخ)

✍ نرگس، ضلع باغ، آزاد کشمیر سے۔ ''پورا پاکیزہ ہی بہت اچھا ہے، ہم سب یہاں بہت شوق سے پڑھتے ہیں، ایک شکایت ہے کہ یہاں رسالہ بہت دیر سے ملتا ہے۔ (آپ سالانہ لگوالیں ہر ماہ کی پہلی کو گھر پر مل جائے گا) باجی آپ نے ام باجی کی سیٹ اچھے سے سنبھال لی ہے اللہ آپ کو استقامت دے۔'' (بس آپ سب کی دعائیں چاہئیں)

✍ فاریہ احمد، رحیم یار خان سے۔ ''باجی میں ساتویں کلاس سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں، اب تو میری شادی کو انیس سال ہو گئے ہیں (ماشاء اللہ) میرا دل بھی بہنوں کی محفل میں آنے کو چاہتا تھا مگر ہمت نہیں ہوتی۔ اب آپ کا نمبر ملا تو ہمت بندھی...... مجھے پاکیزہ بہت اچھا لگتا ہے۔'' (بس اب ہمت کر لی ہے تو ہر ماہ حاضری دینا)

✍ نادیہ، راول پنڈی سے۔ ''پیاری آپی سب سے پہلے آپ سب کو سالگرہ مبارک ہو، پاکیزہ کا سالگرہ نمبر پڑھ لیا اور دل خوش ہو گیا۔ آپ نے مجھے شامل کیا۔ (یہ تو آپ کا حق ہے) آپ جس طرح نئے و پرانے رائٹرز کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں وہ قابلِ قدر ہے۔ پاکیزہ کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے۔ اپنے پیارے وطن کے لیے بھی سب بہنوں سے دعا کی درخواست ہے۔ (جی بالکل اس پاک وطن کی بدولت ہی ہم ہیں) شمع تفسیر نے جو پاکیزہ کو گفٹ دیا ہے وہ ہم سب کی آواز ہے (جی بالکل) دین کی باتیں ایمان تازہ کر دیتی ہیں۔ عذرا آپی اور معراج صاحب اور سب کے لیے دعائیں کرتی ہوں آپ سب بھی میرے بچوں کے لیے دعائیں کریں اور میرے حالات بھی ٹھیک ہو جائیں۔'' (آمین)

✉ سعدیہ وحید سعدی، اسلام آباد۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی کہانیاں جلد لگیں گی۔

✍ فاطمہ، کامرہ قلعہ اٹک سے۔ ''جب سے پاکیزہ پڑھنا شروع کیا ہے مجھے بہت اچھا لگا...... یہ تنہائی میں میری سہیلی ہے اور دکھ درد کا ساتھی ہے۔'' (بہت خوب)

✍ احساس بی بی، لسبیلہ اوتھل سے۔ ''پاکیزہ تو ہے ہی پاکیزہ...... یہ ہماری ذہنی نشوونما کرتا ہے، بہت کچھ اچھا سیکھنے کو ملتا ہے، اسے پڑھ کر مزہ آتا ہے۔'' (شکریہ)

✍ شمائلہ مبین، راول پنڈی سے۔ ''پیاری باجی آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے اور آپ بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔'' (بہت شکریہ، کہانیوں پر تبصرہ بھی کریں)

✍ ریما نور رضوان، کراچی سے۔ ''باجی میری کئی کہانیاں ہیں، پلیز اس پر غور فرمالیں۔ پاکیزہ تو برسوں سے پڑھ رہی ہوں، بہت اچھا لگتا ہے۔'' (جی ضرور فکر نہ کریں)

✍ پروین عذرا تشنہ، کراچی سے۔ ''بہت شکریہ میری کہانی چھاپنے کا اور بہنوں نے تبصرہ بھی خوب کیا۔ سب کا شکریہ...... اب میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، تمام اہلِ پاکیزہ کو سالگرہ کی خوشیاں مبارک ہوں۔ میں اور بھی کہانیاں بھیج رہی ہوں۔'' (جی ضرور)

✉ یمنیٰ اظفر، لاہور۔ آپ کی کہانی بھی ضرور لگے گی، پہلے خوب مطالعہ کریں پھر کہانی بھیجیں۔

✍ سیما محمد عالم، کراچی سے۔ ''والدین کی مغفرت کے لیے خبر لگانے کا شکریہ، میری طبیعت بھی آج کل ٹھیک نہیں رہتی مگر پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔'' (اللہ آپ کو صحت دے)

✉ قرۃ العین قسیم، کراچی۔ آپ کو پاکیزہ میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ پہلے آپ پاکیزہ کا خوب مطالعہ کریں، اس پر اپنی

رائے دیں پھر کہانی بھی ضرور بھیجیں، صفحے کے ایک طرف واضح لکھائی میں لکھیں...... اس پر اپنا رابطہ نمبر ضرور لکھیں...... اور صفحات نمبر بھی ضرور درج کریں۔

✍ مسز زریں زبیر کوٹھاری، کراچی سے۔ ''پچھلے دنوں میں کافی بیمار ہو گئی تھی۔ اس لیے رابطہ نہیں کر پائی۔ مارچ کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ انشاء اللہ باقاعدگی سے تبصرہ اور مراسلات بھیجوں گی۔'' (جی ضرور)

✍ حدیثہ اختر، حاصل پور سے۔ ''حسبِ دستور میرے بیٹے منیب نے خوشی خوشی پاکیزہ لا کر دیا کہ ماما جی اب آپ فریش ہو جائیں۔ جی آپ سب کو ہمارے پاکیزہ کی سالگرہ بہت، بہت مبارک ہو، اللہ پاک ہمیشہ اس پاکیزہ باغ اور اس کے باغبانوں کو سلامت رکھے۔ پہلے دین کی باتوں سے مستفید ہوئے پھر ذکیہ بلگرامی آپا کے پاس جا بیٹھے...... اختر شجاعت کا شمع ہدایت پڑھا ایمان افروز بات ہے حیا...... جزاک اللہ، گوشۂ ظرافت میں آئے کیا خوب سوپ تھا۔ روحانی مشوروں سے بھی فیض یاب ہوئے اور آپ کی حسبِ ہدایت کلاس بھی لے لی۔'' (جی ہاں کتابت کی غلطی ہو جاتی ہے)

✉ حافظہ ست البنات، تونسہ شریف۔ بیٹی تم ابھی پڑھائی میں دل لگاؤ اور فارغ وقت میں رسالے پڑھ سکتی ہو مگر ابھی کہانیاں نہ لکھو...... انشاء اللہ سیکھ جاؤ گی۔

✉ نسیم منظر، کراچی۔ امید ہے آپ کو انعامی پاکیزہ مل گیا ہوگا۔ تبصرہ بھی ضرور لکھیں۔

✍ رفعت جہاں، اورنگی ٹاؤن کراچی سے۔ ''اپریل کا پاکیزہ شمارہ ہاتھ میں آیا تو اس بار یہ فیصلہ کر لیا کہ اب بس بہت ہوا آخر کب تک ہم اپنے اندر موجود رائٹر کو زمانے سے چھپا کر رکھیں گے حالانکہ ہماری کہانیاں گھر والوں سمیت کئی کزنز بھی پڑھ چکے ہیں مگر قاری بہنوں کے سامنے آنے میں کچھ جھجک سی تھی حالانکہ کئی دفعہ کوشش کی کہ بھیج دوں مگر پھر وہی شرم اور جھجک نہ جانے لوگوں کو کیسی لگے تو بالآخر ہم نے چپکے، چپکے کاغذ سیاہ کرنے شروع کر دیے اور اب بہت ہمت کر کے اپنی چھوٹی سی کوشش آپ کو بھیج رہی ہوں، امید ہے پسند آئے گی اور اگلے ماہ پیارے شمارے کی زینت بنے۔ اب چلتے ہیں شمارے کی طرف تو ناولز تو سبھی لاجواب تھے۔ افسانوں کی تعداد بڑھانے کی گزارش ہے کم وقت میں سوچ کا نیا در کھول دیتا ہے افسانہ...... میرے گھر میں سبھی آپ کا شمارہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ بچپن میں امی کو پڑھتے دیکھا پھر حکایات پڑھنے سے آغاز کیا تو افسانوں تک پہنچے اب تو کافی لمبے عرصے سے ناول پڑھنے لگے ہیں۔'' (رفعت خوش آمدید، کہانی دوبارہ میل کریں۔ وہ ہمیں نہیں ملی ہے آپ مطالعہ جاری رکھیں)

✍ رابعہ عمران چوہدری، رحیم یار خان سے۔ ''پاکیزہ کا سالگرہ نمبر ملا...... سرورق بہت خوب صورت لگا، مجھے کچھ کہنا ہے میں بہت پیاری نزہت اصغر کو دیکھ کر بے حد و حساب خوشی ہوئی۔ اللہ پاک شاد و آباد رکھے۔ بہت پرانا تعلق ہے نزہت سے اور اس ادارے سے...... انجم آنٹی اور عذرا رسول صاحبہ کو سلام...... (ان کی طرف سے وعلیکم السلام اور دعائیں) دین کی باتیں پڑھ کر دلی سکون بھی ملتا ہے اور علم بھی اضافہ ہوتا ہے کیونکہ ہم گھروں میں قرآن ضرور پڑھتے ہیں مگر ترجمہ نہیں پڑھتے۔ اللہ اور اس کا نور پڑھ کر دل چاہا ذکیہ بلگرامی کے ہاتھ چوم لوں۔ ماشاء اللہ ثمینہ عظمت کا افسانہ پڑھی لکھی بہت اچھا لگا۔ قانتہ رابعہ کی تحریر خوب تھی اللہ پاک جو کرتا ہے جس وقت کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ ہما علی کی مختصر تحریر خوب تھی، اللہ کے اپنے بندے کے لیے فیصلے کبھی غلط نہیں ہو سکتے۔ ناہید فاطمہ کی تحریر نے دل اداس کر دیا، بیٹیاں تو پیاری ہوتی ہیں بہت سے لوگ بیٹیوں کی پیدائش پر بہو کو الزام دیتے۔ اولاد تو مرد کا نصیب ہے، بیٹیاں تو گھروں کی رونق ہوتی ہیں رفاقت جاوید کی تحریر پُراثر تھی دولت کا کیا مان کرنا آج ہے کل نہیں...... بنت سحر نے لاجواب تحریر لکھی۔ ریمل آرزو کی تحریر بھی اچھی لگی۔ ع سے عورت، ت سے تہمت منفرد کہانی، عمدہ تحریر...... تلخ حقیقت ہے ہمارے معاشرے کی۔ اللہ رحم فرمائے، یہ کہانیاں صرف کہانیاں ہی نہیں...... یہ سب کچھ اصل زندگی میں ہو رہا ہے۔ سمیرا حمید نے اچھا لکھا۔ اختر شجاعت حیا کا عنوان لیے ہیں، فاطمہ بیں دل پڑھ کر روشن ہو گیا۔ اللہ ہم سب کے چہروں پر حیا کی روشنی پھیلا دے۔ (آمین) رضوانہ پرنس ہنستی کھلکھلاتی بہت اچھی لگیں۔ اپنے جوابات کے ساتھ۔ اللہ پاک ہونٹوں کی یہ ہنسی سلامت رکھے، آمین۔ سروے بھی اچھا تھا۔ بہنوں کی محفل کی کیا ہی بات ہے مزہ ہی آجاتا ہے محفل میں جا کر...... فصیحہ آصف، شمیم فضل خالق، پروین افضل، آج سے دس سال پہلے بھی ہر صفحے پر ان کا نام دیکھنے کی عادت تھی۔ اب بھی دیکھ کر اپنائیت کا احساس ہوا۔ نزہت نے پیار کا جو رشتہ تھا اس کا اندازہ ان سے بات کر کے ہوا جب بات ہوئی اور میں نے اپنا پورا نام نہیں بتایا۔ میں نے کہا رابعہ بات کر رہی ہوں۔ اور دس سال بعد بھی نزہت اصغر نے کہا کہ رابعہ...... رابی، جی میں بولی

رابعہ اسلم وڑائچ، پاکیزہ ادارے کے ڈائجسٹ دلکش میں بہت لکھا تھا۔ آخری ناول 2007ء میں چھپا۔ سچے جذبے۔ 2008ء میں شادی ہوگئی۔ لکھتی تو رہی مگر کم کم...... اللہ پاک ادارے کو ترقی دے، آمین انشاء اللہ...... اگلے ماہ حاضر ہوں گی بشرطِ زندگی......" (بہت پیاری رابعہ تم سے بات کر کے اور تبصرہ پڑھ کر بہت اچھا لگا اب اسی طرح آتی رہنا)

آغا اویس احمد، خیر پور میرس سے۔ "پہلی بار پاکیزہ میں انٹری دے رہا ہوں، دینی نہیں چاہیے تھی لیکن ایک بات کی مذمت کرنے کے لیے دے رہا ہوں۔ وہ یہ کہ اپریل کے شمارے میں ہما علی صاحبہ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ مرد، عورتوں کے رسالے نہیں پڑھتے اور سبق حاصل نہیں کرتے ہیں، ہما صاحبہ آپ کو کیا پتا آپ سے زیادہ مرد، عورتوں کے رسالے پڑھتے ہیں لیکن وہ ان میں لکھنے کو مناسب نہیں سمجھتے۔ دوسری بات اکثریت میں اقلیت کو فوقیت نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ مرد، عورتوں کے رسالوں میں نہیں لکھتے۔ اگر پاکیزہ میں مردوں کے لیے بھی کوئی صفحہ مخصوص کیا جائے تو بہت بہتر ہوگا۔" (محترم رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ...... صرف آپ کی رائے ضرور چھپ سکتی ہے)

شہلا نواز، لاہور سے۔ "اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو، آنٹی عذرا رسول و انکل معراج رسول انجم آنٹی اور دیگر اراکینِ پاکیزہ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین ثم آمین) جب سے انجم آنٹی نے پاکیزہ کی ادارت چھوڑی، سچی بات ہمارا تو پاکیزہ میں لکھنے کو دل ہی نہیں کیا، پڑھتے ضرور تھے لیکن تبصرہ لکھنے کا دل ہی نہیں کرتا تھا۔ مگر سالگرہ نمبر میں نزہت آپا نے جس محبت سے ہمیں پکارا تو ہم حیران ہوگئے اور ہمیں دلکش میں خطوط لکھنے کا زمانہ یاد آ گیا اور ہم پاکیزہ میں چلے آئے کہ پاکیزہ کا کاروبار چلے...... ہاہا ہمارا یہی اسٹائل تو سب کو پسند ہے (یہ منہ اور مسور کی دال) ہماری خانہ آبادی ابھی نہیں ہوئی منگنی ہو کے ٹوٹ چکی ہے جس کا ہمیں کوئی غم نہیں کیونکہ منگنی تو ڈھکنی ہوتی ہے اور ہمارے گھر والوں نے بھی لڑکے والوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ لیے تھے اس قدر لالچی تھے توبہ شرعی داڑھی رکھ کر مولوی صاحب نے دین کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ خیر ہم خوش ہیں کہ ہماری جان بچ گئی لالچی لوگوں سے بلکہ ہم نے تو باقاعدہ مٹھائی کھا کے منگنی ٹوٹنے کی خوشی سلیبریٹ کی (بہت خوب بھئی اللہ لالچی لوگوں سے بچائے) اور یقین واثق ہے کہ سب کی دعائیں ہمیں ضرور لگیں گی۔ (انشاء اللہ ضرور) اللہ سب بہنوں کے نصیب کھولے۔ اس بار سالگرہ نمبر سوپر ڈوپر تحاریر سے لب ریز تھا، مزہ آ گیا تمام تحاریر عمدہ تھیں۔ بنت سحر کا ناولٹ دریار خاص کی چیز تھا۔ فائقہ رابعہ اور ناہید سلطانہ کے افسانے مایوس بہنوں کے لیے ٹانک تھے۔ انجم آنٹی کے جلترنگ بند کر کے آپ نے ان کو بالکل ہی بھلا دیا یہ بہت غلط کیا۔ ان سے دوبارہ جلترنگ لکھوائیں۔ نزہت آپا آپ اپنی ذمے داری بہت احسن طریقے سے نبھا رہی ہیں۔" (ڈیئر شہلا تمہارے خط کی بہت خوشی ہوئی۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے، تمہاری قسمت میں بہت اچھا لکھا ہے...... انشا اللہ جہاں تک انجم باجی کے جلترنگ لکھنے کی بات ہے تو ڈاکٹر نے انہیں پڑھنے لکھنے کے کام سے منع ہی تو کر دیا تھا اور بیچاری نے اتنی تکلیف بھی اٹھائی۔ ویسے گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے تو ہم ان کے جلترنگ ریپیٹ ہی کر رہے تھے۔ اسی طرح جن بھی کرتے رہیں گے۔ ہمارے پاس اساتذہ مزاح نگاروں کے لیے کافی فرمائش آئی تھی اس لیے ان سے بھی آپ لطف اندوز ہوں کیونکہ کلاسیکی ادب کم، کم پڑھنے کو ملتا ہے، ہر کوئی کتابیں خریدتا ہے نہ پڑھتا)

☆☆☆

دیکھیں اس مرتبہ بھی صفحات کم پڑ گئے خیر باتیں تو ہوتی رہیں گی اب اجازت چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر آن ہر گھڑی اپنی حفاظت میں رکھے۔ ہم سب کو رزقِ حلال نصیب فرمائے، اپنے فضل و کرم سے ہمارا دامن سیراب کر دے۔ اے رب کریم اپنے حبیب پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے سے ہمارے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے...... بے شک تو بڑا بخشنے والا غفور الرحیم ہے!

آپ کی خیریت کی طالب

نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

اے اللہ

وہ خالق وہ مالک زمین و زماں کا
وہی رازداں ہے مکاں لامکاں کا
وہ تسکینِ دل ہے وہ تسکینِ جاں ہے
مداوا محبت کے دردِ نہاں کا
جو دیکھے ازل تا ابد چشمِ بینا
کرشمہ نظر آئے گا کُن فکاں کا
یہ دل کیا ہے میں جان قربان کردوں
جو اٹھ جائے پردہ کہیں درمیاں کا
بس اِک نام ہے موت بھی زندگی بھی
تماشا فقط ہے یقین و گماں کا
اسے اک نظر دیکھنا چاہتا ہوں
جو تریاق ہے میرے دردِ نہاں کا
پشیماں نہ ہوا اس کی رحمت کبھی کی
مجھے پاس ہے تیرے اشکِ رواں کا
یہاں کی نہ پوچھو جو گزری وہ گزری
خیال اب شب و روز ہے بس وہاں کا
تقی حق نے کیا، کیا نہ انعام بخشے
کرو شکر ہر نعمتِ بیکراں کا

کلام: تقی دہلوی

پسند: صبا نورین

نعت شریف ﷺ

میرے لب پہ ہر دم صلِ علیٰ ہے
وہ شاہ مدینہ حبیبؐ خدا ہے
میری زندگی آپؐ کے در پر گزرے
یہی ہے تمنا یہی التجا ہے
بے مانگے ہی مجھے اُن سے ملا ہے
شیوہ ہی جن کا جود و سخا ہے
مجھے کیا ضرورت جاہ و حشم کی
مجھے بننا کافی اُن کے در کا گدا ہے
میں اپنے مقدر پہ کیوں نہ ہوں نازاں
مجھے اُمتی کا جو رتبہ ملا ہے
میں دیکھوں مدینہ تو پھر کچھ نہ دیکھوں
میرے شوق کی بس یہی انتہا ہے
زمانے سے غافل ذرا ہو کے دیکھو
فقیری کا بھی اپنا الگ ہی مزہ ہے
وہ دشمن کو بھی دیکھیں میٹھی نظر سے
یہ شانِ کریمی بھی اُن کی ادا ہے
میری سب خطائیں وہ بس بخشوا دیں
اجر کی یہ اک دیرینہ دعا ہے

عقیدت گزار: زمر نعیم اجر، لاہور

فضیلت نمازِ پنجگانہ

☆ جب کسی گھرانے میں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بچہ کسی مسلمان گھرانے میں اپنی آمد کی خوشخبری لایا ہے۔

☆ جب کوئی بچہ اپنی عمر کی سات بہاریں دیکھ لیتا ہے تو والدین پر لازم ہے کہ وہ اپنے بچے کو نماز پڑھنے کی عادت ڈالیں۔

☆ نماز پڑھنے کی اتنی زیادہ تلقین کی گئی ہے کہ اگر بچہ پابندیٔ وقت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتا تو اسے سختی کر کے نماز پڑھنے کو کہیں۔

☆ نمازِ فجر سے لے کر نمازِ عشا تک نمازوں کے لیے پانچ وقت وضو کرنا ہوتا ہے جس سے نہ صرف جسم کی صفائی ہو جاتی ہے بلکہ چہرے پر رونق بھی آ جاتی ہے۔

☆ نماز اور قرآن پاک پڑھنے سے نمازی کے چہرے پر ایک خوب صورتی اور نور پیدا ہوتا ہے۔

☆ نماز بدکلامی اور فحش باتوں سے روکتی ہے۔

☆نماز ادا کرنے سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔
از: ہمشیرہ علیم یعقوب، لاہور

خصوصی دعا

اے اللہ! ہم آخرت کے مسافر، اس دنیا کے جنگل سے گزرتے ہوئے حرص و طمع کی بارش اور لامتناہی خواہشات کے طوفان کے باعث بھٹک کر گمراہی کے غار میں گھر گئے...... جس میں ظلم کے زہریلے سانپ ہیں جو بار، بار ہمارے ضمیر کو ڈستے ہیں۔
اس غار کے منہ پر لالچ کا پتھر پڑا ہوا ہے جو ہمیں اس سے نکلنے نہیں دیتا! اے اللہ ہمارے گناہوں کا دفتر تیرے سامنے ہے تو اپنی رحمت سے بہت زیادہ نہ سہی اتنے نمبر لگا دے کہ ہم رعایتی پاس ہو کر تیری جنت میں داخل ہوسکیں۔

دعا گو: ساجدہ ظفر، کمالیہ

تجلیاں

لکھ، لکھ کے نعتیں ہوگئیں حاصل تجلیاں
گدائے نبیؐ کی آرزو و ساحل تجلیاں
مدینے میں رہوں ہر پل بس یہ ہی شوق ہے
مدینے میں جا کے ملتی ہیں کامل تجلیاں
آقاؐ کے در پہ آکر کھلیں نیکیوں کے پھول
بدیوں کے واسطے بنیں قاتل تجلیاں
کیف و سُرور دل کو، چہرے کو نور بخشیں
کرلیتی ہیں یہ جنت کے قابل تجلیاں
چھوڑا ہوا ہے حق کو کافر نے گو یہاں
مانگے گا روزِ حشر کو باطل تجلیاں
آقاؐ کے ہر گدا نے کتنے گدا کیے ہیں
دکھلائے ہم نشینوں کو حاملِ تجلیاں
کوثر میں ڈوب، ڈوب کے یادِ نبیؐ میں آج
سانسوں میں کررہی ہوں شامل تجلیاں

کاوش: کوثر خالد، جڑانوالہ

بچے کا روزہ

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بچے نے روزہ رکھ لیا۔ آدھا دن تو جیسے تیسے اس نے گزار لیا لیکن پھر بھوک، پیاس کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہوگئی اور اس نے اس خیال سے کہ اگر میں چپکے سے کچھ کھالوں تو کسے خبر ہوگی، روزہ توڑ دیا۔ گھر والوں کو واقعی علم نہ ہوا اور وہ شام میں بچے کے روزے کی افطاری کی تیاری میں لگ گئے لیکن ظاہر ہے اب روزے سے بچے کا کچھ سروکار نہ رہا تھا۔
حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں کہ وہ بوڑھا اس بچے سے بڑھ کر نادان ہے جو دکھاوے کے لیے روزہ رکھتا ہے اور نمازیں پڑھتا ہے عبادت تو وہی ہے جو صرف اللہ پاک کی خوشنودی کے لیے کی جائے ایسی نماز تو الٹا دوزخ کی طرف دھکیل دے گی۔

ادا کرتا ہے جو سجدے ریاکاری کے دامن پر
نہ ان سجدوں سے روشن ہوگی ہرگز تیری پیشانی
فراہم کر کہیں سے دولتِ احساس سینے میں
بس اخلاص کی حدت سے دل ہوتے ہیں نورانی

از حکایتِ سعدی،
مرسلہ: مہرین کنول، لیہ

پاکیزہ کی سالگرہ پر خصوصی دعا

یا اللہ، تیری شان بہت بلند ہے اپنی عظمت کے واسطے پاکیزہ سے وابستہ اور مجھ سے وابستہ میرے پیاروں کی زندگی خوشیوں سے بھر دے۔ یا مولائے کریم ہم سب کی خطاؤں کو معاف فرما اور ہمیں محبت و سلامتی والی زندگی عطا کر اور ہمارا خاتمہ ایمانِ کامل پر کرنا۔
نیک تمناؤں کے ساتھ

از: نسیم سکینہ صدف، ڈسکہ

غزل

تیری پیاری، پیاری آنکھیں
سارے جگ سے نیاری آنکھیں
جب دیکھا محسوس ہوا ہے
سب سے خوب تمہاری آنکھیں
پھولوں کا گلدستہ ہیں یہ
خوشبو سی دلداری آنکھیں
تاروں جیسی چمکیں ہر دم
روشن دیپک، خماری آنکھیں
تیری آنکھوں جیسی کب ہیں

ہم نے لاکھ سنواری آنکھیں
قاتل جیسے نین تمہارے
جیسے تیز کٹاری آنکھیں
دے ہے دعائیں خانم کا دل
غم سے ہوں یہ عاری آنکھیں

کلام: فریدہ خانم، لاہور

قابلِ غور

☆ضروری نہیں کہ کچھ توڑنے کے لیے پتھر ہی اٹھاؤ بس لہجہ بدل کر بولنے سے بھی دل ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔
☆انسان سخت مزاج اس وقت بنتا ہے جب اس کی نرم مزاجی کا بہت لوگ ناجائز فائدہ اٹھا چکے ہوں۔
☆ماں باپ سے آپ کا سلوک ایک ایسی کہانی ہے جو لکھتے آپ ہیں مگر آپ کی اولاد پڑھ کے آپ کو سناتی ہے۔

از: صباحت ضیا بخش، کیماڑی کراچی

سالگرہ مبارک

دعا ہے یہ ساعت
ہزار ہا سال آئے
خوشیوں کا نور
یونہی تیرا چہرہ منور رکھے
اور صدیوں تک
تم وقت کے تھال میں
عمر کے سنہری سکے پھینکو
اور جب تم کیک کاٹو
تو تمہاری آنکھوں کے لو دیتے دیے
سب کے چہرے پر جگمگاہٹیں بکھیریں
اور سب تمہیں مبارک باد دیں
اے میرے پیارے پاکیزہ
عمر کی یہ سنہری روپہلی گھڑیاں مبارک ہوں

از طرف: فضہ بتول، بہارہ کہو

اک پاگل لڑکی

ہاتھوں میں اِک قلم دبائے
کہنی کو گھٹنوں پر ٹکائے
پلکوں پر ریشم خواب سجائے
دل میں اِک آشا سی جگائے
اور آنچل کو سر پر جمائے
اِک پاگل لڑکی
پہروں کسی کو سوچتی ہے
ہر پل ہر دم چونکتی ہے
من ہی من رو دیتی ہے
پھر لمحہ، لمحہ کچھ سوچتی ہے
اور
خود ہی خود ہنس دیتی ہے
اِک پاگل لڑکی

از: ایم سحر منان، چوک اعظم، لیہ

عجیب ہے زندگی

☆یہ زندگی بھی کتنی عجیب ہے۔ ایک دن مرنے کے لیے ساری زندگی جینا پڑتا ہے۔
☆زندگی سے پوچھا۔ ”سب کو اتنا غم کیوں دیتی ہو؟“
زندگی بولی۔ ”میں تو سب کو خوشی دیتی ہوں پر ایک کی خوشی دوسرے کا غم بن جاتی ہے۔“
☆شخصیت میں عاجزی نہ ہو تو معلومات میں اضافہ علم کو نہیں تکبر کو جنم دیتا ہے۔
☆دوست بے شک ایک ہو...... لیکن ایسا ہو جو الفاظ سے زیادہ آپ کی خاموشی کو سمجھے۔

از طرف: بلقیس جعفر، کوئٹہ

نوخیز کلیوں کے لیے دعا

یارب......!
میرے ملک کی بچیوں
کے نصیب میں عزت لکھ دے
دکھ ان کے نصیبوں کے
سب مٹا کر سکھ لکھ دے
بچا ان کو ہر اذیت و تکلیف سے
بچا ان کو ظالم درندوں، بھیڑیوں سے

اے میرے اللہ
ان کے سروں پر رحمت کے آنچل ہوں
ان کی عزت کی حفاظت
زمین و آسماں کرے
پھر نہ یہاں کوئی بچی زینب کی
مثال بنے
ایسے نہ کوئی ماں اجڑے
جیسے اجڑی ہے
زینب کی ماں

کاوش: نسیم نیازی، لاہور

غزل

تم نے دیکھا تھا میں کس قدر چپ رہی
مجھ کو کرنے لگے در بدر میں چپ رہی
میری سہمی ہوئی آنکھ میں خوف تھا
راہ جتنی بھی پُر خطر میں چپ رہی
کتنے موسم میرے دکھ پہ ہنستے رہے
زخم سہتی رہی عمر بھر میں چپ رہی
میری قسمت میں ہر سو اندھیرے ہی تھے
میری سہمی ہوئی نظر پہ چپ رہی
جن کو مانگا تھا مجھ کو ملا ہی نہیں
سب دعائیں ہوئی بے اثر میں چپ رہی
مجھ کو راہوں پہ چھوڑا گیا فری
پاس کوئی نہ تھا ہم سفر میں چپ رہی

کلام: فریدہ فری، لاہور

سنہری بات

☆جس درخت کی لکڑی نرم ہوگی اس کی شاخیں زیادہ ہوں گی پس تم نرم طبیعت اور نرم گفتار بن جاؤ تاکہ تمہارے چاہنے والے زیادہ ہوں۔

قول حضرت علی کرم اللہ وجہہ

☆ضمیر......سڑک پر لگے اس معلوماتی سائن بورڈ کی طرح ہے جو راستہ اور صحیح سمت تو بتاتا ہے مگر اس پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔

☆زندگی کی سب سے بڑی فتح نفس پر قابو... پانا ہے۔ اگر نفس نے دل پر فتح پائی تو سمجھو کہ وہ دل

کردہ ہے۔

از: سعدیہ وحید سعدی، اسلام آباد

بولو ماں

بولو ماں
میں اور تم کیا یونہی ہمیشہ
پیڑوں تلے ہنستے باتیں کرتے
انجانے رستوں، گلیوں میں
چلتے رہیں گے
اور سرخ چناروں کے سائے سائے
ٹھنڈے چشموں کے پانی کو
اپنے ہاتھوں میں بھریں گے
پھولوں کی شبنم کو
اپنی پلکوں سے چنیں گے
یا پھر تم
کسی انجانی راہوں سے گزرتے
اِک دن مجھ سے کہوگی
وہ دیکھو، وہ گھر تمہارا
راہ تمہاری تکتا ہے
ہاتھ ہلا کر مجھے پیار کروگی
اور آنکھوں سے کہوگی
میرا آگے رستہ ہے
بولو ماں
کیا ہم دونوں
کبھی ایسے بھی بچھڑیں گے
میں چاہوں تم کو روک سکوں
نہ تم چاہو میں رک جاؤں
بس تھوڑی دیر
آنکھوں، آنکھوں میں
اک دوجے کو دیکھیں گے
گلے ملیں گے اور
سدا یونہی ملیں، بچھڑیں گے
بولو ماں کیا یونہی ہمیشہ......

کلام: ہما علی، اسلام آباد

☆☆☆



☆رافیہ بشیر......کھاریاں
سو جاتا ہے فٹ پاتھ پہ اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتا

☆عروبہ ناز......کوٹلی
ہٹ کر چلیں وہ ہم سے جنہیں سر عزیز ہو
ہم سر پھروں کے ساتھ کوئی سر پھرا چلے

☆نائلہ جبیں......پنجاب
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائی سادگی سے کھا گیا مزدور مات

☆غزالہ شاہد......کراچی
ہر کسی کے ہاتھ پہ بک جانے کو تیار نہیں
یہ میرا دل ہے، تیرے شہر کا اخبار نہیں

☆سعدیہ بشیر......کھاریاں
اس ملک میں مزدور سا کوئی در بدر نہیں
جس نے سارے گھر بنائے اس کا کوئی گھر نہیں

☆فرح طاہر......ملتان
اداسی چیختی ہے قہقہوں میں
ہمارا درد سب سے مختلف ہے

☆آنسہ احسان......گجرات
دن بھر کی مشقت کا صلہ دیکھ لے صاحب
مزدور کو اجرت میں صرف بھوک ملی ہے

☆توبیہ جواد......کھاریاں
ہر طرف اس کی ہی محنت کے مظاہر ہیں مگر
بھوک کے ہاتھ میں مزدور بکھر جاتا ہے

☆نعمانہ جاوید......بہاولپور
اب کے ملنے کی شرط یہ ہوگی
دونوں گھڑیاں اتار پھینکیں گے

☆کائنات عبدالحلیم......میرپور خاص
میری آنکھوں میں یہ قدموں کے نشاں تو دیکھو
کس طرف لوٹ گیا خواب میں آیا ہوا شخص

☆ارم کمال......فیصل آباد
ہم شجر تھے شجر ہی رہے
وہ بدلتا رہا موسموں کی طرح

☆حمنیٰ قندیل......کمالیہ
ہم کو احساس تک نہیں ہوتا
ہم کسی کی حیات ہوتے ہیں

☆ایمن زرناب......ٹوبہ ٹیک سنگھ
یہ میرا ہنر تیری خوشیوں سے وابستہ ہے
مرے سارے لفظوں پہ تیری حکمرانی ہے
کھیل جو بھی تھا جاناں، اب حساب کیا کرنا
جیت جس کسی کی ہو، ہم نے ہار مانی ہے

☆جبیں نیاز......ملتان
غم بیاں کرنے کو کوئی اور ڈھنگ ایجاد کر
تیری آنکھوں کا یہ پانی تو پرانا ہوگیا

☆رفیعہ ابدالی......کراچی
ملول تھا دل آئینہ ہر خراش کے بعد
جو پاش، پاش ہوا اک خراش بھی نہ رہی

☆شاہین مسعود......کمالیہ
تنہا کوئی ہے تو کریں دل کی بات بھی
ہر آدمی کے ساتھ ہے سایہ لگا ہوا

☆مہرین رضا......کراچی
اہل دنیا کی ہوس خیز نگاہوں سے کہو
میں نہیں پیار کا احرام بدلنے والی
چل پڑی ہے جو ہوا، اس کو دھواں کر دے گی
دیپ کی لو ہے سرِ بام بدلنے والی

☆ سائرہ ارم ڈوگر......کمالیہ
کبھی جو ماں سے سن کر ہنس پڑی تھی
ان ہی باتوں پہ روتی جا رہی ہوں
محبت منتقل ہونے لگی ہے
میں اب بچوں کی ہوتی جا رہی ہوں

☆ عرشیہ جنید......کراچی
آیا وہ پاس چاند کی ناؤ میں بیٹھ کر
بچھڑا تو کتنی ظلمتیں ہستی کو دے گیا

☆ ساجدہ......محلّہ جنڈیوالا
فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابنِ آدم نے
خرد گنوا کے، جنوں آزما کے کیا پایا
وہی شکستِ تمنا، وہی غمِ ایام
نگاہِ زیست نے سب کچھ لٹا کے کیا پایا

☆ صبا سجاد......دبئی
محبت ہار کے جینا بہت دشوار ہوتا ہے
اسے بس اتنا کہہ دینا بھرم توڑا نہیں کرتے

☆ شازیہ ہاشم......قصور
سر جھکا دیں شوق سے حق کی اطاعت کے لیے
اور کیا شے ہے اسی کا نام تو اسلام ہے

☆ ساجدہ ظفر......کمالیہ
اس تشفّی کے ساتھ کہ آئے گی اب بہار
ہم نے تمام عمر بتادی خزاں کے ساتھ

☆ نگہت آصف......اسلام آباد
مجھ کو خدائی کی قسم رکھتے ہیں گھیرے دم بدم
تیرے یہ عشق میں صنم، آتش و آب و خاک و باد
کیوں نہ حواس خمسہ کم اہلِ سخن کے ہوں نصیر
تجھ ہی سے بس ہوئے رقم، آتش و آب و خاک و باد

☆ عشا نور......نور پور نون، سرگودھا
تیری راہ گزر پہ نکلی ہوں
بہت تنہا بہت اکیلی ہوں
زمانہ جسے سلجھاتا رہا عشا
ایک وہی میں الجھی پہیلی ہوں

☆ فرخندہ جعفری......گجرات
میرے پاس ہی سے گزرے میرا حال تک نہ پوچھا
میں یہ کیسے مان جاؤں کہ وہ دور جا کے روئے

☆ بیگم تنیم......جہلم
اس جہاں میں کب کسی کا درد اپناتے ہیں لوگ
رخ ہوا کا دیکھ کر اکثر بدل جاتے ہیں لوگ

☆ نجمہ ناز اصغر......کراچی
تری طرح سے کون ہوگا کہ زندگی اپنی
تمہاری یاد کے نام انتساب کردے گا

☆ طیبہ الیاس......سرگودھا
کل کی طرح بلند ہیں سب حوصلے میرے
کشتی بھنور میں ہے کردار تو نہیں

☆ ثمینہ کوکب......جہلم
جو جس کا حق ہے اسے روز سونپ دیتے ہیں
بچا کے کچھ بھی تو ہم رائگاں نہیں رکھتے
جو نیکی کرتے ہیں دریا میں ڈال دیتے ہیں
کبھی حسابِ غمِ دوستاں نہیں رکھتے

☆ نرگس نسیم......صابہ موہڑہ
میں کیوں نہ ترک تعلق کی ابتدا کرتا
وہ دور دیس کا باسی تھا کیا وفا کرتا
وہ میرے ضبط کا اندازہ کرنے آیا تھا
میں ہنس کے زخم نہ کھاتا تو اور کیا کرتا

☆ رابعہ عمران چوہدری......رحیم یار خان
پلک جھپکتے ہی دنیا اجاڑ دیتی ہیں
وہ بستیاں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں
فراز ملتے ہیں غم بھی نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

☆ نفیسہ آرا......راس الخیمہ
بیٹھ جاتا ہوں خاک پہ اکثر
اپنی اوقات اچھی لگتی ہے

☆☆☆

منتخب غزلیں



ماہِ مئی اردو شاعری کے دو عظیم نام ضمیر جعفری اور مجید امجد کا
ماہِ وفات ہے۔ اسی مناسبت سے ان معروف شعراء کا کلام آپ کی نذر



ہم اگر دشتِ جنوں میں نہ غزل خواں ہوتے
شہر ہوتے بھی تو آواز کے زنداں ہوتے

زندگی تیرے تقاضے اگر آساں ہوتے
کتنے آباد جزیرے ہیں کہ ویراں ہوتے

تو نے دیکھا ہی نہیں پیار سے ذرّوں کی طرف
آنکھ ہوتی تو ستارے بھی نمایاں ہوتے

آرزوؤں سے جو پیمانِ وفا ہم رکھتے
سانحے زخم بھی ہوتے تو گلستاں ہوتے

عشق ہی شعلۂ امکانِ سحر ہے ورنہ
خواب تعبیر سے پہلے ہی پریشاں ہوتے

ماضی و دوش کا ہر داغ ہے فردا کا چراغ
کاش یہ شام و سحر صرف دل و جاں ہوتے

ضبط طوفاں کی طبیعت ہی کا اک رخ ہے ضمیر
موج آواز بدل لیتی ہے طوفاں ہوتے

کلام: ضمیر جعفری
یکم جنوری 1916ء تا 12 مئی 1999ء

برس گیا بہ خراباتِ آرزو ترا غم
قدح قدح تری یادیں سبو سبو ترا غم

ترے خیال کے پہلو سے اٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سو ترا غم

غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈھتی کرن تری دُھن
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آبِ جو ترا غم

ندی پہ چاند کا پرتو ترا نشانِ قدم
خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص تو ترا غم

نخیلِ زیست کی چھاؤں میں نَے بہ لب تری یاد
فصیلِ دل کی کلس پر ستارہ جُو ترا غم

طلوعِ مہر شگفتہ سحر سیاہیِ شب
تری طلب تجھے پانے کی آرزو ترا غم

نگہ اٹھی تو زمانے کے سامنے ترا روپ
پلک جھکی تو مرے دل کے روبرو ترا غم

کلام: مجید امجد
29 جون 1914ء تا 11 مئی 1974ء



مائیکرو ویو والا چاکلیٹ کیک

اشیا: میدہ، ایک کپ۔ مکھن، سو گرام۔ بیکنگ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ کوکو پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ۔ انڈے، تین عدد۔ ونیلا ایسنس، ڈیڑھ چائے کا چمچ۔ دودھ، حسبِ ضرورت۔ چینی پسی ہوئی، ایک کپ۔

ترکیب: میدہ، بیکنگ پاؤڈر اور کوکو پاؤڈر کو ایک ساتھ چھان لیں، پھر ایک پیالے میں ڈال کر انڈا، مکھن، چینی اور ونیلا ایسنس ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں اگر ضرورت سمجھیں یعنی خوب گاڑھا ہو تو تھوڑا دودھ ڈال لیں۔ اب مائیکرو ویو برتن میں ڈال کر مائیکرو ویو میں ہائی اسپیڈ پر رکھ کر پانچ منٹ کے لیے پکائیں، جب آپ دیکھیں کہ کیک پھول کر اوپر آ گیا ہو تو نکال لیں اور سرو کریں۔

از: بینا عباس، کراچی

چکن کریلے کباب

آج ایک نئے قسم کے کباب لے کر حاضر ہوں

اشیا: کریلے، آدھا کلو۔ نمک، مرچ، حسبِ ذائقہ۔ تیل، دو پیالی۔ ڈبل روٹی، دو سلائس۔ (چورا کرلیں) چکن کا قیمہ، ڈیڑھ کلو۔ کالی مرچ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ انڈے دو عدد۔ (پھینٹے ہوئے)

ترکیب: پہلے کریلوں کو کاٹ کر درمیان سے بیج نکالیں اور نمک لگا کر دھوپ میں رکھ دیں۔ پھر دو تین گھنٹے بعد پانی سے دھو کر چوپر میں پیس لیں۔ قیمہ علیٰحدہ دیگچی میں ابال لیں۔ جب گل جائے تو پانی خشک کر کے ٹھنڈا کر کے اسے مزید پیس لیں۔ اب بریڈ کا چورا (کرمبز) نمک مرچ انڈے بھی اس میں ملا دیں اور اچھی طرح مکس کرلیں۔ اب اس چکن کریلے قیمے کے کباب بنا کر کم تیل میں فرائی کرلیں اور سرونگ پلیٹ میں سلاد اور چٹنی کے ساتھ نوش فرمائیں۔ یہ ڈش اپنی لذت کے ساتھ، ساتھ شوگر کے لوگوں میں بے حد پسند کی جاتی ہے۔

از: نفیسہ آرا، دبئی

بوہری فرائیڈ کھجوریں

اشیاء: کھجوریں (گٹھلی نکال لیں) آٹھ اونس۔ کریم، (پھینٹ لیں) ایک کپ۔ تیل، تین چمچ۔ پستہ (لمبا کاٹ لیں) ایک کھانے کا چمچ۔

ترکیب: ایک پین میں تیل گرم کریں، کھجوریں ڈال کر دیں، بیس منٹ تک پکائیں پھر ان کو آرام سے چمچے سے نکال کر ڈش میں رکھیں۔ کریم میں پستہ شامل کریں، اور اس کو سرونگ پیالہ میں ڈال کر کھجوروں کے ساتھ سرو کریں۔

مٹن وائٹ قورمہ

اشیا: بکرے کا گوشت، ایک کلو۔ نمک، سرخ مرچ، حسبِ ذائقہ۔ خشخاش، پیسٹ، دو کھانے کے چمچ۔ تیل یا گھی، ایک کپ۔ باریک کٹی ادرک، ایک کھانے کا چمچ۔ جائفل، جاوتری اور سبز الائچی، (پسی ہوئی) ایک چائے کا چمچ۔ ادرک، لہسن کا پیسٹ، دو کھانے کے چمچے۔ کیوڑا ایسنس، چند قطرے۔ بادام، چند عدد۔ کالی مرچ، چار، پانچ عدد۔ چھوٹی الائچی، چار سے پانچ عدد۔ دہی، ایک کپ۔ سبز مرچ، ایک کھانے کا چمچ (باریک کٹی ہوئی) سفید مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ دودھ، ایک کپ۔ پیاز، ایک عدد بڑے سائز کی۔ گرم مسالا پاؤڈر، ایک کھانے کا چمچ۔ کریم، دو کھانے کے چمچ۔ تیز پات، ایک عدد۔ لونگ چار سے پانچ عدد۔ زیرہ سفید، ایک چمچ۔ (بھون کر پیس لیں)

ترکیب: 1۔ ایک دیگچی میں تیل گرم کریں پھر اس میں پیاز ڈال کر فرائی کریں اور پھر گوشت ڈال کر ہلکا سا فرائی کریں۔

2۔ پھر اس میں ثابت گرم مسالا، خشخاش پیسٹ، سفید مرچ، دھنیا پاؤڈر، بادام کا پیسٹ، ادرک، لہسن کا پیسٹ، دہی اور نمک، مرچ، زیرہ ڈال کر اچھی طرح بھون لیں اس کے بعد ایک کپ دودھ ڈال کر ہلکی آنچ پر گوشت گلا لیں۔ حسبِ ضرورت پانی بھی ڈال سکتی ہیں۔

3۔ گوشت گل جائے تو پسا گرم مسالا، جائفل، جاوتری اور سبز الائچی کا پاؤڈر، بادام، پستہ، باریک کٹی ادرک، کریم ڈال کر پانچ منٹ پکائیں اور چولھا بند کردیں۔

4۔ آخر میں کیوڑا ڈال دیں، اور ڈش میں نکال کر گرم، گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

از: سنبل ملک اعوان، شاہدرہ

چپلی کباب

اشیا: قیمہ باریک، آدھا کلو۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ کارن فلاور، آدھا کپ۔ سفید زیرہ (بھون کر کوٹ لیں) لال مرچ، (کٹی ہوئی) ٹماٹر، دو عدد (چوپ کرلیں)۔ پیاز، دو عدد۔ (چوپ کرلیں) ثابت دھنیا، آدھا کپ۔ (بھون کر کوٹ لیں) اناردان، آدھا کپ۔ (باریک کوٹ لیں)

ترکیب: قیمہ میں تمام مسالے ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ کم تیل میں کباب بنا کر تلیں، اوپر سے ایک گول کٹا ہوا ٹماٹر رکھ دیں اور پودینے، کیری کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

از: ماہ نور خان، بہارہ کہو

چکن کیک

اشیا: چکن کا قیمہ، تین کپ۔ چلی ساس، آدھا کپ۔ ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا)، آدھا کپ۔ آئل، حسبِ ضرورت۔ مونگ پھلی کا مکھن، (پی نٹ بٹر) ایک کھانے کا چمچ .... (گھبرائیں نہیں یہ میٹھا نہیں ہے۔) پیاز، (باریک کٹی ہوئی) ایک عدد درمیانی۔ دہی، آدھا کپ۔ بریڈ کرمبز، ڈیڑھ کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ سیاہ مرچ پاؤڈر، حسبِ پسند۔

ترکیب: چکن کا قیمہ ابال لیں۔ اس میں پیاز، دو کھانے کے چمچ۔ چلی ساس، پی نٹ بٹر، نمک، سیاہ مرچ، دہی اور ایک کپ بریڈ کرمبز ملا کر چاپر مشین میں ڈال کر باریک کرلیں۔ پھر ساتھ میں ہرا دھنیا بھی شامل کرلیں۔ اب اس مکسچر سے چوکور کباب تیار کرلیں۔ بریڈ کرمز میں الٹ پلٹ کریں اور آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ ایک اوون پروف ٹرے میں ہلکا سا آئل برش کریں۔ چوکور کبابوں کو ترتیب سے ٹرے میں رکھیں۔ اوپر سے ہلکا سا تیل لگا دیں۔ پہلے اوون کو 20 سے 25 منٹ 250 ڈگری سینٹی گریڈ پر گرم کریں پھر یہ کبابوں کی ٹرے رکھ دیں۔ 20 سے 25 منٹ میں یہ تیار ہو جائیں گے۔

از: زرینہ خان، بہارکہو

ربن سینڈ وچز

اشیاء: ایک فلنگ، ڈبل روٹی دو سلائس۔ لمبائی میں کاٹ لیں، کنارے علیٰحدہ کرلیں۔ دوسری فلنگ، حسبِ ضرورت۔ کیچپ کے لیے .... مایونیز، حسبِ ضرورت۔ چٹنی تیسری فلنگ، مکھن، حسبِ ضرورت۔

چٹنی کے اجزا: ہرا دھنیا، ایک گٹھی۔ پودینے کے پتے، پندرہ عدد۔ ہری مرچ، چھ عدد۔ نمک، آدھا چائے کا چمچ۔ کھوپرا، آدھا کپ۔ لہسن، چار جوے۔

ایک فلنگ کے اجزا:

ابلے انڈے، دو عدد۔ کالی مرچ، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ مایونیز، ایک کھانے کا چمچ۔

ترکیب:

☆ چٹنی بنانے کے لیے تمام اشیا بلینڈر میں ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کرلیں۔ یہاں تک کہ یکجان ہو جائے۔

☆ ایک فلنگ کے لیے دو عدد انڈوں کے ساتھ تمام اشیا کو اچھی طرح میش کرلیں۔

☆ دو سلائس لمبائی میں کٹا ہوا وائٹ سینڈوچ لوف اور دو سلائس لمبائی میں کٹا براؤن سینڈوچ لوف کے کنارے کاٹ لیں۔

☆ اب براؤن بریڈ پر مکھن لگا کر مایونیز اور ہری چٹنی لگائیں

☆ پھر اس پر وائٹ بریڈ کا سلائس رکھیں۔ اب اس پر مکھن اور مایونیز لگا کر ایک اور فلنگ لگا دیں۔ اب سلائسز کاٹ کر پیش کریں۔

چکن فنگرز

ضروری اشیاء: میدہ، ایک کپ۔ بیکنگ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ضرورت۔ تل، دو چائے کے چمچ۔ ڈبل روٹی کا چورا، ایک کپ۔ دہی، ایک کپ۔ چکن (سینے کا پیس) ایک عدد۔ لال مرچ، (پسی ہوئی) کیچپ، دو کھانے کے چمچ۔ لہسن کا پیسٹ، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ دھنیا، (پسا ہوا) ایک چائے کا چمچ۔ زیرہ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ تیل، تلنے کے لیے۔

ترکیب: سب سے پہلے چکن کو فنگر پیسز میں کاٹ لیں پھر اس میں لال مرچ، لیموں کا رس، کیچپ، لہسن کا پیسٹ، نمک، دھنیا، زیرہ پاؤڈر اور دہی شامل کر کے آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

☆ اب میدے میں بیکنگ پاؤڈر اور نمک مکس کر کے پانی سے گھول لیں۔ جب آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو اس میں چکن کے پیس ڈال دیں۔

☆ پھر ڈبل روٹی کے چورے اور تل میں الٹ پلٹ کر کے فرائی کرلیں۔

گولڈن براؤن اور کرسپی ہو جانے پر گرم، گرم چکن فنگرز پلیٹ میں نکال کر پیش کریں۔ از: عریشہ جنید، کراچی

☆☆☆

بزمِ پاکیزہ

پاکیزہ بہنیں



پہلا انعام یافتہ سوال

☆ فرخندہ جعفری...... گجرات

سوال: انسان کی عظمت کو تولنے کا کوئی پیمانہ ہے؟

جواب: آپ کا اپنا دل......

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ مہرین ضیا بنگش...... کراچی

سوال: درد دلوں کے کم ہو جاتے؟

جواب: اگر خلوصِ نیت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے۔

☆ ثمینہ کوکب...... جہلم

سوال: سچ کڑوا ہے تو جھوٹ؟

جواب: کڑوا ترین...... مگر تاثیر میں...... بظاہر تو نادان کام چلا لیتا ہے۔

☆ آسیہ عامر...... کراچی

سوال: باجی ساس کو سہیلی بنانا ہے کیسے بناؤں؟

جواب: پاس بیٹھ کر باتیں کرو، ان کے سر میں تیل لگاؤ، ان کے کپڑے استری کر کے دو، کبھی انہیں گھمانے پھرانے، آئس کریم کھلانے اپنے ساتھ لے جاؤ، ان کی جوانی کی باتیں کرو، دیکھنا پکی سہیلی بن جائیں گی۔

☆ شازیہ ہاشم........ کھڈیاں خاص، قصور

سوال: عدل کی زنجیر ٹوٹ گئی اور سچ کا پیمانہ کہاں چلا گیا ڈیئر؟

جواب: تلاش تو کرو مگر پہلے اپنے گریبان میں ضرور جھانکو۔

سوال: صورت کو سیرت پر ترجیح کیوں دی جاتی ہے؟

جواب: ہر کوئی نہیں دیتا، چشمِ بینا ہر کسی کے پاس تو نہیں ہوتی ناں......

☆ زرینہ خان...... بہارہ کہو

سوال: دل کے ارمان آنسوؤں میں کب بہتے ہیں؟

جواب: آپ کے استری شدہ کپڑے، بھائی پہن کر چل دے یا پھر آپ کی محنت پر کوئی اور قبضہ جمانے آ جائے......

☆ نگینہ ضیا بنگش...... کراچی

سوال: وہ بہت لمبی لمبی چھوڑتی ہے کیا کروں؟

جواب: آپ پھرکی لے کر لپیٹنا شروع ہو جایا کریں۔

سوال: آج کل کی لڑکیوں میں پردہ نام کی چیز کہاں گم ہو گئی ہے؟

جواب: گھر والوں کی عقلوں پر جو پڑ گیا ہے۔

☆ صباحت ضیا بنگش...... کراچی

سوال: سالگرہ کے دن بھی کوئی خالی ہاتھ آئے تو؟

جواب: آج کل تو زبانی مبارک باد بھی لوگ نہیں دیتے تو تحفہ تو......

سوال: سالگرہ میں اگر کیک کے بجائے کوئی پھول گوبھی کاٹے تو؟

جواب: کیا مطلب ہے تم نے پھول گوبھی کی شیپ کا کیک تو نہیں بنا لیا۔

☆ فرخندہ جعفری...... گجرات

سوال: سانپ کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا مگر انسان کا ڈسا؟

جواب: اب کیا کہیں جواب بہت تلخ ہو جائے گا۔



حسن نکھار کے لیے

مہ جبیں

ہماری جلد اور اس کی نگہداشت

قدیم زمانے سے حُسن کو دوبالا کرنے کے لیے دیسی ہربل جڑی بوٹیوں کو استعمال کیا جا رہا ہے جو کہ ہر سائڈ افیکٹ سے پاک ہوتی ہیں اور ہمارے بجٹ میں رہتے ہوئے مفید بھی ہیں۔ ہم آج آپ کو مختلف بازاری کیمیکل پراڈکٹ جو کہ سائڈ افیکٹ بھی رکھتی ہیں، وہ پراڈکٹ آپ کو خود بنانا بتاتے رہے ہیں۔

نارمل جلد: اللہ تعالیٰ کا ایک بہترین تحفہ ہے۔ نارمل جلد جس کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے ہم کیمیکل صابن، لوشن، کریم سے اپنی اسکن کو وقتی فریش تو کر لیتے ہیں مگر وہ کیمیکل جو مضر اثرات رکھتے ہیں نقصان دہ ہیں۔

اسکن کی صفائی: چند تازہ گلاب لے کر اسے دو گلاس کھولتے گرم پانی میں ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ جب پانی گلابی ہو جائے تو اس میں دو چمچے لیمن جوس۔ ایک چمچ شہد، چٹکی، آدھا چمچ۔ دو چمچ کھیرے کا جوس۔ ان سب کو مکس کر کے شیشے کی بوتل میں محفوظ کر کے فریج میں رکھ لیں۔ رات کو سوتے وقت کسی ململ کے کپڑے سے اس محلول سے پورے چہرے، گردن، ہاتھ، پیر کی صفائی کریں۔ چند ہفتوں میں آپ کا چہرہ چمک اٹھے گا اور فریش ہو جائے گا۔ اور یہ سیرپ اسکن ٹونر کا بھی کام دے گا۔

اسکن واش: جلد کو دھونے کے لیے ہمیشہ اچھے صابن یا فیس واش کا انتخاب کریں جو آپ کی جلد کی حفاظت برقرار رکھ سکے۔ یعنی دیسی صابن بھی جڑی بوٹیوں کی مدد سے بنایا جا سکتا ہے۔ آیئے جانتے ہیں کیسے؟

اجزا:

1۔ جو کا آٹا، ایک کپ۔

2۔ گاجر کے بیج، چار ٹیبل اسپون

3۔ ہلدی ثابت، دو ٹیبل اسپون (پیس کر ناپ کر لیں)

4۔ تازہ چنبیلی کے پھول، ایک کپ

5۔ موتیے کے پھول، ایک کپ

6۔ نیم کے خشک پتے، آدھا کپ

7۔ کینو کے چھلکے، ایک کپ (سوکھے ہوئے)

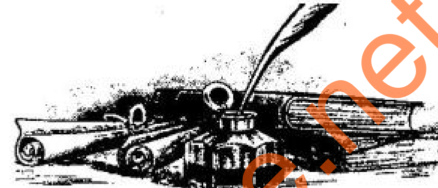
8۔ ریٹھا (جو جھاگ بناتا ہے) ایک پاؤ (گٹھلی نکال کر گرم پانی میں ڈال کر آمیزہ بنا لیں)

ان سب چیزوں کو باریک پسوا کر ایک کلو پانی میں چڑھا دیں۔ اس میں ریٹھے کا پانی آدھا کلو ڈال کر اس آمیزے کو گاڑھا کر لیں۔ اس قدر گاڑھا کر لیں کہ یہ ایک لیس دار آمیزے کی شکل اختیار کر لے۔ اس آمیزے کو چھوٹے، پیالے میں رکھ کر فریج میں جما دیں۔ تاکہ ایک صابن کی شکل اختیار کر لے۔ آپ کا ہربل بیوٹی سوپ تیار ہے جو کہ بے ضرر ہے اور آزمودہ ہے۔ یہ صابن ہر قسم کی جلد کے لیے مؤثر کیمیکل سے پاک ہے۔

دھوپ سے بچنے کے لیے اک نسخہ: دھوپ میں جانے سے قبل گھریلو تیار کردہ ہربل عرقِ گلاب فیس پر اسپرے کر کے جائیں تاکہ آپ کی جلد کی رنگت کالی نہ ہو۔

ترکیب: سن بلاک کے لیے آٹھ سے دس عدد تازہ گلاب کے پھول لے کر اس کو دو کلو کھولتے پانی میں ڈال دیں۔ جب پانی گلابی ہو جائے تو اس پانی میں ایک چمچ لیموں کا جوس ڈال کر فریج میں رکھ دیں۔ گھر سے جانے سے قبل فیس، ہاتھوں اور گردن پر اسپرے کر کے جائیں۔ آپ کی جلد دھوپ سے متاثر نہیں ہو سکے گی۔

☆☆☆





ادارہ

والدین کے لیے دعائے مغفرت

قرآن حکیم میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد والدین کی اطاعت کے بھی احکام ہیں۔

اگر کوئی شخص بدقسمتی سے والدین کی خدمت ان کی زندگی میں نہ کر سکا تو اسے چاہیے کہ صدقِ دل سے اب بھی توبہ کرلے۔

☆ قبورِ والدین پر جائے اور فاتحہ خوانی کرے۔

☆ والدین کی طرف سے جتنا ہو سکے صدقہ خیرات کرے۔

☆ ان کے ذمے پنجگانہ نمازیں اگر ہوں تو وہ ادا کرے۔

☆ بے کس، غریب، مسکین، بیمار، رشتے داروں کی خبرگیری کرے اور جو والدین کے قریبی قرابت دار ہیں ان سے حُسنِ سلوک کرے۔

☆ ان کے لیے اگر ہو سکے تو روزانہ ورنہ ہر شبِ جمعہ دو نفل مغفرت کے ضرور ادا کرے۔

اول رکعت میں بعد سورۃ الحمد یہ آیت......

رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ

ترجمہ: "خداوندا! جب روز حساب آئے تو مجھ کو، میرے ماں، باپ کو اور سارے ایمانداروں کو بخش دینا۔"

اور دوسری رکعت میں بعد سورۃ الحمد یہ آیت

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ

ترجمہ: "خداوندا! میری، میرے ماں، باپ کی اور جو مومن میرے گھر آئے اس کی اور تمام مومن مردوں اور عورتوں کی بخشش فرما۔" تلاوت کرے اور بعد سلام یہ آیت تلاوت کر کے ان کے لیے مغفرت طلب کرے۔

رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا

ترجمہ: "خداوندا! جس طرح میرے والدین نے میرے بچپن میں میری پرورش کی (اور مجھے پیار دیا) اسی طرح تو بھی ان پر رحم فرما۔"

☆ والدین کی خدمت، اطاعت اور ان کی فرمانبرداری ہر مسلمان مرد، عورت پر فرض قرار دی گئی ہے۔ پروردگار سے دعا ہے ہمیں اپنے والدین کے حقوق جاننے اور انہیں پورا کرنے کی توفیق عطا ہوتی رہے۔ الٰہی آمین......!

نظرِ بد

کسی انسان کے ظاہری حسن یا صلاحیتوں پر بھی نظر بد لگ سکتی ہے اس کے لیے احادیث مبارکہ بھی ملتی ہیں، خود رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نواسوں حسنین کریمین کو زانوئے پاک پر بٹھا کر تین، تین بار معوذ تین یعنی سورۃ فلق اور سورۃ والناس پڑھ کر پھونکا کرتے تھے۔ حُسن کی نعمت پروردگار کی عطا ہے کسی کی اچھی آواز پر بھی نظر لگ جاتی ہے، اسی لیے تاکید کی جاتی ہے کہ ماشاء اللہ ضرور کہو...... کسی کی تعریف کرنا صرف اس کو سراہنا نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی گئی نعمتوں کو سراہنا ہے مگر تعریف بھی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک تو رشک ہوتا ہے اور ایک حسد...... رشک بھی اس حد تک ہو کہ اس میں دوسرے

کے لیے حسد اور جلن کا شائبہ تک نہ ہو بلکہ خوش دلی سے تعریف کی جائے۔ بہرحال ہم یہاں بری نظر سے بچنے کے وظائف بتاتے ہیں۔

☆ صبح شام اول و آخر تین بار درود شریف پڑھ کر تین بار معوذ تین پڑھ کر دم کریں۔

☆ یا اسمائے پاک...... یا حسیب، یا حفیظ، یا برّ...... یا مانع، یا منیر، یا خلیل، یا حلیم، یا مرتضیٰ دس، دس بار پڑھ کر دم کریں یا زعفران سے کانے (سرکنڈے) کے قلم سے چینی کی پلیٹ میں لکھ کر پھر اس کا پانی پلائیں۔ اول و آخر چودہ بار درود پاک ضرور پڑھیں۔

زلزلے اور آسمانی آفات سے محفوظ رہنے کی دعا

پروردگارِ عالم سے دعا ہے کہ وہ ہم سب پر اپنا کرم خاص کرے اور ناگہانی و آفاقی آفات سے بچائے۔ ہمارے رسول پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے قدم، قدم پر امت کی رہنمائی فرمائی ہے۔

ان آفات ارضی و سماوی سے حفظ و امان حاصل کرنے کے لیے سونے سے قبل اول و آخر سات، سات بار درود پاک پڑھیں اور مندرجہ ذیل آیات کا ۲۱ بار ورد کریں۔ سورۃ فاطر آیت ۴۱ پارہ نمبر ۲۲۔

ترجمہ: "بے شک خدا ہی سارے آسمان اور زمین اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر (فرض کرو کہ) یہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو پھر اس کے سوا انہیں کوئی روک نہیں سکتا...... بے شک وہ بڑا بُردبار (اور) بڑا بخشنے والا ہے۔"

☆ سورۂ زلزال کا ورد بھی ان آفات سے سلامتی کا باعث ہے۔

دعا برائے سلامتی

ہر قمری مہینے کی یکم کے روز دو رکعت نماز اس ماہ کی سلامتی کے حصول کی نیت سے ادا کریں۔ پہلی رکعت میں بعد سورۃ الحمد تین مرتبہ سورۃ اخلاص اور دوسری رکعت میں بعد سورۃ الحمد تین مرتبہ سورۃ قدر پڑھ کر نماز تمام کریں اور بعد میں حسبِ حیثیت کچھ صدقہ دے دیں۔

خوف دور ہو

کسی شخص کو کسی بھی قسم کا خوف طاری ہو، مشکل ہو پریشانی ہو تو وہ یہ دعا ورد کرے۔

1- بسم اللہ الرحمن الرحیم...... اللھم انی مغلوب فانتصر

2- یا رؤف یا رحیم

☆☆☆

رمضان المبارک کے عشروں کی دعائیں ان کا ورد کثرت سے کریں

پہلا عشرہ، رحمت

یا حی یا قیوم برحمتک استغیث

ترجمہ: "اے زندہ اور قائم رہنے والے رب تیری رحمت کا سوالی ہوں۔"

دوسرا عشرہ، مغفرت

رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین

ترجمہ: "اے رب! تو بخش دے اور رحم فرما اور تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔"

تیسرا عشرہ، جہنم سے نجات

اللھم اجرنی من النار

ترجمہ: "اے اللہ! مجھے جہنم کی آگ سے بچا۔"

☆☆☆



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

تھائیرائیڈ

واورع......لاہور

تقریباً دس سال سے میرے گردوں میں پتھری تھی۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

جون 2018ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

میں بر برس ولگیرس لیتی رہی اور چھپاکی یعنی پتی اچھلنا کا بھی مرض تھا اس کی میں Ptk86 دوائی پیتی تھی۔ اللہ کا خاص کرم ہے کہ دونوں مرض ختم ہوگئے۔ اب تقریباً ایک سال سے 140 تک شوگر اور BP 140/100 تک ہوجاتا ہے۔

گردن کے دائیں طرف تقریباً 5 انچ بڑا گلہڑ ہے۔ یہ گلہڑ کسی طرح بھی کم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اس کا آپریشن ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کا آپریشن کرواؤں۔ اس کو تقریباً بارہ سال ہوگئے ہیں لیکن اس میں کوئی درد وغیرہ نہیں ہوتا۔ میں کھڑے ہوکر نماز نہیں پڑھ سکتی اور نہ ہی ٹانگیں دوہری کرسکتی ہوں، زیادہ چل پھر نہیں سکتی نہ ہی واک کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ گردن اور مونڈھے کے پٹھے اور ٹانگوں ہاتھوں پیروں میں شدید اکڑن یعنی اکڑاؤ ہوجاتا ہے پھر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں پتھر کی ہوگئی ہوں۔ پیشاب بھی کنٹرول نہیں ہوتا۔ برائے مہربانی کوئی اچھی قسم کی دوائیاں تجویز فرمادیں۔ بہت بہت شکریہ۔

جواب: آپ اللہ سے اچھی امید رکھیں، دعا کریں اور اس پر چھوڑ دیں۔ متوازن غذا لیں اور جتنا ممکن ہو چلیں پھریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Viscum Pentarkan Ptk 89 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ Rhustox Pentarkan Ptk73 7 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ Iodium 30,Calc Fluor 30 کے 7 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ Syzygium Schwabe کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

حرا درّانی......کوئٹہ

جواب: آپ کا تفصیلی جذباتی و نفسیاتی خط پڑھنے کے بعد اس بات کی ضرورت محسوس ہورہی ہے کہ میاں بیوی دونوں کا انٹرویو/معائنہ کیا جائے اس کے بعد پھر فیصلہ کیا جائے کہ اصل معاملہ کیا ہے اور اس کے حل کے لیے کیا قدم اٹھایا جائے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ کسی قریبی اچھے ماہر ہومیو پیتھ کو دکھایا جائے کیونکہ ان سب معاملات کا ہومیو پیتھی میں موثر علاج ہے۔ باقی اللہ کی طرف سب رجوع کریں۔ نیت اچھی رکھیں، انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

وزن کی زیادتی

عائزہ نور......سانگلہ ہل

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور تندرستی والی لمبی عمر عطا فرمائے اور آپ اسی طرح مخلوقِ خدا کی خدمت کرتے رہیں اور پاکیزہ میں آپ کا نام روشن ہوتا رہے۔ (آمین) میرا وزن (73) کلو ہے اور موٹاپا ہمارا خاندانی مسئلہ ہے جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے وزن کم کرنے کے لیے دوائیں بتائیں اور میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے ہیں ان کو بھی صاف کرنے کے لیے کوئی دوا تجویز کریں۔



جواب: وزن کم کرنا آسان کام نہیں اس کی کئی ایک وجوہات ہوتی ہیں۔ مختلف ہارمونز بھی اس کی وجہ بنتے ہیں۔ خاندانی بھی ہوتا ہے۔ غذا پر کنٹرول اور ورزش بھی اہم ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ ہر ہفتے Calc carb 200 کی ایک خوراک یعنی 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں لیں۔ ایک دن کے وقفے کے بعد Fucus ves Q اور Phytolacca e baccis Q کے 10 قطرے 1/2 کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے دوبارہ آگاہ کریں۔

ذہنی طور پر ڈسٹرب

منزہ تبسم......خوشاب

مجھے بھوک نہیں لگتی حالانکہ دوائی لیتی ہوں۔ قبض ہے اور دوسرا بڑا مسئلہ نزلے کا۔ حلق میں نزلہ گرتا رہتا ہے۔ اگر کھانسی زکام ہوجائے تو نزلہ بڑھ جاتا ہے۔ نزلے کا کوئی حل بتائیں۔ میں نے اس کے لیے کوئی دوا نہیں لی۔ لیکن پریشانی بہت ہے۔ ٹانگوں میں کبھی، کبھی درد ہوتا ہے۔ تھکن ہوجاتی ہے۔ ڈپریشن کی بھی دوا لیتی ہوں۔ نہ لوں تو طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔ غلط خیالات آتے ہیں۔ ٹینشن ہوتی ہے۔ نزلہ سفید رنگ کا عموماً ہوتا ہے۔ یہ تکلیف تقریباً سات سال سے ہے۔ آج کل زیادہ مسئلہ ہے۔

جواب: اللہ کی طرف دل لگائیں، نماز کی پابندی کریں۔ مرغن غذا سے پرہیز کریں۔ سادہ غذا کھائیں، ٹھنڈا اور ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کریں۔ نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر ناک میں چڑھائیں اور غرارے بھی کریں کم از کم 3 مرتبہ۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Teucrium 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ

لیں۔ Carduus Marianus Pentarkan Ptk 23 کے 15 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ Cinnabaris Pentarkan Ptk 31 کی 2 گولیاں دن میں 3 مرتبہ چبا کر لیں۔ Nux vomica Pentarkan Ptk 63 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ ہر کھانے کے بعد لیں۔ رات سونے سے ایک گھنٹا قبل Passiflora Pentarkan Ptk 66 کے 20 قطرے تھوڑے پانی کے ساتھ لیں۔ ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے مطلع کریں۔

پلاک (plaque)

مسز کامران...... ہری پور ہزارہ

میرا plaque کا مسئلہ ہے۔ صفائی کرواتی ہوں تو کچھ عرصے بعد پھر سامنے کے دانت پر plaque بن جاتا ہے۔ اگرچہ میں anti plaque / میڈیکیٹڈ ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتی ہوں مگر پھر بھی بن جاتا ہے۔ مسوڑھوں سے خون نہیں آتا مگر جب plaque کو توڑوں تو خون آتا ہے۔ اب کبھی کبھی مسوڑھوں میں درد محسوس ہوتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کوئی ایسی دوائی / غذا تجویز کریں جس سے دانتوں اور مسوڑھوں کے مسائل حل ہوجائیں۔

جواب: یہ آپ کی جان اس لیے نہیں چھوڑ رہا کیونکہ آپ اس کے سدِباب کے لیے کچھ نہیں کررہی ہیں۔ ہر کھانے کے بعد برش کریں، خصوصاً رات کو سونے سے پہلے اور صبح ناشتے کے بعد ضرور برش کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Carbo veg 30 ...... 5,5,Fragaria ves 30 قطرے ایک گھونٹ پانی میں لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

نشوونما کے مسائل

مسز احمد خان...... اسلام آباد

میری بچی جس کی عمر 16 سال ہے۔ جسمانی طور پر صحت مند اور ذہین بچی ہے۔ 3 سال پہلے دور کی نظر کمزور ہوئی تو 4 نمبر کا چشمہ لگ گیا، اب نظر اور کمزور ہوگئی ہے۔ ایک آنکھ کا 4.50 اور دوسری آنکھ کا 5 نمبر ہوگیا ہے۔ اس کے سر کے بال بھی دس سال کی عمر سے سفید ہونا شروع ہوگئے تھے۔ پہلے کم تھے اب بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔ قد 4 فٹ "11 ہے میں چاہتی ہوں تھوڑا اور بڑھ جائے۔

جواب: ہمیشہ یاد رکھیں متوازن غذا، مناسب ورزش، تازہ ہوا، دھوپ اور صاف پانی نہ صرف کسی بھی عمر میں صحت کو برقرار رکھتے ہیں بلکہ جسم کی نشوونما کے لیے بھی بے حد اہم ہیں۔ جسے ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ لہٰذا ان سب چیزوں کا خیال رکھیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc Fluor 6، Calc Phos 30، Physostigma 30 اور Lycopodium 30 کے پانچ پانچ قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ دو ماہ بعد کا حال بتائیں۔

چہرے و جسم کی رنگت

پریا خان...... فیصل آباد

ڈاکٹر صاحب میں پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں اور آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آج سے 7-8 سال پہلے میں نے اپنا مسئلہ آپ سے بیان کیا تھا کہ میرا رنگ صاف اور فیئر تھا لیکن پڑھائی کی ٹینشن سے ڈل ہونے لگا۔ آپ نے مجھے جو دوا استعمال کرنے کو کہا اس سے میرا رنگ بہت اچھا اور سرخ سفید ہوگیا۔ اب میں شادی شدہ ہوں اور دو بچے بھی ہیں۔ میرا پتے کا آپریشن بھی ہوا تھا جس کے بعد سے پھر رنگ ڈل ہونے

لگا ہے۔ پہلے جیسا نہیں ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے دوا تجویز کریں کہ میں پہلے جیسی ہوجاؤں۔ سر کے بال بھی بہت گرنے لگے ہیں۔ اس کے لیے بھی بتائیے گا۔

جواب: وقت کے ساتھ ہارمونز میں تبدیلی آتی ہے جو جسمانی تبدیلیاں لے کر آتے ہیں، کچھ دوائیوں کے اثرات ہوتے ہیں۔ آپریشن اور بچوں کی پیدائش کے بعد بھی جسم میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ حفظانِ صحت کے اصولوں کا خیال رکھیں۔ متوازن غذا کا استعمال کریں، پانی زیادہ پئیں، تازہ پھلوں کے جوسز کا استعمال کریں۔ یاد رکھیں جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے ہمیں اپنا خیال اور زیادہ رکھنا پڑتا ہے۔ Hb% چیک کرا کر رپورٹ بھیجیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Sulphur 200 کے 7 قطرے 1/2 کپ پانی ڈال کر صبح نہار منہ لیں۔ پھر ایک دن بعد Berberis AquifoliumQ کے 7 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے مطلع کریں۔

رمضان المبارک میں بیماری و صحت سے متعلق پوچھے گئے سوالات

بہت سارے خطوط میں رمضان المبارک میں بیماریوں اور مختلف صحت کے متعلق سوالات پوچھے گئے ہیں۔

۱) کیا رمضان میں وزن کم کیا جاسکتا ہے؟
(ایمان، لاہور)

۲) شوگر کے مریض روزہ رکھ سکتے ہیں؟
(نادیہ، ناظم آباد، کراچی)

۳) دل کے مریض روزہ کس طرح رکھیں؟
(راحیلہ، گلبرگ لاہور، رمضان، کریم آباد کراچی)

۴) روزے میں سانس ہو جائے تو کیا کریں؟
(ریحانہ شاہ فیصل کالونی، کراچی)



۵) میرے گردے میں پتھری اور پیشاب میں انفیکشن ہے کیا میں روزہ رکھ سکتی ہوں؟
(فریدہ، حیدرآباد کالونی، کراچی)

۶) لیکوریا ہونے کی وجہ سے کیا روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ (کراچی)

۷) بلڈ پریشر بڑھا رہتا ہے تو رمضان میں دوائی کیسے استعمال ہوگی؟
(علی، پی آئی بی کالونی، کراچی)

۸) آپ اور عموماً ڈاکٹر حضرات دن میں 3 سے 4 مرتبہ دوائی کا استعمال بتاتے ہیں تو یہ روزے میں کس طرح ممکن ہے؟ (غزالہ، پی ای سی ایچ ایس، کراچی)

۹) میرا بچہ 8 ماہ کا ہے۔ میں اس کو فیڈ کرا رہی ہوں۔ کمر کی تکلیف ہے کیا کروں؟ اور کیا میں روزہ رکھ سکتی ہوں؟ (کراچی)

جواب: ان سب سوالوں کا فرداً فرداً جواب دینے سے پہلے میں ایک جنرل اصول بیان کروں گا جس سے بہت ساری چیزیں ہمارے ذہن میں صاف ہوجائیں گی۔ رمضان المبارک کا مہینہ سال میں ایک بار آتا ہے جس کا مقصد ہماری روح کی پاکیزگی ہے۔ یعنی اس کے اندر جو خرابیاں ہیں اس کو ختم کرنا اور اس کے اندر موجود کمزوریوں کو دور کرنا۔ روح اور جسم کا ایک بڑا گہرا تعلق ہے۔ جسم روح کے بغیر کسی کام کا نہیں ہے۔ اس لیے روح جتنی طاقتور اور صحت مند ہوگی جسم بھی اتنا ہی اچھا ہوگا۔ روزہ ہمیں کچھ درس دیتا ہے۔ کچھ احساس دلاتا ہے۔ کچھ چیزوں سے روکتا ہے۔ نظم و ضبط سکھاتا ہے۔ غصے کو روکتا اور غیبت سے بچاتا ہے۔ اوقاتِ مقررہ پر کھانا، پینا، تقریباً 24 گھنٹے حالتِ عبادت میں گزارتے ہیں اور یوں روح طاقتور ہوجاتی ہے۔ فکر، غم، غصہ، غیبت، بدنیتی، حرص، طمع، حسد، کینہ، روح کو کمزور کرتے ہیں۔ ہر وقت کھاتے پیتے رہنے یا

افطار و سحر میں مرغن غذاؤں کا استعمال روح اور جسم دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس تمام گفتگو کا مقصد آپ کو یہ باور کرانا ہے کہ ہمارے عمل کی وجہ سے ہم رمضان کے مہینے کو بامقصد، بارحمت و برکت والا بھی بنا سکتے ہیں اور بے مقصد و مصیبت و تکالیف والا بھی۔ اس لیے اس بابرکت و رحمت والے مہینے میں....

(جواب:1) ایسی غذا کا استعمال کریں جو زیادہ مرغن نہ ہو اگر عام روٹی سالن یا چاول کا استعمال کریں تو یہ صحت کے لیے انتہائی مفید ہے۔ عبادات کے لیے وقت زیادہ نکالیں پھر آرام کے لیے اور اس کے بعد کچھ وقت کھانے پینے کے لیے جبکہ عملاً ایسا نہیں ہوتا۔ کھانے پکانے کے لیے وقت بہت زیادہ نکالا جاتا ہے۔ پھر کھانے میں وقت گزرتا ہے اس کے بعد آرام میں اور معمولی وقت عبادت میں۔ یوں وزن بڑھتا ہے، کولیسٹرول بڑھتا ہے، بلڈ پریشر بڑھتا ہے، صحت خراب ہوتی ہے پھر دہراتا ہوں کہ کم ٹھنڈے پانی کا استعمال کریں اور زیادہ مقدار میں پئیں۔ گردے کی پتھری اور انفیکشن سے محفوظ رہیں گے اور علاج میں معاون بھی بنے گا۔

سادہ غذا کا استعمال کریں، یہ شوگر، بلڈ پریشر، کولیسٹرول اور وزن کو کنٹرول کرنے کے ساتھ دل کے مسائل سے محفوظ کرے گا۔ واک بھی ضرور کریں۔ اللہ کا ذکر و عبادت (نماز) ڈپریشن کے لیے انتہائی مفید ہے۔

(جواب:2) شوگر کے وہ مریض جو غذائی پرہیز پر ہیں ان کے لیے روزہ انتہائی مفید ہے۔ شوگر کے وہ مریض جو ادویاتی علاج پر ہیں وہ بھی روزہ رکھ سکتے ہیں۔ شوگر کے وہ مریض جو انسولین پر ہیں اگر وہ صبح و شام لیتے ہیں تو وہ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق انسولین کی مقدار کو شام کو زیادہ اور صبح کم لے کر شوگر کے وہ مریض جو ہومیوپیتھک دوا پر ہیں ان کے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں۔

(جواب:3 اور 7) دل کے مریض اور بلڈ پریشر کے مریض اپنی دل کی کیفیت، معالج سے مشورہ کر کے اور دوائیوں کی مقدار کو ایڈجسٹ کرا کر روزہ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن معالج سے ضرور مشورہ کریں۔

(جواب: 4) سانس کے مریض روزے کی حالت میں دوا کو سونگھ سکتے ہیں کیونکہ ہومیوپیتھک دوا کو سونگھ کر یا جلد پر لگا کر مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

(جواب: 5) معمولی انفیکشن و پتھری میں روزہ رکھ سکتے ہیں کوئی قباحت نہیں لیکن بہتر ہے کہ اپنے معالج سے مشورہ ضرور کریں۔

(جواب: 6) لیکوریا کا بہترین علاج ہومیوپیتھی میں ہے، اس سے روزے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(جواب: 8) یقیناً دن میں روزہ ہوتا ہے اور روزے میں دوا کا استعمال ممنوع ہے اس لیے ہر دوا کو افطار کے بعد، تراویح کے بعد، سوتے وقت اور سحری میں استعمال کرتے رہیں۔

(جواب: 9) اللہ تعالیٰ نے جہاں روزہ فرض کیا ہے وہاں ان لوگوں کو رعایت دی ہے جو بیمار ہیں یا رضاعی مائیں یا وہ کمزور لوگ جن کو روزہ رکھنے کے بعد کمزوری بڑھنے کا خدشہ یا بیمار پڑنے کا ڈر ہو۔ ایسے لوگ (یعنی آپ بھی) روزہ قضا کریں پھر ٹھیک ہونے کے بعد قضا روزہ رکھیں۔

کھانے پینے کا خیال رکھیں۔ وزن اُٹھاتے وقت احتیاط کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رمضان کی خیر و برکت عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆